سرسید: درونِ خانہ
افتخار عالم خاں
ایجوکیشنل بُک ہاؤس ۰ علی گڑھ

سرسید: درونِ خانہ

افتخار عالم خاں

ایجوکیشنل بک ہاؤس ○ علی گڑھ

نام کتاب : سرسید: درونِ خانہ

مصنف : افتخار عالم خاں

سنہ اشاعت : ۲۰۰۶ء

مطبع : ایم۔کے۔ آفسیٹ پریس، دہلی

قیمت : ۳۰۰ روپے

ایجوکیشنل بُک ہاؤس
یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ

Sir Syed Daroon-e-Khana, By Iftikhar Alam Khan
Published by Educational Book House,
University Market, Aligarh-202002

ترتیب

باب سوم

سرسید کا دور وضعداری (۱۸۷۰ء تا ۱۸۷۶ء)

باب چہارم

سرسید کا دور حصاری (۱۸۷۶ء تا ۱۸۹۰ء)

باب پنجم

سرسید کا دور تردد (۱۸۹۰ء تا ۱۸۹۸ء)

باب ششم

☆☆☆

نیک فال

پروفیسر افتخار عالم خاں صاحب کے ان مضامین پر نظر ڈالنے کا مجھے اتفاق ہوا جو ''سرسید : درونِ خانہ'' کے عنوان سے تہذیب الاخلاق میں سلسلہ وار شائع ہوتے رہے ہیں۔ ہم بالعموم اکابرین کی ذات کے ان ہی پہلوؤں سے شناسائی بہم کر پاتے ہیں جن کا تعلق ان کے کارناموں سے ہوتا ہے۔ وہ روزمرہ کی زندگی کس طرح گزارا کرتے تھے، وہاں تک ہماری رسائی بہت کم ہو پاتی ہے۔

افتخار عالم خاں صاحب نے اردو والوں اور سید والا گہر کی تعلیمی مہم کے قدر دانوں پر بڑا احسان کیا کہ ان کی نجی زندگی کا کچا چٹھا نہاں خانوں سے نکال کر قارئین کے سامنے رکھ دیا۔

سید حامد
چانسلر جامعہ ہمدرد، نئی دہلی
(سابق وائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

انتساب

میرے ''ابا'' (یعنی میرے دادا اختر عالم خاں صاحب، عرف جانعالم خاں صاحب)
کے نام......
جنھوں نے مجھے اس قدر محبت و شفقت دی اور اتنا لاڈ و پیار کیا کہ اب کوئی
حسرت باقی نہ رہی۔

پیش لفظ

پروفیسر افتخار عالم خاں کا نام سرسید شناسی کے میدان میں نہ صرف یہ کہ بخوبی متعارف ہے بلکہ اس ضمن میں ان کی تحریروں کو اب اعتبار و استناد کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔ سائنٹفک سوسائٹی، سرسید اور فن تعمیر، اور مسلم یونیورسٹی کی عمارتوں کے بارے میں ان کی کتابوں کو جس نوع کی مقبولیت حاصل ہوئی ہے وہ ان کے اعتبار اور اہمیت کا بہترین ثبوت ہے۔ ایک ماہر میوزیولوجسٹ اور واقفِ آثارِ قدیمہ کی حیثیت سے تو وہ پہلے بھی جانے جاتے تھے اور ایک استاد کی حیثیت سے ان معاملات میں انھوں نے خاصی مشق و ممارست بھی بہم پہنچائی تھی۔ مگر گذشتہ برسوں میں ان علوم کے اشتراک سے انھوں نے جب علی گڑھ تحریک کے پس منظر میں ایک مورخ کا فریضہ انجام دینا شروع کیا تو ایسا محسوس ہوا کہ ان کے علمی اور تصوراتی کاموں کو ایک ایسی زمین میسر آ گئی جس کی یافت متذکرہ کتابوں کی صورت میں نمودار ہو کر سامنے آ گئی ہے۔

افتخار عالم خاں نے میوزیولوجی، تحفظ عجائب اور آثار قدیمہ پر گہری نظر رکھنے کے باوجود علی گڑھ کے حوالے سے جس طرح تاریخ نویسی کے مسائل و معاملات سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کیا ہے اس کا بہترین نمونہ زیر نظر کتاب ''سرسید: درونِ خانہ'' ہے۔ اہل علم اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ مابعد جدید عہد میں تاریخ نویسی کے علم میں

واقعات کی تعبیری رویوں کو کس قدر اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ ماضی کی تاریخی کتابیں اسی باعث آج کے تعبیری پیمانوں پر نئے سرے سے پرکھی جارہی ہیں اور نئے انداز میں ان کی قدر و قیمت کا تعین کیا جارہا ہے۔ تاریخی واقعات کی تعبیرات کس کس انداز میں کی جاسکتی ہیں اور ان تعبیرات میں موضوعیت (Subjectivity) اور معروضیت (Objectivity) کے تناسب کا اندازہ کیوں کر لگایا جاسکتا ہے؟ ان سوالات کو نئے علمی مباحث میں بڑی اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ اس ضمن میں تاریخ نویسی کے عالموں نے زیادہ سے زیادہ معروضیت پر اصرار کرنا شروع کردیا ہے۔

افتخار عالم صاحب چوں کہ بنیادی طور پر ایک سائنس داں ہیں اس لیے وہ معروضیت کی اہمیت اور قدر و قیمت سے بخوبی واقفیت رکھتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انھوں نے سرسید کی زندگی اور علی گڑھ تحریک کے بارے میں متعدد رائج معروضات پر سوالیہ نشان لگائے ہیں۔ یہ بات ہم میں سے کون نہیں جانتا کہ سرسید کی زندگی اور علی گڑھ کے ابتدائی شب و روز کے بارے میں جتنی تحریریں ہمارے سامنے ہیں وہ یا تو الطاف حسین حالی کی کتاب حیات جاوید کی بازگشت ہیں یا کم از کم ان پر حالی کے خیالات کا عکس پڑتا دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح سرسیدیات کے میدان میں حالی ایک ایسے استناد ساز مورخ کے طور پر ابھرتے ہیں جن کی عقیدت مندی نے بہت سے حقائق کے منظر نامے کو دھندلا بنا رکھا ہے۔ تحقیق اور تاریخ نویسی کے ضمن میں عقیدت مندی سے زیادہ گمراہ کن عداوت اور دشمنی بھی نہیں ہوتی۔ چنانچہ سرسید علیہ الرحمہ سے جس نوع کی عقیدت مندی کا مظاہرہ ان کے تاریخ نویس بالعموم کرتے رہے ہیں اس نے سرسید شناسی کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ زیر نظر کتاب سے مصنف نے علی گڑھ کے ماحول میں نشو و نما پانے اور عقیدت مندوں کے حصار میں گھرے رہنے کے باوجود اپنی سلامتی طبع کا ثبوت تحقیق اور تاریخ نویسی میں غیر جانب داری کے رویے کو اختیار کرکے دیا ہے۔ وہ الطاف حسین حالی کی کتاب 'حیات جاوید' کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کے دوررس اثرات کو محسوس کرتے ہیں مگر بعض حقائق کی نقاب کشائی میں بھی کوئی تکلف محسوس نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ حالی کے بیانات میں جو مبالغہ آمیزی اور نیاز مندی ہے اس کو ان کی مجبوری

کے علاوہ کوئی اور نام نہیں دیا جاسکتا۔'' ایسے ماحول میں حالی وہی سب کچھ لکھ سکتے تھے جو انھوں نے 'حیات جاوید' میں لکھا ہے، اور جسے مولانا شبلی نے مدلل مداحی قرار دیا ہے''۔

مگر اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ہر محقق اور تاریخ نویس حالی کے بیانات کو داخلی اور خارجی شہادت کی کسوٹی پر پرکھے بغیر قبول کرلے اور ان کی بنیاد پر علمی تجزیے کی دولت سے دست بردار ہوجائے۔ جیسا کہ بیش تر ماہرین سرسید نے کیا ہے۔ مصنف نے حالی کی بعض مجبوریوں کا ذکر کرنے کے بعد جو ذیل کے جملے لکھے ہیں وہ پوری طرح اس عہد کی بوالعجبی اور حالی کی نفسیات کو سامنے لے آتے ہیں:

> '' دراصل یہ وقت کا تقاضا تھا اور حالی کی مجبوری تھی۔ حالی نے اپنے ہیرو کو قوم کا نجات دہندہ اور دین کے محافظ کے بطور پیش کیا ہے۔ اسی لیے ان کی مذہبی اور قومی خدمات کا جائزہ لینے اور انہیں حق بجانب ثابت کرنے میں وہ اس قدر منہمک ہوگئے تھے کہ انہیں یہ خیال ہی نہ رہا تھا کہ کب اور کہاں وہ اصل سرسید سے بچھڑ کر اپنے تشکیل کردہ ہیرو کی انگلی پکڑ کر چلنے لگے تھے۔ اسی لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ سرسید کی نجی زندگی کے ان شب وروز میں جھانک کر دیکھا جائے جن کا عکس حالی کے ہیرو کی زندگی میں مفقود نظر آتا ہے۔'' (تمہید)

اس پس منظر میں اس کتاب کو سرسید کی زندگی اور معاملات کو حقیقت پسندانہ رویے کے ساتھ دیکھنے اور پرکھنے کی عمدہ کوشش کا نام دیا جاسکتا ہے۔ مصنف نے اس کتاب کو سرسید کے تشکیلی دور کے بعد وفاداری، وضع داری، طرح داری اور تردد، جیسے ابواب اور ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ ان ادوار میں ہر باب کا عنوان سرسید کے مزاج اور ان کی شخصیت کے حاوی رجحان کی مناسبت سے قائم کیا گیا ہے۔ بعض ایسے مقامات پر جہاں حقائق کی پوری تفصیل تک رسائی مشکل معلوم ہوتی ہے وہاں مصنف نے 'غالباً' اور 'اندازاً' جیسے قیاسی الفاظ استعمال کیے ہیں، جن سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے مزعومات اور معروضات کو حقائق اور تاریخ کا نعم البدل بناکر پیش کرنے سے اجتناب برتتے ہیں اور تحقیق کا دروازہ

کھلا رہنے دینا چاہتے ہیں۔

افتخار عالم خاں صاحب نے سرسید کے بارے میں اپنے اس طریق مطالعہ کو ماحولیاتی مطالعے (Ecological Stidy) کا نام دیا ہے جو ہر اعتبار سے مناسب بھی ہے اور ان کے طریق مطالعہ کی انفرادیت کو بھی نشان زد کرتا ہے...... ناچیز نے اس کتاب کے مختلف ابواب تہذیب الاخلاق کے شماروں میں بالاقساط شائع کیے تھے اور اندازہ لگایا تھا کہ ان قسطوں کی اشاعت نے کیوں کر سرسید شناسی کا ایک نیا ماحول بنایا ہے، جس کی بنیاد حقائق اور تلاش و تجسس پر قائم ہے اور ان ابواب کی پسندیدگی نے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ ہمارے قارئین کا نیا طبقہ روز بہ روز کس قدر حقیقت پسندی کی طرف مائل ہو رہا ہے۔...... ان کلمات کے ساتھ میں اس پروقار علمی اور تحقیقی نمونے کی پذیرائی کرتا ہوں اور سید حامد صاحب کی طرح اسے اردو دنیا کے لیے فال نیک تصور کرتا ہوں۔

ابوالکلام قاسمی *

۲۰۰۶/۶/۳ء

---

* (سابق صدر شعبۂ اردو)، ایڈیٹر تہذیب الاخلاق، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

تمہید

سرسید پر شائع ہونے والی بیشتر تصانیف 'حیات جاوید' کی بازگشت معلوم ہوتی ہیں۔ حالی نے بلامبالغہ 'حیات جاوید' تصنیف کر کے ایک اہم کارنامہ انجام دیا تھا۔ لیکن 'حیات جاوید' نہ حرفِ آخر ہے اور نہ ہی اسے حرفِ آخر سمجھنا چاہیے۔ حالی کی اپنی مجبوریوں، مصلحتوں، پسند اور ناپسند کا 'حیات جاوید' پر اثر اندازی ہونا تو لازمی تھا ہی لیکن اسی کے ساتھ 'حیات جاوید' میں رائے عامہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی ایما کا پرتو بھی کسی حد تک صاف جھلکتا ہے۔

حالی نے 'حیات جاوید' سرسید کی وفات کے بعد تصنیف کی تھی۔ سرسید کی وفات کے بعد کے دو تین سال کا عرصہ ایم اے او کالج کے مستقبل کے لیے خاصا مشکل اور غیر یقینی دور تھا۔ اسی غیر یقینی اور مشکل دور میں حالی نے 'حیات جاوید' کی تصنیف مکمل کی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب لوگوں کو سرسید اور ان کے قومی کاموں کی اہمیت کا پوری طرح احساس ہو گیا تھا۔ بلکہ ان کی وفات کے بعد قومی قیادت میں جو خلا پیدا ہو گیا تھا وہ آسانی سے پُر ہوتا دکھلائی نہیں دیتا تھا۔ خواص و عام اپنے اپنے انداز سے سرسید خود کو خراج عقیدتِ پیش کرنے میں ایک دوسرے سے نمبر لے جانے کی فکر میں مصروف نظر آ رہے تھے۔ یہاں تک کہ سرسید کے مخالفین بھی نادم نظر آتے تھے اور احساسِ ندامت کے ساتھ ان کی قومی خدمات کا اعتراف کر رہے تھے۔ حقیقت یہی ہے کہ ایسے ماحول میں حالی وہی سب کچھ لکھ سکتے تھے جو انھوں نے 'حیات جاوید' میں لکھا ہے اور جسے مولانا شبلی نعمانی نے 'مدلل مداح سرائی' قرار دیا ہے۔ دراصل یہ وقت کا تقاضا تھا اور حالی کی مجبوری تھی۔

حالی نے اپنے ہیرو کو قوم کا نجات دہندہ اور دین کے محافظ کے طور پر پیش کیا ہے۔ اسی لیے ان کی مذہبی اور قومی خدمات کا جائزہ لینے اور انہیں حق بجانب ثابت کرنے میں وہ اس قدر منہمک ہو گئے تھے کہ انہیں یہ خیال ہی نہ رہا تھا کہ کب اور کہاں وہ اصل سرسید سے بچھڑ کر اپنے تشکیل کردہ ہیرو کی انگلی پکڑ کر چلنے لگے تھے۔ اسی لیے ضرورت محسوس

ہوئی کہ سرسید کی نجی زندگی کے اُن شب وروز میں جھانک کر دیکھا جائے جن کا عکس حالی کے ہیرو کی زندگی میں مفقود نظر آتا ہے۔

ماحولیاتی سائنس میں عام طور پر 'ایکولوجیکل اسٹڈی' (Ecological Studies) سے مراد کسی جاندار کا اس کے اپنے ماحول کے تناظر میں مطالعہ اور مشاہدہ قرار دیا جاتا ہے۔ ہم نے بھی زیر نظر کتاب میں کوشش کی ہے کہ سرسید کی نجی زندگی کی روداد اس طرح پیش کریں کہ ان کو ہم ان کے عزیز واقارب، ان کے موافقین ومخالفین، ان کے حاکموں اور ماتحتوں ان کی کامیابیوں اور ناکامیوں، ان کے غموں اور خوشیوں اور اس زمانے کی سماجی اقدار اور سماج کے بدلتے ہوئے رشتوں اور تقاضوں کے تناظر میں دیکھ اور پرکھ سکیں تاکہ ہمیں معلوم ہو سکے کہ کس طرح سرسید نے تمام تر مشکلات ومحرکات کے باوجود سماج کے ایک کارآمد رکن اور ایک باشعور شہری کی حیثیت سے اپنی زندگی گزارتے ہوئے سماج میں ایک مثبت اور کارآمد رول ادا کیا تھا۔ اس کتاب کو ایک طرح سے سرسید کی 'ایکولوجیکل اسٹڈی' ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔

میں پروفیسر ابوالکلام قاسمی صاحب (ایڈیٹر تہذیب الاخلاق) کا مشکور ہوں جنھوں نے اس کتاب کو تقریباً ڈھائی سال تک قسط وار 'تہذیب الاخلاق' میں شائع کر کے بخوبی متعارف کرایا اور قارئین کو غور کرنے کا موقع فراہم کیا۔ میں ڈاکٹر محبوب عالم (مدیر اعلیٰ، نوائے اخلاق، اسلام آباد) کا بھی مشکور ہوں جنھوں نے اس کتاب کو (تہذیب الاخلاق کے شکریہ کے ساتھ) اپنے جریدے میں قسط وار شائع کر کے پاکستان میں متعارف کروایا تھا۔ میں اپنے بزرگ پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب کا بھی مشکور ہوں جو اس کتاب کی قسطیں پڑھ کر مجھے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے رہے تھے۔ میں جناب اسد یار خاں صاحب کا بھی ممنون اور مشکور ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کو شائع کرنے کی پیش کش کی اور اس ذمہ داری کو بحسن اہتمام نبھایا۔ آخیر میں میں اپنی اہلیہ پروین عالم صاحبہ کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے کتاب کے مسودے کی تیاری میں حتی الامکان میرا ہاتھ بٹایا۔

ڈاکٹر افتخار عالم خاں
عالم منزل، زہرہ باغ، علی گڑھ (یوپی)
فون: 2400438 (0571)

باب اول

سر سید کا تشکیلی دور

(۱۸۱۷ء تا ۱۸۵۷ء)

بقول مولانا الطاف حسین حالی ''سر سید کی زندگی کا نمایاں حصہ غدر سے شروع ہوتا ہے'' یعنی ۱۸۵۷ء سے ان کے سنہ انتقال (یعنی ۱۸۹۸ء) تک کے دور کو ان کی زندگی کا نمایاں دور کہا جا سکتا ہے۔ ان کی زندگی کے اس ''نمایاں دور'' سے متعلق اطلاعات اور شواہد کا ایک بڑا ذخیرہ ہمارے پاس موجود ہے۔ لیکن ۱۸۵۷ء سے پہلے کی ان کی زندگی کے سلسلے کے مآخذ اتنے کثیر التعداد نہیں ہیں۔ خاص طور پر ان کے حسب نسب (عزیز و اقارب) اور ان کے بچپن اور جوانی کے حالات کے سلسلے میں زیادہ تر اطلاعات ہمیں خود سر سید ہی کے حوالے سے ملتی ہیں۔ خاص طور پر ان کی تصنیف ''سیرتِ فریدیہ'' کے حوالے سے۔ یہ کتاب انھوں نے ۱۸۹۶ء میں شائع کی تھی۔ یعنی جب ان کی عمر تقریباً ۸۰ سال کی تھی۔ اس عمر میں پچاس، ساٹھ سال پہلے کے واقعات اور حالات درج کرنے میں بہت سے احتمال ہو سکتے ہیں۔ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ جو چیزیں بچپن میں ایک معصوم ذہن پر جس طرح سے نقش ہو جاتی ہیں وہ داخلی زیادہ اور حقیقی یا خارجی کم ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے ضروری ہو جاتا ہے کہ سیرتِ فریدیہ سے حاصل شدہ اطلاعات کو بھی اس زمانے کے خارجی حقائق کی روشنی میں پرکھا جائے۔ یہاں یہ تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ''سیرتِ فریدیہ'' کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۴ء میں پاک اکیڈیمی، کراچی سے شائع ہوا تھا جس کو محمود احمد برکاتی نے ترتیب دیا تھا[۱] اس ایڈیشن میں محمود احمد برکاتی صاحب نے ایک طویل (تقریباً ۹۰ صفحوں پر مشتمل) ابتدایہ بھی تحریر کیا ہے۔ جس میں انھوں نے سر سید کے افکار و کردار کا تنقیدی جائزہ ''اپنے نقطۂ نظر'' سے پیش کیا ہے۔ (جو خاصا تلخ اور جارحانہ ہے) راقم نے سیرت فریدیہ سے استفادہ کرتے وقت محمود احمد برکاتی صاحب کے ''نقطۂ نظر'' کو بھی ملحوظ رکھا ہے تاکہ بات یک طرفہ نہ ہو جائے۔ بہر حال ہم سر سید کے حسب نسب اور ان کی زندگی کے ابتدائی دور کے

حالات کے سلسلے میں خصوصاً ''سیرت فریدیہ'' اور عموماً ''حیات جاوید'' ہی پر تکیہ کر رہے ہیں۔

سرسید کا حسب نسب:

سرسید کے بزرگ شاہجہاں کے عہد میں، ہرات سے ہندوستان آئے تھے۔ اس وقت سے اکبر شاہ ثانی کے زمانے تک ان کا مغل دربار سے کسی نہ کسی حیثیت سے ہمیشہ تعلق قائم رہا تھا۔

سید برہان کے بیٹے سید عماد تھے۔ سید عماد کے دو بیٹے سید ہادی اور سید مہدی تھے۔ سید ہادی (جو کہ سرسید کے دادا تھے) کو عزیز الدین عالمگیر ثانی نے ۱۱۶۸ھ میں جواد علی خاں کا خطاب اور منصب ہزار ذات و پان صد سوار دو آسپہ وسہہ آسپہ دیا تھا اور ان کے بھائی سید مہدی کو بھی وہی منصب اور قباد علی خاں کا خطاب دیا تھا۔ شاہ عالم جب بادشاہ ہوئے تو سرسید کے دادا کے خطاب میں جواد الدولہ کا اور اضافہ کیا گیا اور عہدہ احتساب وکردار صوبہ شاہجہاں آباد اور ۱۱۸۸ھ میں عہدہ قضائے لشکر عنایت ہوا۔ سید ہادی کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے (یعنی سرسید کے والد) سید محمد متقی خاں کا درجہ دربارِ عام اور دربارِ خاص میں وہی رہا جو ان کے والد کا شاہ عالم اور اکبر شاہ کے زمانے میں تھا۔ اکبر شاہ کے ساتھ سید محمد متقی خاں کا شہزادگی کے زمانے سے ہی بہت خلوص تھا۔ اسی لیے اکبر شاہ کے زمانے میں ان کا رتبہ اور اثر ورسوخ دربار میں دوبالا ہو گیا تھا۔ سید محمد متقی خاں کی اکبر شاہ کی خوابگاہ تک رسائی تھی۔

سید محمد متقی خاں۔ والد سید احمد خاں:

سید محمد متقی خاں (حالی ان کا نام میر متقی لکھتے ہیں لیکن سرسید نے سیرت فریدیہ میں ان کا نام سید محمد متقی خاں لکھا ہے) مغل دربار کے پشتینی منصب دار تھے اور نہایت ہی بااثر اور صاحب حیثیت شخص تھے۔ قلعہ سے تنخواہ مقرر تھی۔ ساتھ ہی موروثی جائداد کی معقول آمدنی تھی۔ اس سلسلے میں سرسید ایک جگہ اپنی والدہ کی دینداری کے بیان میں اپنے گھر کی آمدنی کا تذکرہ غیر ارادی طور پر اس طرح کر گئے ہیں:

> ''ان کا دستور تھا کہ جو کچھ گھر میں آتا، روپیہ پیسہ، گاؤں کا یا ملکوں کا غلہ، مکانوں کا کرایہ، تنخواہ قلعہ کی، باغوں کا میوہ، سب میں سے بحساب پانچ فی صد خدا کے نام پر علیحدہ کر دیتی تھیں''۔[۲]

سید محمد متقی خاں ایک آزاد طبیعت انسان تھے۔ اس زمانے کے چلن کے مطابق متقی خاں کو گھوڑ سواری کے ساتھ فنِ تیر اندازی و تیراکی میں کمال حاصل تھا۔ سید محمد متقی خاں کی شادی خواجہ فرید الدین احمد کی بڑی بیٹی عزیز النساء بیگم سے (غالبًا) ۱۸۰۵ء میں ہوئی تھی۔ شادی کے بعد سید محمد متقی اپنی بیوی کی تعمیر کردہ نئی حویلی میں منتقل ہو گئے تھے جو خواجہ فرید الدین احمد کی حویلی کے احاطہ کے خواص پورہ نامی حصہ میں تعمیر کی گئی تھی۔ سید محمد متقی خاں کی اولاد میں ایک بیٹی اور دو بیٹے تھے۔ بیٹی کا نام عجبۃ النساء بیگم تھا (سر سید نے کئی خطوط میں ان کا نام عجیبۃ النساء بیگم لکھا ہے یہ ہی ان کا صحیح نام معلوم ہوتا ہے) جو سب سے بڑی تھیں۔ ان کا انتقال ۱۸۹۴ء میں دہلی میں ہوا۔ ان سے چھوٹے بیٹے سید محمد احمد خاں تھے۔ جن کی پیدائش (غالبًا) ۱۸۱۱ء میں اور انتقال ۱۸۴۵ء میں ہوا۔ سب سے چھوٹے بیٹے سید احمد خاں تھے۔ جو ۱۷/ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ سید محمد متقی خاں کا انتقال ۱۸۳۸ء میں بمقام دہلی ہوا تھا۔

سر سید کا ننھیال:

سر سید کے نانا خواجہ فرید الدین احمد کے دادا خواجہ عبدالعزیز کشمیر سے بغرض تجارت دلی آئے تھے۔ وہ کشمیری مال اور ریشم کی تجارت کرتے تھے۔ بعد میں انھوں نے دلی ہی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ خواجہ عبدالعزیز کے بیٹے خواجہ اشرف تھے۔

خواجہ فرید الدین احمد خواجہ اشرف کے بیٹے تھے۔ ان کے سات بھائی اور تھے۔ جن میں خواجہ نجیب الدین رسول شاہی درویش ہو گئے تھے۔ ۱۸۴۳ء میں ان کا انتقال ہوا تھا۔ (ان کے تین بیٹے تھے جن میں خواجہ ضیاء الدین اور خواجہ کمال الدین کا سر سید کی حیات ہی میں انتقال ہو چکا تھا۔ تیسرے بیٹے کے بارے میں ہمیں کوئی معلومات نہ مل سکی) خواجہ اشرف کے دوسرے بیٹے خواجہ علاء الدین تھے۔ انھوں نے بھی درویشی اختیار کی تھی۔ ان کا انتقال ۱۸۵۵ء میں ہوا تھا۔ (خواجہ علاء الدین کے تین بیٹے تھے دو بیٹوں یعنی خواجہ ضیاء الدین اور خواجہ کمال الدین کا انتقال سر سید کی حیات میں ہی ہو گیا تھا۔ تیسرے بیٹے حکیم خواجہ بہی الدین جاورہ میں سکونت پذیر تھے اور ۱۸۹۴ء تک حیات تھے) تیسرے بیٹے خواجہ حسام الدین جوانی ہی میں دریائے چنبل میں ڈوب کر مر گئے تھے۔ چوتھے بیٹے خواجہ کمال الدین کا انتقال بھی عالمِ شباب میں ہوا تھا۔ پانچویں بیٹے خواجہ شہاب الدین عربی نسخ خط

لکھنے کے استاد تھے اور انگریزی عمل داری میں کسی محکمہ میں ناظر ہو گئے تھے۔ چھٹے بیٹے خواجہ محی الدین قلعہ میں خدمت گار ہو گئے تھے۔ ساتویں بیٹے خواجہ نورالدین سندھیا کی فوج کے سواروں میں کسی عہدے پر مامور تھے۔

سر سید کے نانا خواجہ فریدالدین احمد۔

سر سید کے نانا خواجہ فریدالدین احمد اپنے خاندان میں نہایت با اقبال اور لائق فرد تھے، ریاضیات میں مہارت رکھتے تھے۔ علم ریاضی کی تحصیل کے لیے وہ ۱۷۹۰ء کے آس پاس لکھنؤ گئے تھے اور وہاں تقریباً تین سال رہ کر علامہ تفضل حسین خاں صاحب سے ریاضی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ۱۷۹۷ء میں وہ دوبارہ تلاش معاش کے سلسلے میں لکھنؤ گئے اور اسی سال لکھنؤ کے فرنگی حکام کی سفارش پر ملازم ہو کر کلکتہ چلے گئے۔ جہاں بقول سر سید ان کو انگریزوں کے قائم کردہ مدرسہ کلکتہ میں سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے بمشاہرہ ۷۰۰ روپے ماہوار کی نوکری مل گئی تھی (محمود احمد برکاتی مولوی عبدالستار کی لکھی مدرسہ کلکتہ کی تاریخ کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں کہ اس وقت اس مدرسہ میں سپرنٹنڈنٹ کا عہدہ نہیں تھا نہ ہی خواجہ فریدالدین نامی شخص کا تذکرہ کسی اور عہدہ کے سلسلے میں ملتا ہے[۳]) بہر حال حقیقت جو بھی ہو لیکن یہ طے ہے کہ خواجہ فریدالدین احمد نے کلکتہ میں انگریز حاکموں کے درمیان اپنا رسوخ اور دبدبا اس قدر قائم کر لیا تھا کہ جب نواب مہدی علی خاں کمپنی کے سفیر کی حیثیت سے ناکام قرار دیئے جانے کی وجہ سے ایران سے واپس بلائے گئے (مرزا ابوطالب اصفہانی کے بیان کے مطابق جون ۱۸۰۳ء میں نواب مہدی علی خاں حشمت جنگ واپس بمبئی پہنچ چکے تھے۔[۴]) اور مارکویس آف ولزلی (جو اس وقت گورنر جنرل تھے) کو ایران وزارت بھیجنے کی ضرورت ہوئی تو ۱۸۰۳ء میں مسٹر بوٹ کے ساتھ خواجہ فریدالدین احمد کو ایران بھیجنا تجویز ہوا۔ اس وفد کی تاریخ روانگی کے سلسلے میں سر سید تحریر کرتے ہیں کہ ''تاریخ روانگی ٹھیک طور پر معلوم نہیں ہوئی۔ مگر غالباً ۱۸۰۳ء مطابق ۱۲۱۸ھ کے روانہ ہوئے ہوں گے''۔ (اس سلسلے میں مرزا ابوطالب اصفہانی کے حوالے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگست ۱۸۰۳ء تک ابوطالب بمبئی میں مقیم تھے اس وقت تک یہ سفارتی وفد ایران روانہ نہیں ہوا تھا۔ اس لیے خیال اغلب ہے کہ اگست کے بعد ۱۸۰۳ء کے اواخر ہی میں یہ وفد ایران روانہ ہوا ہوگا)۔[۵]

ایران کے اس سفر کے دوران مسٹر بوٹ راہ میں بیمار ہو جانے کی وجہ سے واپس لوٹ آئے تھے۔ اس لیے گورنر جنرل کے حکم کے بموجب خواجہ فرید الدین تنہا ہی بطور مستقل سفیر کے شیراز پہنچے تھے۔ (محمود احمد برکاتی کا خیال ہے کہ چند افراد پر مشتمل ایک سفارتی وفد ایران بھیجا گیا تھا جس کے خواجہ فرید الدین بھی ایک رکن تھے۔ یہ وفد صرف ایک مسئلہ پر شاہ ایران کی آمادگی حاصل کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اس لیے زیادہ عرصے وہاں نہ روکا ہوگا۔[۶]) اس سفارت کے انجام دینے کے بعد خواجہ فرید الدین شیراز سے بوشہر اور وہاں سے کلکتہ واپس آئے تھے۔ (یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ کتنے عرصے ایران میں رہے تھے) کلکتہ آنے کے بعد ایک پولیٹیکل امر کو طے کرنے کی خاطر، جو گورنمنٹ انگریزی اور سلطنت ''آوا'' (واقع برہما) میں درپیش تھا، خواجہ فرید الدین احمد کو گورنمنٹ انگریزی کی طرف سے بطور ایجنٹ مقرر کر کے ''آوا'' (واقع برہما) بھیجا گیا تھا۔ ''آوا'' سے واپسی کے بعد خواجہ فرید الدین کو بندیلکھنڈ کے ضلع باندھ کے پرگنہ اگاسی وغیرہ کی مال گزاری وصول کرنے کے واسطے عہدہ تحصیل داری پر مقرر کیا گیا تھا۔ لیکن کچھ عرصے بعد ہی وہ اس عہدے سے مستعفی ہو کر تقریباً بارہ برس بعد ۱۸۱۰ء میں دہلی واپس آ گئے تھے۔ مگر کچھ عرصہ دہلی میں رہنے کے بعد دوبارہ کلکتہ چلے گئے تھے۔ پانچ سال بعد (یعنی ۱۸۱۵ء کے آس پاس) اکبر شاہ ثانی نے سید محمد متقی خاں (سرسید کے والد جن کی شادی خواجہ فرید کی بیٹی سے اس وقت تک ہو چکی تھی) کی سفارش پر خواجہ فرید الدین احمد کو کلکتہ سے بلا کر وزارت کے عہدہ پر مقرر کیا تھا۔ (یعنی وزیر بنائے گئے تھے) اور خلعت وزارت کے ساتھ ''دبیر الدولہ امین الملک مصلح جنگ'' کا خطاب عطا کیا تھا۔ دورانِ وزارت خواجہ فرید الدین احمد نے آمدنی اور خرچ کے برابر کرنے کے لیے جو تدابیر کیں ان کی وجہ سے قلعہ میں عام ناراضگی پیدا ہو گئی تھی۔ شاہزادے، بیگمات اور درباری تنخواہوں میں کمی کیے جانے کے باعث ان کی طرف سے شاکی ہو گئے تھے۔ بادشاہ سے شکایتیں ہونے لگی تھیں۔ اس حریصانہ ماحول سے بددل ہو کر خواجہ فرید الدین احمد نے وزارت سے استعفیٰ دے دیا اور کچھ عرصہ بعد دوبارہ کلکتہ چلے گئے تھے۔

لیکن دوبارہ پھر سید محمد متقی (سرسید کے والد) کی مصلحت آمیز سعی اور سفارش کی وجہ سے بادشاہ نے ۱۸۱۹ء میں خواجہ فرید الدین کو دوبارہ کلکتہ سے بلا کر عہدہ وزارت پر مامور کیا تھا۔ کچھ عرصے بعد بادشاہ نے خواہش ظاہر کی کہ چند اور لوگوں کو بھی خواجہ فرید کے ساتھ

وزارت کے کاموں میں شریک کیا جائے جن میں ایک نام راجہ جی سکھ رائے کا بھی تھا۔ خواجہ فریدالدین احمد کو ان کی شرکت میں کام کرنا منظور نہیں ہوا۔ اسی لیے انھوں نے اپنے دوست جنرل اکٹرلونی (ریذیڈنٹ) کی صلاح پر ۱۸۲۲ء میں وزارت کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ سرسید لکھتے ہیں کہ اس کے بعد سنۂ انتقال تک دہلی ہی میں رہے لیکن بادشاہ کی تحریک کے باوجود پھر کوئی ذمہ داری قبول نہیں کی۔ ۱۸۲۶ء میں دہلی ہی میں انتقال ہوا۔ بیرون ترکمان دروازہ، جونسٹھ کھمبہ میں تکیہ شاہ فدا حسین میں تدفین ہوئی تھی۔

خواجہ فریدالدین کی اولاد:

خواجہ فریدالدین احمد کی اولادوں میں دو بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ بڑے صاحبزادے کا نام وحیدالدین خاں تھا (جو مرزا جہانگیر کے بیٹے تیمور شاہ کی سرکار میں مختار تھے) چھوٹے صاحبزادے نواب زین العابدین تھے۔ صاحبزادیوں میں عزیز النساء بیگم (والدہ سرسید احمد خاں) سب سے بڑی تھیں۔ منجھلی بیٹی کا نام فاطمہ بیگم تھا۔ فخر النساء بیگم سب سے چھوٹی بیٹی تھیں (جن کی پیدائش ۱۷۹۷ء سے پہلے غالباً ۱۷۹۵ء میں ہوئی تھی۔) ان سب کے سلسلے کی تفصیلات درج ذیل ہیں۔

خواجہ وحیدالدین احمد خاں:

خواجہ وحیدالدین احمد خاں، خواجہ فریدالدین کے بڑے صاحبزادے تھے۔ ۱۸۰۹ء میں اکبر شاہ ثانی کے عہد میں ان کی چہیتی بیوی ''نواب ممتاز محل'' کے بیٹے مرزا جہانگیر کو ولی عہد بنائے جانے کی تحریک ہوئی تھی لیکن انگریز ریذیڈنٹ مسٹر سیٹن اس تجویز کے خلاف تھے۔ جس سے بددل ہوکر مرزا جہانگیر نے بغاوت کرنا چاہی اور مسٹر سٹین پر طمنچہ سے گولی چلادی۔ گولی ان کی ٹوپی میں لگی۔ مسٹر سٹین تو بچ گئے لیکن مرزا جہانگیر کو گرفتار کر کے قلعہ الہ آباد میں نظربند کردیا گیا۔ وہیں ۱۸۲۱ء میں ان کا انتقال ہوا۔ الہ آباد سے مرزا جہانگیر کی میت کو دہلی لانے کے لیے شہزادے کی والدہ کی ایما پر، خواجہ وحیدالدین احمد کا نام تجویز ہوا اور وہ ہی میت کو الہ آباد سے دہلی لائے تھے اسی وجہ سے مرزا جہانگیر کی والدہ نواب ممتاز محل، وحیدالدین احمد خاں پر حد سے زیادہ مہربان ہوگئی تھیں۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ وحید الدین خاں کو میں اپنے بیٹے مرزا جہانگیر کے برابر سمجھتی ہوں۔ ۱۸۲۲ء میں مرزا جہانگیر کے صغیرسن بیٹے، مرزا تیمور شاہ کو نواب ممتاز محل نے تخت پر بٹھایا اور مرزا تیمور شاہ کی سرکار

کا خواجہ وحید الدین خاں کو مختارِ کل مقرر کرنے کے ساتھ نواب مختار الدولہ کے خطاب سے نوازا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وحید الدین خاں کے والد خواجہ فرید الدین (نواب دبیر الدولہ) ہنوز وزارت کے عہدے پر فائز تھے۔ لیکن اس کے کچھ ہی عرصہ کے بعد انھوں نے انگریز ریذیڈنٹ جنرل آکٹرلونی کے مشورے سے وزارت کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا تھا۔

نواب مختار الدولہ (وحید الدین خاں) کو سرکار تیمور اور نواب ممتاز محل کی نظروں میں جو بلند مقام حاصل ہو گیا تھا وہ کافی عرصے تک قائم رہا۔ نواب ممتاز محل کے انتقال کے برس ڈیڑھ برس پہلے، کسی بات پر ناگواری کے سبب وحید الدین خاں سرکار کی مختاری چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے تھے۔ لیکن لکھنؤ میں چند سال نواب علی نقی خاں نائب کے ساتھ نہایت عروج کے ساتھ گزارنے کے بعد پھر واپس دہلی آ کر سکونت اختیار کر لی تھی۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے ناکام ہونے کے بعد جب انگریزی افواج نے دوبارہ دہلی پر اقتدار حاصل کیا اس وقت انگریزی فوج کے کچھ سپاہی چیلوں کے کوچہ کی طرف سے خواجہ وحید الدین خاں کی حویلی میں گھس آئے۔ وحید الدین خاں اس وقت تک خاصے ضعیف ہو چکے تھے۔ نماز عصر پڑھ رہے تھے۔ ایک سپاہی کی گولی سے عین نماز کی حالت میں شہید ہوئے۔ اس حادثہ میں ان کے بھتیجے خواجہ ہاشم علی خاں (جو انگریزی سرکار میں منصف مقرر ہو چکے تھے) بھی مارے گئے تھے۔

سیرتِ فریدیہ میں موجود خواجہ وحید الدین خاں کی زندگی کے ان مختصر حالات سے ہم کو ان کی اولاد کے سلسلے میں کوئی اطلاع نہ مل سکی۔ غالباً وہ لاولد تھے۔

محمود احمد برکاتی (۱۹۶۴ء) مولوی عبدالقادر رام پوری کے وقائع کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> ''وحید الدین خاں پسر خواجہ فرید الدولہ ایک مدت تک جنرل اکٹرلونی صاحب کا مصاحب خاص رہا۔ بلکہ عالم جناب عصمت آب رحیم النساء بیگم کی مہربانی پر گزر کرتا تھا''۔ [۷]

حالاں کہ محمود احمد برکاتی نے مندرجہ بالا حوالے کو وحید الدین خاں کی تحقیر کے بطور لکھا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہی ہے کہ جب خواجہ وحید الدین خاں مرزا تیمور شاہ کی سرکار کے مختارِ کل مقرر ہوئے تھے اس وقت ان کے ہی نہیں بلکہ ان کے والد خواجہ فرید الدین احمد کے بھی انگریز ریذیڈنٹ اکٹرلونی سے بہت قریبی دوستانہ تعلقات تھے۔ جسے تعصب کی

عینک سے دیکھا جائے تو مصاحبت کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ حالاں کہ کسی کا مصاحب ہونا، اس زمانہ میں کوئی عیب کی بات نہیں سمجھی جاتی تھی۔ (مولانا الطاف حسین حالی کافی عرصے تک نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ رئیس دہلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد، ضلع بلند شہر کے (تنخواہ دار) مصاحب رہے تھے اور خود حالی کو اس امر کے لکھنے میں کبھی کوئی عار محسوس نہیں ہوا)۔

رحیم النساء بیگم (یعنی نواب ممتاز محل) کی مہربانی کی وجہ سے ہی خواجہ وحید الدین خاں کا قلعہ میں عروج ہوا تھا اور انہیں کی مہربانی کی وجہ سے وہ تیمور شاہ کی سرکار کے مختار کل مقرر ہوئے تھے۔ لیکن نواب ممتاز محل کے اس خلوص اور اعتماد کو اس طرح بیان کرنا کہ ''رحیم النساء بیگم کی مہربانیوں پر گزر کرتا تھا'' وقائع نگار کے اپنے تعصب کو منعکس کرتا ہے۔

بہادر شاہ کے روز نامچہ مرتبہ خواجہ حسن نظامی کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹/ مارچ ۱۸۴۷ء کو مختار الدولہ خواجہ وحید الدین خاں کو ''خلعت پنچ پارچہ اور رقم جواہر عطا ہوا''۔[۸] اس سے یہ ہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ آخیر عمر تک قلعہ میں مختار الدولہ کی عزت و تعظیم قائم رہی تھی۔

خواجہ زین العابدین احمد خاں:

خواجہ زین العابدین احمد خاں، خواجہ فرید الدین احمد خاں کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ انھوں نے اپنی تمام زندگی نہایت عمدگی اور فارغ البالی کے ساتھ بسر کی۔ حالاں کہ وہ قلعہ سے نام و نمود حاصل کرنے کے کبھی خواہش مند نہ رہے تھے۔ لیکن ۱۸۴۶ء میں بہادر شاہ ظفر نے ان کو دبیر الدولہ خواجہ زین العابدین احمد خاں بہادر مصلح جنگ، کا خطاب عطا کیا تھا۔ ۲۲/ اکتوبر ۱۸۵۶ء کو ان کا دہلی میں انتقال ہوا۔

ان کی زندگی مختلف شوقیہ مشاغل میں بسر ہوئی۔ والد سے ریاضیات کی تعلیم حاصل کی تھی۔ بعد میں ان کو گانے اور ''بین'' بجانے کا شوق ہوا۔ یہ شوق کسی نہ کسی قدر آخیر عمر تک قائم رہا۔ اس شوق کو انھوں نے کمال کی حد تک پہنچا دیا تھا۔ بین خود اپنے ہاتھ سے بناتے تھے۔ اس عمل میں انھوں نے نئی نئی جدتیں اور ایجادیں کی تھیں۔ اس زمانے میں وہ ان چیزوں کے شغل کے علاوہ کسی اور چیز میں دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ بڑے بڑے نامی دھرپت و خیال گانے والے نوکر تھے۔ بینیں تیار کی جاتی تھیں میر ناصر احمد جو مشہور بین بجانے والے ہمت خاں اور راگ رس خاں کے نواسوں میں تھے۔ بین بجانے کے لیے آتے تھے اور بین بجانے کے فن کے کمال دکھلاتے تھے۔

ایک زمانے میں ان کو فنِ ریاضی سے شوق ہو گیا تھا۔ دن رات بجز آلات برائے مشاہدات کواکب کے بنانے اور ستاروں کا مشاہدہ کرنے کے کوئی اور شغل نہ تھا۔ چوں کہ خود بہت بڑے دستکار تھے۔ اس لیے تمام آلاتِ رصد اپنے ہاتھ سے بناتے تھے۔ نہایت بڑے قطر کا برنجی کرہ اور برنجی اضطراب اپنے ہاتھ سے ایسا عمدہ بنایا تھا جو بقول سرسید عجائب روزگار میں سے تھا۔

ایک زمانے میں ان کو پتنگ بازی کا شوق ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں بجز پتنگ بازی کے کسی اور چیز کا ذکر تک نہ ہوتا تھا، اپنے ہاتھ سے پتنگ بنانے کو بھی انھوں نے ایک علمی فن بنا دیا تھا اور ایک رسالہ صنعتِ پتنگ سازی پر لکھا تھا۔ اقلیدس کی طرح پتنگ کی شکلیں اور اس کی نسبتیں قائم کی تھیں اور ہر ایک قسم کی پتنگ کی مخصوص خصوصیات واضح کی تھیں۔ سرسید لکھتے ہیں کہ ''افسوس وہ رسالہ غدر میں ضائع ہو گیا''۔

جس زمانے میں ان کو تیر اندازی کا شوق ہوا تھا تو بجز تیر اندازی اور کمانوں اور تیروں کے بنانے اور سہ پہر میں تیر اندازی کے جلسوں میں شرکت کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ کرتے تھے۔ انھوں نے تیر اندازی سرسید کے والد سید محمد متقی خاں سے، جو اس فن کے ماہر تھے، سیکھی تھی اور اس فن میں ایسا کمال پیدا کیا تھا کہ خود اپنے ہاتھ سے کمانیں اور ہر قسم کے تیر بناتے تھے۔ آخیر زمانے میں الّا موسیقی دوسری چیزوں کا شوق نہیں رہا تھا۔ ۲۲/اکتوبر ۱۸۵۶ء میں دہلی ہی میں انتقال ہوا۔ خواجہ زین العابدین احمد خاں کے بارے میں محمود احمد برکاتی نے مولوی عبدالقادر کی رائے کا حوالہ دیا ہے کہ جس سے ان کی شخصیت پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ مولوی عبدالقادر ''علم و عمل'' میں تحریر کرتے ہیں کہ:

> ''جنرل (آکٹرلونی) کا مشیر خاص تھا۔ زین العابدین امیروں کی خدمت کا خاص سلیقہ رکھتا تھا اور جس سے چاہتا تھا بڑی خوبی سے تعلقات پیدا کر لیتا تھا۔ اس وجہ سے جنرل (آکٹرلونی) نے اس جوان کو اسٹور صاحب کا منشی کر دیا تھا، مردِ خوش رو، باادب، بزم صاحب سلیقہ زباں داں، حفظِ مراتب سے خبردار اور نوشت و خواند میں ماہر۔ جو کوئی اس کے ساتھ مروت سے پیش آتا اور اس کے باپ کے مرتبہ کا لحاظ کرتے ہوئے اس سے برتاؤ کرتا تو وہ ایسے شخص سے ہمیشہ خوش رہتا تھا''۔[9]

نواب زین العابدین احمد خاں کی اولادِ ذکور:

نواب زین العابدین احمد خاں کے تین بیٹے تھے۔ خواجہ امام الدین خاں، خواجہ شرف الدین خاں اور خواجہ ہاشم علی خاں۔ خواجہ امام الدین خاں ایک اعلیٰ خوش نویس تھے۔ دوسرے بیٹے خواجہ شرف الدین خاں تھے۔ (ان کا نام کئی جگہوں پر خواجہ شریف الدین اور خواجہ اشرف الدین بھی تحریر کیا گیا ہے لیکن سرسید کے خطوط بنام حکیم احمد الدین میں ان کا نام شرف الدین تحریر کیا گیا ہے۔ جو صحیح معلوم ہوتا ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے ان کے تین بیٹے خواجہ فخر الدین، خواجہ مصلح الدین اور خواجہ وجیہ الدین تھے۔ ان ہی کی بیٹی سے بعد میں سرسید کے چھوٹے صاحبزادے سید محمود کی شادی ہوئی تھی) تیسرے بیٹے خواجہ ہاشم علی خاں تھے۔ (حالی نے ان کا نام حاتم علی خاں تحریر کیا ہے) یہ سرسید کے ہم عمر تھے اور سرسید اور ان کے بڑے بھائی سید محمد خاں کے ساتھ ۱۸۴۱ء میں منصفی کے امتحان میں بیٹھے تھے۔ سرسید اور ہاشم علی خاں اس امتحان میں کامیاب ہوگئے تھے۔ (سید محمد خاں دوسرے سال دوبارہ امتحان میں بیٹھ کر کامیاب ہوئے تھے) اس امتحان کو پاس کر لینے کے بعد خواجہ ہاشم علی خاں کا بطور منصف تقرر ہوگیا تھا۔ (تقرر کہاں ہوا تھا یہ ہمیں معلوم نہ ہوسکا) ۱۸۵۷ء میں جب انگریزوں کی فوج نے دوبارہ دہلی پر قبضہ کیا، اس وقت کچھ سپاہی خواجہ وحید الدین احمد خاں کی حویلی میں گھس آئے تھے اور ایک سپاہی کی گولی سے خواجہ وحید الدین خاں صاحب نماز پڑھتے ہوئے مارے گئے تھے۔ حادثہ میں اپنے چچا کے ساتھ خواجہ ہاشم علی خاں بھی مارے گئے تھے۔

خواجہ فرید الدین احمد کی صاحبزادیاں:

خواجہ فرید الدین احمد خاں کی تین بیٹیاں تھیں سب سے بڑی بیٹی عزیز النساء بیگم تھیں (والدہ سرسید احمد خاں) جن کی شادی ۱۸۰۵ء کے آس پاس سید محمد متقی خاں صاحب (یعنی سرسید کے والد) سے ہوئی تھی۔ منجھلی بیٹی کا نام فاطمہ بیگم تھا۔ ان کی شادی مولوی خلیل اللہ خاں سے ہوئی تھی جو بعد میں دہلی میں صدر امین ہوگئے تھے اور ان ہی کی کچہری میں سرسید نے سب سے پہلے (۱۸۳۸ء میں) عدالتی کارروائیوں کے متعلق کام سیکھنا شروع کیا تھا۔ سب سے چھوٹی بیٹی کا نام فخر النساء بیگم تھا۔ ان کی شادی خواجہ نقیب الاولیا غلام علی سے ہوئی تھی (ان ہی کی بیٹی پارسا بیگم (عرف مبارک بیگم) کی شادی سرسید سے ہوئی تھی) فخر النساء بیگم آخر عمر میں آنکھوں سے معذور ہوگئی تھیں اور اپنی بڑی بہن (یعنی سرسید کی والدہ)

اور اپنی بیٹی (یعنی سر سید کی بیوی) کے ساتھ ہی رہتی تھیں ۔ سر سید کی بیوی پارسا بیگم فخر النساء بیگم کی غالباً اکلوتی اولاد تھیں کیوں کہ سر سید کی بیوی کے بھائی یا بہن کا کوئی تذکرہ کہیں نہیں ملتا ہے۔ اور غالباً اسی وجہ سے فخر النساء بیگم کا مکان ان کے بعد ورثہ میں پارسا بیگم کو ملا تھا۔ جس کی تفصیل ہم آئندہ تحریر کریں گے۔

سر سید کی ننھیال میں پرورش؟

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ سر سید کی پرورش اپنی ننھیال میں ہوئی تھی ۔ اس بات کو متعدد لوگوں نے لکھا ہے۔ حالاں کہ ننھیال کے قریب رہائش اختیار کرنے کو ننھیال میں پرورش پانے کے مترادف نہیں ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ حالی کے لکھنے کے مطابق:

> ''سید محمد متقی خاں کا موروثی مکان جامع مسجد کے قریب اس کے گوشہ جنوب مشرق کی طرف تھا جو کئی دفعہ ماور گردی اور مرہٹہ گردی میں لٹ چکا تھا اور اس کے اکثر حصے منہدم ہو گئے تھے دالان اور کچھ مکان جو باقی رہ گئے تھے ان میں رہتے تھے اور دن کو جامع مسجد کے مشرقی دروازے پر جو مکانات ہیں ان میں بیٹھتے تھے''۔[۱۰]

سید محمد متقی خاں کی موروثی حویلی کی بوسیدگی کے مندرجہ بالا بیان سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ شادی کے بعد انہیں رہائش کے لیے ایک بہتر مکان کی ضرورت ہوگی۔ سر سید کے نانا خواجہ فرید الدین احمد نے مہدی قلی خاں (وزیر فرخ سیر) کی بڑی حویلی واقع قریب تراہہ بہرم خاں اپنی رہائش کے لیے خرید لی تھی ۔ یہ ایک بہت بڑی حویلی تھی جس میں دیوان خانہ، فیل خانہ، اصطبل، شاگرد پیشہ وغیرہ متعدد مکانات تھے ۔ اسی حویلی کے احاطے موسومہ خواص پورہ میں سر سید کی والدہ نے اپنی رہائش کے لیے بھی ایک مکان تعمیر کروالیا تھا ۔ اس حویلی کے تعمیر کیے جانے کی شہادت سر سید کے مندرجہ ذیل اقتباس سے ملتی ہے۔

> ''جب میری والدہ نے اپنے رہنے کی جدا حویلی بنائی اور وہاں آرہیں تو باوجودیکہ اس حویلی اور نانا صاحب کی حویلی میں صرف ایک سڑک درمیان تھی (لیکن) جب کبھی میں ان کی حویلی میں جاتا تو ایک آدمی میرے ساتھ جاتا''۔[۱۱]

اس اقتباس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ سر سید کے والدین ان کے نانا فرید الدین

احمد کی حویلی کے بجائے قرب ہی میں واقع ایک نوتعمیر حویلی میں رہتے تھے۔ اس حویلی میں مردانہ اور زنانہ مکانوں کے علاوہ جلوخانہ، اصطبل، اور شاگرد پیشہ کی عمارتیں موجود تھیں ۔سرسید کے اس مکان کے قریب ہی ان کی دوسری خالہ (یعنی چھوٹی خالہ فخر النساء بیگم) نے بھی ایک مکان میں رہائش اختیار کر رکھی تھی۔ اس بات کی شہادت اس واقعے سے ملتی ہے کہ جب بچپن میں سرسید کو ان کی والدہ نے ایک بزرگ خدمت گار پر ہاتھ اٹھانے کی پاداشت میں گھر سے نکال دیا تھا۔ اس سلسلے میں سرسید لکھتے ہیں کہ:

''ایک ماما میرا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر لے گئی اور باہر سڑک پر چھوڑ دیا۔ اسی وقت ایک ماما دوسرے گھر سے یعنی میری خالہ کے گھر سے جو قریب تھا نکلی اور مجھ کو میری خالہ کے گھر میں لے گئی'' ۔۱۲

سرسید کی والدہ اور ان کی چھوٹی خالہ اپنے والد خواجہ فرید الدین احمد کی حویلی کے قریب رہتی تھیں اس بات کی ایک اور شہادت سیرتِ فریدیہ میں موجود سرسید کے اس بیان سے بھی ملتی ہے:

''رات کا کھانا وہ (یعنی خواجہ فرید الدین احمد) باہر دیوان خانے میں کھاتے تھے۔ زنانہ ہو جاتا تھا۔ ان کی بڑی بیٹی یعنی راقم کی والدہ اور چھوٹی بیٹی فخر النساء بیگم کھانا کھلانے جاتی تھیں'' ۔۱۳

اس تذکرے میں خواجہ فرید کی منجھلی بیٹی فاطمہ بیگم کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے جس سے یہ ہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ سرسید کی والدہ اور چھوٹی خالہ خواجہ فرید الدین احمد کی حویلی کے قرب ہی میں رہتی تھیں جب کہ ان کی منجھلی خالہ فاطمہ بیگم (زوجہ مولوی خلیل اللہ خاں) کی رہائش اس احاطہ میں نہیں تھی۔ عام طور پر وہ خواتین جن کے شوہر اپنی مفلسی کی وجہ سے اپنے بیوی بچوں کی کفالت کے قابل نہ ہوں یا جن کی اپنے شوہر سے علیحدگی یا طلاق ہو گئی ہو یا جو اپنے شوہر کا انتقال ہو جانے کی وجہ سے بیوہ ہو گئی ہوں۔ ایسی خواتین اپنے بچوں کی پرورش کی خاطر اپنے والدین کے گھر میں سکونت اختیار کر لیتی تھیں ۔ (بشرطیکہ ان کے والدین ان کی اور ان کے بچوں کی پرورش کرنے کی حیثیت رکھتے ہوں) لیکن سرسید کے والدین کے سلسلے میں اس طرح کی کوئی بات نظر نہیں آتی ہے۔ جہاں تک سرسید کے والد سید محمد متقی خاں کا تعلق ہے وہ کسی طرح سے بھی عزت وثروت میں اپنے سسر خواجہ فرید الدین احمد خاں سے کم نہیں تھے۔ باپ دادا کے زمانے سے انہیں مغل سرکار میں اعلیٰ منصب حاصل تھا۔ قلعہ میں چند

بااثر لوگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ شہزادگی کے زمانے کے تعلقات کی بنا پر اکبر شاہ کے دورِ اقتدار میں سید محمد متقی خاں کا اثر رسوخ دربار میں دوبالا ہو گیا تھا۔ اکبر شاہ کی خواب گاہ تک رسائی تھی۔ بادشاہ نے ان کو وزارت کا عہدہ قبول کرنے کی پیشکش بھی کی تھی۔ لیکن سید محمد متقی خاں (جو تیراکی، گھوڑسواری اور تیراندازی میں یکتا تھے) آزاد طبیعت انسان تھے۔ وزارت کے کاموں کی الجھنوں سے دور رہنا چاہتے تھے اسی وجہ سے انھوں نے بادشاہ سے معذرت کرلی تھی۔ یہ ان کا اثر اور رسوخ ہی تھا جس کی وجہ سے ان ہی کی سفارش پر ان کے سُسر (خواجہ فریدالدین احمد خاں) کا دو مرتبہ قلعہ میں وزارت کے عہدے پر تقرر ہوا تھا۔

دوسرے خواجہ فریدالدین خاں کا انتقال ۱۸۲۶ء میں ہو گیا تھا جب کہ سید محمد متقی خاں اس کے دس بارہ سال بعد تک حیات رہے تھے اور اپنے بیوی بچوں کی بخوبی کفالت کرتے رہے تھے۔ سید محمد متقی خاں کا انتقال ۱۸۳۸ء میں ہوا تھا۔[14] (اس وقت تک سرسید اور ان کے بڑے بھائی اور بڑی بہن کی شادیاں بھی ہو چکی تھیں)۔

ننھیال اور ددھیال کا ماحول:

یہ ضرور ہے کہ سید محمد متقی خاں عہدِ وسطیٰ کی روایات پر مبنی، بے دست و پا اور زوال پذیر مغل سرکار سے وابستہ تھے۔ دوسری طرف سرسید کے نانا خواجہ فریدالدین احمد ایک جہاں دیدہ شخص تھے۔ برسوں کلکتہ میں انگریزی سرکار کی ملازمت کر چکے تھے۔ ایران کی سفارت کے فرائض انجام دے چکے تھے۔ انگریزی پڑھ لیتے تھے۔[15] (اور شاید بول بھی لیتے تھے) ان کے گھر کا ماحول سید محمد متقی خاں کے گھر کے ماحول سے ضرور مختلف ہوگا۔ جہاں تک سید محمد متقی خاں کے گھر کے رہن سہن اور رکھ رکھاؤ کا تعلق ہے، اغلب ہے کہ وہ عام ہندوستانی روساء کے رہن سہن کی طرح قرونِ وسطیٰ کی طرز کا ہوگا لیکن اس کے برخلاف قیاس یہ ہی ہے، کہ خواجہ فریدالدین احمد کی حویلی کے رہن سہن پر انگریزی طرزِ زندگی کی چھاپ نمایاں ہوگی۔ خواجہ فریدالدین کی کلکتہ میں طویل رہائش۔ انگریزوں سے ان کے ذاتی تعلقات، انگریز ریذیڈنٹ سے دوستی اور ان کا خواجہ فریدالدین احمد کی حویلی میں (بکثرت) آنا جانا اور ان کی خاطر و مدارات سے خواجہ فرید کی حویلی کا رہن سہن اور رکھ رکھاؤ ضرور متاثر ہوا ہوگا۔

ایمپورٹڈ انگلش لیمپوں اور گیس کے ہنڈوں کی روشنی جس قدر، چراغ، شمع اور مشعل کی روشنی سے مختلف ہو سکتی ہے اسی طرح کا فرق ان دونوں گھروں کے معاشرے

اور ماحول میں بھی موجود ہوگا، ایک دھندھلی روشنی والا معاشرہ دوسرا یورپ کی طرزِ زندگی کی چکاچوند کا حامل ماحول۔ خواجہ فرید کی حویلی نہایت عمدہ فرش وفروش سے آراستہ ہوگی۔ شیشہ آلات جو اس زمانے میں کلکتہ میں مروج تھے، عمدگی سے گھر میں سجائے گئے ہوں گے۔ عمدہ کراکری اور فرنیچر بھی گھر میں موجود ہوگا۔ ان سب چیزوں کی شہادت کے بطور سیرتِ فریدیہ میں واضح اشارے ملتے ہیں۔ مثلاً حویلی میں کھانا کھانے کے لیے ایک علیحدہ کمرا مقرر تھا۔ دستر خوان پر علیحدہ علیحدہ رکابیوں میں کھانا کھانے کا چلن تھا اس سلسلے میں سرسید ایک جگہ تحریر کرتے ہیں کہ:

''نواب دبیر الدولہ (یعنی خواجہ فرید) کا معمول تھا کہ صبح کا کھانا محل سرا میں جا کر کھاتے تھے ایک بہت بڑے نعمت خانے میں (مراد کھانا کھانے کے کمرے سے ہے) بہت وسیع دستر خوان بچھایا جاتا تھا اور کل بیٹے اور بیٹیاں اور پوتے اور پوتیاں نواسے اور نواسیاں، اور بیٹوں کی بیویاں اور چھوٹے وبڑے سب ان کے ساتھ کھاتے تھے۔ چھوٹے بچوں کے آگے خالی رکابیاں ہوتی تھیں اور وہ ہر ایک سے پوچھتے تھے کہ کون سی چیز کھاؤ گے۔ جب وہ بتاتا تو اس کے آگے خالی رکابی میں اپنے ہاتھ سے وہی چیز چمچہ سے اٹھا کر بقدر مناسب عنایت فرماتے تھے''۔[16]

ایک دوسری جگہ سرسید تحریر کرتے ہیں کہ چراغ جلنے کے بعد پوتے اور نواسے جو مکتب میں پڑھتے تھے اپنا سبق سنانے کے لیے خواجہ فرید کے پاس جاتے تھے۔

''ان کی مسند کے آگے دو سفید رنگ کے شیشے کی فانوسیں جو مردنگیں کہلاتی ہیں موم بتی سے روشن ہوئی رکھی رہتی تھیں اور ان کے سامنے لڑکے بیٹھتے تھے اول مشکل یہ تھی کہ نہایت سفید چاندنی کا فرش بچھا ہوا ہوتا تھا۔ لڑکے اپنے پاؤں نہایت صاف رکھتے تھے اس خوف سے کہ کہیں چاندنی پر دھبہ نہ لگ جائے''۔[17]

خواجہ فرید الدین احمد کے دیوان خانہ میں نشست و برخاست کے لیے کرسی کا استعمال بھی روا تھا۔ جس کی شہادت سیرتِ فریدیہ کے مندرجہ ذیل بیان سے ملتی ہے۔

''جنرل آکٹرلونی اور وزیر اعظم دبیر الدولہ خواجہ فرید الدین احمد میں

بڑی دوستی تھی، جنرل آکٹرلونی اکثر دبیرالدولہ کے پاس جب چاہتے
آیا کرتے تھے اور اسی لیے دبیرالدولہ کی مسند کے پاس ہمیشہ ایک
نہایت عمدہ لال مخمل کی کرسی رکھی (رہتی) تھی کہ جس وقت بے وقت
جنرل صاحب آویں تو اس پر بیٹھ سکیں''۔۱۸

سرسید کی انگریزوں سے مرعوبیت:

ظاہر ہے کہ اس طرح کے ماحول میں ایک چھ سات سال کے بچے کے ذہن پر جس طرح کے اثرات مرتب ہونا چاہیے تھے وہی اثرات سرسید کے ذہن پر بھی مرتب ہوئے ہوں گے۔ غالباً سرسید کی انگریزوں سے مرعوبیت کا نقطہ آغاز یہ ہی ماحول تھا جس کے اشارے سیرتِ فریدیہ سے فراہم کیے جاسکتے ہیں۔ سرسید ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

''ایک دن جنرل آکٹرلونی آئے ہوئے تھے۔ اتفاقاً راقم کسی سبب
سے وہاں گیا۔ اور جنرل صاحب کو دیکھ کر واپس آنے لگا مگر انھوں
نے بلا لیا اور کچھ بات کی، راقم نے جنرل سے جو فل ڈریس، پوری
پوشاک (باوردی) پہنے ہوئے تھے پوچھا کہ ''آپ نے ٹوپی میں 'پر'
کیوں لگا رکھے ہیں اور کوٹ میں دوہرے بٹن کیوں لگائے ہیں''۔
جنرل اس سوال سے بہت خوش ہوئے اور مسکرا کر خاموش ہو رہے۔
اس وقت راقم کی عمر پانچ یا چھ برس ہوگی''۔۱۹

سرسید کے معصوم ذہن پر جنرل کی وردی، ٹوپی میں لگے 'پر' یا کوٹ میں لگے چمکتے دوہرے ''بٹنوں'' سے ہی انگریزوں سے مرعوبیت کا آغاز ہوا ہوگا۔ اسی مرعوبیت نے بعد میں سرسید کو قلعہ کی روایتی ملازمت کے بجائے انگریزی سرکار کی ملازمت اختیار کرنے نیز انگریزوں سے راہ ورسم بڑھانے کی ترغیب دی ہوگی۔ سرسید نے اپنی ننھیال اور ددھیال میں جس طرح کے دو مختلف ماحولوں میں پرورش پائی تھی اسی کا نتیجہ تھا کہ جہاں وہ آنے والے وقت کی تابنا کی کو دیکھ سکتے تھے وہیں وہ ماضی کی تاریکیوں سے بھی باخبر تھے۔ سرسید ذاتی زندگی میں تاریکی سے روشنی تک کے اس مختصر سفر کو بآسانی طے کر لینے کے مقدور تھے۔ لیکن پورے معاشرے کو اپنے ساتھ لے کر چلنے کی دھن میں وہ ایک عرصے تک نیم تاریک راہوں پر گامزن رہے۔

سید محمد متقی خاں کی شادی:

سید محمد متقی خاں کی شادی، خواجہ فرید الدین احمد کی بڑی صاحبزادی عزیز النساء بیگم سے ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں حالی تحریر کرتے ہیں کہ:

> ''میر متقی کے والد سید ہادی اور خواجہ فرید الدین احمد سے جن کا ذکر عنقریب آئے گا، بہت رسم وراہ تھی۔ میر متقی بھی والد کے انتقال کے بعد خواجہ فرید سے نہایت ادب کے ساتھ ملتے تھے، اور خواجہ فرید بھی ان کے حال پر بہت مہربانی کرتے تھے۔ جب وہ ایران اور آوا کے سفر سے واپس آئے تو انھوں نے اپنی بڑی بیٹی عزیز النساء بیگم کی شادی میر متقی سے کردی۔ اب میر متقی اپنے قدیم موروثی مکان سے اٹھ کر مہدی قلی خاں والی حویلی میں، جو خواجہ فرید نے خرید لی تھی، آرہے''۔[۲۰]

حالی نے یہ واضح نہیں کیا کہ سید محمد متقی خاں کی شادی کس سنہ میں ہوئی تھی۔ اس کے بجائے صرف اتنا لکھنے پر اکتفا کیا کہ ''جب وہ (یعنی خواجہ فرید) ایران اور آوا کے سفر سے واپس آئے تو انھوں نے اپنی بڑی بیٹی عزیز النساء بیگم کی شادی میر متقی سے کردی''۔ ہمارے اندازے کے مطابق خواجہ فرید الدین احمد ۱۸۰۳ء کے اواخر میں ایران روانہ ہوئے تھے۔ ایران تک کی مسافت، وہاں قیام اور واپسی کی مسافت میں ان کو تقریباً ایک سال کا وقت ضرور لگا ہوگا۔ اس طرح ایران سے ان کی واپسی ۱۸۰۴ء کے اواخر میں ہوئی ہوگی۔ پھر فوراً ہی تو آوا کے سفر پر روانہ ہو نہیں گئے ہوں گے۔ ایران سے واپس آنے کے کچھ عرصے بعد (یعنی چند مہینوں کے بعد) ہی انھوں نے ''آوا'' (برہما) کا سفر کیا ہوگا۔ اس مسافت میں بھی چند مہینے ضرور صرف ہوئے ہوں گے۔ اگر اس تمام مدت کو ذہن میں رکھا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایران اور آوا کے سفر کے بعد غالباً ۱۸۰۵ء کے اواخر (یا ۱۸۰۶ء کے اوائل) ہی میں خواجہ فرید کی بڑی صاحبزادی کی شادی سید محمد متقی خاں سے ہوئی ہوگی۔

حالی کے اس بیان سے کہ: ''اب میر متقی اپنے قدیم موروثی مکان سے اٹھ کر مہدی قلی خاں والی حویلی میں، جو خواجہ فرید نے خرید لی تھی، آرہے''۔ غالباً اس بات کو شہرت ملی ہے کہ سرسید کی پرورش اپنی ننھیال میں ہوئی تھی۔ حالاں کہ جیسا ہم پہلے سرسید کے حوالے

سے لکھ چکے ہیں کہ شادی کے بعد سید محمد متقی خاں اور ان کی بیوی مہدی قلی خاں والی حویلی کے احاطے میں ایک نوتعمیر مکان میں منتقل ہوئے تھے نہ کہ مہدی قلی خاں کی حویلی میں، جو خواجہ فرید الدین احمد نے خرید لی تھی۔

سید محمد متقی خاں کی اولاد:

سید محمد متقی خاں کی اولاد میں ایک بیٹی اور دو بیٹے تھے۔ بیٹی سب سے بڑی تھیں۔ ان کی پیدائش ۱۸۰۶ء کے آس پاس ہوئی ہوگی۔ بیٹی کی پیدائش کے تقریباً ۵ سال بعد بڑے صاحبزادے، سید محمد خاں پیدا ہوئے تھے۔ جن کا انتقال ۱۸۴۵ء میں ہوا تھا۔ سید محمد متقی خاں کے چھوٹے صاحبزادے، سید احمد خاں، کی پیدائش ۱۸۱۷ء میں ہوئی اور انتقال ۱۸۹۸ء میں ہوا۔

سید محمد متقی خاں کی صاحبزادی:

سید محمد متقی خاں کی صاحبزادی عمر میں اپنے دونوں بھائیوں سے بڑی تھیں ہمارے اندازے کے مطابق ان کی پیدائش ۱۸۰۶ء میں ہوئی تھی۔ حالی نے ''حیات جاوید'' میں ان کا نام صفیۃ النساء بیگم لکھا ہے۔ لیکن سر سید نے اپنے متعدد خطوط (بنام حکیم احمد الدین) میں ان کا نام عجبۃ النساء بیگم لکھا ہے۔ وہ ان خطوں میں اپنی بڑی بہن کو ''ہمشیرہ صاحبہ''، ''بوا صاحب'' اور ''کوچہ والی ہمشیرہ'' کے لقب سے بھی مخاطب کرتے ہیں۔ غالباً بہنوئی کے انتقال کے بعد سے سر سید نے اپنی بہن کی کفالت کی ذمہ داری خود قبول کر لی تھی اس لیے ان کو ۲۵ روپے مہینہ ان کے خرچ کے لیے بھیجتے تھے۔ ہم ان امور کے سلسلے میں، حوالے کے بطور، سر سید کے خطوط بنام حکیم احمد الدین، کے مندرجہ ذیل اقتباسات پیش کرنا چاہیں گے۔

> خط مورخہ ۶/اکتوبر ۱۸۸۳ء میں تحریر کرتے ہیں کہ ''منی آرڈر مبلغ ۱۵۰ کا تمہارے نام مرسل ہے اس کا روپیہ وصول کر کے بوا صاحب کے سپرد کردو''۔[۲۱]
>
> خط مورخہ ۱۲/اکتوبر ۱۸۸۳ء میں یوں خطاب کرتے ہیں کہ ''ہمشیرہ صاحبہ عزیزہ وشفیقہ سلمہا''۔[۲۲]
>
> خط مورخہ ۶/نومبر ۱۸۸۳ء میں لکھتے ہیں کہ ''پچاس روپے کی چیک بینک آف بنگال کی اس خط میں ملفوف ہے۔ اس چیک کا روپیہ بنک

سے وصول کر کے ہمشیرہ صاحب کو بابت تنخواہ دو ماہ دے دو''۔ ۲۳

خط مورخہ ۴ر جنوری ۱۸۸۴ء میں تحریر کرتے ہیں کہ ''پچاس روپے ہمشیرہ صاحبہ کو بابت دو ماہ دے دو''۔ ۲۴

خط مورخہ ۶ر ستمبر ۱۸۸۴ء میں لکھتے ہیں کہ ''بوا سے کہہ دینا کہ ان دنوں فرصت بہت ہی کم ہے، ایک آدھ دن بعد ان کو خط لکھوں گا۔ سید محمود یہاں آ گئے ہیں ان کا خود دہلی جانے کا ارادہ ہے۔ وہ خود آ کر بوا کو یہاں لے آئیں گے''۔ ۲۵

خط مورخہ ۱۵ر اپریل ۱۸۸۵ء میں تحریر کرتے ہیں کہ ''اگر ہمشیرہ عجبۃ النساء بیگم، حویلی کی، جس میں وہ رہتی ہیں کچھ درستی کو کہیں تو فی الفور کرا دینا''۔ ۲۶

خط مورخہ ۱۵ر فروری ۱۸۸۸ء میں تحریر کرتے ہیں کہ ''سو روپے کوچہ والی کو دے دو کہ یہ روپے واسطے مہمان داری کے ہے۔ دو سو روپے کوچہ والی کو دے دو کہ احمدی بیگم (دختر سید حامد) کے لیے جو تم نے مانگا تھا وہ بھیجے ہیں جو کچھ چاہیں اس کو بنوا دیں''۔ ۲۷

خط مورخہ ۱۴ر ستمبر ۱۸۹۰ء میں تحریر کرتے ہیں کہ ''بوا سے کہہ دینا کہ ماہ نومبر میں سب لوگ دہلی آویں گے اور محمود بیگم کا ارادہ ہے کہ مسعود کے دودھ چھوٹنے کی شادی کریں گی۔ بس اس مکان میں جس میں تم رہتے ہو تمہارے ساتھ سب رہیں گے۔ محمود بیگم نے کہا کہ میں جس قدر روپے کہیں گی ان کو یعنی عجبۃ النساء بیگم صاحبہ کو دے دوں گی ان کو اختیار ہوگا جس طرح چاہیں کریں وہی بڑی ہیں اور وہ ہی سب کچھ کریں گی''۔ ۲۸

سرسید کی پیدائش کے وقت ان کی بڑی بہن عجبۃ النساء بیگم کی عمر تقریباً گیارہ بارہ سال کی ہوگی اور اس کے پانچ چھ سال بعد ہی (یعنی سترہ، اٹھارہ سال کی عمر میں) ان کی شادی ہوگئی ہوگی۔ یہ صرف ایک مفروضہ ہی ہے کیوں کہ اس زمانے میں لڑکیوں کی شادی عموماً سولہ سترہ سال کی عمر میں کر دی جاتی تھی۔ عجبۃ النساء بیگم کی شادی کس سے ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں ہم کوئی بات وثوق سے نہیں کہہ سکتے ہیں۔ سرسید کی ایک تقریر کے اقتباس سے

ان کی بہن کے مکان وغیرہ کے سلسلے میں کچھ مبہم اشارے ملتے ہیں۔ سرسید نے ۱۸۸۸ء میں بمقام لاہور تعلیم نسواں سے متعلق ایک ریزولیوشن کی تائید کرتے ہوئے بیان کیا تھا کہ ان کے بچپن میں (یعنی جب سرسید کی عمر پندرہ سولہ سال کی تھی یعنی تیس کی دہائی میں) لڑکیوں کی تعلیم کے لیے محلّوں کے گھروں میں کوئی معزز گھر اس کام کے لیے منتخب کرلیا جاتا تھا جس میں ایک دالان بطور مکتب تجویز کیا جاتا تھا جس میں تخت بچھے رہتے تھے جن پر صاف فرش ہوتے تھے اور لڑکیاں وہاں بیٹھ کر پڑھا کرتی تھیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے فرمایا تھا کہ:

> ''میری حقیقی بہن کا گھر اس کام کے لیے خاص کیا گیا تھا اور ایک گروہ رشتہ دار لڑکیوں کا اس طرح پر ایک دالان میں پڑھا کرتا تھا اور میری بہن کے شوہر، جو نہایت بزرگ تھے، ان لڑکیوں کی تعلیم میں زیادہ کوشش کرتے تھے۔ میرے نانا کے حقیقی بھائی ہر روز یا ایک دن بیچ کر کے مکتب میں آتے تھے اور فارسی خط جو لڑکی سیکھنا چاہتی تھی اس کو اصلاح دیتے تھے۔ صبح سے کھانے کے وقت تک پڑھنے کا وقت تھا۔ کھانے کے وقت پر سب لڑکیاں اس گھر کی مالکہ کے ساتھ کھانا کھاتی تھیں۔ کھانے کے بعد ظہر کے وقت تک سینے پرونے یا اسی قسم کے خانہ داری کے کاموں کو سیکھنے میں گزرتا تھا۔ ظہر کے وقت سب لڑکیاں نماز پڑھتی تھیں اور عصر کے وقت تک پھر اپنے پڑھنے میں مصروف رہتی تھیں۔ عصر کے بعد ڈولیوں میں سوار ہوئیں اور اپنے اپنے گھر چلی گئیں۔ جمعہ کا دن نہایت دلچسپ ہوتا تھا۔ سب لڑکیاں بدستور صبح سے آتی تھیں اور سب مل کر چھوٹی چھوٹی پتیلیوں میں مختلف قسم کے کھانے پکاتی تھیں اور سب لڑکیوں کو انہیں کا پکایا ہوا کھانا کھلاتی تھیں۔ کبھی کبھی اپنے ہم عمر بھائیوں کو بھی وہ لڑکیاں بلاتی تھیں اور کھانا کھلاتی تھیں''۔ [۲۹]

سرسید کے مندرجہ بالا اقتباس سے ہم نے یہی نتیجہ نکالا ہے کہ سرسید کی حقیقی بہن کا اپنا ایک بڑا مکان تھا جس میں اپنی ضروریات کے علاوہ اتنی مکانیت تھی کہ ایک دالان کو محلے کی لڑکیوں کی تعلیم کے واسطے مکتب کے بطور استعمال کیے جانے کے لیے وقف کر دیا تھا

(غالباً یہ مکان چیلوں کے کوچہ میں واقع تھا اسی وجہ سے سرسید اپنی بہن کو کوچہ والی ہمشیرہ بھی کہتے تھے) سرسید کی بہن کے شوہر نہایت بزرگ تھے۔ (جس سے سرسید کی غالباً یہ مراد ہوسکتی ہے کہ وہ کافی عمر رسیدہ تھے) اس اقتباس سے ہمیں یہ اطلاع بھی ملتی ہے کہ سرسید کے نانا خواجہ فرید الدین احمد کے حقیقی بھائی، خواجہ شہاب الدین ،اس وقت تک۔ (یعنی ۱۸۳۴ء کے آس پاس تک) حیات تھے۔ خواجہ شہاب الدین نسخ خط لکھنے کے ماہر تھے اور انگریزی عمل داری میں کسی محکمہ میں ناظر (ہیڈ محرر) ہوگئے تھے۔ وہ مکتب میں لڑکیوں کو فارسی خط سکھلاتے اور اصلاح دیتے تھے۔ سرسید کے نانا خواجہ فرید الدین احمد کے ۱۸۲۶ء میں انتقال کے بعد غالباً خواجہ شہاب الدین ہی اس پیڑھی کے چند بزرگوں میں اب تک حیات تھے۔ ورنہ ان کے دوسرے سات بھائیوں میں سے تقریباً چار کا اب تک انتقال ہو چکا تھا۔

عجبۃ النسا بیگم کی اولاد:

ہمیں عجبۃ النسا بیگم کی اولاد کے بارے میں کوئی مستند حوالہ نہ مل سکا۔ لیکن اس سلسلے میں ہم اپنے مفروضات یہاں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ سرسید نے ۱۸۸۲ء کے بعد اپنی وفات سے پہلے تک جو خطوط حکیم احمد الدین صاحب کو لکھے تھے، وہ حکیم صاحب نے سرسید کی وفات کے بعد یکجا کر کے ایک مجلّہ کی صورت میں مدرسۃ العلوم کی نذر کر دیئے تھے۔ اس مخطوطے میں حکیم احمد الدین نے اپنے آپ کو سرسید کا نواسہ بتلایا ہے۔ انہوں نے واضح طور پر لکھا ہے کہ ''میں سرسید مغفور کا نواسہ ہوں'' [۳۰] خطوط کے متن سے بھی وہ سرسید کے قریبی عزیز معلوم ہوتے ہیں۔ سرسید کی بیٹی، آمینہ بیگم کا انتقال ۱۸۶۹ء میں نہایت کم عمری میں ہوگیا تھا۔ اس لیے سرسید کے کسی حقیقی نواسے کے ہونے کا احتمال ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ سرسید کے بڑے بھائی کی بیٹی کا بیٹا بھی سرسید کا نواسہ کہلایا جاسکتا تھا۔ لیکن چوں کہ سرسید کے بڑے بھائی سید محمد خاں کی بیٹی کے صاحبزادگان کے بارے میں ہمیں تفصیلی آگاہی ہے اس لیے، ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ حکیم احمد الدین سرسید کے بڑے بھائی کی بیٹی کے بیٹے نہیں تھے۔ ایک تیسری صورت یہ بھی ہوسکتی تھی کہ وہ سرسید کی بہن عجبۃ النسا بیگم کے صاحبزادے ہوتے لیکن اس صورت میں وہ سرسید کے ''نواسے'' کے بجائے ''بھانجے'' کہلاتے۔ ان سب امکانات پر غور کرنے کے بعد ہم اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ حکیم

احمد الدین غالباً سرسید کی بہن عجبۃ النساء بیگم کی صاحبزادی کے بیٹے تھے یعنی وہ عجبۃ النساء بیگم کے نواسے تھے۔ اس رشتے سے وہ اپنے آپ کو سرسید کا نواسہ لکھنے کے بھی مجاز تھے۔ غالباً یہی ان کا سرسید سے صحیح رشتہ تھا۔ اگر اس مفروضہ کو صحیح مان لیا جائے تو ایک اور رشتہ بھی صاف ہوجاتا ہے یعنی چند حوالوں کی بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ سرسید کے بڑے صاحبزادے سید حامد کی بیگم صاحبہ حکیم احمد الدین کی حقیقی بہن تھیں۔ یعنی سرسید کی بڑی بہو (سید حامد کی بیوی) سرسید کی حقیقی بہن عجبۃ النساء بیگم کی نواسی تھیں۔ اس سلسلے میں ہم سرسید کے خطوط بنام حکیم احمد الدین کے مندرجہ ذیل اقتباسات پیش کرنا چاہیں گے۔

(۱) سرسید کا خط بنام حکیم احمد الدین مورخہ ۶ ر ستمبر ۱۸۸۳ء---- ''تم کو علی گڑھ میں پچیس یا تیس روپے کی نوکری مل سکتی ہے۔ اگر تم کو منظور ہو تو اطلاع دو اور نیز یہ بھی لکھو کہ تمہاری بہن اور سید حامد اور ہمشیرہ عجبۃ النساء بیگم بھی اس بات پر راضی ہیں یا نہیں''۔[۳۱]

(۲) سرسید کا خط بنام حکیم احمد الدین مورخہ ۱۳ ر اکتوبر ۱۸۹۳ء---- ''آج تمہاری بہن (بیگم سید حامد) روانہ فتح گڑھ ہوئی ہیں۔ احمد علی ان کو پہنچانے جاتا ہے''۔[۳۲]

(۳) سید حامد کے انتقال کے آٹھ مہینے بعد سرسید اپنے خط بنام حکیم احمد الدین مورخہ ۳ ر اگست ۱۸۹۴ء میں لکھتے ہیں---- ''پچاس روپے کا منی آرڈر مرسل ہے۔ اپنی بہن کو دے دو۔ اس کا خط نسبت قرضہ کے آیا تھا۔ کسی اتوار کو تم یہاں آؤ تو مشورہ کیا جائے''۔[۳۳]

ان اقتباسات سے یہ بات کسی حد تک واضح ہوجاتی ہے کہ سید حامد کی بیگم، حکیم احمد الدین کی (غالباً) حقیقی بہن تھیں۔

حکیم احمد الدین:

جیسا کہ ہم نے اوپر تحریر کیا ہے۔ حکیم احمد الدین غالباً سرسید کی بڑی بہن عجبۃ النساء بیگم کے نواسے اور سید حامد کی بیوی کے بھائی تھے۔ ۱۸۸۲ء کے آس پاس سرسید، ان کی (دہلی میں) گھر پر موجودگی کو مقدم سمجھتے تھے۔ وہاں خانگی اور دوسرے انتظامات کی ذمہ داری حکیم احمد الدین ہی کے سپرد تھی۔ حکیم احمد الدین اس زمانے میں علی گڑھ میں نوکری

کرنے کے خواہاں تھے۔ لیکن سرسید نے ان کو علی گڑھ میں کوئی معمولی نوکری کرنے کے بجائے دہلی میں گھر پر رہ کر مختلف انتظامات کی دیکھ بھال کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس سلسلے میں سرسید اپنے خط بنام احمد الدین مورخہ ۶ ستمبر ۱۸۸۳ء میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''تم کو علی گڑھ میں پچیس یا تیس روپے کی نوکری مل سکتی ہے، اگر تم کو منظور ہو تو اطلاع دو اور نیز یہ بھی لکھو کہ تمہاری بہن اور سید حامد اور ہمشیرہ عجبۃ النساء بیگم بھی اس بات پر راضی ہیں یا نہیں''۔ ۳۴؎

اس خط کے ساتھ ہی سرسید نے سید حامد کو بھی اس سلسلے میں مشورہ کرنے کے لیے ایک خط مورخہ ۷ ستمبر ۱۸۸۳ء تحریر کیا تھا۔ سید حامد اس وقت پیلی بھیت میں تعینات تھے۔ سرسید نے اس خط میں تحریر کیا تھا کہ:

''تمہارے نزدیک دہلی کے لوگوں کا کچھ حرج و دقت نہ ہو تو میں احمد الدین کو علی گڑھ میں کالج کے متعلق پچیس، تیس روپے کی نوکری پر بلالوں۔ مگر یہ خیال ہے کہ اس کے چلے آنے کے بعد دہلی میں گھروں پر کوئی شخص نہیں رہتا۔ تمہاری کیا صلاح ہے۔ بلانا مناسب ہے یا نہیں''۔ ۳۵؎

سید حامد نے سرسید کے اس خط کی پشت پر مندرجہ ذیل متن کا خط لکھ کر احمد الدین صاحب کو ارسال کر دیا تھا تاکہ وہ خود اس سلسلے میں فیصلہ کر کے سرسید کو مطلع کریں۔ سید حامد نے تحریر کیا تھا کہ:

''بھائی احمد صاحب۔ کیا کہتے ہو۔ میری دانست میں تو کچھ فائدہ نہیں ہے۔ اپنی ہمشیرہ صاحبہ اور آپا خان صاحبہ اور والدہ صاحبہ کی رائے لکھو۔ عجب مشکل کی بات ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ کا کیا (خیال ہے)۔ لیکن جہاں تک میں خیال کرتا ہوں علی گڑھ جانے میں فائدے کم ہیں اور ہمارا نقصان زیادہ ہے۔ تم کو اگر روپے کی ضرورت ہے اور (عبارت پڑھی نہ جا سکی) ...... غیرت کا خیال ہے تو ہم سے پچیس روپے ماہوار لے لیا کرو۔ جو ضرورت ہوئی خرچ کیا جیسے ہم خود، تمہاری ہمشیرہ، یا اجبہ بیگم خرچ کرتی ہیں۔ اپنا جان کر۔ اس خط کو بعد ملاحظہ اور جناب آپا خان صاحبہ کو سنا کر جو آپا خان صاحبہ

فرمادیں و نیز اپنا جواب سرکار کی خدمت میں روانہ علی گڑھ کردو۔ پھر جیسا سرکار فرماویں، تعمیل کرو۔ باقی سب خیریت ہے''۔ فقط

خاکسار۔ سید حامد [۳۶]

حکیم احمد الدین صاحب نے علی گڑھ میں نوکری کرنے کا خیال تو چھوڑ دیا، لیکن ان کے ایک خط سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ انھوں نے دہلی ہی میں اسسٹنٹ کلکٹر کے دفتر میں ایک نوکری کر لی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ سرسید ہی کی ایما اور سفارش پر ان کو یہ نوکری ملی ہو۔ اس نوکری کے ساتھ ہی وہ گھر پر رہ کر خانگی انتظامات کی ذمہ داریاں بھی نبھاتے رہے تھے۔ وہ اپنے خط بنام سرسید مورخہ ۷/اکتوبر ۱۸۸۹ء میں دہلی سے تحریر کرتے ہیں کہ:

''حضور قبلہ و کعبہ دام اقبال۔ بعد آداب التماس یہ ہے کہ آج ناچیز دہلی میں پہنچا۔ یہاں سب خیر و عافیت سے ہیں۔ صاحب اسسٹنٹ کلکٹر بہادر جن کے محکمہ میں تابعدار تعینات ہے وہ دورہ میں ہیں۔ ان کا سررشتہ دار دورہ میں سے بیمار ہوکر یہاں آگیا ہے۔ ایسی صورت میں تابعدار کو دورہ میں جانا ضرور ہے۔ چار پانچ روز میں واپس آجاؤں گا۔ اس وقت تمام باتوں کا مفصل جواب عرض کروں گا۔ اشیا مطلوبہ کی بابت سرکار روپے بھیجیں تو سرکار کو چہ والی نانی صاحبہ کو لکھ دیں کہ جب میں آؤں تو اس وقت وہ دے دیں۔ زیادہ حدِ آداب۔ کل مجھ کو دورہ میں روانہ ہونا ہوگا''۔ [۳۷]

حضور کا تابعدار: احمد الدین دہلوی

مورخہ ۷/اکتوبر ۱۸۸۹ء، از دہلی

دو ایک خطوں سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ حکیم احمد الدین ۱۸۹۶ء میں اپنی نوکری کے سلسلے میں حصار میں تعینات تھے۔ سرسید کے انتقال کے بعد جب انھوں نے سرسید کے خطوط ''جلد بند'' کروا کر مدرسۃ العلوم کی نذر کیے تھے اس وقت وہ ضلع حصار میں داروغہ آب کاری کی حیثیت سے تعینات تھے۔ انھوں نے اس ''جلد بند'' مخطوطے میں اپنا نام اس طرح لکھا ہے۔

''احمد الدین۔ متوطن دہلی۔ تہراہہ بیرم خاں۔ گزرفیض بازار۔ داروغہ آب کاری، ضلع حصار''۔ [۳۸]

حکیم احمد الدین صاحب کتنے عرصے زندہ رہے۔ ان کا انتقال کب اور کہاں ہوا نیز ان کی اولاد کے سلسلے میں ہمیں کوئی اطلاع حاصل نہ ہو سکی۔

عجبۃ النساء بیگم کا سنہ انتقال:

مولانا الطاف حسین حالی ''حیات جاوید'' میں سر سید کی بڑی بہن کے انتقال کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ:

> ''سر سید کی بہن صفیۃ النساء بیگم (ان کا صحیح نام عجبۃ النساء بیگم تھا) بھی، جن کا انتقال دسمبر ۱۸۹۲ء میں، جب کہ سر سید محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی تقریب سے دلی میں موجود تھے کچھ کم نوے برس کی عمر میں ہوا۔ عورتوں میں ممتاز اور قابل تھیں''۔ ۳۹

حالاں کہ سر سید کے ایک خط مورخہ ۱۶ر نومبر ۱۸۹۴ء سے واضح اطلاع ملتی ہے کہ ۱۸۹۴ء تک ان کی ہمشیرہ حیات تھیں اور اس سے پہلے سید حامد کا انتقال ہو چکا تھا۔ سید حامد کا انتقال جنوری ۱۸۹۴ء میں ہوا تھا۔ مذکورہ خط میں سر سید تحریر کرتے ہیں کہ:

> ''عزیزی احمد الدین
>
> تمہارا خط پہنچا ہمشیرہ عجبۃ النساء بیگم کی علالت طبع جو حد سے زیادہ ہو گئی ہے اس کا مجھ کو نہایت رنج ہے۔ میں ہر چند دل کو دہلی آنے پر مضبوط کرتا ہوں مگر وہاں کے مکانات اور سید حامد مرحوم کا رنج اس قدر دل پر اثر کرتا ہے کہ قدم نہیں اٹھتا۔ اب تک سید حامد مرحوم کا غم میرے دل سے کم نہیں ہوا۔ یہاں اور کاموں کے خیال میں دن گزر جاتا ہے۔ مگر دہلی کے خیال سے غم تازہ ہو جاتا ہے۔ دو دن سے میری طبیعت بھی کسی قدر علیل ہے۔ بہر حال میں ارادہ دہلی آنے کا اور ہمشیرہ صاحبہ کو دیکھنے کا مصمم رکھتا ہوں۔ کہاں تک دہلی جانے سے پرہیز کروں گا۔ بہر حال اگر قسمت میں ملنا ہے تو میں آ کر ملوں گا۔ تم ان کے حال کا برابر خط لکھتے رہو۔ اگر ممکن ہو تو یہ خط ہمشیرہ صاحبہ کو سنا دینا۔ ۴۰
>
> والسلام خاکسار: سید احمد
>
> علی گڑھ ۱۶ر نومبر ۱۸۹۴ء

ہمارے اندازے کے مطابق سرسید کی ہمشیرہ عجبۃ النساء بیگم کا انتقال دسمبر ۱۸۹۴ء میں دہلی میں ہوا تھا۔

سرسید کے بڑے بھائی سید محمد خاں:

حالی، حیات جاوید میں تحریر کرتے ہیں کہ:

> ''سرسید کے پیدا ہونے سے پہلے ان کی بہن صفیۃ النسا بیگم (یعنی عجبۃ النسا بیگم) اور ان کے بھائی سید محمد خاں پیدا ہو چکے تھے۔ سید محمد خاں کی ولادت کے بعد چھ برس تک ان کے والدین کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا تھا، اس لیے سید احمد خاں کے پیدا ہونے سے ان کو نہایت خوشی ہوئی''۔[۴۱]

حالی کے مندرجہ بالا بیان کی وجہ سے ہم نے سید محمد خاں کا سنہ ولادت ۱۸۱۱ء متصور کرلیا ہے۔ (کیوں کہ سرسید کا سنہ پیدائش ۱۸۱۷ء لکھا جاتا ہے اور چوں کہ ان کے بڑے بھائی ان سے چھ سال بڑے تھے اس لیے ان کا سنہ پیدائش ۱۸۱۱ء ہونا چاہیے)۔ سرسید کے بڑے بھائی کے سلسلے میں بہت زیادہ اطلاعات نہیں ملتی ہیں۔ حالی صرف اتنا لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ:

> ''سرسید کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے صرف معمولی تعلیم پائی تھی۔ مگر بہت زندہ دل اور شگفتہ مزاج تھے۔ ان کو بھی شاہ غلام علی صاحب سے بیعت تھی مگر وضع اس کے خلاف تھی۔ اکثر ان کے والد کے ملنے والے ان سے کہتے کہ بیٹے کو سمجھاؤ کہ اپنی وضع درست کرے اور داڑھی نہ منڈوایا کرے۔ وہ یہ جواب دیتے کہ عمر کا تقاضا ہے جو اس کا دل چاہے کر لینے دو۔ کبھی نہ کبھی خود درست ہو جائے گا۔ آخر ایک مدت کے بعد ان کا طریقہ خود بخود بدل گیا۔ داڑھی رکھ لی اور نماز کے سخت پابند ہو گئے''۔[۴۲]

اس اقتباس سے سید محمد خاں کی ایک بے فکر و لا اُبالی قسم کے انسان ہونے کی تصویر ذہن میں آتی ہے۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق سید محمد خاں نے غالباً تیراکی، تیراندازی اور گھوڑسواری میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ کیوں کہ سرسید خود ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ''میں نے

اور بڑے بھائی نے اپنے والد سے تیرنا سیکھا تھا''۔ غالباً تیر اندازی اور گھوڑ سواری کی تربیت انھوں نے اپنے والد کے ساتھ ساتھ اپنے ماموں کی صحبت میں حاصل کی ہوگی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سید محمد متقی خاں (والد سرسید) کی نظروں میں بڑے بیٹے سید محمد خاں کے مقابلے میں سرسید کے اندر، کم عمر ہونے کے باوجود، اہم ذمہ داریاں قبول کرنے اور انہیں نبھانے کی اہلیت نسبتاً زیادہ تھی۔ اس سلسلے میں حالی ایک جگہ تحریر کرتے ہیں کہ:

''سرسید کے والد کو اکبر شاہ کے زمانے میں ہر سال تاریخ جلوس کے جشن پر پانچ پارچہ اور تین اقوام جواہر کا خلعت عطا ہوتا تھا۔ مگر آخیر میں جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا انھوں نے دربار کا جانا کم کر دیا تھا اور اپنا خلعت سرسید کو باوجود یہ کہ ان کی عمر کم تھی، دلوانا شروع کر دیا تھا۔ سرسید کہتے تھے کہ ایک بار خلعت ملنے کی تاریخ پر ایسا اتفاق ہوا کہ والد بہت سویرے اٹھ کر قلعہ چلے گئے اور میں بہت دن چڑھے اٹھا ہر چند بہت جلد گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں پہنچا مگر پھر بھی دیر ہو گئی''۔[۴۳]

یہ بات کہ سید محمد متقی خاں کی نظروں میں سرسید اہم ذمہ داریاں قبول کرنے کے زیادہ اہل تھے۔ ہم نے اس وجہ سے لکھی کہ سید محمد متقی خاں نے اپنا خلعت سرسید کو (باوجود اس کے کہ ان کی عمر کم تھی) دلوانا شروع کر دیا تھا۔ حالاں کہ چھ سال بڑے بھائی کی موجودگی میں کم عمر چھوٹے بھائی کو خلعت قبول کرنے کے لیے نامزد کرنا ایک طرح سے دونوں بیٹوں کے درمیان امتیازی سلوک روا رکھنے کے مترادف ٹھہرایا جا سکتا ہے لیکن غالباً اس کی وجہ یہی تھی کہ سرسید کے اندر ذمہ داریوں کو قبول کرنے اور انہیں نبھانے کا رجحان بدرجۂ اتم موجود تھا۔

سرسید نے ۱۸۴۰ء میں قوانین دیوانی متعلقہ منصفی کا ایک خلاصہ اس غرض سے تیار کیا کہ وہ عہدۂ منصفی ملنے کا ایک ذریعہ بن سکے۔ بعد میں سرسید نے اس خلاصے کو اپنے اور اپنے بڑے بھائی کے نام سے بعنوان ''انتخاب الاخوین'' کے شائع کروا دیا تھا۔ سرسید نے ۱۸۴۰ء میں منصفی کے امتحان میں بیٹھنے کی تیاری شروع کی۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنے بڑے بھائی سید محمد خاں اور اپنے ماموں زاد بھائی ہاشم علی خاں کو بھی امتحان دینے پر آمادہ کر لیا تھا۔ سرسید اور ہاشم علی خاں پہلی ہی بار میں اس امتحان میں کامیاب ہوئے۔ جب کہ سید محمد خاں دوسرے سال میں امتحان پاس کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ سرسید کی شادی ۱۸۳۶ء میں ہوئی تھی۔ خیال اغلب ہے کہ ان کے بڑے بھائی سید محمد خاں کی شادی سرسید

کی شادی سے کئی سال پہلے ہوگئی ہوگی۔ ہمارے مفروضہ کے مطابق سید محمد خاں کی شادی ۱۸۳۴ء کے آس پاس ہوئی ہوگی۔ سید محمد خاں کے والد سید محمد متقی خاں کا انتقال ۱۸۳۸ء میں ہوا تھا۔ اس وقت تک ان کے تینوں بچوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ سید محمد خاں نے ۱۸۳۷ء کے آس پاس ایک اخبار بعنوان ''سید الاخبار'' جاری کیا تھا۔ حالی کا خیال ہے کہ اس اخبار کا نام سرسید کے نام کی مناسبت سے ''سید الاخبار'' رکھا گیا تھا (کیوں کہ اس زمانہ میں سرسید کی عرفیت ''سید'' تھی)۔ اس بات کو لکھنے سے غالباً، حالی کی منشا یہ ثابت کرنے کی رہی ہوگی کہ دونوں بھائیوں کے درمیان بہت خلوص اور محبت تھی۔ بھائیوں میں آپسی محبت اور خلوص شرفا کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا تھا۔ ''سید الاخبار'' کافی عرصہ تک جاری رہا بلکہ ۱۸۴۵ء میں سید محمد خاں کے انتقال کے بعد بھی سرسید نے اس کو جاری رکھنے اور ترقی دینے کا اہتمام کیا تھا۔ سید محمد خاں منصفی کا امتحان پاس کرنے کے بعد، ہنگام ضلع فتح پور میں منصف مقرر ہوگئے تھے۔ ۱۸۴۵ء میں سرسید فتح پور سیکری میں بطور منصف متعین تھے۔ دسہرے کی تعطیل میں سرسید فتح پور سیکری سے اور سید محمد خاں ہنگام سے دہلی آئے ہوئے تھے۔ تب ہی سید محمد خاں کو دہلی میں بخار آنے لگا اور یہی بخار آخیر کو جان لیوا ثابت ہوا۔ تقریباً ایک مہینہ بیمار رہنے کے بعد دہلی ہی میں ان کا انتقال ہوگیا۔

سید محمد خاں کا سنہ انتقال:

سرسید نے ایک جگہ تحریر کیا ہے کہ ان کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے سینتیس، اڑتیس سال کی عمر میں انتقال کیا تھا۔[۴۴] حالی نے ایک دوسری جگہ تحریر کیا ہے کہ ''سید محمد'' سرسید سے چھ سال بڑے تھے۔[۴۵] حالی کے اس بیان کے مطابق سید محمد خاں کا سنہ پیدائش ۱۸۱۱ء قرار دیا جا سکتا ہے اور اگر ان کا، بقول سرسید، سینتیس، اڑتیس سال کی عمر میں انتقال ہوا تھا تو اس حساب سے ان کے انتقال کا سنہ ۱۸۴۸ء یا ۱۸۴۹ء ہونا چاہیے حالاں کہ خود حالی کے بیان کے مطابق سید محمد خاں کا انتقال ۱۸۴۵ء کے اواخر میں ہوا تھا۔ بہر حال ہم نے اس سلسلے میں اپنے شکوک قارئین کے علم میں لانا مناسب سمجھا۔ حالاں کہ ہم نے خود بھی سید محمد خاں کا سنہ انتقال (بغیر کسی معقول وجہ کے) ۱۸۴۵ء تسلیم کرلیا ہے۔

سید محمد خاں کی اولاد:

مختلف حوالہ جات کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ سرسید کے بڑے بھائی سید محمد خاں کی

اولاد میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھے۔ بیٹے کا نام سید محمد احمد خاں تھا۔ جو بعد میں خان بہادر کے خطاب سے سرفراز ہوئے تھے۔ بڑے بھائی کے انتقال کے بعد سرسید نے اپنے بھتیجے کی دیکھ ریکھ اور تعلیم و تربیت میں نمایاں حصہ نبھایا تھا۔ سید محمد احمد خاں ۱۸۹۶ء میں اپنی ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد پہلے علی گڑھ میں اور بعد میں سیتاپور میں رہائش پذیر رہے تھے۔ اپنے آخری زمانے میں سید محمود، سیتاپور میں، سید محمد احمد خاں کے ساتھ ہی رہائش پذیر تھے۔ سید محمد احمد خاں صاحب کی شادی سعیدۃ النساء بیگم[۴۶] سے ہوئی تھی۔ جو سید محمد احمد کی رشتہ کی بہن تھیں اور اسی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔

سید محمد خاں کی صاحبزادی کے بارے میں ہمیں بہت زیادہ جانکاری دستیاب نہ ہو سکی۔ لیکن ان کے دو صاحبزادگان، یعنی سید محمد علی اور سید احمد علی کے سلسلے میں بہت زیادہ اطلاعات ہمیں ملتی ہیں۔ ان دونوں نے مدرسۃ العلوم ہی میں تعلیم پائی تھی۔ اور طالب علمی کے زمانے میں سرسید کے ساتھ ہی رہتے رہے تھے۔ احمد علی (یعنی چھوٹے بھائی) بعد میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر فائز ہوئے تھے۔ نیز بڑے صاحبزادے (یعنی سید محمد علی) ۱۹۱۸ء میں عدلیہ کی سروس سے ریٹائر ہونے کے بعد مدرسۃ العلوم کے ٹرسٹیان کے سکریٹری بھی مقرر ہوئے تھے۔ سید محمد علی کی شادی سرسید کی اکلوتی پوتی (یعنی سید حامد کی اکلوتی بیٹی) احمدی بیگم سے ہوئی تھی۔

سید محمد خاں کے صاحبزادے سید محمد احمد خاں اور سید محمد خاں کے نواسوں (یعنی سید محمد علی اور سید احمد علی) کا تذکرہ آئندہ ابواب میں جابجا حسبِ ضرورت، تفصیل سے کیا گیا ہے۔

خاندانی منصوبہ بندی:

سرسید کے خاندان کے دوسرے افراد کے تذکرے سے پہلے ہم قارئین کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کروانا چاہتے ہیں کہ سرسید کی چار پانچ نسلوں میں، کوئی بھی آدمی کثیر الاولاد نظر نہیں آتا ہے۔ سید ہادی (سرسید کے دادا) صرف دو بھائی تھے۔ سید محمد متقی خاں (والد سرسید) غالباً سید ہادی کے اکلوتے بیٹے تھے۔ سید محمد متقی خاں کے یہاں پانچ پانچ، چھ چھ سال کے وقفہ سے ایک بیٹی اور دو بیٹے پیدا ہوئے۔ (یعنی سرسید اور ان کے بڑے بھائی و بڑی بہن) خود سرسید کی شادی ۱۸۳۶ء میں ہوئی تھی لیکن تقریباً تیرہ سال تک ان کے یہاں کوئی اولاد پیدا نہ ہوئی۔ تیرہ سال بعد ۱۸۴۹ء اور ۱۸۵۰ء میں تقریباً ڈیڑھ

سال کے وقفہ سے دو بیٹے (یعنی سید حامد اور سید محمود) پیدا ہوئے اور اس کے سات یا آٹھ سال بعد ایک بیٹی (آمینہ بیگم) پیدا ہوئیں ۔ سر سید کے صاحبزادگان میں بھی سید حامد کے یہاں تقریباً ۲۰ سالہ شادی شدہ زندگی میں صرف ایک بیٹی (یعنی محمدی بیگم) پیدا ہوئی تھیں ۔ اسی طرح سید محمود کی پندرہ سالہ شادی شدہ زندگی میں صرف ایک صاحبزادے (یعنی سید راس مسعود) پیدا ہوئے تھے ۔ سید راس مسعود کے یہاں بھی پہلی شادی کے بعد تقریباً ۱۶ سال میں صرف دو بیٹے پیدا ہوئے تھے (یعنی سید انور مسعود اور سید اکبر مسعود) اسی طرح ان کی دوسری بیوی ۔ جن کے ساتھ سید راس مسعود نے (انتقال سے پہلے) تقریباً سات اٹھ سال کی ازدواجی زندگی بسر کی تھی ان سے بھی صرف ایک بیٹی (یعنی نادرہ بیگم) پیدا ہوئی تھیں ۔

اس طرح ہم دیکھ سکتے ہیں کہ سر سید کے دادا سے لے کر پر پوتوں تک یعنی چھ نسلوں میں کوئی بھی شخص کثیر الاولاد نظر نہیں آتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں خاندانی منصوبہ بندی کے سلسلے میں کوئی شعوری احساس یا آگاہی تو تھی نہیں ۔ نہ ہی خاندانی منصوبہ بندی کے وہ طریقے اس وقت رائج ہوئے ہوں گے جو آج کل رائج ہیں ۔ اسے کوئی موروثی (جنیٹک) میلان بھی قرار نہیں دیا جا سکتا ہے ۔ ایسی صورت میں یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ خاندانی منصوبہ بندی غالباً اس زمانے کے سماجی اور معاشرتی طور طریقوں کی دین تھی ۔ لیکن وہ کون سے سماجی اور معاشرتی طور طریقے تھے (یا کوئی اور اقدار اور روایات تھیں) جن کے نتیجے میں اس طرح کی ''خاندانی منصوبہ بندی'' ممکن ہو سکی تھی ۔ اس سلسلے میں تفصیلی تحقیق کی ضرورت ہے ۔ کیوں کہ یہ مخصوص میلان کسی ایک خاندان کے بجائے سماج کے مخصوص طبقہ میں (جن کے بارے میں اعداد و شمار موجود ہیں) عام نظر آتا ہے ۔

سید احمد خاں :

سید محمد متقی خاں کے چھوٹے صاحبزادے سید احمد خاں ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے ۔ ان کی تعلیم عہد وسطیٰ کی روایتی طرز پر مختلف اساتذہ کی نگرانی میں مکمل ہوئی ۔ ۱۸۳۶ء میں ازدواجی رشتہ میں بندھے ۔ ۱۸۳۸ء میں کمپنی کی ملازمت اختیار کی ۔ ۱۸۴۱ء میں منصفی کا امتحان پاس کیا اور عدلیہ کی ملازمت کی ابتدا کی ۔ اس سلسلے میں پہلے فتح پور سیکری اور بعد میں دہلی میں تعینات رہے ۔ اس عرصہ میں اپنے منصبی فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ تصنیف اور تالیف کے کام میں بھی مصروف رہے اور اہم تصنیفات مثلاً ''جامِ

جم'' ، '' انتخاب الاخوین'' اور'' آ ثارالصنادید'' وغیرہ شائع کیں۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے وقت سید احمد خاں بجنور میں صدر امین کے بطور تعینات تھے۔ باغی فوجیوں کے ہاتھوں بجنور میں ان کا گھر لوٹا گیا۔ ادھر انگریزی فوج کے دہلی پر دوبارہ غلبہ حاصل کر لینے کے بعد سید احمد خاں کے ماموں اور ماموں زاد بھائی کا قتل ہوا۔ دہلی کا گھر بھی لوٹ لیا گیا۔ سید احمد خاں اور ان کے خاندان کے دیگر افراد طرح طرح کی اذیتوں میں مبتلا رہے۔ غرض ۱۸۵۷ء سے پہلے کی سرسید کی زندگی کے مندرجہ بالا واقعات اور ۱۸۵۷ء کے دوران خود ان پر اور ان کے خاندان کے مختلف افراد پر جو مصائب گزریں ان کا حال مندرجہ ذیل صفحات میں درج کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سید احمد خاں کا سنہ پیدائش:

مولانا الطاف حسین حالی'' حیات جاوید'' کی ابتدا ہی ان الفاظ سے کرتے ہیں کہ:

'' سید احمد خاں ۵/ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۷/اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔''

جہاں تک سرسید کی تاریخ پیدائش کا سوال ہے سرسید کے صاحبزادے سید محمود نے اپنی تحریروں میں کم از کم ایک جگہ پر سرسید کی یہی'' تاریخ پیدائش'' درج کی ہے۔ لیکن ہمیں تعجب ہوا کہ اس کے باوجود سرسید کے پوتے سید راس مسعود کے ذریعہ شائع کیے گئے۔ '' خطوط سرسید'' کے دیباچہ میں جناب عبداللہ جان (وکیل سہارنپور) نے ۶/فروری ۱۹۲۲ء بمقام لدھیانہ تحریر کیا ہے کہ:

'' مارچ ۱۸۹۷ء کی ستائیسویں تاریخ تھی جب اس مربی قوم اور سرپرست ملک سرسید اعظم نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ (حالاں کہ سرسید کا انتقال ۱۸۹۸ء میں ہوا تھا) اپنی قوم کو خداوند کریم کے رحم پر چھوڑ کر اس دنیا سے دائمی رفاقت کی اور سفرِ آخرت کا راستہ اختیار کیا۔ اس وقت ان کی عمر اسی اکیاسی برس کی سمجھی جاتی تھی۔ اس حساب سے ان کی پیدائش پچھلی صدی کے آغاز میں ۱۸۲۰ء سے کچھ پہلے کی ہوگی''۔[۴۲]

عبداللہ جان صاحب کے لیے سرسید اجنبی نہیں تھے بلکہ وہ سرسید کے قریبی لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ اسی وجہ سے سید راس مسعود نے ان سے'' خطوط سرسید'' کا دیباچہ

لکھنے کی درخواست کی تھی۔ عبداللہ جان صاحب خود تحریر کرتے ہیں کہ:

"خود راقم کے پاس صاحب مکتوبات کے (یعنی سرسید کے) بہت خطوط سالہا سال تک متواتر آتے رہے ہیں اور حسرت آمیز تاسف سے اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان میں سے ایک پرچہ محفوظ نہیں ہے"۔ ۴۸

اتنے قریبی شخص کو سرسید کے انتقال کے ۲۴ سال بعد یہ علم نہیں تھا کہ سرسید کی تاریخ پیدائش ۱۷/۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء ہے۔ جب کہ حالی کی "حیات جاوید" ۱۹۰۱ء میں شائع ہوچکی تھی جس کی ابتدا ہی اس جملے سے ہوتی ہے کہ "سید احمد خاں ۱۷/۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔" اس امر کا بھی امکان کم ہے کہ سرسید کا کوئی شناسا شاذ ہی ایسا ہوگا جس نے اس زمانے میں حیات جاوید سے استفادہ نہ کیا ہو۔ اسی کے ساتھ سرسید کے پوتے سید راس مسعود جو "خطوط سرسید" کے مرتب تھے اور جن کے اصرار پر ہی عبداللہ جان صاحب نے یہ مقدمہ لکھا تھا۔ انھوں نے بھی اس سلسلے میں عبداللہ جان صاحب کی کچھ مدد نہ کی اور نہ ہی ان کی تصحیح فرمائی۔ (حالاں کہ عبداللہ جان صاحب نے سنہ پیدائش کے ساتھ وفات کا سنہ بھی غلط درج کیا تھا)۔ جہاں تک مختلف افراد کے سنہ پیدائش و سنہ وفات کا تعلق ہے بیشتر خاندانوں میں اس کا باقاعدہ ریکارڈ رکھنے کی روایت موجود تھی۔ ہوسکتا ہے ۱۸۵۷ء کی قتل و غارت گری میں خاندانوں کے یہ ریکارڈ ضائع ہوگئے ہوں۔ لیکن کسی مستند ریکارڈ کی غیر موجودگی میں اکثر بزرگوں کی "یادداشت" سے بھی کام چلایا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر سرسید اپنے خط بنام حکیم احمد الدین، مورخہ ۶ ستمبر ۱۸۸۴ء میں تحریر کرتے ہیں کہ:

"سب لوگوں سے تحقیقات کر کے لکھ بھیجو کہ ہمارے نانا صاحب کا کس تاریخ اور کس سنہ میں انتقال ہوا تھا اور یہ بھی دریافت کر کے لکھو کہ ہمارے والد کا کس سنہ و تاریخ میں انتقال ہوا تھا اس کی ضرورت ہے"۔ ۴۹

غالباً "سیرۃ فریدیہ" میں سرسید نے اپنے نانا اور والد کے سلسلے میں جو تاریخیں درج کی ہیں وہ اسی طرح کے یادداشتی مآخذ پر مبنی ہیں۔ حالی نے چوں کہ "سیرۃ فریدیہ" ہی سے سرسید کے بزرگوں کے سلسلے کی مختلف تاریخیں درج کی ہیں اس لیے ان کی صحت صرف اس حد تک ہے کہ سرسید نے خود ان تاریخوں کو اپنے متعلقین سے دریافت کر کے "سیرۃ

فریدیہ'' میں درج کیا تھا۔ اس لیے مجھے قطعی کوئی تعجب نہیں ہوگا اگر کل کوئی محقق یہ دعویٰ کرے کہ سرسید کا ''یوم پیدائش'' بھی ایک قیاسی تاریخ ہے جو سرسید نے اپنی ابتدائی نوکری کے لیے درخواست دیتے وقت یا اسی قسم کے کسی فارم کو بھرتے وقت اپنے اندازے سے ''تاریخ وسنہ پیدائش'' کے کالم میں درج کر دی تھی۔ حالاں کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ لیکن تحقیق کے نقطۂ نظر سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان تاریخوں کو (چاہیے وہ خود سرسید ہی نے کیوں نہ درج کی ہوں) مستند مان لینے کے باوجود جہاں تک ممکن ہو سکے مختلف حوالہ جات یا ان کی ''کراس ریفرینسینگ'' کے ذریعہ وقتاً فوقتاً صحیح کرتے رہنا چاہیے۔

سرسید کی ابتدائی تعلیم:

اس زمانہ کے رواج کے مطابق بسم اللہ کے بعد ایک اشراف گھرانے کی پردہ نشین استانی سے قرآن پڑھنے کے بعد مکتب کی پڑھائی شروع کی۔ ایک بزرگ مولوی حمیدالدین صاحب، جو ان کے نانا کے یہاں ملازم تھے، سے ابتدائی کتابیں، کریما، خالق باری، آمدنامہ وغیرہ پڑھیں۔ مولوی حمیدالدین کے انتقال کے بعد دوسرے لوگ پڑھانے پر مامور ہوئے جن سے انھوں نے فارسی میں گلستاں بوستاں اور ایسی ہی دو ایک اور کتابوں سے زیادہ نہ پڑھا۔ پھر عربی پڑھنی شروع کی۔ عربی میں شرح ملا، شرح تہذیب اور چند دوسری کتابوں کا درس لیا۔ اس کے بعد اپنے ماموں نواب زین العابدین خاں سے ریاضی کی تعلیم حاصل کی۔ اسی زمانے میں طب پڑھنے کا شوق ہوا۔ حکیم حیدر خاں سے، جو ایک خاندانی حکیم تھے، طب کی کتابیں پڑھیں اور چند ماہ تک ان کے پاس مطب بھی کیا۔ پھر پڑھنا چھوڑ دیا۔ حالاں کہ اس کے بعد بطور خود کتابوں کے مطالعہ کا برابر شوق رہا اور دہلی میں جو اہل علم اور فارسی دانی میں نام آور تھے، جیسے صہبائی، غالب، آزردہ، ان سے ملنے اور ان کی علمی مجلسوں میں شرکت کا اکثر موقع ملتا رہتا تھا۔ جس وقت سرسید نے پڑھنا موقوف کیا تھا اس وقت ان کی عمر اٹھارہ انیس سال کی تھی۔ (یعنی سنہ ۱۸۳۶ء۔۱۸۳۵ء کے آس پاس) اسی زمانے میں (یعنی ۱۸۳۶ء میں) ان کی شادی ہوئی تھی۔

سرسید کی شادی:

سنہ ۱۸۳۶ء میں سرسید کی شادی، اپنی خالہ زاد بہن، پارسا بیگم (عرف مبارک بیگم) سے ہوئی تھی۔ پارسا بیگم، سرسید کی سب سے چھوٹی خالہ، فخر النساء بیگم کی صاحبزادی

تھیں، فخر النساء بیگم، خواجہ نقیب الاولیا غلام علی کی بیوی تھیں۔[۵۰] فخر النساء بیگم نے بھی اپنی بڑی بہن (یعنی سرسید کی والدہ عزیز النساء بیگم) کی طرح، شادی کے بعد تہراہہ بہرم خاں میں، اپنے والد خواجہ فرید کی حویلی کے احاطہ میں، ایک مکان اپنی رہائش کے لیے تعمیر کروالیا تھا۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، فخر النساء بیگم کا یہ مکان ان کی بڑی بہن عزیز النساء بیگم کے مکان سے متصل تھا۔ یہاں ہم اپنے چند مفروضات کی وضاحت کرنے کی اجازت چاہیں گے۔ ہمارا مفروضہ ہے کہ سرسید کی بیوی، پارسا بیگم، اپنے والدین کی غالباً اکلوتی اولاد تھیں۔ کیوں کہ اول، تو ہم کو سرسید کی بیوی کے کسی بھائی یا بہن کا کوئی حوالہ کہیں دستیاب نہ ہوسکا۔ دوسرے ۱۸۵۷ء کے واقعات کے تذکرے سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ اس وقت فخر النسا بیگم (جو تقریباً نابینا تھیں) اپنی بڑی بہن (یعنی سرسید کی والدہ) اور اپنی بیٹی (یعنی سرسید کی بیوی) کے ساتھ ہی ان کے مکان میں رہائش پذیر تھیں۔ اس سے ہم نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ اس وقت تک وہ غالباً بیوہ ہو چکی تھیں اور چوں کہ وہ اپنی بیٹی کے گھر میں رہ رہی تھیں اس لیے غالباً ان کے کوئی بیٹا نہیں تھا کیوں کہ اگر کوئی بیٹا ہوتا تو غالباً وہ بیٹی کے بجائے اس کے ساتھ ہی رہتیں۔ دوسرے بعد کے ایک حوالہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کے مکانات سرسید کی والدہ مہر النسا بیگم اور ان کی بیوی پارسا بیگم کے نام تھے۔ جہاں تک والدہ سرسید، یعنی مہر النسا بیگم کا تعلق ہے ہمیں یہ معلوم ہے کہ انھوں نے اپنی رہائش کے لیے تہراہہ بہرم خاں میں خود مکان تعمیر کروایا تھا اس لیے وہ ان کی ملکیت ہوسکتا تھا۔ لیکن سرسید کی بیوی پارسا بیگم کو، اپنی والدہ فخر النساء بیگم کا مکان (ان کے انتقال کے بعد) وراثت میں ملا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ وراثت میں پورا مکان بیٹی کو اسی وقت مل سکتا تھا جب کہ کوئی اور وارث (خاص طور پر لڑکا) موجود نہ ہو۔ انہیں وجوہ کی بنا پر ہم نے یہ مفروضہ بنایا تھا کہ سرسید کی بیوی، پارسا بیگم، اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھیں یہ بات کہ دہلی کے مکانات سرسید کی والدہ اور بیوی کے نام تھے، اس کی شہادت ہم کو سرسید کے مندرجہ ذیل خط بنام حکیم احمد الدین، مورخہ ۱۴ ستمبر ۱۸۹۰ء سے فراہم ہوتی ہے۔

> ''بوا سے یہ بھی کہہ دو کہ سید محمود کا مستقل ارادہ ہے کہ جو زمین حویلی کے پاس اور منہدمہ دوکانیں پڑی ہیں وہاں ایک کمرہ وغیرہ مکانات اپنے آرام کے موافق بنوالیں تاکہ جب چاہیں وہاں آویں رہیں۔ لیکن انھوں نے صاف طور پر کہا کہ اگرچہ یہ مکان دراصل آپ کا

نہیں ہے۔ لیکن اس مکان کا قبالہ خرید آپ کی والدہ اور بیوی کے نام کا ہے یعنی موسومہ عزیز النسا بیگم و پارسا بیگم اور اس سبب سے جھگڑے کی چیز ہے اور میں نے اسی سبب سے کہ ایک جھگڑے کی چیز میں پڑنا بے فائدہ ہے۔ اب تک کچھ نہیں کیا۔ میں نے کہا کہ ہاں یہ بات سچ ہے مگر کوئی جھگڑا کرنے والا نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ گو اس وقت کوئی نہیں ہے۔ اگر آئندہ کوئی کرے تو کیا علاج ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر تم کو ایسا خیال ہے تو میں تمہارے نام اس مکان کی دستاویز جس طرح پختگی سے تم چاہو لکھ دوں، پھر کچھ اندیشہ نزاع باقی نہیں رہے گا۔ ابھی وہ اس بات کو سوچتے ہیں اگر ان کی رائے میں آ گیا اور منظور کیا تو میں دستاویز لکھ دوں گا اور وہ مکان بنالیں گے۔ غرض کہ بوا کو جو تردد تھا کہ سید محمود نے باوجود مصمم ارادہ کے کیوں اب تک مکان بنانے کا ارادہ نہیں کیا اس تحریر سے ان کو معلوم ہو جاوے گا کہ اس کا سبب یہ تھا''۔[۵۱]

سر سید کی ملازمت کی ابتدا:

سنہ ۱۸۳۸ء میں سر سید کے والد سید محمد متقی خاں کا انتقال اپنے آبائی شہر دہلی میں ہوا تھا۔ اس وقت سر سید کی عمر ۲۱ سال تھی۔ والد کے انتقال کے بعد انھوں نے قلعہ کی ملازمت کے بجائے گورنمنٹ انگریزی کی نوکری اختیار کرنے کا ارادہ کیا۔ اس ارادے میں کسی کے مانع ہونے کے بجائے سر سید کی انگریزوں سے مرعوبیت اور راہ و رسم کا دخل زیادہ تھا۔ سب سے پہلے انھوں نے انگریزی قوانین اور عدالت کی کارروائی سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت سر سید کے خالو، مولوی خلیل اللہ خاں، دہلی میں صدر امین تھے۔ (مولوی خلیل اللہ خاں سے سر سید کی منجھلی خالہ فاطمہ بیگم کی شادی ہوئی تھی) مولوی خلیل اللہ خاں نے اپنی کچہری میں سر سید کو کام سیکھنے کی اجازت دے دی اور سر سید نے بڑے انہماک اور تندہی سے وہاں کام سیکھنا شروع کر دیا۔ چند مہینوں کے اندر ہی خلیل اللہ خاں نے ان کو فوجداری کے خفیف مقدمات کا (جو فیصلہ کے لیے صدر امینی میں آتے تھے) اپنی کچہری میں سررشتہ دار مقرر کر دیا۔ سر سید کی انگریز افسران سے راہ و رسم اور واقفیت نوکری

حاصل کرنے کی 'تگ ودو' میں ان کے بہت کام آئی۔

مسٹر رابرٹ ہملٹن جوان دنوں جج کی حیثیت سے دہلی میں تعینات تھے۔ سرسید سے واقف ہی نہ تھے بلکہ ان کی نوکری کے لیے کوشاں تھے۔ جب مسٹر رابرٹ ہملٹن کا تبادلہ بحیثیت کمشنر آگرہ ہوگیا تو فروری ۱۸۳۹ء میں مسٹر رابرٹ ہملٹن نے سرسید کو آگرہ بلالیا اور کمشنر کے دفتر میں نائب منشی کی جگہ پر ان کا تقرر کردیا۔ یہ گویا سرسید کا ملازمت کے سلسلے کا پہلا باقاعدہ تقرر تھا۔

قیام آگرہ میں تصنیف وتالیف:

آگرہ کے دورِ قیام میں سرسید نے فارسی میں اپنی پہلی تاریخی کتاب ''جام جم'' تصنیف کی جو ۱۸۴۰ء میں آگرہ ہی سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کے بارے میں ہم مشہور تاریخ داں پروفیسر عرفان حبیب کی مندرجہ ذیل رائے قارئین کے سامنے پیش کرنا چاہیں گے۔

> ''ان کی اس پہلی تاریخی تصنیف ہی میں مغربی تاریخ نویسی کا اثر جھلکتا ہے۔ کیوں کہ 'جام جم' ایک روایتی تاریخی کتاب نہیں ہے۔ بلکہ ایک حوالہ کی کتاب ہے جس میں تیمور کے وقت سے لے کر ہندوستان کے بادشاہوں کے شجرے، پیدائش، تخت نشینی اور وفات کی تاریخیں اور القاب وغیرہ دیئے گئے ہیں۔ سید احمد خاں ۱۸۳۹ء میں آگرہ کمشنری میں نائب منشی کے عہدہ پر مقرر کیے گئے تھے اور تعجب کی بات نہیں کہ ''جام جم'' انھوں نے آگرہ کے کمشنر رابرٹ ہملٹن کی فرمائش پر لکھی ہو''۔ ۵۲

انتخاب الاخوین:

آگرہ ہی میں سرسید نے ''قوانین دیوانی متعلقہ منصفی'' کا خلاصہ اس غرض سے تیار کیا کہ وہ عہدہ منصفی ملنے کا ایک ذریعہ بن سکے۔ حالاں کہ اس خلاصہ کو کمشنر رابرٹ ہملٹن نے اپنی اس سفارش کے ساتھ کہ سید احمد خاں کو منصفی کے عہدے پر فائز کیا جاسکتا ہے، گورنمنٹ میں بھیج دیا تھا۔ لیکن اس وقت تک عہدہ منصفی کے لیے قواعدِ امتحان جاری ہوگئے تھے۔ اسی لیے سرسید نے خود بھی منصفی کے امتحان کی تیاری شروع کی اور اپنے بڑے بھائی

سید محمد خاں اور ماموں زاد بھائی ہاشم علی خاں کو بھی امتحان دینے کے لیے آمادہ کیا۔ سرسید اور ہاشم علی خاں نے پہلی بار ہی میں امتحان پاس کرلیا۔ لیکن سید محمد خاں دوسرے سال امتحان میں کامیاب ہوئے۔ امتحان کے بعد سرسید نے "خلاصہ قوانین دیوانی متعلقہ منصفی" کو "انتخاب الاخوین" کے نام سے شائع کیا اور اپنے ساتھ اپنے بڑے بھائی سید محمد خاں کا نام بھی اس میں شامل کرلیا۔ سرسید کا یہ خلاصہ قوانین آئندہ کئی برسوں تک منصفی کے امتحان میں بیٹھنے والے امیدواروں میں بہت مقبول ہوا تھا اور امتحان پاس کرنے کے لیے کافی کارآمد سمجھا جاتا تھا۔

منصف کے بطور پہلا تقرر:

۱۸۴۱ء میں سرسید نے منصفی کا امتحان پاس کرلیا تھا۔ دسمبر ۱۸۴۱ء میں مین پوری کی منصفی خالی ہوئی۔ جس پر بطور منصف سرسید کا پہلا تقرر ۲۴/دسمبر ۱۸۴۱ء کو کر دیا گیا۔ یہاں ان کا قیام صرف دو ہفتے ہی رہا۔ ۱۵/جنوری ۱۸۴۲ء کو انہیں مین پوری سے تبدیل کر کے فتح پور سیکری بھیج دیا گیا۔

فتح پور سیکری میں قیام:

مین پوری میں تقرر کے چند روز بعد ہی سرسید کا تبادلہ فتح پور سیکری کر دیا گیا تھا۔ غالباً اس تبادلے کے پیچھے سرسید کی ایما اور آگرہ کے کمشنر رابرٹ ہملٹن کا ہاتھ نظر آتا ہے اور یہ اس بات کی شہادت فراہم کرتا ہے کہ سرسید کے انگریز افسران ان کے کام کرنے کی صلاحیت سے کس قدر مطمئن رہا کرتے تھے۔ منصف کی حیثیت سے فتح پور سیکری میں سرسید کا قیام چار سال تک رہا۔

دہلی میں تقرر:

۱۸/فروری ۱۸۴۶ء کو سرسید کا فتح پور سیکری سے دہلی تبادلہ ہوگیا۔ دراصل دسمبر ۱۸۴۵ء میں سرسید کے بڑے بھائی سید محمد خاں کا انتقال ہوگیا تھا۔ اس لیے والدہ اور مرحوم بھائی کے بیوی بچوں کی کفالت کی ذمہ داری بھی اب ان کے ذمہ آ گئی تھی اس لیے انھوں نے خود درخواست دے کر اپنا تبادلہ دہلی کروالیا تھا۔ ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۴ء تک (جب تک کہ وہ مستقل صدر امین مقرر نہ ہوگئے) وہ دہلی ہی میں رہے۔ حالاں کہ اس آٹھ سال کے عرصہ میں دو دفعہ یعنی ایک بار ۱۸۵۰ء اور دوسری بار ۱۸۵۳ء میں تھوڑے تھوڑے عرصے کے

لیے قائم مقام صدر امین مقرر ہو کر رہتک جانے کا اتفاق ضرور ہوا تھا۔

آثار الصنادید کی تصنیف:

۱۸۴۶ء میں دہلی آنے کے بعد سر سید نے ''آثار الصنادید'' کی تصنیف کے سلسلے کا کام شروع کیا۔ حالی کا خیال ہے کہ ''خرچ کی تنگی کو رفع کرنے کے خیال سے انھوں نے آثار الصنادید کا کام شروع کیا تھا''۔[۵۳] حالاں کہ ہماری نظر میں یہ مفروضہ بحث طلب ہے۔ کیوں کہ اول تو ''خرچ کی تنگی تھی'' کی وضاحت کرنی پڑے گی۔ دوسرے یہ بات بھی وضاحت طلب ہے کہ اس زمانہ میں کوئی کتاب مزید آمدنی کا ذریعہ بن سکتی تھی۔

بہر حال ''آثار الصنادید'' لکھنے کی وجہ کچھ بھی رہی ہو لیکن اس تخلیقی تحریک کے پس پردہ فتح پور سیکری میں گزارے ہوئے چار سال کے عرصے کا ہاتھ ضرور کارفرما ہوگا۔ فتح پور سیکری میں بقول حالی:

> ''جہاں اکبر کی خواب گاہ تھی حسنِ اتفاق سے وہی عالیشان مکان سر سید کو رہنے کے لیے ملا تھا۔ یہ چاروں برس اسی مکان میں گزرے''۔[۵۴]

سر سید فتح پور سیکری میں اکبر کی بنوائی ہوئی انڈو پرشین طرز کے مخلوط فنِ تعمیر کی حامل خوبصورت عمارتوں کے جمالیاتی حسن، متناسب جاذبیت، بامقصد کشادگی اور اعلیٰ (رائج الوقت) تیکنیکوں، نیز سنگِ سرخ کے خوش نما استعمال سے ضرور متاثر ہوئے ہوں گے۔ (مدرسۃ العلوم کی عمارتوں کے (مخلوط) مغل فنِ تعمیر میں بعض نمایاں راجستھانی عناصر اس تاثر کی تصدیق کرتے ہیں) اور اسی تاثر نے سر سید کا دھیان دہلی میں موجود تاریخی عمارتوں کی طرف مبذول کروایا ہوگا۔ لیکن عام طور پر یہی خیال کیا جاتا ہے کہ (اس وقت دہلی کے جج) مسٹر ایڈورڈ تھامس کی ایما اور ہمت افزائی سے سر سید نے آثار الصنادید کی تصنیف کا کام شروع کیا تھا۔ ڈیڑھ سال کے اندر اس کتاب کی تصنیف مکمل ہوگئی تھی اور اس طرح ۱۸۴۷ء میں اس کا پہلا ایڈیشن دہلی سے شائع ہوا تھا۔ سر سید کی تصنیف کردہ کتابوں میں ''آثار الصنادید'' کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اس کتاب کے سر سید کی زندگی ہی میں تین ایڈیشن شائع ہو چکے تھے۔ ساتھ ہی اس کا ترجمہ فرانس کے گارسن دتاسی نے ۱۸۶۱ء۔۱۸۶۰ء میں فرانسیسی زبان میں شائع کیا تھا۔ غالباً گارسن دتاسی کے فرانسیسی ترجمے کے رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں پہنچنے کے بعد ہی سر سید کو ۴ر جولائی ۱۸۶۴ء کو رائل

ایشیاٹک سوسائٹی کا اعزازی فیلو منتخب کر لیا گیا تھا۔

پروفیسر عرفان حبیب نے اپنے ایک حالیہ مضمون میں آثار الصنادید پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

''آثار الصنادید میں مغربی انداز کے آثارِ قدیمہ سے دلچسپی کارفرما نظر آتی ہے''۔۵۵

اس زمرہ میں وہ آگے تحریر کرتے ہیں کہ:

''اپنی نوعیت کی یہ اتنی اہم تصنیف تھی کہ نہ صرف سید احمد خاں کی زندگی میں اس کے تین اڈیشن شائع ہوئے (دوسرا ایڈیشن دہلی ۱۸۵۴ء۔۱۸۵۳ء اور تیسرا لکھنؤ ۱۸۷۶ء) بلکہ اس کا ترجمہ فرانس کے مشہور مستشرق، گارسن دتاسی نے ۱۸۶۱ء۔۱۸۶۰ء میں فرانسیسی میں شائع کیا''۔۵۶

سرسید کی مغربی انداز کی آثارِ قدیمہ میں جو دلچسپی ''آثار الصنادید'' کے ساتھ شروع ہوئی تھی وہ آخیر وقت تک قائم رہی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی میں ایک بڑا ذخیرہ آثارِ قدیمہ سے متعلق نادرات کا جمع کر لیا تھا۔ جو آج بھی ''سرسید کلیکشن'' کے نام سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے آرکیالوجیکل سیکشن میں موجود ہے۔

بجنور میں صدر امینی پر تقرر:

دہلی کے جج مسٹر اڈورڈ تھامس کی سفارش پر ۱۳؍جنوری ۱۸۵۵ء کو سرسید کا مستقل صدر امین مقرر کر کے دہلی سے بجنور تبادلہ کر دیا گیا۔ بجنور میں ۱۸۵۷ء سے پہلے دو سال تک وہ اپنے منصبی فرائض کو انجام دینے کے ساتھ تصنیف اور تالیف کے کاموں میں مصروف رہے۔ اور جہاں ایک طرف ضلع بجنور کی تاریخ مرتب کی وہیں دوسری طرف ابوالفضل کی تصنیف ''آئین اکبری'' کی تین جلدوں میں سے دو جلدوں (یعنی اول اور سوم) کو ۱۸۵۵ء میں مع تصویروں کے (جن میں سے اکثر انھوں نے خود بنوائی تھیں) شائع کیا۔ اسی کے ساتھ ''تاریخ ضلع بجنور'' تصنیف کی۔ ''تاریخ ضلع بجنور'' کے سلسلے میں حالی لکھتے ہیں کہ: ''مسٹر شیکسپیئر کلکٹر ضلع بجنور کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخِ ضلع بجنور کا مسودہ کلکٹر نے ملاحظہ کے لیے صدر بورڈ میں بھیج دیا تھا۔ ابھی وہ وہاں سے واپس نہ آیا تھا کہ غدر ہو گیا اور آگرہ میں تمام دفاتر سرکاری کے ساتھ وہ بھی ضائع ہو گیا''۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے وقت سرسید بجنور ہی میں صدر امین کے بطور تعینات تھے۔ اس وقت ان کے بیوی بچے دہلی میں اپنی دادی، پھوپھی اور چچی وغیرہ کے ساتھ رہ رہے تھے۔ بجنور میں سرسید کے ساتھ ان کے بھتیجے سید محمد احمد خاں رہتے تھے۔ اس وقت سید محمد احمد خاں کی عمر تقریباً ۱۴ سال کی تھی حالی کے مندرجہ ذیل بیان سے بھی اس کی شہادت ملتی ہے۔

> "سرسید کو جب یہ معلوم ہوا کہ کچھ تلنگے اور صوبہ دار بہ ارادہ فساد کلکٹر کی کوٹھی پر گئے ہیں۔ سرسید اسی وقت مسلح ہو کر کوٹھی کو روانہ ہو گئے اور اپنے صغیر سن بھتیجے (نوٹ یعنی سید محمد احمد خاں، سب جج، سیتاپور، حال، پینشنر) کو جو تنہا چچا کے پاس تھا۔ چلتے وقت اپنے آدمی کے سپرد کر گئے اور کہہ گئے کہ اگر میں مارا جاؤں تو لڑکے کو کسی امن کی جگہ پر پہنچا دیجیو"۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت:

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے وقت سرسید بجنور میں صدر امین کے بطور تعینات تھے۔ ۱۰ رمئی ۱۸۵۷ء کو بغاوت ہوئی۔ باغی سپاہیوں نے ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو دہلی پر قبضہ کر لیا اور بہادر شاہ ظفر کو ملک کا بادشاہ تصور کرتے ہوئے ملک کے نظم و نسق کا ذمہ دار بنایا۔

۱۸۵۷ء کے دوران دہلی کے حالات:

دہلی میں باغیوں کی فوج کے غلبہ کے بعد کس طرح کا ماحول تھا۔ اس کی ایک عمدہ تصویر ہم کو اقبال حسین کی تصنیف "دی ریبل ایڈمنسٹریشن آف دہلی"[۵۷] سے فراہم ہوتی ہے۔ جس کی بنیاد پر ذیل میں درج دہلی کے حالات کا جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

انگریزوں کی عملداری کے یکا یک ختم ہو جانے سے چورا چکوں اور دوسرے سماج دشمن عناصر نے باغی سپاہیوں کے نام پر لوٹ مار شروع کر دی تھی۔ کچھ باغی سپاہی بھی، جوہریوں، بنیوں اور دوسرے سیٹھ ساہوکاروں اور چھوٹے دکانداروں کو لوٹنے میں شامل ہو گئے تھے۔ لوگوں نے گھبرا کر بادشاہ سے تحفظ مہیا کرانے کی درخواست کی۔ لیکن حالات اتنی تیزی سے بگڑے تھے اور اتنے وسیع پیمانے پر لوٹ مار کا بازار گرم ہوا تھا کہ بادشاہ کے پاس نہ تو اتنی طاقت تھی نہ ہی اتنے وسائل تھے کہ اس بڑھتی ہوئی لاقانونیت پر کسی طرح قابو پاسکتے۔ ۱۲ رمئی تک حالات اتنے بگڑ چکے تھے کہ ہر آدمی پریشان نظر آتا تھا۔ بادشاہ نے ذی

اقتدار لوگوں سے صلاح مشورہ کیا۔ خود شہر کا دورہ کر کے لوگوں میں اعتماد پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی سعی کارگر نہ ہو سکی۔ ساتھ ہی دہلی اور میرٹھ کے باغی سپاہیوں میں مالِ غنیمت کے بٹوارے پر تنازعہ کھڑا ہو گیا۔ چار پانچ روز تک لوٹ مار اور افراتفری کا بازار اسی طرح گرم رہا، بادشاہ اپنے کو بالکل بے دست و پا محسوس کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ قلعہ میں بھی ایک مقامی پیدل فوج کی ٹکڑی نے قبضہ کر کے اپنے پہرے دار متعین کر دیئے تھے۔

اس سلسلے میں آغا مرزا بیگ (سرور جنگ) اپنی آپ بیتی میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''پوربیوں کا (باغی سپاہ کے لیے پوربیہ کا لقب مستعمل تھا) یہ حال تھا کہ ہر فرد اپنے تیں خود مختار بلکہ بادشاہ سمجھتا تھا۔ حتی کہ ابوظفر محمد بہادر شاہ سے بھی گستاخیاں کرتے تھے اور علانیہ کہتے تھے کہ: ''بادساہ وادسا کہوں کا۔ جس کے مونٹر پر ہم منڈا رکھ دیں۔ تون ہو، بادسا، ہوئے''۔[۵۸]

بادشاہ نے شہر کے انتظام کو ٹھیک کرنے کی خاطر فوج کی بھرتی کے احکام جاری کیے۔ شہزادوں کو انتظامی امور میں شامل کرنے کی غرض سے ان کو مختلف ذمہ داریاں نبھانے کے لیے مختلف عہدوں پر مامور کیا گیا، لیکن کسی شہزادے میں انتظام کو درست کرنے کی صلاحیت موجود نہیں تھی۔ نتیجے میں خود ان کے درمیان ایک دوسرے کو زک پہنچانے کے لیے ساز باز اور سازشوں کا دور شروع ہو گیا جس کی وجہ سے حالات اور ابتر ہو گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ باغیوں نے بادشاہ کے ذاتی دفتر پر قبضہ کر کے اپنے آدمیوں کو بادشاہ کے دفتر کے عملے میں متعین کر دیا اور دیوانِ خاص پر اپنے پہرے دار بٹھا دیئے۔ اس تمام کارروائی میں بھی شہزادوں کی آپسی رنجش اور سازشیں شامل حال تھیں۔ نقلی سونے اور چاندی کے سکوں کی بازار میں بھرمار تھی۔ روپے کی قیمت تشویش ناک حد تک گر گئی تھی۔ جس کی وجہ سے باغی سپاہیوں نے اپنے خسارے کو پورا کرنے کے لیے بڑے پیمانے پر عام آدمیوں کو لوٹنا کھسوٹنا شروع کر دیا تھا۔ سوائے چند صاحب حیثیت لوگوں کے جو شہزادوں یا دوسرے افسروں کو رشوت دینے کی سکت رکھتے تھے، ان کے علاوہ کوئی بھی آدمی اس لوٹ کھسوٹ سے محفوظ نہیں تھا۔ تقریباً ۲۰، ۲۵ روز تک سماج میں نظم و نسق کا کوئی شائبہ بھی موجود نہیں تھا۔ اشیا خوردنی کی قیمتیں آسمان کو چھونے لگی تھیں۔ نیز ہر چیز عنقا تھی۔

اس عرصے میں بقرعید کے موقع پر گائے کی قربانی کا تنازعہ کھڑا ہو گیا۔ باغی

سپاہیوں میں موجود ہندو سپاہی گائے کی قربانی کے خلاف تھے۔ جس کی وجہ سے فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھنے لگی۔ شہر کے باہر چار قصابوں کا قتل بھی کر دیا گیا تھا۔ بادشاہ نے اس فتنہ کو دبانے کے لیے گائے کی قربانی کو ممنوع قرار دیتے ہوئے ایک فرمان جاری کیا۔ جس کو مسلمانوں نے اپنے مذہبی معاملات میں مداخلت کے مترادف قرار دیتے ہوئے جہاد کا فتویٰ جاری کر دیا۔ بہر حال بادشاہ کو چند علما کی مدد سے بدقت اس مسئلے کو نبٹانا پڑا اور جہادیوں نے اپنا فتویٰ واپس لے لیا۔ لیکن اس فرقہ وارانہ کشیدگی کی وجہ سے شہر کے حالات اور زیادہ مکدر ہو گئے تھے۔

جولائی میں بادشاہ نے شہری نظم ونسق اور محکمہ مال سے متعلق کل اختیارات بخت خاں کے سپرد کر دیئے۔ ان کو انگریزوں کے مورچوں کے خلاف لڑائی لڑنے اور قلعہ سے پیدل اور سوار افواج کو منتقل کرنے کے ساتھ ساتھ شہر میں لوٹ مار کو سختی سے روکنے، نئے اور پرانے خدام کی تنخواہوں کا انتظام کرنے، ٹیکس وصول کرنے اور شہر کے باہر لوٹ مار کو روکنے کے لیے چوکیاں قائم کرنے کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کو سخت سے سخت سزائیں دینے کے احکام دیئے گئے تھے جو سپاہیوں کے بھیس میں عام لوگوں کے گھروں میں گھس کر لوٹ مار کیا کرتے تھے۔ بخت خاں اپنے تجربے اور لیاقت کے باوجود شہزادوں کی سازشوں کے چلتے فوج میں نظم ونسق قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ بلکہ مرزا مغل، کے جنرل، سدھاری سنگھ سے بخت خاں کے اختلافات ہونے کی وجہ سے فوج بھی دو گروہوں میں بٹ گئی تھی۔

ان سب حالات کو دیکھتے ہوئے اس بات سے کوئی تعجب نہیں ہوتا ہے کہ اس لاقانونیت اور افراتفری سے تنگ آ کر دہلی کے باکثرت شہری انگریزوں کے نہ صرف حمایتی ہو گئے تھے بلکہ ان کے خیر خواہ اور ہمدرد بن گئے تھے اور ان کے لیے جاسوسی کرتے تھے تا کہ انگریزوں کا دہلی پر دوبارہ قبضہ کرنے کا راستہ صاف ہو سکے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ستمبر میں انگریزوں کی فوج کشمیری گیٹ کو فتح کرنے کے بعد دہلی پر دوبارہ قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

۱۸۵۷ء میں بجنور کے حالات:

جس طرح کے حالات دہلی میں تھے اسی طرح کی لاقانونیت اور مطلق العنانی چھوٹے شہروں اور قصبوں میں بھی پھیلی ہوئی تھی۔ ۱۰ ر مئی کو دہلی میں باغیوں کے قبضہ کر لینے کی خبر ۱۲ ر مئی کو بجنور پہنچی۔ سرسید اس وقت بجنور میں موجود تھے۔ جہاں نواب محمود خاں کی

سربراہی میں علم بغاوت بلند کیا گیا تھا۔ مسٹر شیکسپیئر اس زمانے میں بجنور کے کلکٹر تھے۔ ان کے گھر پر بجنور میں موجود سب ہی انگریز افراد جمع ہو گئے تھے۔ جن کی کل تعداد بیس پچیس کے قریب تھی جن میں زیادہ تر عورتیں اور بچے تھے۔ وہ حفاظتی دستہ جوان کی حفاظت کے لیے تعینات تھا۔ ان کی نیتیں بھی بگڑ گئی تھیں۔ ساتھ ہی باغیوں کی افواج کمک کے بطور عنقریب مراد آباد سے بجنور پہنچنے والی تھی اور کوئی صورت ان انگریز مردوں، عورتوں اور بچوں کے تحفظ کی کارگر ہوتی نظر نہیں آتی تھی۔ سب کو یقین تھا کہ باغی افواج کے بجنور پہنچنے کے بعد ان سب کو قتل کر دیا جائے گا۔ ایسے موقع پر سرسید نے نواب محمود خاں سے جو باغیوں کی پیشوائی کر رہے تھے مذاکرات کا سلسلہ شروع کیا اور نواب محمود خاں کو اس بات پر قائل کرنا چاہا کہ: ''انگریزوں کے مار ڈالنے سے انہیں کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ اس لیے ان کی جان بخش دیں اور انہیں یہاں سے صحیح و سالم نکل جانے دیں اور اس کے عوض اس خطہ کی حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لیں''۔ سرسید نے کچھ اس طرح سے نواب محمود خاں سے گفتگو کی کہ وہ قائل ہو گئے اور سب انگریزوں کو اسی رات اُس جگہ سے نکال کر روڑکی، روانہ کر دیا گیا اور بجنور پر نواب محمود خاں کا قبضہ ہو گیا۔ سرسید اور میر تراب علی (جو اس زمانے میں بجنور میں تحصیل دار تھے) اسی رات کو بجنور سے چھ سات کوس دور بستی کوٹلہ چلے گئے۔ مگر نواب محمود خاں نے سوار بھیج کر ان کو وہاں سے واپس بجنور بلا لیا اور کہا کہ بدستور بجنور میں اپنا اپنا کام کرتے رہو۔ سرسید نے حسب معمول، دیوانی کا کام کرنا شروع کر دیا۔ محمود خاں نے دوبارہ ایک رات سرسید کو بلایا اور کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ تم ہمارے ساتھ شریک ہو جاؤ اور ہم سے اس بات پر حلف کر لو۔ سرسید نے خاصے تامل کے بعد نواب صاحب سے کہا کہ:

> ''میں اس بات پر بلاشبہ حلف کر سکتا ہوں کہ میں ہر حال میں آپ کا خیر خواہ رہوں گا اور کسی وقت آپ کی بدخواہی نہ کروں گا۔ لیکن اگر آپ کا ارادہ ملک گیری کا اور انگریزوں سے مقابلہ کرنے کا ہے تو میں آپ کے ساتھ اس میں شریک نہیں ہو سکوں گا''۔

سرسید نواب محمود خاں کو آخیر وقت تک یہ ہی سمجھاتے رہے کہ انگریزوں سے مقابلہ کرنے کا ارادہ دل سے نکال دیں۔ انگریزوں کی عمل داری ہرگز نہیں جانے کی۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ تمام ہندوستان سے انگریز چلے جائیں گے تو بھی انگریزوں کے سوا

ہندوستان میں کوئی عمل داری نہ کر سکے گا۔ آپ سرکار کی اطاعت کو ہاتھ سے نہ دیں۔ اگر بالفرض انگریز جاتے رہے تو آپ نواب بنے بنائے ہیں۔ آپ کی نوابی کوئی نہیں چھین سکتا اور اگر میرا خیال صحیح ہے تو آپ خیر خواہِ سرکار بھی بنے رہیں گے اور سرکار آپ کی نہایت قدر کرے گی۔

سر سید۔ دورانِ بغاوت:

سر سید جس طرح کے مشورے نواب محمود خاں کو دے رہے تھے غالباً دورانِ بغاوت خود بھی انہیں پر عمل پیرا تھے۔ دراصل بغاوت اتنی اچانک اور اتنے بڑے پیمانے پر ہوئی تھی کہ سر سید ہی کیا خود انگریز بھی ششدر رہ گئے تھے۔ صرف کمی تھی تو تنظیم کی۔ (ورنہ یہ بغاوت کے بجائے ملک کی آزادی کا پیش خیمہ بن جاتی) بڑھتی افراتفری، لاقانونیت اور مطلق العنانی نے ہر ایک کو بے دست و پا کر دیا تھا۔ ظاہر ہے ان حالات میں اعتدال کا راستہ وہی تھا جس کی صلاح سر سید نے نواب محمود خاں کو دی تھی اور جس پر وہ خود بھی، دورانِ بغاوت عمل پیرا رہے تھے۔

بجنور میں مسٹر شیکسپیئر کے گھر میں جمع انگریز، مرد، عورتوں اور بچوں کی جان بچانے کے علاوہ (جو ایک نہایت قابل تعریف انسانی ہمدردی کا کام تھا) سر سید کا بغاوت کے دوران کوئی دوسرا عملی کارنامہ نظر نہیں آتا ہے۔ ہم تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ اگر سر سید باغیوں کی صفوں میں شامل نہ ہوئے تو عملی طور پر وہ انگریزوں کی صفوں میں بھی کھڑے نظر نہیں آتے ہیں۔ دورانِ بغاوت (حالات سے متعلق) انگریز افسروں کو چند رپورٹیں بھیجنے کے علاوہ وہ مسلسل تین مہینوں تک میرٹھ میں بیمار پڑے رہے تھے۔ (یہ بیماری کس حد تک حالات کی مجبوری کی وجہ سے تھی اس کا اندازہ لگانا کوئی مشکل کام نہیں ہے)

بغاوت کے شروع ہونے کے تقریباً ایک مہینہ تک وہ بجنور ہی میں رہے۔ جس کے بعد انھوں نے بجنور سے نکل کر میرٹھ میں پناہ لینے کا ارادہ کیا۔ بجنور سے میرٹھ تک کے اس سفر میں ان کو کئی جگہوں پر باغی افواج کے ہاتھوں قتل کیے جانے کے امکان پیدا ہو گئے تھے غرض وہ کسی طرح پچھراؤں پہنچے جہاں کچھ روز مولوی محمود عالم اور مولوی مظہر اللہ صاحب کے پاس قیام کیا اور علالت کے سبب (یا حالات کی نزاکت کے تحت) بالکل خاموشی اختیار کر لی اور کچھ روز بعد پچھراؤں سے میرٹھ منتقل ہو گئے۔ اس تمام عرصہ میں سید محمد احمد

خاں (سرسید کے صغیر سن بھتیجے) ان کے ساتھ رہے ہوں گے کیوں کہ وہ بجنور میں بغاوت شروع ہونے کے وقت سرسید کے ساتھ ہی رہ رہے تھے۔

بچھراؤں میں سرسید کا قیام:

بچھراؤں میں سرسید نے مولوی محمود عالم اور مولوی مظہر اللہ صاحب کے پاس چند روز قیام کیا تھا۔ مولوی مظہر اللہ صاحب انگریزی عمل داری میں نہایت مخلص اور وفادار کارکن مانے جاتے تھے۔ کلکٹر مسٹر شیکسپیئر ان کے مداحوں میں تھے۔ بغاوت کے ناکامیاب ہونے کے بعد اُن پر نواب محمود خاں (جن کو انگریزوں نے خطرناک باغی قرار دے کر زندہ یا مردہ پکڑنے والے کو بڑے بڑے انعاموں سے نوازنے کا اشتہار دے رکھا تھا) کو دو رات اور ایک دن پناہ دینے کا الزام تھا۔ جس کی پاداشت میں ان کو موت کی سزا ہونے کا قطعی امکان تھا۔ جب کلکٹر شیکسپیئر کو اتفاقاً اس واقعہ کا علم ہوا تو انھوں نے مظہر اللہ خاں سے باز پرس کی۔ مظہر اللہ خاں نے ان کے سامنے اپنے جرم کا اقرار کرتے ہوئے کہا کہ گو میری ہمدردیاں نواب محمود خاں کے ساتھ نہیں تھیں پھر بھی جب مصیبت کے وقت انھوں نے میری پناہ چاہی تو میں مروتاً و اخلاقاً انکار نہ کر سکا اور اس عمل کے لیے ہر سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔ بہر حال مسٹر شیکسپیئر نے ان سے وعدہ لیا کہ آئندہ ان سے اس قسم کی غلطی سرزد نہیں ہوگی اور اس طرح مسٹر شیکسپیئر کی ذاتی مداخلت کے سبب مظہر اللہ خاں صاحب کی گلوخلاصی ہو سکی۔

اس واقعہ سے یہی واضح کرنا مقصود تھا کہ انگریزوں سے وفاداری کے باوجود بہت سے اشخاص ایسے معاملات میں ملزم قرار دیئے گئے تھے جو نادانستہ طور پر ان سے سرزد ہوئے تھے اور ان کی پاداشت میں انہیں پھانسی پر چڑھا دیا گیا تھا۔ سرسید چند روز بچھراؤں میں رہنے کے بعد میرٹھ منتقل ہو گئے تھے۔

میرٹھ میں قیام:

میرٹھ میں سرسید کا قیام منشی الطاف حسین صاحب کے گھر پر رہا تھا، بعد میں جب دہلی پر دوبارہ انگریزوں کا قبضہ ہونے کے بعد سرسید کے بیوی بچے نیز دوسرے رشتہ دار میرٹھ پہنچے تو غالباً منشی الطاف حسین صاحب نے سرسید کے رہنے کے لیے ایک علیحدہ مکان خالی کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں سرسید لکھتے ہیں کہ:

"منشی الطاف حسین سررشتہ دار کمشنری میرٹھ نے جو میرے ساتھ

بچپن سے کھیلے تھے اور ان کے خاندان اور میرے خاندان سے ارتباط قدیمی تھا۔ میرے رہنے کو ایک مکان خالی کر دیا۔ میں ہمیشہ ان کے اس احسان کو یاد رکھتا ہوں''۔ ۵۹

غرض سرسید میرٹھ پہنچنے کے بعد (بہ ظاہرہ بہ سبب علالت) تقریباً تین مہینے تک گوشہ نشینی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ملک میں رائج لاقانونیت اور مطلق العنانی کے سبب وہ اپنے آپ کو بالکل ہی بے دست و پا محسوس کر رہے تھے اسی لیے ان کے پاس خاموش رہ کر حالات کا جائزہ لینے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔

دہلی پر انگریزوں کا قبضہ:

بقول آغا مرزا۔ ''۱۸۵۷ء میں شہر میں باغی اور پہاڑی پر انگریز تخمیناً چھ ماہ تک لڑتے رہے۔''

غرض ۱۴ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو انگریزی افواج کشمیری گیٹ کو فتح کر کے شہر کے اندر داخل ہو گئیں اور ایک بار پھر شہر میں کہرام مچ گیا۔ لوگ جان بچانے کے لیے ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ اس وقت کے حالات کا اندازہ ہم آغا مرزا احمد بیگ کے مندرجہ ذیل اقتباس سے لگا سکتے ہیں۔ جو اس وقت دہلی دروازے کے قریب واقع اپنے مکان میں موجود تھے۔

> ''شہر میں قیامت برپا ہو گئی۔ ہر گلی کوچہ میں دست بدست لڑائی شروع ہو گئی۔ راستے سب بند ہو گئے گورے اور خاکی اور افغان ہر قسم کے ہتھیار باندھے فتح کے نشہ میں سرشار لوٹ پر ٹوٹ پڑے۔ زن و بچہ، ضعیف و جوان میں فرق نہ کرتے تھے۔ خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ زنانوں میں گھس گھس کر غارت گری شروع کر دی۔ بیبیاں اپنے گھر چھوڑ کر اپنے مردوں کے حالات سے بے خبر جدھر منہ اٹھا بھاگ رہی تھیں۔ ہمارے مکان سے شہر کا دروازہ قریب تھا۔ والد مرحوم اور محمد ابراہیم خاں مع ہم سب اہل و عیال و ملازمین، افتاں و خیزاں، شہر کے باہر نکل گئے اور حضرت سید حسن رسول نما رحمۃ اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں پہنچ کر وہاں کے کھنڈروں میں پناہ گزیں ہوئے۔ یہاں رحیم بخش اور غلام رسول، دو قدیم ملازمین بھی ہتھیار بستہ پہنچ گئے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ عین دار و گیر کے دن بڑے ابا اور نواب ضیاء الدولہ مع اعزا و ملازمین

مسلح گھر سے نکلے۔ ان کا چوک میں کانے مٹکاف سے مقابلہ ہوگیا وہیں
سب مرد شہید ہوئے عورتوں اور بچوں کا حال معلوم نہیں کدھر گئے"۔۶۰

غرض شہر میں کہرام تھا۔ ہر شخص اپنی جان بچانے کے لیے ادھر ادھر بھاگ رہا تھا، لوگ گھر بار چھوڑ چھوڑ کر محفوظ جگہوں کی تلاش میں ویرانوں کا رخ کر رہے تھے۔ غالباً سرسید کے عزیز و اقارب بھی محفوظ جگہوں کی تلاش میں اپنے گھر سے نکل گئے تھے۔ لیکن سرسید کی والدہ اور ان کی چھوٹی بہن فخر النساء بیگم (جو سرسید کی خوش دامن بھی تھیں، نابینا ہو گئی تھیں اور اپنی بڑی بہن اور بیٹی کے ساتھ ہی رہتی تھیں) گھر چھوڑ کر کہیں جانے کو تیار نہ ہوئیں اور بدستور گھر ہی میں رہتی رہیں۔ (لیکن بعد میں جب ان کا گھر لوٹا گیا تو انھوں نے جلوخانہ کی ایک کوٹھری میں چھپ کر اپنی جان بچائی۔)

سرسید کی بڑی بہن عجبۃ النساء بیگم اور ان کے اعزّہ نے برف خانے میں پناہ لی تھی، اس کا اشارہ ہمیں آغا مرزا احمد بیگ کے مندرجہ ذیل اقتباس سے ملتا ہے:

"نوکروں نے خبر دی کہ خالہ صاحبہ (عجبۃ النساء بیگم) اور ان کے ساتھ
دوسرے رشتہ دار مرد اور عورت برف خانے میں مقیم ہیں۔ ہم سب
گرتے پڑتے برف خانے پہنچے۔ وہاں دیکھا ہر طرف پہرا چوکی ہے اور
سب لوگ اطمینان سے بے خوف اور فراغت گزر کر رہے ہیں"۔۶۱

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پناہ گزینوں کے لیے برف خانے میں انگریزوں کی طرف سے مخصوص انتظامات کیے گئے تھے۔ آغا مرزا احمد بیگ کا سرسید سے کوئی سیدھا رشتہ نہیں تھا۔ لیکن شرفا کے خاندانوں میں جس طرح کے تعلقات ہوتے ہیں اس کے ناطے وہ سرسید کو ماموں صاحب اور سرسید کی بہن (عجبۃ النساء بیگم) کو خالہ صاحبہ کہتے تھے۔ (جس وقت کا یہ ذکر ہے اس وقت آغا مرزا احمد بیگ کی عمر تقریباً نو یا دس سال کی تھی) ویسے آغا مرزا احمد بیگ، سمیع اللہ خاں صاحب کے نسبتاً قریبی عزیزوں میں تھے۔ مرزا احمد بیگ کی والدہ سمیع اللہ خاں کی چچازاد بہن تھیں یعنی ایک معنی میں وہ سمیع اللہ خاں صاحب کے بھانجے ہوتے تھے۔ بعد میں ان کے سمیع اللہ خاں صاحب سے قریبی رشتے قائم ہو گئے تھے۔ جن کا تذکرہ ہم آئندہ باب میں کریں گے۔

آغا مرزا احمد بیگ کے حقیقی خالو، نواب امین الدولہ خاں عرف منشی اموجان، ریاست الور کے وزیر اعظم تھے۔ انھوں نے وہاں سے، سواریاں، پروانے راہ داری اور نقد رقم کثیر بھیج کر اپنے سب عزیزوں کو الور بلا لیا تھا۔ برف خانے میں کچھ روز رہنے کے بعد آغا مرزا احمد

بیگ اپنے والدین اور دوسرے عزیزوں کے ساتھ الور چلے گئے تھے۔ لیکن بجۃ النساء بیگم اور سرسید کے دوسرے عزیز کس طرح دہلی سے میرٹھ پہنچے اس کے سلسلے میں ہمیں کوئی قابل بھروسہ حوالہ نہ مل سکا۔ (ویسے حکایتیں کئی بیان کی جاتی ہیں) بہر حال یہ طے ہے کہ ان لوگوں کے میرٹھ پہنچنے کے بعد ہی سرسید کو اپنے خاندان کے افراد کی مکمل کیفیت معلوم ہو سکی تھی۔ چوں کہ والدہ اور خالہ ہنوز دہلی کے مکان میں ہی رکی رہ گئی تھیں (جس کو بعد میں انگریزی افواج کے سپاہیوں نے لوٹ لیا تھا) اسی وجہ سے ان لوگوں کی خیر و عافیت معلوم کرنے کے لیے سرسید نے دہلی کا قصد کیا۔ آگے کیا ہوا، اس کا حال ہم سرسید ہی کی زبانی بیان کرنا چاہتے ہیں:

> ”جب زمانہ فتح دہلی قریب ہوا اور کشمیری دروازہ فتح ہو گیا۔ سب زن و مرد شہر سے باہر چلے گئے۔ مگر وہ (یعنی سرسید کی والدہ) اور ان کی بہن جو نابینا تھیں اسی یقین پر کہ انگریز بے گناہوں کو نہیں ستانے کے، اپنے گھر سے نہیں گئیں۔ مگر افسوس کہ ان کا خیال غلط نکلا اور جب دہلی فتح ہوئی تو سپاہی گھروں میں گھس آئے۔ تمام گھر لوٹ لیا۔ وہ مع اپنی بہن کے حویلی کو چھوڑ کر اس کوٹھری میں چلی آئیں جس میں زیبا (نامی) لاوارث بڑھیا رہتی تھی آٹھ دس دن انھوں نے نہایت تکلیف سے بسر کیے۔ اس عرصہ میں راقم جو میرٹھ میں آ گیا تھا۔ میرٹھ سے دہلی پہنچا اور اپنی والدہ کے پاس گیا۔ اس وقت تین دن سے ان کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔ گھوڑے کا دانہ کچھ مل گیا تھا اسی پر بسر تھی۔ دو دن سے پانی بھی ختم ہو چکا تھا پانی کی سخت تکلیف تھی“۔[٦٢]

سرسید کی والدہ کا انتقال:

ہمارے اندازے کے مطابق دہلی فتح ہونے کے دس پندرہ روز بعد ہی سرسید اپنی والدہ اور خالہ کی خبر گیری کے لیے دہلی پہنچنے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ (غالباً اکتوبر ۱۸۵۷ء کے اوائل میں وہ دہلی پہنچے تھے) وہاں انھوں نے اپنی والدہ اور خالہ کو نہایت کسمپرسی کی حالت میں پایا تھا سرسید، بھوک اور پیاس سے نڈھال اپنی والدہ اور خالہ کو قلعہ کے (انگریز) حکام کی منت و سماجت کر کے میرٹھ ڈاک لے جانے والی شکرم میں بیٹھا کر میرٹھ لے جانے میں کامیاب ہوئے تھے۔ سرسید کی والدہ بھوک اور پیاس کے مصائب جھیلنے سے، اس قدر لاغر اور کمزور ہو گئی تھیں کہ باوجود علاج کے کچھ دن بیمار رہ کر یکم ربیع الثانی ۱۲۷۴ھ مطابق

۱۸۵۷ء کے ان کا بمقام میرٹھ انتقال ہوگیا۔ ان کی تدفین میرٹھ ہی میں ہوئی۔ والدہ کے انتقال کے سلسلے میں سرسید سیرت فریدیہ میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''یکم ربیع الثانی ۱۲۷۴ ہجری مطابق ۱۸۵۷ء کے انھوں نے بمقام میرٹھ انتقال کیا۔ مگر ان کی نیک نیتی کا یہ نتیجہ تھا کہ انتقال سے چند روز پیشتر ان کی بیٹی اور نواسیاں اور پوتے اور پوتیاں اور بہوویں جو مختلف مقامات پر چلی گئی تھیں سب ان کے پاس میرٹھ میں جمع ہوگئی تھیں اور انھوں نے سب کو صحیح و سالم اور خیر و عافیت سے دیکھ کر نہایت خوشی ظاہر کی تھی''۔ ۶۳

اس اقتباس میں سرسید کے ان تمام قریبی عزیزوں کا ذکر ہے جو ان کی والدہ کے انتقال سے پہلے بخیریت سرسید کے پاس میرٹھ پہنچ گئے تھے۔ اس اقتباس میں بیٹی (یعنی عجبۃ النسا بیگم) کے ساتھ ساتھ ''نواسیوں'' کی موجودگی کا بھی ذکر ہے۔ جس سے ہم نے یہی اندازہ لگایا کہ عجبۃ النسا بیگم کی ایک سے زیادہ صاحبزادیاں تھیں۔ (حالاں کہ ہم یہ مفروضہ پہلے ہی بنا چکے ہیں کہ عجبۃ النساء بیگم کی ایک بیٹی کی اولاد میں حکیم احمد الدین اور ان کی بہن شامل تھیں جن کی شادی سرسید کے بڑے بیٹے سید حامد سے ہوئی تھی) لیکن سرسید نے ''نواسیوں'' کے ساتھ ''نواسے'' یا ''نواسوں'' کا ذکر نہیں کیا ہے۔ جس سے ہمارے اس مفروضے کو تقویت ملتی ہے کہ عجبۃ النساء بیگم کے کوئی لڑکا نہیں تھا۔ اسی طرح 'پوتے'' اور ''پوتیوں'' کی موجودگی کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ جہاں تک پوتوں کا تعلق ہے۔ سید حامد (عمر تقریباً ۸ سال) اور سید محمود (عمر تقریباً ۷ سال) کے علاوہ، سید محمد احمد خاں (عمر تقریباً ۱۴ سال) یعنی تین ''پوتے'' اس وقت وہاں موجود تھے۔ لیکن اس اقتباس میں ''پوتی'' کی جگہ ''پوتیاں'' غالباً سرسید روا روی میں لکھ گئے ہیں۔ کیوں کہ ہماری اطلاع کے مطابق اس وقت تک سرسید کی والدہ کی صرف ایک ''پوتی''، یعنی سرسید کے بڑے بھائی (سید محمد خاں) کی صاحبزادی ہی موجود تھیں۔ ان کے علاوہ کسی اور پوتی کا تذکرہ ہمیں نہیں ملتا ہے۔ جہاں تک خود سرسید کی اپنی بیٹی ''آمینہ بیگم'' کا تعلق ہے ان کی پیدائش سرسید کی والدہ کے انتقال کے بعد (غالباً) ۱۸۶۰ء کے آس پاس ہوئی تھی۔ ''بہوویں'' کا لفظ سرسید نے صحیح استعمال کیا ہے کیوں کہ اس وقت تک سرسید کے بڑے بھائی کی بیوی اور خود سرسید کی بیوی (پارسا بیگم) یعنی دونوں ''بہوویں'' میرٹھ پہنچ چکی تھیں۔

۱۸۵۷ء میں سرسید کی کارکردگی:

سیرتِ فریدیہ کے دوسرے ایڈیشن (۱۹۶۴ پاک اکیڈمی، کراچی) کے مرتب، محمود احمد برکاتی اپنے ابتدائیہ میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''سرسید مرحوم کے دامانِ حیات پر سب سے سوا بدنما اور ''نادیدنی'' داغ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ان کی شرکت حریفانہ تھی''۔ ویسے تو محمود احمد برکاتی سرسید کے ہر قول و فعل میں کچھ نہ کچھ کمی نکال کر ''ایک دوسری رائے'' کے بطور پیش کرتے ہیں لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں سرسید کی ''شرکت حریفانہ'' پر ان کی رائے خاصی تلخ اور کسی حد تک (حقیقی ہونے کے بجائے) جذباتی معلوم ہوتی ہے۔ وہ تحریر کرتے ہیں کہ:

> ''جنگ آزادی بلاشک جنگِ آزادی تھی۔ یہ فرنگی غاصبوں کی مستعمرانہ حرص وآر کے خلاف وطن دوست ہندیوں کی ایک حرکت تھی، بظاہرِ نظر ناکام مگر نتائج وثمرات کے پیش نظر کامیاب۔ ہر وطن دوست طبقے اور فرد نے اس جنگ میں حصہ لیا اور جس طبقے اور فرد نے اس میں حصہ لینے میں کوتاہی کی اس کی غلامانہ ذہنیت، دوں ہمتی، وطن دشمنی اور خدمتِ استعمار پر کوئی بڑے سے بڑا زبان آور اور ''قلم دراز'' بھی پردہ نہیں ڈال سکتا ہے۔ اس جنگ میں ارباب ہند دو گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک طرف، ہماری طرف، بخت خاں، فیروز شاہ، فضل حق اور محمود خاں وغیرہ تھے۔ جب بھی ان کا ذکر چھڑ جاتا ہے ہمارے دل دھڑک کر ان کو سلامی دیتے ہیں۔ دوسری طرف، ہمارے مقابل، منشی رجب علی، الٰہی بخش اور سرسید وغیرہ تھے۔ ان کے دامنوں پر فرنگیوں کی اعانت وحمایت ونصرت کا داغ ہے۔ ان کے دامنوں کا یہ داغ ہمارے دلوں کا گھاؤ بن گیا ہے۔ ہم نے لاکھ حسنِ ظن کے مرہم استعمال کیے مگر یہ گھاؤ نہ بھرنا تھا نہ بھرا''۔[۶۴]

جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہمیں اس جنگ کے دوران سرسید کہیں بھی حریفوں کی صفوں میں کھڑے نظر نہ آئے۔ بلکہ ان کا رویہ ایک عام امن پسند شہری کا رویہ نظر آتا ہے۔ بجنور میں جہاں ان کا گھر باغی سپاہیوں کے ذریعہ لوٹا گیا وہیں دہلی میں انگریزی افواج کے

ہاتھوں نہ صرف ان کا مکان لوٹا گیا بلکہ ان کے ماموں اور ماموں زاد بھائی کو قتل کیا گیا۔اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہزاروں ہندوستانیوں کی طرح سرسید کی ہمدردیاں بھی انگریز حکمرانوں کے ساتھ تھیں۔جن کی علمی، معاشرتی اور تنظیمی صلاحیتوں کے وہ قائل تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دوران رائج لاقانونیت اور مطلق العنانی نے ان کی اس رائے کو غالباً کچھ اور زیادہ مستحکم کیا ہوگا۔لیکن دورانِ جنگ وہ انگریز عمل داری کے ایک مخلص افسر ہونے کے ناطے اپنے فرائض منصبی نبھانے کے بطور چند رپورٹیں اپنے اعلیٰ افسروں کو بھیجنے کے علاوہ کسی طرح کی عملی صف آرائی میں کہیں کھڑے نظر نہیں آتے ہیں۔(حالاں کہ سرسید نے خود اور ان کے بہی خواہوں اور سوانح نگاروں نے ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات کی ضرورت کے مدنظر سرسید کی ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے تئیں وفاداری کے عمل کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی تگ ودو میں انہیں انگریزوں کی صفوں میں کھڑا کرنے کی کوشش ضرور کی ہے)اسی لیے اس بات کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ ۱۸۵۷ء میں سرسید کی کارکردگی پر باقاعدہ تحقیق کی جائے۔ہمیں امید ہے کہ اس تحقیق کے نتیجے میں ہمیں محمود احمد برکاتی صاحب کے ''دل کے گھاؤ'' کا اکسیر مرہم ضرور فراہم ہوجائے گا۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ سیرتِ فریدیہ۔مولفہ: سرسید احمد خاں (دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۴ء) مرتبہ: محمود احمد برکاتی، پاک اکیڈیمی، کراچی، راقم کو اس ایڈیشن کی عکسی کاپی مہر الٰہی صاحب کے تعاون سے حاصل ہوئی۔

۲۔ سیرتِ فریدیہ۔مؤلفہ: سرسید احمد خاں، مرتبہ: محمود احمد برکاتی، پاک اکیڈیمی، کراچی، ۱۹۶۴ء، صفحہ: ۱۳۸

۳۔ ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۸۹

۴۔ سفر نامہ فرنگ۔مرزا ابو طالب اصفہانی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی (۱۹۹۹ء)، صفحہ ۳۵

۵۔ ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۳۵۴

۶۔ سیرتِ فریدیہ۔مؤلفہ: سرسید احمد خاں، مرتبہ: محمود احمد برکاتی، پاک اکیڈیمی، کراچی، صفحات: ۵۵۔۵۴

۷۔ سیرتِ فریدیہ۔مؤلفہ: سرسید احمد خاں، مرتبہ: محمود احمد برکاتی، بحوالہ: علم وعمل (وقائع) مولوی عبدالقادر رام پوری، صفحہ: ۱۶۳

۸۔ سیرتِ فریدیہ۔مؤلفہ: سرسید احمد خاں، مرتبہ: محمود احمد برکاتی، بحوالہ: بہادر شاہ کا روزنامچہ، مرتبہ: خواجہ حسن نظامی، صفحہ: ۱۶۴

۹۔ سیرتِ فریدیہ۔مؤلفہ: سرسید احمد خاں، مرتبہ: محمود احمد برکاتی، بحوالہ: علم وعمل (وقائع نگار) مولوی عبدالقادر رامپوری، صفحہ: ۱۶۴

١٠۔ حیات جاوید، مصنفہ: الطاف حسین حالی، (تیسرا ایڈیشن ١٩٩٠ء)، ترقی اردو بیورو، دہلی، صفحہ: ٣٣

١١۔ حیات جاوید، مصنفہ: الطاف حسین حالی، (تیسرا ایڈیشن ١٩٩٠ء)، ترقی اردو، بیورو، دہلی، صفحہ: ٥٠

١٢۔ سیرتِ فریدیہ، مولفہ: سر سید احمد خاں (دوسرا ایڈیشن ١٩٦٤ء) مرتبہ: محمود احمد برکاتی، پاک اکیڈمی، کراچی، صفحہ ١٣٦

١٣۔ سیرتِ فریدیہ، مولفہ: سر سید احمد خاں (دوسرا ایڈیشن ١٩٦٤ء) مرتبہ: محمود احمد برکاتی، پاک اکیڈمی، کراچی، صفحہ ١٢٤

١٤۔ حیات جاوید، مصنفہ: الطاف حسین حالی، ترقی اردو بیورو، دہلی صفحہ: ٦٠

١٥۔ سیرتِ فریدیہ، مولفہ: سر سید احمد خاں مرتبہ: محمود احمد برکاتی (١٩٦٤ء)، پاک اکیڈمی، صفحہ: ١٢٢

١٦۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ١٢٤

١٧۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ١٢٥

١٨۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ١١٣

١٩۔ سیرتِ فریدیہ، مولفہ: سر سید احمد خاں مرتبہ: محمود احمد برکاتی (١٩٦٤ء)، پاک اکیڈمی، صفحہ: ١١٣

٢٠۔ حیات جاوید، مولفہ: الطاف حسین حالی، (تیسرا ایڈیشن ١٩٩٠ء) ترقی اردو بیورو، دہلی، صفحہ: ٣٤

٢١۔ خطوطِ سر سید، بنام حکیم احمد الدین، مرتبہ: نسرین بصیر (١٩٩٥ء)، علی گڑھ، صفحہ: ٤٣

٢٢۔ ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ٤٤

٢٣۔ ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ٤٤

٢٤۔ ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ٤٥

٢٥۔ ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ٥٠

٢٦۔ ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ٥٣

٢٧۔ ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ٦٣

٢٨۔ ایضاً ایضاً ایضاً صفحات: ٦٩۔٦٨

٢٩۔ مکمل مجموعہ لیکچر و اسپیچیز، مرتبہ: مولوی محمد امام الدین گجراتی، نولکشور گیس پرنٹنگ ورکس، لاہور، صفحہ ٢٢٩

٣٠۔ خطوطِ سر سید (مخطوطہ نمبر ١٠٠) بنام حکیم احمد الدین، منسکرپٹ سیکشن، مولانا آزاد لائبریری اے ایم یو علی گڑھ

٣١۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً (خط نمبر ٢)

٣٢۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً (خط نمبر ٨٤)

٣٣۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً (خط نمبر ٩٣)

٣٤۔ خطوطِ سر سید (بنام حکیم احمد الدین)، مرتبہ: نسرین بصیر (١٩٩٥ء)، علی گڑھ، صفحہ: ٤١

٣٥۔ خطوطِ سر سید (مخطوطہ نمبر ١٠٠) بنام حکیم احمد الدین، مخطوطات سیکشن، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (خط نمبر ٣)

٣٦۔ خطوطِ سر سید (مخطوطہ نمبر ١٠٠)، بنام حکیم احمد الدین، مخطوطے میں موجود یہ خط کسی وجہ سے شائع نہ ہو سکا۔ اس خط کی پشت پر درج سر سید کا خط ''خطوطِ سر سید'' مرتبہ: نسرین بصیر کے صفحہ ٤٢، ٤١ پر شائع ہوا ہے۔

٣٧۔ خطوطِ سر سید (مخطوطہ نمبر ١٠٠)، بنام حکیم احمد الدین (چونکہ مذکورہ خط بنام سر سید تھا، غالباً اسی وجہ سے

''خطوطِ سرسید'' بنام حکیم احمد الدین، مرتبہ: نسرین بصیر (۱۹۹۵ء) میں شائع نہیں کیا گیا۔ حالاں کہ مذکورہ مخطوطے میں موجود ہے)

۳۸۔ خطوطِ سرسید (مخطوطہ نمبر ۱۰۰) بنام حکیم احمد الدین، مخطوطات سیکشن، مولانا آزاد لائبریری، اے ایم یو علی گڑھ

۳۹۔ حیاتِ جاوید، مؤلفہ: الطاف حسین حالی (تیسرا ایڈیشن ۱۹۹۰ء) ترقی اردو، بیورو، دہلی، صفحہ: ۴۶

۴۰۔ خطوطِ سرسید (بنام حکیم احمد الدین) مرتبہ: نسرین بصیر، (۱۹۹۵ء)، علی گڑھ، صفحہ: ۸۹

۴۱۔ حیاتِ جاوید، مؤلفہ: الطاف حسین حالی (تیسرا ایڈیشن (۱۹۹۰ء) ترقی اردو، بیورو، دہلی، صفحہ: ۴۸

۴۲۔ ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۴۶

۴۳۔ ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۵۳

۴۴۔ سیرتِ فریدیہ، مؤلفہ: ڈاکٹر سرسید احمد خاں، مطبع مفید عام، آگرہ (۱۸۹۶ء)

۴۵۔ حیاتِ جاوید، مؤلفہ: الطاف حسین حالی، (تیسرا ایڈیشن ۱۹۹۰ء)، ترقی اردو بیورو، دہلی، صفحہ: ۴۸

۴۶۔ خلاصہ رپورٹ مرزا عابد علی بیگ (ٹرسٹی مدرسۃ العلوم) مطبع ریاض ہند، علی گڑھ (۱۸۹۸ء)، صفحہ: ۳۳

۴۷۔ خطوطِ سرسید، مرتبہ: سید راس مسعود، نظامی پریس، بدایوں، صفحہ: ۴۰

۴۸۔ ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۴۰

۴۹۔ خطوطِ سرسید (بنام حکیم احمد الدین)، مرتبہ: نسرین بصیر (۱۹۹۵ء)، علی گڑھ، صفحہ: ۵۰

۵۰۔ ایضاً ایضاً بحوالہ: تذکرہ سرسید، امین زبیری، صفحہ: ۲۱

۵۱۔ ایضاً ایضاً (خط نمبر ۶۵)

۵۲۔ سرسید احمد خاں اور تاریخ نویسی، مولفہ: پروفیسر عرفان حبیب، فکر و آگہی (علی گڑھ نمبر) ۲۰۰۰ء صفحہ: ۱۲۲

۵۳۔ حیاتِ جاوید، مولفہ: الطاف حسین حالی (تیسرا ایڈیشن ۱۹۹۰ء)، ترقی اردو بیورو، دہلی، صفحہ: ۶۴

۵۴۔ ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۶۲

۵۵۔ سرسید احمد اور تاریخ نویسی، مولفہ: پروفیسر عرفان حبیب، فکر و آگہی (علی گڑھ نمبر) ۲۰۰۰ء، صفحہ: ۱۲۳

۵۶۔ ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۱۲۳

۵۷۔ دی ریبل ایڈمنسٹریشن آف دہلی، مصنفہ: اقبال حسین، سوشل سائنٹسٹ، جلد: ۲۶، نمبر ۴_۱، جنوری۔اپریل، ۱۹۹۸ء، صفحات: ۳۷_۲۵

۵۸۔ کارنامہ سروری، سوانح خودنوشت نواب آغا مرزا احمد بیگ، مرتبہ: نواب ذوالقدر جنگ، مطبع: مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ (۱۹۳۳)

۵۹۔ سیرتِ فریدیہ، مولفہ: سرسید احمد خاں (سیکنڈ ایڈیشن ۱۹۴۶ء)، مرتبہ: محمود احمد برکاتی، پاک اکیڈیمی، کراچی، صفحہ: ۱۴۷

۶۰۔ کارنامہ سروری، سوانح خودنوشت، نواب آغا مرزا احمد بیگ، مرتبہ: ذوالقدر جنگ، اے ایم یو علی گڑھ (۱۹۳۳)

۶۱۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً

۶۲۔ سیرتِ فریدیہ، مولفہ: سرسید احمد خاں (سیکنڈ ایڈیشن ۱۹۴۶ء)، مرتبہ: محمود احمد برکاتی، پاک اکیڈیمی، کراچی، صفحہ: ۱۴۵

۶۳۔ ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۱۴۳

۶۴۔ ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۳۷

☆☆☆

باب دوم

سرسید کا دورِ وفاداری
(۱۸۵۸ء تا ۱۸۷۰ء)

۱۸۵۷ء سے پہلے تک سرسید کی انگریزوں کے تئیں مرعوبیت نے انہیں انگریزوں کا گرویدہ بنا دیا تھا یہ خود ان کی اپنی مرضی کا انتخاب تھا۔ جس میں بہت حد تک ان کی ننھیال کے ماحول کا اثر کارفرما نظر آتا ہے۔ نیز ان اثرات نے پہلے انگریزوں کی وقعت اور تعظیم کا سبق سکھلایا جس نے بعد میں انگریزی حکومت کے تئیں وفاداری کی بنیاد فراہم کی۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد ان کی انگریزوں کے تئیں وفاداری، خود از روئے اختیار منتخب نہیں کی گئی تھی بلکہ اب یہ سرسید کی مجبوری بن گئی تھی۔ اسی لیے ۱۸۵۷ء کے بعد کے چار سال جو سرسید نے بجنور اور مراد آباد میں گزارے وہ ایک طرح سے اسی مجبوری کے تحت انگریزوں کے تئیں اپنی وفاداری ثابت کرنے ہی میں صرف ہوئے۔

بجنور میں دوبارہ بحالی:

ستمبر ۱۸۵۷ء کے اواخر میں انگریزوں کے دوبارہ دہلی پر قبضہ کر لینے کے بعد مختلف اضلاع میں بھی بتدریج انگریزوں کا اقتدار بحال ہونا شروع ہو گیا تھا۔ جون ۱۸۵۷ء کے اواخر میں سرسید بجنور چھوڑ کر میرٹھ پہنچے تھے۔ جہاں وہ فروری ۱۸۵۸ء تک مقیم رہے۔ ۱۶رفروری ۱۸۵۸ء کو گورنمنٹ کے احکامات کلکٹر شیکسپیئر کے نام پہنچے جن کی رو سے انہیں مطلع کیا گیا تھا کہ ضلع بجنور کے عملہ کے ساتھ روڑ کی پہنچ جاؤ۔ چنانچہ سرسید بھی ضلع بجنور کے عملہ کے ساتھ روڑ کی پہنچے۔ جہاں سے شیکسپیئر فوج کے ساتھ بجنور واپس آئے۔ راستے میں نجیب آباد اور نگینہ پر احمد اللہ خاں اور ماڑے خاں وغیرہ نے مقابلہ کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے اور اس طرح بجنور پر دوبارہ انگریزوں کا قبضہ بحال ہو گیا۔

اس قبضے کے بعد تقریباً ایک سال تک سرسید بجنور ہی میں تعینات رہے۔ بجنور کے اس ایک سال کے قیام کے دوران سرسید نے (غالباً) تاریخ سرکشی بجنور کی تصنیف کا

کام مکمل کرلیا تھا جسے بعد میں انھوں نے مرادآباد تبادلہ ہو جانے کے بعد شائع کیا۔

بجنور ہی میں، دورانِ بغاوت سرسید کی وفاداری کے صلہ کے بطور کلکٹر مسٹر شیکسپیئر نے سرسید کا نام ''پولٹیکل پنشن'' دیئے جانے کے لیے اپنی سفارش کے ساتھ گورنمنٹ میں داخل کیا تھا۔ جس کی بنیاد پر سرسید کے نام دوسو روپے ماہانہ کی پولٹیکل پنشن دو پشتوں کے لیے جاری ہوگئی تھی۔ (پنشن کے احکامات میں درج تھا کہ سرسید کے بعد ان کے بڑے بیٹے کو تاحیات دوسو روپے ماہانہ کی پنشن ملتی رہے گی)۔

مرادآباد میں تقرر:

اپریل ۱۸۵۸ء میں سرسید ترقی پا کر صدر الصدور کے عہدے پر مرادآباد میں مقرر کیے گئے۔ مرادآباد پہنچ کر سرسید نے تاریخ سرکشی بجنور شائع کی۔ اس کتاب میں مئی ۱۸۵۷ء سے لے کر اپریل ۱۸۵۸ء تک کے حالات اور واقعات جو بغاوت کے دوران ضلع بجنور میں گزرے تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔

مرادآباد ہی میں سرسید نے ''اسباب بغاوت ہند'' پر ایک رسالہ لکھا، لیکن اسے چھپوانے کے بعد ساری کاپیاں انگلستان میں مختلف اہلِ اقتدار میں تقسیم کردی گئیں۔ اس رسالے کو ہندوستان میں مشتہر نہیں کیا گیا تھا تاکہ ضرورت پڑنے پر انگریز حکمرانوں کو مصنف کی نیک نیتی اور انگریزی حکومت سے وفاداری کا یقین دلایا جاسکے۔ سرسید کی اس تصنیف کو بھی اس زمانے کے خوں چکاں دور میں سرسید کی انگریز حکمرانوں کے تئیں اپنی وفاداری ثابت کرنے کی ایک کوشش قرار دیا جاسکتا ہے۔ پروفیسر عرفان حبیب اس کتاب کے سلسلے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''۱۸۶۴ء۔۱۸۶۳ء میں تزکِ جہانگیری کی طباعت سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ سرسید احمد خاں نے مغل بادشاہوں کے لیے جو سخت الفاظ ''اسباب بغاوت ہند'' میں ۱۸۵۸ء۔۱۸۵۷ء کے غدر کے فوراً بعد استعمال کیے وہ سرکار انگلشیہ کی خوشنودی کے لیے زیادہ تھے اور ان کے دل کی آواز کم۔ آخر کچھ ہی سال پہلے تو وہ اپنے آبا واجداد کی سلطنت مغلیہ کے لیے خدمات کو بڑے فخر سے بیان کرتے تھے''۔[۱]

اسی لیے ہمیں یہ احساس ہوا کہ ہمارا یہ مفروضہ کہ ۱۸۵۷ء کے بعد سرسید کی سرکارِ

انگلشیہ کے تئیں وفاداری اب ان کی اپنی مرضی کے انتخاب کے بجائے ان کی ایک بڑی مجبوری بن گئی تھی ۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کے چار سال جو سرسید نے بجنور اور مرادآباد میں گزارے وہ ایک طرح سے اسی مجبوری کے تحت انگریزوں کے تئیں اپنی وفاداری ثابت کرنے میں صرف ہوئے۔

مرادآباد ہی میں سرکارِ انگلشیہ کو ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے دوران مسلمانوں کی وفاداری اور جاں نثاری کا یقین دلانے کے لیے سرسید نے ''لائل محمڈنز آف انڈیا'' کی ترتیب وسلسلے وار اشاعت کا اہتمام کیا لیکن اس رسالے کے ایک سال میں (یعنی ۱۸۶۱ء۔۱۸۶۰ء کے دوران) صرف تین شمارے ہی شائع ہوسکے اور وہ بند ہوگیا۔ اس رسالے کے اس طرح یکا یک بند ہوجانے سے ہمیں یہی احساس ہوا کہ اس وقت تک ذی حیثیت مسلمان گو انگریزوں کی نظروں میں آکر سرخرو تو ہونا چاہتے تھے لیکن ابھی تک وہ اپنے آپ کو سرعام انگریزوں کا وفادار ثابت کرنے سے ہچکچا رہے تھے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ لائل محمڈنز آف انڈیا کے ابتدائی شماروں میں سرسید اپنے اور میر تراب علی اور ڈپٹی رحمت خاں کے حالات چھاپنے کے بعد لوگوں کے عدم تعاون کی وجہ سے اس رسالے کی اشاعت کو موقوف کرنے پر مجبور ہوئے۔

مرادآباد ہی میں سرسید نے بائبل کی تفسیر لکھنا شروع کردی تھی۔ حالی کے بقول اس تفسیر کے لکھنے سے سرسید کی مراد یہ تھی کہ:

> ''اصولِ اسلام اور اصولِ اہل کتاب میں جہاں تک ممکن ہو مطابقت ثابت کی جائے اور جہاں جہاں اختلاف پایا جائے وہاں اختلاف کی وجہ بیان کی جائے۔ اسلام کی نسبت جو بدگمانیاں عیسائیوں کو ہیں وہ رفع کی جائیں اور مسلمان جو موجودہ بائبل کو مطلقاً استناد کے قابل نہیں سمجھتے اور اس میں تحریفِ لفظی کے قائل ہیں اس غلطی کو دور کیا جائے'' ۔[۲]

حالی یہ بھی لکھتے ہیں کہ سرسید نے بائبل کی تفسیر کو چھاپنے کے لیے کئی ہزار روپے کا پریس روڑکی سے منگوایا تھا۔ (جو دراصل بعد میں ان کے غازی پور پہنچنے کے بعد وہاں لگایا گیا تھا) دراصل انہی دنوں سرسید کو غدر کے زمانے کی چڑھی ہوئی تنخواہ کے ساتھ جو اسباب ان کا بجنور میں لٹ گیا تھا اس کے معاوضہ کے بطور بہت سا روپیہ سرکار سے ملا

تھا۔اس کے علاوہ ان کو دو سو روپے ماہوار کی پولٹیکل پنشن بھی ملنا شروع ہوگئی تھی۔اس لیے اس وقت سر سید کے پاس روپے کی کمی نہیں تھی۔اسی روپے سے انھوں نے روڑکی سے (حالی کے بیان کے مطابق) آٹھ ہزار روپے خرچ کرکے ایک عمدہ پریس خریدا تھا۔ ہمارے ایک سرسری اندازے کے مطابق اس وقت ایک روپے کی قیمت خرید آج کے تقریباً ڈیڑھ سو روپے کے برابر تھی۔اس اندازے کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب یہ چھاپہ خانہ سر سید نے خریدا تھا اس وقت اس کی قیمت آج کے تقریباً بارہ لاکھ روپے کے برابر ہوگی۔

یہ بات کہ سر سید نے اتنی کثیر رقم خرچ کرکے اپنا ذاتی چھاپہ خانہ خریدا تھا اس بات پر شہادت ہے کہ سر سید کو تصنیف وتالیف کے کام میں کس قدر دلچسپی تھی۔اسی کے ساتھ یہ اس بات کی بھی غمازی کرتا ہے کہ انیسویں صدی میں ذرائع ابلاغ کے سلسلے میں الیکٹرونک میڈیا یعنی، ریڈیو، فلم، ٹیلی ویژن وغیرہ کی غیر موجودگی میں پرنٹ میڈیا یعنی چھاپہ خانے کی کتنی اہمیت تھی۔سر سید کو پرنٹ میڈیا کی اہمیت کا اندازہ شروع سے تھا۔اس زمانے میں ذرائع ابلاغ کے بطور عوام اور حکام دونوں تک اپنی بات پہنچانے کے لیے یہی ایک ذریعہ تھا۔خاص طور پر ایسی صورت میں جب کہ ٹائپ رائیٹر اور کاربن ابھی ہندوستان میں رائج نہیں ہوئے تھے۔ہمارا قوی خیال ہے کہ ۱۸۶۲ء میں سر سید کے اس ذاتی چھاپہ خانے کے جاری ہونے ہی نے ان کو ''کچھ اور'' چھاپنے کی تحریک دی ہوگی۔نایاب مشرقی مخطوطات تو سر سید کو بآسانی چھاپنے کے لیے دستیاب ہو سکتے تھے لیکن ان کا ذہن انگریزی اور سائنس کی کتابوں کے ترجموں کو چھاپنے کی طرف اس لیے مائل ہوا ہوگا کیوں کہ وہ ان علوم کو ملک میں رائج کرکے سماج میں مثبت رجحانات پیدا کرنے کے خواہش مند تھے۔ہمارا یقین ہے کہ غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی کے قیام کے پیچھے جہاں اور بہت سے محرکات ہوں گے وہاں سر سید کے پاس موجود اس ذاتی چھاپے خانے نے بھی انہیں اس سلسلے میں ضرور تحریک دی ہوگی۔

مرادآباد میں رہن سہن:

ہمیں یہ تو نہیں معلوم کہ مرادآباد میں سر سید کس قسم کے مکان میں رہتے تھے لیکن قیاس یہی ہے کہ ان کا رہن سہن خاصا فارغ البالی کا رہا ہوگا۔سر سید کے ایک خط بنام محمد سعید خاں، مورخہ یکم جون ۱۸۶۲ء سے اطلاع ملتی ہے کہ مرادآباد میں سر سید کے پاس اپنی

ایک ذاتی بگھی موجود تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''تم جعفر علی صاحب وکیل سے ملو اور دریافت کرو کہ اگر بگھی کی قیمت وصول ہوئی ہے تو جلد میرے پاس بھیج دیں''۔[۴۲]

ظاہر ہے اس زمانے میں صرف بہت ہی متمول انداز سے رہنے والے ہی بگھی وغیرہ رکھ سکتے تھے جس کے لوازمات کے بطور ایک یا دو گھوڑے، سائیس، گراس کٹ، وغیرہ بھی رکھنا ضروری ہوتے تھے۔ پھر مکان میں گھوڑوں اور ان سے متعلق سائیس وغیرہ کے رہنے کے لیے اصطبل اور شاگرد پیشے کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ جس کے معنی ہیں کہ مکان یا اس کے احاطے کو کافی کشادہ ہونا چاہیے تاکہ اصطبل اور شاگرد پیشے وغیرہ کی اس میں تعمیر ممکن ہو سکے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مراد آباد سے ہی سر سید کا رہن سہن کافی اجلا نظر آتا ہے۔

بیٹی کی پیدائش:

مراد آباد کے دورانِ قیام سر سید اپنے بیوی بچوں کے ساتھ وہاں رہ رہے تھے ان کے بھتیجے سید محمد احمد خاں (جن کی پیدائش ۱۸۴۳ء میں ہوئی تھی) بھی ان کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ ان کی عمر اس وقت تقریباً ۱۷ سال کی ہوگی۔ اسی کے ساتھ سر سید کے بڑے صاحبزادے سید حامد کی عمر تقریباً ۱۱ سال اور چھوٹے صاحبزادے سید محمود کی عمر تقریباً ۱۰ سال کی تھی۔ اسی زمانے میں یعنی ۱۸۶۰ء کے آس پاس سر سید کی بیٹی آمینہ بیگم کی ولادت ہوئی تھی۔ جن کا مئی ۱۸۷۰ء میں تقریباً دس سال کی عمر میں اس وقت انتقال ہوا تھا جب سر سید خود اور ان کے دونوں صاحبزادگان انگلینڈ میں تھے۔

سر سید کے گھر میں تلاشی:

مراد آباد کے دورِ قیام کے سلسلے میں حالی سر سید کے ایک دوست کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں کہ:

> ''مراد آباد میں جب کہ سر سید وہاں صدر الصدور تھے محکمہ صاحب جج کے ایک ہندو کلرک کو سر سید سے کچھ رنجش تھی۔ وہ اکثر گم نام عرضیاں ان کی شکایت کی اعلیٰ افسروں کو لکھتا رہتا تھا۔ ایک بار جب کہ پولیس کا نیا نیا انتظام ہوا تھا اس نے ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ کو ایک عرضی لکھ

بھیجی کہ صدر اعلیٰ کے بھتیجے (مراد سید محمد احمد خاں سے ہے) نے ایک عورت کو مار ڈالا ہے اور ان کے گھر میں اس کی لاش موجود ہے فوراً تلاشی لی جائے۔ اسی وقت پولیس کا عملہ ان کے مکان پر چڑھ آیا۔ سرسید نے مکان میں پردہ کرادیا اور تلاشی لی گئی۔ مگر چوں کہ وہ محض اتہام تھا کوئی چیز برآمد نہیں ہوئی۔ سرسید کو اس کا نہایت رنج ہوا، مرادآباد کا کوتوال اس جرم میں کہ بغیر موجودگی مدعی کے تلاشی لی گئی، برخاست کیا گیا''۔[۲۴]

اس واقعہ کو یہاں بیان کرنے سے ہمارا مقصد یہ دکھانا تھا کہ صدر الصدور کے عہدے پر فائز ہونے اور انگریزوں کے تئیں اپنی تمام تر وفاداری کے باوجود سرسید کی حیثیت ابھی تک اتنی مستحکم نہیں ہوئی تھی کہ وہ ایک جھوٹی شکایت پر پولیس کے داروغہ کو اپنے گھر کی تلاشی لینے سے باز رکھ سکتے (کیوں کہ اس طرح کی تلاشیاں عموماً قانون کو نافذ کرنے کے لیے کم اور صاحبِ خانہ کو بے عزت کرنے کے لیے زیادہ ہوتی تھیں)۔ اس واقعہ سے سید محمد احمد خاں کے سرسید کے ساتھ مرادآباد میں رہنے کے ہمارے مفروضہ کو بھی مزید تقویت ملتی ہے لیکن ساتھ ہی کسی حد تک اس طرح کا واقعہ سید محمد احمد خاں کی خود اپنی ساکھ کو بھی منعکس کرتا ہے۔

عوامی فلاح و بہبود کے کام:

سرسید نے اس دور کے شرفا اور صاحبِ حیثیت لوگوں کے رسم و رواج کے مطابق ۱۸۵۷ء کے بعد پہلی بار مرادآباد ہی میں عوامی فلاح و بہبود کے کاموں میں عملی دلچسپی لینا شروع کی تھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے ۱۸۵۹ء میں مرادآباد میں ایک مدرسہ قائم کیا جو فارسی ذریعہ تعلیم کا ایک روایتی قسم کا مدرسہ تھا۔ بقول حالی ''کچھ دنوں یہ مدرسہ بدستور اپنی حالت پر رہا مگر جب اسٹریچی صاحب وہاں کلکٹر ہو کر آئے اور انھوں نے ایک تحصیلی مدرسہ قائم کیا اس تحصیلی مدرسہ میں اس فارسی مدرسہ کے طلبا بھی داخل ہو گئے''۔ گویا بعد میں یہ مدرسہ ایک طرح سے تحصیلی اسکول کے قائم ہونے کے بعد اس میں ضم کر دیا گیا تھا۔

اسی کے ساتھ سرسید نے مرادآباد میں لاوارث بچوں کی پرورش اور تعلیم کے لیے ایک بڑا یتیم خانہ کھولنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن ان کے مرادآباد سے تبادلے کے بعد یہ

تجویز التوا میں پڑ گئی تھی۔

۱۸۶۰ء میں جب کہ اضلاع شمال مغرب میں ایک عام قحط پڑا تھا اس وقت ضلع کلکٹر مراد آباد مسٹر جان اسٹریچی نے ضلع کے قحط زدہ علاقوں کا انتظام سرسید کے سپرد کر دیا تھا۔ جس کو انھوں نے نہایت عمدگی، سلیقہ اور انسانی ہمدردی کے ساتھ نبھایا تھا۔ اسی انتظام کے دوران سرسید کی پہلی بار راجہ جے کشن داس صاحب سے ملاقات ہوئی تھی جو بعد میں سرسید کے نہایت گہرے دوست بن گئے تھے۔ ۱۸۵۹ء میں مراد آباد میں جب باغیوں کی ضبط شدہ جائدادوں کے متعلق عذر داریوں کی سنوائی کے لیے ایک اسپیشل کمیشن بنایا گیا تھا اس میں دو یورپین ممبر (یعنی ایک کمشنر روہیل کھنڈ، دوسرا جج مراد آباد) اور ایک ہندوستانی ممبر یعنی سرسید مقرر ہوئے تھے۔ چنانچہ دو برس تک وہ اپنے عہدہ کے علاوہ یہ کام بھی انجام دیتے رہے تھے۔ حالاں کہ ہمیں سرسید کے اس کمیشن میں ادا کیے گئے کار منصبی کے بارے میں کوئی مستند حوالہ نہ مل سکا لیکن خیال اغلب یہی ہے کہ دو یورپین ممبروں کی موجودگی میں ایک ایسے ہندوستانی ممبر کی (جو ان کا ماتحت بھی ہو) یورپین افسروں کی ہاں میں ہاں ملانے کے علاوہ کوئی اور صورت نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر بھی خیال یہی ہے کہ سرسید کی کمیشن میں موجودگی کا کچھ نہ کچھ فائدہ تو ان لوگوں کو پہنچا ہی ہوگا جن کی ضبط شدہ جائدادیں واپس کر دی گئی تھیں۔

جہاں تک سرسید کی انگریزوں کے تئیں وفاداری کا تعلق ہے ملکۂ معظّمہ کے اشتہار معافی اور امن وامان کے مشتہر ہونے پر سرسید نے مراد آباد کے مسلمانوں کو ملکۂ معظّمہ کے شکریہ کی تقریب منظم کرنے کے سلسلے میں ترغیب دی جس کے نتیجہ میں شاہ بلاقی صاحب کی درس گاہ میں ہزاروں مسلمانوں کا اجتماع ہوا تھا، جہاں غریب اور مسکینوں کو کھانا تقسیم کیا گیا تھا اور عصر کی نماز کے بعد سرسید نے صحن مسجد میں ایک اونچی جگہ کھڑے ہو کر اردو زبان میں ایک مناجات پڑھی تھی جس کا ایک اقتباس ہم یہاں پیش کر رہے ہیں جو سرسید کے اس دورِ وفاداری کا ضامن ہے:

> ''الٰہی تیرا ایک بڑا احسان اپنے بندوں پر یہ ہے کہ اپنے بندوں کو عادل اور منصف حاکموں کے سپرد کرے۔ سو برسوں تک تو نے اپنے ان بندوں کو جن کو تو نے خطہ ہندوستان میں جگہ دی ہے اسی طرح عادل اور منصف حاکموں کے ہاتھ میں ڈالا۔ پچھلے کم بخت برسوں

میں، جو بسبب نہ ہونے ان حاکموں کے، ہماری شامت اعمال ہمارے پیش آئی۔ اب تو نے اس کا عوض کیا اور پھر وہی عادل اور منصف حاکم ہم پر مسلط کیے۔ تیرے اس احسان کا ہم دل سے شکر ادا کرتے ہیں تو اپنے فضل اور کرم سے اس کو قبول کر۔ (آمین)''[۵]

سرسید کی اہلیہ کا انتقال:

مراد آباد ہی میں ۱۸۶۱ء میں سرسید کی اہلیہ پارسا بیگم کا انتقال ہوا تھا اور وہیں ایک مسجد میں ان کی تدفین ہوئی تھی۔ سید عبدالباقی صاحب کے بیان کے مطابق اسّی کی دہائی کے اوائل میں جب زین العابدین صاحب کی اہلیہ کا انتقال ہوا تھا اس وقت سید عبدالباقی صاحب مراد آباد میں زین العابدین صاحب کے گھر پر ہی رہتے تھے اور ان کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانے پر مامور تھے۔ وہ زین العابدین صاحب کی اہلیہ کی تدفین میں شریک ہوئے تھے۔ زین العابدین کی اہلیہ کو مراد آباد میں ایک چھوٹی سی مسجد کے صحن میں دفن کیا گیا تھا۔ وہیں ایک چبوترے پر ایک دوسری قبر موجود تھی جس کے بارے میں وہاں موجود لوگوں نے بتلایا تھا کہ یہ سرسید کی اہلیہ کی قبر ہے۔ عبدالباقی صاحب کے اس بیان سے ہمیں اطلاع ملتی ہے کہ سرسید کی بیگم صاحبہ ۱۹۶۱ء میں مراد آباد میں جہاں دفن ہوئی تھیں وہیں تقریباً بیس سال بعد ان کے دوست زین العابدین صاحب کی اہلیہ کی تدفین بھی ادا کی گئی تھی۔ بالکل اسی طرح جس طرح ۱۸۹۸ء میں سرسید کی مدرسۃ العلوم کی جس مسجد میں تدفین ہوئی تھی اسی مسجد میں سات سال بعد ۱۹۰۵ء میں زین العابدین صاحب بھی دفن کیے گئے تھے۔

ہم یہ بات وثوق سے نہیں کہہ سکتے ہیں کہ سرسید کی خوش دامن (یعنی ان کی اہلیہ کی والدہ) اپنی بیٹی کی وفات کے وقت حیات تھیں یا ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ ہمارا مفروضہ یہی ہے کہ ان کا اپنی بیٹی کی وفات سے پہلے ہی انتقال ہو چکا ہوگا کیوں کہ اگر وہ اپنی بیٹی کی وفات کے بعد تک حیات ہوتیں تو ان کا مکان موروثی جائداد کے بطور ان کی بیٹی کے نام منتقل ہونے کے بجائے ان کی وفات کے بعد ان کے ''نواسوں'' یعنی سید حامد اور سید محمود کے نام منتقل ہوتا۔ لیکن جیسا کہ ہمیں علم ہے کہ وہ مکان پارسا بیگم کے نام تھا اسی وجہ سے ہم نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ پارسا بیگم کی والدہ (یعنی سرسید کی خوش دامن اور خالہ، فخر النسا بیگم،

زوجہ خواجہ نقیب الاولیا غلام علی) کا انتقال ان کی بیٹی کی وفات سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔

اہلیہ کے انتقال کے بعد بچوں کی پرورش کی ساری ذمہ داری سرسید کے سر آ گئی تھی۔ چوں کہ بیٹی (امینہ بیگم) صغیر سن تھیں اس لیے ان کی پرورش اور دیکھ ریکھ کا مناسب انتظام کرنے کی نیت سے ان کو سرسید نے اپنی بہن اور بھاوج کی نگہداشت میں رہنے کے لیے دہلی بھیج دیا ہوگا۔ لیکن دونوں صاحبزادگان یعنی سید حامد (عمر ۱۲ سال) اور سید محمود (عمر تقریباً ۱۱ سال) سرسید کے ساتھ ہی رہ رہے تھے۔ ان دونوں کے علاوہ سرسید کے بھتیجے سید محمد احمد (عمر ۱۸ سال) بھی ان کے ساتھ ہی رہ رہے تھے۔ گویا ایک طرح سے اب سرسید کے گھر میں مردانہ نظام غالب تھا۔ گو کبھی کبھی دہلی سے سرسید کی بہن، بھاوج، بھتیجی یا دوسری خواتین آتی رہتی ہوں گی۔ اسی لیے ضرورت تھی کہ بچوں کی دیکھ ریکھ کے لیے بھروسہ مند ملازم رکھے جائیں غالباً عظیم اللہ (عرف چھجو) اسی ضرورت کے تحت ملازم رکھے گئے ہوں گے۔

عظیم اللہ عرف چھجو:

جب سرسید پہلی بار ۱۸۶۴ء میں غازی پور سے تبادلہ کے بعد بطور ''سب جج'' علی گڑھ آئے تھے اس وقت سید محمود اور سید حامد کے ساتھ ملازم کے بطور عظیم اللہ عرف چھجو سرسید کے ساتھ ہی علی گڑھ آئے تھے۔ چھجو کی سائنٹفک سوسائٹی کے زمانے کے ایک گروپ فوٹو گراف میں تصویر بھی موجود ہے۔ جس میں وہ سید محمود اور سید حامد کے درمیان ان کے پیچھے کھڑے ہیں (اسی بنا پر ہم نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ بچوں کی دیکھ ریکھ پر مامور ہوں گے)۔ تصویر میں وہ غالباً انگرکھا پہنے ہیں، چہرے پر داڑھی ہے، سر پر صافہ بندھا ہے، دیکھنے سے پستہ قد معلوم ہوتے ہیں۔ حلیہ سے وہ انگریز افسروں کے چپراسیوں کی مانند نظر آتے ہیں۔ تصویر دیکھنے سے ۳۰۔۲۸ کی عمر معلوم ہوتی ہے۔

چھجو غازی پور سے سرسید کے ساتھ علی گڑھ آئے تھے۔ اسی لیے ہمارا خیال تھا کہ غالباً وہ مشرقی یوپی کے رہنے والے تھے۔ لیکن اب ہمیں یہ خیال ہو رہا ہے کہ ۱۸۶۱ء میں مرادآباد میں سرسید کی اہلیہ کی وفات کے بعد بچوں کی دیکھ ریکھ کے لیے سرسید کو ایک با اعتبار ملازم کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی اور ہو سکتا ہے کہ چھجو کا اس کام کے لیے انتخاب سرسید نے مرادآباد ہی میں کیا ہو۔ ایسی صورت میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ چھجو مشرقی یوپی کے بجائے

مرادآباد کے آس پاس کے رہنے والے بھی ہو سکتے ہیں۔

عظیم اللہ عرف چھجو ایک لمبے عرصے تک (یوں کہنا چاہیے تا حیات) سرسید کے پاس لازم رہے تھے۔ ۱۸۶۹ء میں چھجو سرسید اور ان کے صاحبزادگان کے ساتھ انگلینڈ بھی گئے تھے۔ جہاں وہ تقریباً چار سال تک سید محمود کے ساتھ لندن اور کیمبرج میں مقیم رہے تھے۔ انگلینڈ سے لکھے سرسید کے متعدد خطوط میں گاہے گاہے چھجو کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ مثلاً سرسید اپنے خط بنام محسن الملک مورخہ ۲۰/اگست ۱۸۶۹ء میں لندن سے تحریر کرتے ہیں کہ:

> ''چھجو آداب وتسلیمات عرض کرتا ہے اور اس وقت میرے سر پر کھڑا ہے اور آپ کی تصویر مانگتا ہے اس نے بھی ایک البم بنائی ہے''۔ ۶

ایک دوسرے خط مورخہ ۱۰/مئی ۱۸۷۰ء بنام محسن الملک میں سرسید لندن سے تحریر کرتے ہیں کہ:

> ''جس وقت میں آپ کے الفاظ چھجو کو سناتا ہوں تو خوشی کے مارے حلق سے آواز نہیں نکلتی ہے اور آپ کو ہزاروں دعائیں دیتا ہے اور کہتا ہے کہ خدا وہ دن کرے کہ ملازمت ہو''۔ ۷

سرسید لندن سے اپنے خط مورخہ ۲۸/جون ۱۸۷۰ء بنام محسن الملک تحریر کرتے ہیں کہ:

> ''چھجو دست بستہ آداب عرض کرتا ہے۔ وہ محمود کے ساتھ رہے گا اور اس کے ساتھ کیمبرج جائے گا''۔ ۸

سرسید اور ان کے بڑے صاحبزادے سید حامد ۱۸۷۰ء میں تقریباً ڈیڑھ سال ولایت میں رہنے کے بعد ہندوستان واپس آ گئے تھے۔ لیکن چھجو سید محمود کے ساتھ ان کے ذاتی ملازم کے بطور لندن سے کیمبرج منتقل ہو گئے تھے اور تقریباً تین سال مزید ولایت میں رہنے کے بعد ۱۸۷۳ء میں سید محمود کے ساتھ ہی واپس ہندوستان آئے تھے۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد وہ سید محمود کے ذاتی ملازم کی حیثیت سے جانے جاتے تھے اور اسی حیثیت سے وہ سید محمود کے ساتھ الہ آباد میں رہتے تھے جہاں سید محمود ہائی کورٹ میں پریکٹس کر رہے تھے۔ ۱۸۷۷ء میں سید محمود نے چھجو کی طرف سے ۲۰ روپے کا چندہ کالج میں دیا تھا تا کہ ان کا نام کالج کے احاطہ کی دیوار پر کندہ کر دیا جائے۔ جس کے نتیجہ میں دیوار کے کھنڈ نمبر ۵۶ پر (اگر ظہور گیٹ کی طرف سے شمار کیا جائے) مندرجہ ذیل عبارت کندہ ہے۔

''عظیم اللہ عرف چھجو۔ ملازم سید محمود''۔۹

چھجو کے پنڈے کا اندراج انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۱۷ر نومبر ۱۸۷۷ء میں موجود ہے۔ ۱۸۷۰ء میں جب چھجو ولایت ہی میں سید محمود کے ساتھ رہنے کے لیے روک لیے گئے تھے اس وقت ہندوستان واپس آنے کے بعد سرسید نے اپنے ذاتی ملازم کے بطور مجیب اللہ کو رکھ لیا تھا۔ عظیم اللہ اور مجیب اللہ کے ناموں کی ردیف سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان دونوں حضرات میں آپس میں کسی طرح کی نسبت ضرور تھی، ہوسکتا ہے کہ عظیم اللہ (عرف چھجو) ہی کی سفارش پر سرسید نے چھجو ہی کے کسی عزیز (مجیب اللہ) کو ملازم رکھ لیا ہو۔ بہر حال مجیب اللہ کافی عرصہ تک سرسید کے ذاتی ملازم کے بطور ان کے پاس کام کرتے رہے تھے جس کی شہادت ہمیں کالج کے احاطہ کی دیوار پر ۱۸۷۷ء میں کندہ کروائی گئی مندرجہ ذیل عبارت سے فراہم ہوتی ہے۔

''مجیب اللہ ملازم سرسید احمد خاں''۔۱۰

ہمیں عظیم اللہ عرف چھجو کے حالات زندگی میں اس لیے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی کیوں کہ ہم یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ ایک معمولی حیثیت اور سوجھ بوجھ کے آدمی میں چار سال تک ولایت میں رہنے کے بعد کس قسم کی تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں اور آئندہ اس کی زندگی کس طور سے گزری تھی۔ ہمیں چھجو کی ذاتی زندگی سے متعلق بہت زیادہ اطلاعات فراہم نہ ہوسکیں بلکہ ان کے سلسلے کے زیادہ تر بیانات ہمارے اپنے مفروضات پر مبنی ہیں۔ غالباً انگلینڈ جانے سے پہلے ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ بعد میں بھی ان کے بیوی بچوں کے سلسلے کا کوئی حوالہ نہیں ملتا ہے۔ جہاں تک ان کے لباس کا تعلق ہے ولایت جانے سے پہلے وہ عام ہندوستانیوں کی طرح کا لباس (یعنی انگرکھا وغیرہ) پہنتے ہوں گے۔ انگلینڈ جانے سے پہلے سرسید کے لیے خود، لباس کا مسئلہ خاصا اہم تھا۔ ان کو انگلینڈ میں موجود ان کے دوستوں نے صلاح دی تھی کہ اگر وہ یہاں ہندوستانی طرز کا لباس زیب تن کریں گے تو تماشہ بنے گا۔ اسی وجہ سے سرسید نے وہاں یورپین طرز کا لباس (ٹرکش کوٹ اور پتلون وغیرہ) زیب تن کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ بچوں کے لیے بھی یورپین طرز کے لباس تیار کروائے گئے تھے۔ اسی لیے ہمیں یقین ہے کہ چھجو کا لباس بھی تبدیل کروایا گیا ہوگا۔ چار سال انگلینڈ میں یورپین طرز کے ملبوسات پہننے کے بعد چھجو واپس ہندوستان آنے کے بعد کس طرح کا لباس زیب تن کرتے تھے اس سلسلے میں ہم کوئی بات وثوق سے نہیں کہہ سکتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم نہ

ہو سکا کہ چھجو نے انگلینڈ میں رہ کر کس حد تک انگریزی بولنے میں شد بد پیدا کر لی تھی۔ ہم یہ بھی جاننے سے قاصر رہے کہ ولایت کے دورِ قیام میں سید محمود کی ذاتی زندگی میں جس طرح کے اثرات مرتب ہوئے تھے خاص طور پر ان کی شراب نوشی وغیرہ کی عادت اس سلسلے میں کیا عظیم اللہ عرف چھجو بھی سید محمود کے شاملِ حال رہے تھے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سید محمود کے مقابلے میں عظیم اللہ غالباً انگلینڈ میں بھی اپنی معاشرتی اقدار کے زیادہ پابند رہے تھے۔ کیوں کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو آخیر عمر میں وہ دوبارہ سر سید کے ملازمِ خاص کے بطور ان کے ساتھ نہ رہتے۔ کیوں کہ اس زمانے میں سر سید کی سب سے بڑی پریشانی سید محمود کی کثرت شراب نوشی کی وجہ سے گرتی ہوئی صحت اور منتشر ہوتی ہوئی شخصیت تھی۔ اگر چھجو بھی اس بے راہ روی کے شکار ہوتے تو سر سید انہیں دوبارہ اپنے قریب پھٹکنے نہ دیتے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سید محمود کی ملازمت میں ایک طویل عرصہ گزارنے کے بعد بھی چھجو کی بنیادی وفاداری سر سید کے ساتھ ہی تھی جو آخیر دم تک قائم رہی اور اسی وجہ سے کسی مرحلے پر (غالباً اس وقت جب سید محمود الہ آباد ہائی کورٹ کے جج مقرر ہو گئے تھے اور ان کے آس پاس ملازمین کی ایک فوج موجود رہتی تھی) چھجو دوبارہ سر سید کے ذاتی ملازم کے بطور ان کی خدمت میں واپس آ گئے تھے۔ لندن سے واپس آنے کے بعد چھجو کے رتبہ میں اتنا فرق ضرور آ گیا تھا کہ اب لوگ انہیں ان کی عرفیت کے بجائے صرف عظیم اللہ کے نام سے مخاطب کرنے لگے تھے۔ انھوں نے سر سید کا عروج بھی دیکھا تھا اور وہ وقت بھی جب بوڑھاپے میں لوگ ان کو ڈوبتا سورج سمجھ کر بے اعتنائی برتنے لگے تھے لیکن اس وقت بھی چھجو ایک وفادار، مونس و غم خوار کے بطور ان کے ساتھ موجود رہے تھے جس کی شہادت ولایت حسین صاحب کی خود نوشت ''آپ بیتی'' میں سر سید کی وفات کے تذکرے میں ملتی ہے۔ ولایت حسین صاحب لکھتے ہیں کہ:

> ''میں اور عبد الباقی اس وقت ظہور حسین وارڈ میں رہتے تھے۔ سید صاحب کے جنازہ پر جانے کے لیے ظہور وارڈ سے نکلے ہی تھے کہ مولوی زین الدین صاحب ملے (غالباً مولوی زین العابدین صاحب سے مراد ہے) کہ سید صاحب کا نوکر عظیم اللہ میرے پاس آیا تھا اور سید صاحب کی تجہیز و تکفین کے لیے کچھ روپیہ مانگتا تھا میرے پاس تو کچھ تھا نہیں میں نے اس کو نواب محسن الملک کے پاس

بھیج دیا ہے''۔[11]

ایک دوسری جگہ ولایت حسین صاحب لکھتے ہیں کہ جب وہ اور عبدالباقی صاحب نواب محسن الملک کی کوٹھی پر پہنچے تو انھوں نے کہا کہ:

''سید صاحب کا نوکر عظیم اللہ کہتا ہے کہ محمد احمد کے ملازم سے دس روپے قرض لے کر وہ سامان لینے آیا ہے''۔[12]

اس کے علاوہ ایک اور جگہ ولایت حسین صاحب تحریر کرتے ہیں کہ جب انھوں نے سید صاحب کی تجہیز و تکفین کرنے کی غرض سے نواب محسن الملک سے اجازت مانگی تو نواب صاحب نے فرمایا کہ:

''نہیں تم کو انتظام کرنے کی ضرورت نہیں ہے عظیم سے دریافت کیا تھا کہ کس قدر روپے کی ضرورت ہوگی؟ عظیم نے پچاس روپے بتائے اور نواب صاحب نے فرمایا کہ'' یہ سید صاحب کا آخری چندہ ہے۔ پھر کب چندہ مانگنے آویں گے''۔ پچاس روپے عظیم کو دے دیئے''۔[13]

غرض ان حوالہ جات سے ہمیں معلوم ہوا کہ عظیم اللہ (عرف چھجو) سرسید کی وفات تک سرسید کے ساتھ تھے۔ ظاہر ہے کہ ۱۸۶۱ء سے ۱۸۹۸ء تک سرسید اور ان کے صاحبزادے سید محمود کی تقریباً ۳۷ سال تک خدمت کرنے کے بعد تقریباً ۶۰ سال کی عمر میں وہ یہ گھر چھوڑ کر تو چلے نہیں گئے ہوں گے۔ سرسید کے انتقال کے بعد سید محمود اور ان کے انتقال کے بعد مشرف بیگم (بیگم محمود) کی ملازمت میں انھوں نے سرسید ہاؤس ہی میں اپنی زندگی کے آخری دن گزارے ہوں گے۔ وہ کب تک حیات رہے اور کس سنہ میں ان کا انتقال ہوا اس سلسلے میں ہم کوئی بات وثوق سے نہیں کہہ سکتے ہیں۔

تاریخ فیروز شاہی کی تصحیح:

مرادآباد ہی میں سرسید نے اپنے تحقیقی اور تصنیفی کاموں کو دوبارہ دل جمعی سے شروع کر دیا تھا۔ اس سلسلہ میں کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی کی دعوت اور ایما پر چودھویں صدی کے ہندوستان کے مشہور مورخ ضیاالدین برنی کی ''تاریخ فیروز شاہی'' کے تین چار نسخوں کی مدد سے ایک صحیح نسخہ تیار کیا جسے ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے ۱۸۶۲ء میں شائع کیا گیا تھا۔

پروفیسر عرفان حبیب کی رائے میں، اپنی کمزوریوں کے باوجود ''سید احمد خاں کا (تاریخ فیروز شاہی کا) یہ ایڈیشن اب بھی برنی کی تاریخ کا واحد کامل ایڈیشن ہے اور دہلی سلطنت کی تاریخ کے لیے سب سے اہم ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے''۔[۱۴]

غازی پور تبادلہ:

۱۲رمئی ۱۸۶۲ء کو سرسید کا مراد آباد سے غازی پور تبادلہ ہوگیا تھا۔ غازی پور وہ اپنے دونوں صاحبزادگان (سید حامد اور سید محمود) اور بھتیجے سید محمد احمد و ملازم عظیم اللہ عرف چھجو کے ساتھ پہنچے تھے۔ غازی پور میں انھوں نے اپنی پہلی فرصت میں روڑکی سے خریدے گئے چھاپے خانہ کو لگانے کا اہتمام کیا۔ اس بات کی شہادت کہ یہ پریس جولائی ۱۸۶۲ء میں پوری طرح کام کر رہا تھا۔ سرسید کے ڈپٹی امداد علی کو لکھے خط مورخہ ۳رجولائی ۱۸۶۲ء سے ملتی ہے۔ جس میں سرسید غازی پور سے تحریر کرتے ہیں کہ:

''میں یہاں بہت خوش ہوں۔ کام بہت کم ہے۔ تصنیف کتب کو بہت فرصت ہے۔ چھاپہ خانہ فضلِ الٰہی سے جاری ہوگیا ہے۔ تفسیر چھپ رہی ہے''۔[۱۵]

غازی پور کا قیام سرسید کی زندگی میں ایک بہت ہی اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سرسید پہلی بار تصنیف وتالیف کے ساتھ عملی طور پر سماجی خدمت کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک اسکول قائم کرنا، چھاپہ خانہ لگانا اور سائنٹفک سوسائٹی کی داغ بیل ڈالنا شامل کیا جاسکتا ہے۔

غازی پور میں مدرسہ کا قیام:

سرسید اس زمانے میں بلا امتیازِ مذہب وملت تمام ہندوستانیوں کو سماجی بہتری اور ترقی کے کاموں میں اپنا شریک بناتے ہوئے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو ساتھ لے کر چلنے کی سعی کر رہے تھے۔ انھوں نے غازی پور میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے چندے سے ایک جدید نوعیت کا اسکول قائم کیا جس کی عمارت کے لیے تقریباً ۷۰ ہزار روپے جمع کرنے کے بعد مدرسہ کی عمارت کا سنگِ بنیاد راجہ دیو نرائن سنگھ اور مولانا فصیح اللہ صاحب کے ہاتھوں رکھوایا گیا تھا۔ یہ مدرسہ غازی پور میں وکٹوریہ ہائی اسکول کے نام سے اب بھی موجود ہے۔

۱۸۶۴ء کا سماجی پس منظر:

سرسید نے جب ۱۸۶۴ء میں سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزوں کے ۱۸۵۷ء کے بعد کیے گئے ظلم وستم اور قتل وغارت گری کی یادیں کچھ کچھ دھندلانے لگی تھیں۔ انگریزی سامراج کا شکنجہ ہندوستانی عوام کو پوری طرح اپنی گرفت میں جکڑ چکا تھا۔ انگریز حکومت نوآبادیاتی لوٹ کھسوٹ کو زیادہ موثر بنانے کے لیے ایک منظّم اسٹیٹ مشینری بنانے میں مصروف تھی۔ قانون کو سختی سے لاگو کر کے عوام کو ایک طرف حکومت کی غیر جانبدارانہ انصاف پسندی اور امن وامان قائم کرنے کی نیک نیتی کا یقین دلایا جارہا تھا تو دوسری طرف اسی عمل کے ذریعہ عوام کے دل میں حکومت کی دہشت بٹھائی جارہی تھی۔ سماجی رشتے بدل رہے تھے۔ کل تک جو حکومت کی طاقت کے علمبردار تھے آج قانون کے خوف سے کانپ رہے تھے۔ کل تک جن کی سماج میں کوئی حیثیت نہ تھی آج ادنیٰ سرکاری نوکریوں کے بل پر حکومت کی طاقت کے ساجھے دار بن گئے تھے۔ زمین داروں، ساہوکاروں اور نوکری پیشہ لوگوں میں انگریز حاکموں کی قدم بوسی اور خوشامد کا دور دورہ تھا۔ ہر ایک اپنے آپ کو تاج برطانیہ کا وفادار ثابت کرنے کی دوڑ میں اول رہنا چاہتا تھا۔

دوسری طرف ہندوستان کے مفلس ونادار، ان پڑھ عوام (کسان، مزدور، دستکار) معاشی، سماجی اور سیاسی ظلم وستم اور لوٹ کھسوٹ کا نشانہ بن رہے تھے۔ مقامی زمیندار اور ساہوکار ایک طرف انگریز حکمرانوں کی خوشامد اور جی حضوری کرنے میں ایک دوسرے سے نمبر لے جانے کی فکر میں رہتے تھے۔ دوسری طرف بے دخلیاں کروانے، زمینوں پر ناجائز قبضے کرنے، جھوٹے مقدمے دائر کرانے، وارنٹ نکلوانے، گرفتاریاں وقرقیاں کروانے سے لے کر کھیت کھلیانوں میں آگ لگوانے، اغوا کرانے یا قتل کروانے تک سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ یہ سب بدعنوانیاں ومظالم مقامی پولیس اور انتظامیہ کی سانٹھ گانٹھ سے ہوتی تھیں۔ زمینداروں اور ساہوکاروں کی اس لوٹ کھسوٹ کے ڈرامے میں داروغہ، تحصیل دار اور پٹواری اہم رول ادا کیا کرتے تھے۔ اسی کے ساتھ انگریزوں ہی کے توسل سے، جب ہندوستانی عوام مغرب کی جدید سائنس اور نئی نئی تکنیکی ایجادات سے پہلی مرتبہ روشناس ہوئے تو ان کے دل میں انگریزوں کے علم وہنر کی ایک دھاک سی بیٹھ گئی تھی۔

ریل، ڈاک، تار، گیس کے ہنڈے، پانی کے نلکے، بنگلے، ٹم ٹم، گھوڑے گاڑیاں،

بندوقیں، طمنچے، میز کرسیاں، ڈنر، کلب، کرکٹ، کیمپ، شکار گویا ۱۸۵۷ء سے پہلے کا کلکتہ، کا فورٹ ولیم جس طرح کا جنت نشان بنا ہوا تھا۔ ۱۸۶۴ء تک اس طرح کے چھوٹے چھوٹے مراکز ہر ضلع میں رونما ہونے لگے تھے۔ سر پر پگڑیاں باندھے، کمر میں پٹکے لگائے، لال پیلی وردیوں میں ملبوس، چپراسی، کارندے، سپاہی و پیش کار، انگریز حاکم کے جاہ وجلال کی علامت بن گئے تھے۔

کہتے ہیں کہ جب اغوا کار معصوم لوگوں کو یرغمال بنا لیتے ہیں تو ڈر وخوف اور دہشت کے ماحول میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد یرغمالیوں کے ذہن پر کچھ اس طرح کے اثرات مرتب ہوتے ہیں کہ وہ اپنے اغوا کاروں کو منصف مزاج، رحم دل اور شائستہ انسانوں کی صورت میں دیکھنے لگتے ہیں۔ اس صورت حال کو ''اسٹاک ہوم سنڈ روم'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی کے ناکام ہونے کے بعد انگریزوں نے جس بربریت، ظلم اور تشدد کو روا رکھا تھا غالباً اس ظلم اور تشدد کی دہشت ہی کا نتیجہ تھا کہ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ہندوستانی عوام انگریزوں کے عدل وانصاف، عمدہ ایڈمنسٹریشن اور اعلیٰ تہذیب اور تمدن کے گن گانے لگے تھے۔ گویا پورا شمالی ہندوستان ایک طرح کے ''اسٹاک ہوم سنڈ روم'' میں مبتلا نظر آنے لگا تھا۔

سرسید ایک سرکاری ملازم تھے اور اس دور کے دوسرے سرکاری ملازمین کی طرح وہ بھی اپنے حاکموں کو اپنی وفاداری کا یقین دلا کر ان کی خوشنودی حاصل کرنے کی سعی پیہم میں مصروف نظر آتے ہیں۔ لیکن دوسروں کے مقابلے میں سرسید کی اس سعی پیہم میں، (ذاتی مفاد یا دکھاوے کے بجائے) ان کا اعتماد اور اعتقاد صاف جھلکتا ہے۔ جس پر وہ سچے دل سے پابند نظر آتے ہیں۔ وہ ہر صورت سے انگریزوں اور ہندوستانیوں کو قریب لانا چاہتے ہیں اور مغربی علوم وفنون کو ہندوستان میں رائج کر کے ترقی کی راہوں کو ہموار کرنا چاہتے ہیں۔

سرسید کی انگریزوں کے تئیں مرعوبیت سے شروع ہونے والی داد وتحسین ۱۸۵۷ء کے بعد ایک مجبوری بن کر سرسید کو انگریزوں کی وفاداری کا دم بھرنے پر مجبور کرتی رہی۔ یہی مجبوری آہستہ آہستہ سرسید کی رواداری اور بعد ازاں ان کی وضع داری بن گئی تھی۔

سائنٹفک سوسائٹی کا قیام:

۱۸۶۳ء میں سرسید نے ایک رسالہ بابت ''التماس بخدمت ساکنانِ ہند۔ در

باب ترقیِ تعلیم اہل ہند'' شائع کیا۔ اس رسالے کے متن سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ مغربی علوم کی کتابوں کو مقامی زبان (ورنا کیولر جس سے مراد اردو ہوتی تھی) میں ترجمہ کروا کر مشتہر کرنے کے واسطے سرسید ایک سوسائٹی بنانا چاہتے تھے۔ اس رسالے کے عنوان سے ہی واضح ہوتا ہے کہ سرسید اس وقت تک ترقیِ تعلیم ''اہل ہند'' کے لیے کوشاں تھے (نہ کہ ترقیِ تعلیم ''مسلمانانِ'' ہند کے لیے) اور اس کے لیے التماس بخدمت ''ساکنانِ ہند'' سے کر رہے تھے۔ یہ وہی دور ہے جب سرسید کسی بھی مذہبی امتیاز کے بغیر ''اہل ہند'' کی ترقی کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔ یہ رسالہ جن لوگوں تک پہنچا ان میں سے بیشتر حضرات نے سرسید کے خیالات کی تائید کی اور اپنا عملی تعاون دینے کا وعدہ کر کے ان کی حوصلہ افزائی بھی کی جس کے نتیجہ میں ۹ رجنوری ۱۸۶۴ء کو غازی پور میں سرسید کے مکان واقع محلہ میاں پورہ کی لال کوٹھی (موسومہ شمس منزل) میں ایک بڑے جلسے میں (جس میں کافی تعداد میں انگریزوں اور ہندوستانیوں نے شرکت کی تھی) سائنٹفک سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔ سرسید اور لفٹنٹ ایف آئی گریہم سائنٹفک سوسائٹی کے لائف سکریٹری مقرر ہوئے۔ (سائنٹفک سوسائٹی کی تفصیلات کے لیے دیکھیے راقم کی کتاب ''سرسید اور سین ٹیفک سوسائٹی- ایک باز یافت'' شائع کردہ مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی)

غازی پور میں بچوں کی تعلیم:

سرسید اپنے بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں ہمیشہ کوشاں نظر آتے ہیں۔ سرسید کے بھتیجے سید محمد احمد خاں (جن کی ۱۸۶۲ء میں تقریباً ۱۹ سال کی عمر تھی) کی تعلیم روایتی طرز پر ہوئی تھی۔ سرسید خود ان کے درس و تدریس میں مصروف رہتے تھے۔ حالی اس سلسلے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''۱۸۵۷ء سے پہلے سرسید کو یہ خیال ہوا تھا کہ اسلام کی حمایت میں مشنریوں کے اعتراضات کے جوابات لکھے جائیں چنانچہ غدر سے پہلے بجنور میں انھوں نے کچھ کچھ بطور یادداشت کے لکھا بھی تھا اور اپنے بھتیجے سید محمد احمد کو جو اس وقت صغیر سن تھے جو کچھ لکھتے تھے بطور سبق کے پڑھاتے جاتے تھے۔ دفعتاً غدر ہو گیا اور وہ تمام یادداشتیں جاتی رہیں''۔[16]

حالی کے اس اقتباس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ سید محمد احمد کی تعلیم کی ذمہ داری سر سید نے اپنے سر لے رکھی تھی اور غالبًا اسی وجہ سے وہ انہیں اپنے ساتھ ہی رکھتے تھے۔ لیکن ۱۸۶۲ء تک تعلیم کے لوازمات اور تقاضے بدل چکے تھے۔ اب مغربی طرزِ تعلیم کا رواج ہو رہا تھا۔ خاص طور پر انگریزی زبان میں مہارت حاصل کرنے کا چلن عام ہو رہا تھا جو باعزت نوکریاں حاصل کرنے کی ضمانت بنتی جا رہی تھی۔ اسی وجہ سے سر سید اپنے بیٹوں یعنی سید حامد (عمر ۱۳ سال) اور سید محمود (عمر ۱۲ سال) کو انگریزی زبان کی تعلیم دلوانے کے خواہش مند نظر آتے ہیں۔ ہمیں قوی امید ہے کہ اس سلسلے میں غازی پور میں موجود سر سید کے جواں سال دوست، لفٹنٹ آئی ایف گریہم نے سر سید کی حتی الامکان مدد کی ہوگی۔ انہیں کے مشورے سے بچوں کو انگریزی پڑھانے کے لیے ''ٹیوٹر'' مقرر کیے گئے ہوں گے اور بچوں کے لیے اسکول کا انتخاب کیا گیا ہوگا۔ اس وقت تک سر سید نے غازی پور میں وہ اسکول قائم نہیں کیا تھا جو بعد میں وکٹوریہ ہائی اسکول کے نام سے موسوم ہوا تھا۔ اس لیے خیال اغلب ہے کہ سید محمد اور سید حامد کو غازی پور میں موجود مشن اسکول میں داخل کروایا گیا ہوگا۔ اس مفروضہ کو کہ سید محمود غازی پور میں اسکول جاتے تھے لفٹنٹ گریہم کے ایک بیان سے تقویت ملتی ہے۔ لفٹنٹ گریہم سر سید کی سوانح میں ۱۸۸۴ء میں سر سید اور سید محمود کو ایک ڈنر کے دوران وائسرائے ہند کے دائیں اور بائیں بیٹھے دیکھ کر رشک کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''میں سید احمد کو ایک چھوٹی سی جگہ غازی پور کے سب ارڈینٹ جج کی حیثیت سے جانتا تھا اور سید محمود کو ایک اسکول جانے والے بچے کے بطور'' ۔[۱۷]

اگر سید محمود غازی پور میں کسی اسکول میں نہ جاتے ہوتے تو گریہم یہ جملہ کیوں لکھتے وہ بآسانی لکھ سکتے تھے کہ:

> ''میں سید محمود کو ایک بچہ کے بطور جانتا تھا''۔

بچوں کی تعلیم کے سلسلے کی ان کوششوں میں سید محمود اپنے بڑے بھائی سید حامد کے مقابلے میں بہتر کارکردگی دکھلاتے تھے خاص طور پر انگریزی زبان سیکھنے کے سلسلے میں اور اسی وجہ سے والد کے التفات کے قدرِ زیادہ مستحق ٹھہرائے جاتے تھے۔ ہمارے اندازے کے مطابق غازی پور میں دونوں بچوں نے اسکول کی ابتدائی تعلیم مکمل کی تھی کیوں کہ اگر اس

طرح اندازہ کیا جائے کہ ۱۸۶۸ء میں سید محمود نے بنارس کے وکٹوریہ اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ ایسی صورت میں ۱۸۶۱ء سے ۱۸۶۷ء تک (یعنی دورانِ قیام غازی پور) انھوں نے غازی پور میں اسکول کے ابتدائی درجوں کی تعلیم مکمل کی ہوگی ۔ (یعنی تیسرے درجے سے پانچویں درجہ تک کی تعلیم)۔

علی گڑھ تبادلہ:

سرسید نے ۹ر جنوری ۱۸۶۴ء میں غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی اور اسی روز سے کتابوں کے ترجمے کا کام شروع کر دیا تھا۔ اس کام کے لیے بابو گنگا پرساد کو انگریزی مترجم کے بطور ۸۰ روپے ماہوار تنخواہ پر اور مولوی فیاض الحسن کو اردو (یا ورنا کیولر) مترجم کے بطور ۵۰ روپے ماہوار تنخواہ پر ۹ر جنوری ہی سے مقرر کر دیا گیا تھا۔ سرسید کے لکھنے کے مطابق بابو گنگا پرساد انگریزی کتابوں کی عبارت کا متن اردو میں مولوی فیاض الحسن صاحب کو بتلاتے تھے جو اس کو اپنی سلیس اور بامحاورہ زبان میں لکھ لیتے تھے۔ اس طرح ان دونوں کی محنت سے بہت موزوں ترجمہ تیار ہو جاتا تھا۔ یہ حضرات ایک ہفتہ میں ترجمہ کے کم از کم چار فارم ضرور تیار کر لیتے تھے۔

لیکن ابھی سوسائٹی کے قیام کو تین مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ اپریل ۱۸۶۴ء میں سرسید کا غازی پور سے علی گڑھ تبادلہ ہوگیا۔ علی گڑھ میں رہائش کے لیے کوئی عارضی بندوبست کرنا سرسید کے لیے اس وقت ممکن نہیں تھا کیوں کہ اب ان کے ساتھ دو بیٹوں اور ذاتی نوکروں کے علاوہ ایک چھاپہ خانہ اور اس کا عملہ نیز سائنٹفک سوسائٹی کا دفتر اور اس کا عملہ بھی غازی پور سے علی گڑھ منتقل ہونا تھا۔ (سرسید کے ایک بیان کے مطابق ۱۸۶۷ء میں ان کے ذاتی چھاپے خانے میں تقریباً ۲۲ لوگ کام کر رہے تھے اسی سے ہم نے اندازہ لگایا کہ تین سال پہلے یعنی ۱۸۶۴ء میں اس کے آدھے یعنی دس لوگ بھی غازی پور میں چھاپے خانے کی ملازمت میں تھے تو ان میں سے کم از کم آدھے یعنی پانچ لوگ تو ضرور ہی ''پریس'' کے ساتھ غازی پور سے علی گڑھ منتقل ہوئے ہوں گے) اس طرح ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ سین ٹیفک سوسائٹی کے آفس میں اس وقت تین لوگ ملازم تھے اور یہ تینوں حضرات یعنی بابو گنگا پرساد، مولوی فیاض الحسن اور منشی محمد یار خاں، سائنٹفک سوسائٹی کے دفتر کے ساتھ ہی غازی پور سے منتقل ہو کر علی گڑھ آئے تھے۔ اس طرح ہم سمجھ سکتے ہیں کہ ذاتی نوکروں

کے علاوہ پریس اور سین ٹیفک سوسائٹی کے عملہ کے دس بارہ ملازمین میں سے کم از کم چار پانچ لوگوں کے قیام وطعام کا انتظام سرسید ہی کے ذمہ ہوگا اسی لیے ان کو علی گڑھ میں نہ صرف ایک رہائشی مکان کی ضرورت تھی بلکہ ایک ایسے بڑے رہائشی انتظام کی ضرورت تھی جس میں ان کی رہائش کے ساتھ ہی ان کے ذاتی ''پریس'' کو غازی پور سے منتقل کر کے لگانے کے لیے کشادہ جگہ موجود ہو جس میں ''پریس'' اور سائنٹفک سوسائٹی کے عملہ کے لوگوں کے رہنے کے لیے کچھ بندوبست کرنے کی بھی گنجائش موجود ہو۔ غالباً انہیں وجوہ کی بنا پر سرسید نے علی گڑھ پہنچتے ہی ایک بڑا بنگلہ خریدنے کی کوشش کی۔ علی گڑھ میں جس جگہ اور جس نوعیت کا بنگلہ سرسید نے اپنی رہائش کے لیے پسند کیا تھا اس کو دیکھ کر حالی کا یہ کہنا بالکل درست معلوم ہوتا ہے کہ:

> ''سرسید نے یورپین طریقہ پر بود باش رکھنا۔ کوٹھی بنگلوں میں آبادی سے الگ تھلگ رہنا۔ میز کرسی لگا کر کھانا کھانا ولایت جانے سے پہلے اختیار کر لیا تھا''۔ [۱۸]

علی گڑھ میں رہائش:

علی گڑھ میں سرسید نے اپنی رہائش کے لیے پرانی چھاؤنی کے سیول کے علاقہ میں ایک بڑا بنگلہ خرید لیا تھا یہ اس زمانے کے انگریزوں کے بنگلوں کی طرز کا چھپر کا بڑا بنگلہ تھا جو ایک کشادہ احاطے کے وسط میں واقع تھا۔ یہ بنگلہ دیوانی کچہری کے قریب مسیحی قبرستان کے مغرب میں واقع تھا۔ اس بنگلہ کا رخ شمال میں موجود سرکاری سڑک کی جانب تھا (یہ سڑک اب بھی موجود ہے اور تصویر محل سے ریلوے پھاٹک سے گزرتی ہوئی نمائش میدان کی طرف جاتی ہے) اسی سڑک پر اس بنگلے کے احاطے کا پھاٹک تھا۔ اس بنگلے کے احاطے کے مشرق اور مغرب میں بھی آمدورفت کے لیے راستے موجود تھے۔ اس بنگلے کے احاطے کے جنوب میں میکاچین صاحب کا بنگلہ تھا جس کے کشادہ احاطے میں باغ لگا ہوا تھا۔ سرسید نے جو بنگلہ خریدا تھا اس کا احاطہ ''چوکور'' تھا جو تقریباً چار سو فٹ لمبا اور اتنا ہی چوڑا تھا۔ (اس طرح اس بنگلے کے احاطے کا رقبہ تقریباً سترہ ہزار مربع گز تھا) اس احاطے کے وسط میں شمال کی جانب رخ کرتے ہوئے چھپر کا ایک بڑا بنگلہ بنا ہوا تھا۔ عمارت کے سامنے لان اور باغیچے کے لیے کشادہ جگہ موجود تھی۔ احاطے کا گیٹ شمال کی جانب موجود سرکاری سڑک پر

کھلتا تھا اسی سڑک سے ساری آمد و رفت تھی۔ مکان کے جنوب میں خدمت گاروں کے لیے کوارٹر بنے تھے، جنوب مشرق میں ان کوارٹروں سے متصل چھاپے خانے کی عمارت تھی۔ یہ سب عمارتیں سرسید نے غالباً بنگلہ خریدنے کے بعد خود بنوائی تھیں۔ جس کی شہادت منشی محمد یار خاں کے سائنٹفک سوسائٹی کے اخبار کے جاری کرنے کے سلسلے کے اقرار نامہ کے ان الفاظ سے ملتی ہے:

''پرائیویٹ پریس واقع کوٹھی اور مکانات نوتعمیر اندرونِ حدود چھاؤنی سیول''۔ [19]

اقرار نامہ میں ''مکاناتِ نوتعمیر'' جیسے الفاظ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ کچھ رہائشی کوارٹرز اور پریس لگانے کے لیے عمارت بنگلہ خریدنے کے بعد سرسید نے خود بنوائی ہوگی۔

سرسید کی آمدنی و خرچ:

ہمارے اندازے کے مطابق اس وقت اس طرح کے بنگلے (جیسا سرسید نے علی گڑھ میں خریدا تھا) کی قیمت چار پانچ ہزار روپے رہی ہوگی اسی کے ساتھ اس میں چھاپہ خانے کے لیے عمارت بنوانے اور اسٹاف کی رہائش کے لیے کوارٹرز وغیرہ تعمیر کروانے پر بھی ڈیڑھ دو ہزار روپے کی لاگت آئی ہوگی جس کا مطلب ہے کہ تقریباً چھ ہزار روپے سرسید نے اس بنگلے کے خریدنے اور اس میں مزید تعمیرات کرانے پر صرف کیے ہوں گے۔ (یہ رقم آج کے تقریباً نو دس لاکھ روپے کے برابر ہوگی) ۱۸۵۷ء کے بعد سے سرسید کے ذریعہ کیا گیا یہ دوسرا بڑا خرچہ تھا۔ پہلا بڑا خرچہ اُس وقت کیا گیا تھا جب انھوں نے تقریباً تین سال پہلے ایک ''چھاپہ خانہ'' روڑکی سے خریدا تھا۔

لیکن اب سرسید کی آمدنی اتنی تھی کہ وہ ایسے خرچے بآسانی کر سکتے تھے۔ ہمارے اندازے کے مطابق اس وقت سرسید کی تنخواہ تین ساڑھے تین سو روپے ماہوار ضرور ہوگی۔ اسی کے ساتھ ۱۸۵۸ء سے ان کو گورنمنٹ کی طرف سے ۲۰۰ روپے ماہوار پولٹیکل پنشن ملنا بھی شروع ہوگئی تھی۔ اس لیے صرف تنخواہ اور پنشن کی آمدنی ہی تقریباً ساڑھے پانچ سو روپے مہینہ تھی۔ حالاں کہ اس کے علاوہ بھی سرسید کی دہلی میں موجود جائداد (جس میں کرایہ کے مکانات اور دکانیں شامل تھیں) سے بھی آمدنی ہوتی تھی جس کو فی الحال ہم ان کی ماہانہ

آمدنی میں شامل نہیں کر رہے ہیں۔ اس طرح ہم دیکھیں تو صرف تنخواہ اور پولٹیکل پنشن سے ان کی جو آمدنی تھی وہ ہمارے اندازے کے مطابق آج کے تقریباً اسی ہزار روپے مہینہ کے برابر تھی۔ اگر اس آمدنی میں سے وہ تین سو روپے ماہوار اپنے اور اپنے خاندان کے رہن سہن پر خرچ کرتے تھے تب بھی وہ تقریباً ۲۰۰ روپے ماہوار کی بچت بآسانی کر سکتے تھے جس کا مطلب ہے کہ سالانہ تقریباً ڈھائی ہزار روپے کی بچت۔ غالباً یہی سالانہ بچت سرسید ہر دو تین سال بعد یک مشت کسی بڑے خرچے کے بطور صرف کرتے تھے۔ ان کا تیسرا بڑا خرچہ اس وقت ہوا تھا جب ۱۸۶۹ء میں انھوں نے اپنے دونوں صاحبزادگان اور ملازم چھجو کے ساتھ ولایت کے سفر کا ارادہ کیا تھا اور انگلینڈ میں تقریباً ڈیڑھ سال رہنے کے بعد وہ واپس ہندوستان آئے تھے۔ انگلینڈ جانے اور وہاں رہنے کے مصارف کی تفصیل ہم آئندہ صفحات میں بیان کریں گے۔

بنگلے کا محلِ وقوع:

علی گڑھ میں سرسید نے جس بنگلے کو خریدا تھا وہ یوں تو آبادی سے الگ تھلگ تھا لیکن سرسید کی رہائش کے لیے اس وقت اس سے بہتر کوئی اور جگہ نہیں ہو سکتی تھی اول تو یہ دیوانی کچہری کی عمارت کے کافی قریب واقع تھا۔ دوسرے قریب ہی گورنمنٹ کا ایک بڑا پارک موجود تھا۔ (جس کو بعد میں سین ٹیفک سوسائٹی نے گورنمنٹ سے تجرباتی کھیتی کے واسطے پٹے میعادی پر لے لیا تھا) جہاں ہر صبح و شام سیر کے لیے جایا جا سکتا تھا۔ تیسرے انگلش گورنمنٹ اسکول بھی گھر سے بہت قریب تھا۔ علی گڑھ میں اس وقت یہی ایک اچھا اسکول تھا۔ جس کا ہیڈ ماسٹر انگریز ہوا کرتا تھا۔ اسکول کے گھر سے نزدیک ہونے کی اہمیت اس وجہ سے اور زیادہ تھی کیوں کہ جب سرسید علی گڑھ آئے تھے تو اس وقت سید محمود کی عمر ۱۴ سال اور سید حامد کی عمر ۱۵ سال کے قریب تھی۔ سرسید ضرور خواہش مند ہوں گے کہ ان کے یہ دونوں بیٹے کسی اچھے اسکول میں تعلیم حاصل کریں اور علی گڑھ میں موجود اس وقت کے سب سے اچھے انگریزی اسکول کے گھر سے اتنے قریب واقع ہونے سے سرسید کو ضرور اطمینان ہوا ہوگا کہ بچے بآسانی اس اسکول سے مستفید ہو سکیں گے۔ سید محمود نے دسمبر ۱۸۶۸ء میں میٹرک کا امتحان وکٹوریہ ہائی اسکول بنارس سے پاس کیا تھا جہاں وہ سرسید کے تبادلے کے بعد ۱۸۶۷ء کے وسط میں منتقل ہوئے تھے۔ اس لیے دیکھا جائے تو سید محمود

اور سید حامد کی اصل اسکول جانے کی عمر علی گڑھ ہی میں گزری تھی اسی لیے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اگر ان دونوں نے واقعی کہیں لمبے عرصے تک کسی اسکول میں تعلیم پائی تھی تو وہ یہی علی گڑھ کا گورنمنٹ اسکول ہی ہوسکتا تھا۔ اس مفروضہ کو اس بات سے بھی تقویت ملتی ہے کہ گورنمنٹ انگلش اسکول کے ہیڈ ماسٹر مسٹر کیڈی نہ صرف سین ٹیفک سوسائٹی کے ممبر تھے بلکہ سوسائٹی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ سرسید کے بیان کے مطابق وہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے انگلش سیکشن کی ادارت کے فرائض نبھانے میں بھی معاون ہوتے تھے۔ بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں سرسید مسٹر کیڈی سے ضرور صلح مشورہ کرتے ہوں گے اور غالباً انہی کے مشورے سے بچوں کو اس اسکول میں داخل کروایا گیا ہوگا۔

سرسید کے گھر کا ماحول:

علی گڑھ کے بنگلے اور اس کے احاطے میں سرسید اور ان کے بچوں و بھتیجے کی رہائش کے علاوہ سائنٹفک سوسائٹی کا آفس بھی قائم کیا گیا تھا جس میں کم از کم تین افراد یعنی منشی محمد یار خاں، بابو گنگا پرساد اور مولوی فیاض الحسن صاحب دن میں آفس کے اوقات میں موجود رہتے ہوں گے۔ اسی طرح پریس کے اسٹاف کے لوگ بھی اپنی ڈیوٹی کے اوقات میں بنگلے کے احاطہ میں موجود رہتے ہوں گے۔ سرسید کے ایک بیان کے مطابق ۱۸۶۷ء میں سرسید کے ذاتی چھاپے خانے میں تقریباً ۲۲ لوگ ملازم تھے ان میں ہندو، مسلمان اور عیسائی سب ہی شامل تھے۔ ان ملازمین میں ایک مسٹر چارلس ڈوینگو کمپوزیٹر کی حیثیت سے ۱۲ روپے ماہوار پر اور مسٹر فیلیکس پریس مین کی حیثیت سے ۲۰ روپے ماہوار پر ملازم تھے۔

چھاپے خانے اور سین ٹیفک سوسائٹی کے عملے کے لوگوں کے علاوہ بنگلے میں بچوں کے خاص خدمت گار عظیم اللہ (عرف چھجو) کے علاوہ دو تین باوردی، چپراسی اور بیرے ہر وقت موجود رہتے ہوں گے ساتھ ہی خانساماں، بھشتی، صفائی والا، چوکیدار، مالی اور دھوبی وغیرہ بھی شاگرد پیشے میں رہائش پذیر ہوں گے۔ سید محمود اور سید حامد کو پڑھانے کے لیے ٹیوٹر مقرر ہوں گے جو اپنے وقت پر آکر انہیں پڑھاتے ہوں گے۔ نیز صبح کے وقت بچے اسکول جاتے ہوں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ گھر میں کوئی انگلو انڈین یا انگریز گورنیس بچوں کی دیکھ ریکھ اور تعلیم و تربیت کے لیے مقرر کی گئی ہو۔ ویسے کئی انگریز ایسے تھے جن کے

سرسید سے ذاتی مراسم تھے اور اکثر وہ لوگ (مع اپنی فیملی کے) سرسید کے بنگلے پر آتے رہتے تھے۔ جن میں ڈاکٹر کلکلی (سیول سرجن، علی گڑھ)، مسٹر کیڈی (ہیڈ ماسٹر انگلش اسکول)، مسٹر میکا چین (سرسید کے پڑوسی) اور مسٹر جی ایل لینگ (جو اس وقت غالباً ڈپٹی کلکٹر تھے بعد میں کلکٹر کے بطور بھی متعین ہوئے تھے) وغیرہ شامل تھے۔ ان کے علاوہ جب کبھی لفٹنٹ جی ایف آئی گریہم (لائف سکریٹری سین ٹیفک سوسائٹی) سائنٹفک سوسائٹی کے اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے علی گڑھ آتے تھے تو سرسید کے فیملی ممبر کی طرح ان کے بنگلے میں ان کے ساتھ ہی قیام کرتے تھے۔ (اس زمانے میں گریہم صاحب غازی پور سے تبدیل ہو کر بدایوں پہنچ گئے تھے) ان انگریز دوستوں کے علاوہ سرسید کے علی گڑھ سے باہر اور علی گڑھ ڈسٹرک میں موجود ہندوستانی دوستوں، عزیزوں، صلاح کاروں اور قدر دانوں کی ایک لمبی لسٹ مرتب کی جا سکتی ہے جو اکثر و بیشتر سرسید کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوتے رہتے تھے۔ حالی بھی جب ۱۸۶۸ء میں پہلی مرتبہ سرسید سے ملے تھے تو اسی طرح کی مہمان نوازی سے بہرہ مند ہوئے تھے۔ وہ تحریر کرتے ہیں کہ:

''غالباً ۱۸۶۷ء یا ۱۸۶۸ء میں سائنٹفک سوسائٹی کا سالانہ جلسہ تھا اور دہلی سے منشی امو جان مرحوم اور جہانگیر آباد سے نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کہ یہ بھی اس وقت تک سوسائٹی کے ممبر تھے۔ علی گڑھ آ گئے تھے۔ نواب صاحب کے ہمراہ میں بھی گیا تھا گو اس وقت تک میری سرسید سے جان پہچان نہ تھی مگر چوں کہ ہم انہیں کی کوٹھی میں ٹھہرے تھے ان کے خیالات معلوم کرنے کا اکثر موقع ملتا تھا''۔[۲۰]

جب سرسید نے سائنٹفک سوسائٹی کے لیے ایک عمارت (موسومہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ) تعمیر کروائی تو اس کے آس پاس موجود وسیع احاطے میں ایک نہایت ہی عمدہ باغ آراستہ کروایا گیا تھا۔ اس باغ کا کل نقشہ اور پلاننگ مسٹر جی۔ ایل۔ لینگ کی جواں سال صاحبزادی مس لینگ نے کی تھی۔ بقول سرسید اس باغ کو منصوبہ بند طریقے پر آراستہ کرنے میں مس لینگ نے نہایت خلوص، لگن اور جاں فشانی سے کام کیا تھا۔ سرسید نے ''سفرنامہ مسافرانِ لندن'' میں ۱۸۶۹ء میں سوسائٹی کے باغ کا تذکرہ کرتے ہوئے مس لینگ کے اس کام کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا تھا:

''ہاں اس مکان (یعنی مکان سائنٹفک سوسائٹی) کا باغ ایسا عمدہ آراستہ

ہے جو بہت کم اپنا نظیر رکھتا ہے۔ وہ بھی کسی ہندوستانی کی سعی وکوشش کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک فیاض و عالی ہمت اور نیک دل، نیک خصلت، فرشتہ سیرت، ہمہ تن نیکی و سرتاپا خیر مجسم یورپین لیڈی کا نتیجہ ہے جس نے اپنے شوق اور محنت سے اس کو آراستہ کر دیا ہے"۔ ۲۱

اس اقتباس سے یہ دکھلانا مقصود تھا کہ مس لینگ کے لیے سرسید کے دل میں کس قدر عزت اور قدر و منزلت تھی اور مس لینگ نے کس قدر لگن اور محنت سے سوسائٹی کے باغ کو آراستہ کیا تھا۔ اس کام کے سلسلے میں صلاح و مشورہ کرنے کے لیے مس لینگ اکثر و بیشتر سرسید کے بنگلے میں آتی ہوں گی بلکہ ہمارا تو خیال ہے کہ سرسید کے بچوں ہی کی طرح مس لینگ بھی گھر میں خاندان کے ایک فرد کی طرح گھلی ملی رہتی ہوں گی۔ انھوں نے سوسائٹی کے مکان کے ساتھ ساتھ سرسید کے بنگلے کے باغ کو بھی ضرور آراستہ کیا ہوگا۔ بلکہ باغ کے ساتھ ساتھ مکان کے اندر کی آرائش و زیبائش میں بھی مس لینگ کے مشورے شامل حال رہتے ہوں گے۔

مس لینگ کا اسّی کی دہائی کے اوائل میں اچانک انتقال ہو گیا تھا۔ اس وقت مسٹر جی۔ ایل۔ لینگ (غالباً) آگرہ کے کمشنر تھے۔ سرسید کو مس لینگ کے انتقال سے کس قدر صدمہ پہنچا تھا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ مس لینگ کے انتقال کے بعد ہی سرسید نے انسٹی ٹیوٹ کی عمارت کے احاطے میں موجود ایک خوبصورت فوارے کو "مس لینگ کوین" کے نام سے موسوم کیا تھا اور اس پر ۱۸۸۲ء میں مندرجہ ذیل عبارت کندہ کروائی تھی۔ جو آج بھی موجود ہے۔

"اس فوارے کو جو مدت سے بنا ہوا تھا اور بسبب تیار نہ ہو سکنے پانی کے خزانہ کے بے آب پڑا تھا ممبران سین ٹیفک سوسائٹی اور رئیسان ضلع علی گڑھ و بلند شہر نے بیادگار اس توجہ و کوشش کے جو مس لینگ صاحبہ نے کوٹھی کے باغ کی آراستگی میں کی 'مس لینگ کوین' کے نام سے موسوم کیا اور آپ کے چندے سے ان کی یادگار قائم کرنے کے لیے پانی کا خزانہ بنایا۔ کنواں جس پر خزانہ بنا ہے خاص محمد عنایت اللہ خاں صاحب رئیس بھیکم پور کے...... اس فوارے سے پانی کی...... جو شعاع نور کی...... مس لینگ صاحبہ کے احسانوں کو یاد دلاتا رہے گا۔ ۱۸۸۲ء" ۲۲

(نوٹ: کہیں کہیں سے گھس جانے کی وجہ سے چند الفاظ پڑھے نہ جاسکے جن کی جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہے)

مس لینگ کے اس تذکرے سے ہم یہ بھی دکھلانا چاہتے ہیں کہ سرسید کے گھر میں ایک طرح کا آزاد خیالی بے تعصبی، کشادہ دلی اور تروتازگی کا ماحول رہتا تھا جس میں پرخلوص اور باصلاحیت ومحنتی نوجوانوں کا گزر رہتا تھا۔ بلکہ اس طرح کے لوگوں کو گھر میں خاندان کے ایک فرد جیسا ہی احترام دیا جاتا تھا۔ ہمارا یہ بھی مشاہدہ ہے کہ عموماً باصلاحیت قسم کے روشن دماغ اور مخلص نوجوان سرسید کی شخصیت سے متاثر ہوکر ان کے گرویدہ ہوجاتے تھے۔ سرسید ایسے نوجوانوں کی بھرپور ہمت افزائی کرتے تھے اوران کی صلاحیتوں کی مطابقت سے ان سے بڑے بڑے کام لینے کا ہنر جانتے تھے۔ ساتھ ہی زندگی میں ان کی ترقی کے راستوں کو ہموار کرنے اور آگے بڑھنے میں حتی الامکان ان کی مدد اور رہبری کرتے تھے۔

سرسید کے علاوہ مجھے یہ خصوصیت پنڈت جواہر لال نہرو کی شخصیت میں نظر آتی تھی۔ ان کی شخصیت میں بھی سرسید ہی کی طرح ایسی کشش موجود تھی جو باصلاحیت اور ذہین نوجوانوں کو اپنی طرف مبذول کراتی تھی اور اسی لیے ان کے آس پاس نئی نسل کے ذہین اور باصلاحیت نوجوانوں کا جم گھٹا لگا رہتا تھا۔ جن سے وہ کام لینا بھی خوب جانتے تھے اور جن کے کیریئر کو وضع کرنے میں حتی الامکان ان کی مدد بھی کرتے تھے۔

سرسید کی انگریزی زبان میں استعداد:

سرسید کے بہت سے انگریزوں سے ذاتی تعلقات تھے۔ ان سے ذاتی ملاقاتوں میں تبادلہ خیال کے لیے ہر وقت مترجم کی مدد نہیں لی جاسکتی تھی۔ جس طرح یہ انگریز ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں اپنا مطلب ادا کرسکتے تھے۔ اسی طرح سرسید بھی اسی نوع کی انگریزی میں اپنی بات سمجھا سکتے تھے۔ انگلینڈ میں ڈیڑھ سال کے دوران وہاں انگریزی کتابوں سے استفادہ کرنے اور خود اپنی لکھی ہوئی کتابوں (خاص طور پر خطبات احمدیہ) کو مترجم کے ذریعہ انگریزی میں ترجمہ کروانے کے عمل میں بھی ان کی انگریزی پڑھنے، سمجھنے اور بولنے کی صلاحیت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا تھا۔ یہ بات کہ سرسید انگریزی بول لیتے تھے۔ اس کے واضح اشارے ملتے ہیں۔ وہ خود انگلینڈ سے لکھے اپنے خط مورخہ ۲۰ راگست ۱۸۶۹ء میں محسن الملک کو تحریر کرتے ہیں:

> ''وزیر ہند سے ایک دفعہ معہ حامد اور محمود ملاقات ہوئی تھی اور دو دفعہ صرف میں تنہا ملا۔ میں نے انگریزی میں ان کی سب باتوں کا جواب دیا، سب سمجھا اور سب جواب صحیح دیئے مگر نہایت بدوخراب انگریزی میں''۔۲۳؎

یہ حقیقت ہے کہ وہ انگریزی اخبار پابندی سے پڑھتے تھے۔ان کی ہمیشہ کوشش ہوتی تھی کہ جب وہ انگریزی داں لوگوں کے سامنے انگریزی بولیں تو بالکل صحیح اور عمدہ انگریزی بولیں، اسی وجہ سے انگریزی بولنے سے جھجکتے تھے۔ لیکن جب ضروری ہوجاتا تھا تو اس سلسلے میں بے انتہا محنت کرتے تھے۔ دسمبر ۱۸۷۸ء میں سرسید دو سال کے لیے وائسرائے کی کونسل کے ممبر مقرر ہو گئے تھے۔ کونسل کی ممبری کے زمانے میں انھوں نے متعدد بل پیش کیے اور ان کی پیروی میں بہت عمدہ اور مدلل تقریریں انگریزی زبان میں کونسل کے اندر کیں جس کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ پہلے وہ خود اردو میں تقریر لکھتے تھے پھر اس کا انگریزی میں عمدہ ترجمہ کرواتے تھے جس کو وہ اردو اسکرپٹ میں لکھ کر کونسل میں پڑھتے تھے۔ اس عمل میں ان کو کس قدر محنت کرنی پڑتی تھی اس کا صحیح اندازہ اگر آج کوئی لگا سکتا ہے تو وہ نیشنل کانگریس کی موجودہ صدر محترمہ سونیا گاندھی صاحبہ ہیں جو ابھی حال تک اپنی ہندی کی تقریروں کو رومن اسکرپٹ میں لکھ کر پڑھا کرتی تھیں ۔ میرے خیال میں جتنی ہندی سونیا گاندھی صاحبہ بول اور سمجھ سکتی ہیں غالباً اتنی ہی انگریزی سرسید بول اور سمجھ سکتے تھے۔ کونسل میں کی گئی ان کی بعض تقریروں کی وائسرائے نے خود ان سے تعریف کی تھی اور مبارک باد دی تھی۔ سرسید اپنی اردو اسکرپٹ میں لکھی انگریزی تقریروں کے پڑھنے اور صحیح تلفظ ادا کرنے کے سلسلے میں گھنٹوں ریہرسل کرتے تھے اور اپنے آس پاس موجود انگریزی کے واقف کار نوجوانوں اور طالب علموں سے مدد لینے میں بھی انہیں ذرا تامل نہ ہوتا تھا۔ یہ سرسید میں موجود نئی چیزوں کو سیکھنے اور ہر چیلنج کو قبول کرنے اور ہر کام کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دینے کی صلاحیتوں کی موجودگی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تمام عمل اور انتھک محنت کے دوران سرسید کی انگریزی زبان پڑھنے، سمجھنے اور بولنے کی استعداد کئی گنا بڑھ گئی ہوگی۔ یہ ضرور ہے کہ انگریزی لکھنے میں آخر وقت تک وہ خاطر خواہ دست رس حاصل نہ کر سکے تھے۔

سائنٹفک سوسائٹی کی سرگرمیاں:

علی گڑھ میں دیوانی عدالت کے جنوب میں واقع تقریباً تین ایکڑ تین پول اور تیس راڈ آراضی سرسید نے سائنٹفک سوسائٹی کے لیے ایک عمارت تعمیر کرنے کے واسطے گورنمنٹ سے حاصل کرلی تھی۔ جس پر ۳۰؍نومبر ۱۸۶۴ء کو سائنٹفک سوسائٹی کی عمارت کا سنگِ بنیاد لفٹنٹ گورنر آنریبل اے ڈریمنڈ صاحب کے ہاتھوں رکھوایا گیا تھا۔ سوا سال کے اندر یہ عمارت تعمیر ہوگئی تھی جس کا افتتاح ۱۴؍فروری ۱۸۶۶ء کو میرٹھ ڈویژن کے کمشنر مسٹر ایف ویمس کے ہاتھوں انجام پایا تھا۔ اس عمارت کو سرسید نے انسٹی ٹیوٹ کے نام سے موسوم کیا تھا۔ انسٹی ٹیوٹ کی عمارت میں ایک بہت بڑا مرکزی ہال تھا، جس کے چاروں طرف برآمدہ تھا او ربرآمدے کے چاروں کونوں پر چار کشادہ کمرے تھے۔ جن میں سے ایک میں لائبریری، دوسرے میں ریڈنگ روم، تیسرے میں میوزیم اور تجربہ گاہ قائم کی گئی تھی چوتھا کمرا کتابوں کی اشاعت وغیرہ کے سلسلے کے کاموں کے لیے وقف تھا۔ ۳۰؍مارچ ۱۸۶۶ء سے اخبار سائنٹفک سوسائٹی یا انسٹی ٹیوٹ گزٹ بھی شائع ہونا شروع ہوگیا تھا۔ انسٹی ٹیوٹ کی عمارت کے آس پاس موجود بڑے احاطے میں ایک خوبصورت باغ لگایا گیا تھا۔ جس میں سایہ دار درخت، پھولوں کی کیاریاں، جھاڑیوں کی باڑیں، روشیں اور لان وغیرہ نہایت خوبصورتی سے آراستہ کیے گئے تھے۔ ساتھ ہی ۱۸۶۸ء میں سرسید نے دیوانی عدالت کے قریب ہی واقع پبلک گارڈن کو گورنمنٹ سے تجرباتی زراعت کے واسطے پٹہ پر لے لیا تھا تاکہ عام لوگوں کو جدید طریقوں سے کاشت کرنے کی ترغیب دی جاسکے۔ اس شعبہ کو انسٹی ٹیوٹ گارڈن کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ انسٹی ٹیوٹ کے مرکزی ہال میں عام ممبروں کے لیے لیکچرز دیئے جاتے تھے۔ جن میں اپنی بات کو 'کر' کے دیکھلانے کے لیے تجربات بھی کرکے دکھلائے جاتے تھے اور ساتھ ہی موڈلوں، چارٹوں اور نقشوں وغیرہ کی مدد سے بھی بات کو سمجھانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ (تفصیلات کے لیے دیکھیں راقم کی کتاب ''سرسید اور سین ٹیفک سوسائٹی'')

سید محمود سوسائٹی کے جلسوں میں:

سائنٹفک سوسائٹی کے اکثر جلسوں میں سید محمود کی تقاریر بھی ہوتی تھیں۔ وہ بیشتر انگریزی ہی میں تقریر کرتے تھے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ چودہ پندرہ سال کی عمر ہی میں سید محمود نے انگریزی زبان میں اچھی خاصی دسترس حاصل کرلی تھی۔ وہ چاہے لکھ کر اپنی

تقریر سامعین کے سامنے پڑھتے ہوں یا زبانی حفظ کر کے بولتے ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کی تقاریر میں سرسید ہی کے خیالات کی ترجمانی ہوتی تھی۔ جس کے لیے سید محمود کو صریحاً پہلے سے تیاری کروائی جاتی ہوگی۔ سین ٹیفک سوسائٹی کی عمارت کے افتتاح کے موقع پر سید محمود نے حاضرین کو انگریزی میں بولتے ہوئے اس طرح خطاب کیا تھا:

''اے صاحبو۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ عمدہ عمارت جو آپ لوگوں کے ذریعہ اس سوسائٹی کے لیے تعمیر کی گئی ہے اب مکمل ہوگئی ہے۔ تھوڑے ہی دن ہوئے جب اس عمارت کی بنیاد کا پہلا پتھر ہماری سوسائٹی کے مقامی پیٹرن جناب لفٹنٹ گورنر بہادر شمالی مغربی اضلاع نے اس چٹیل میدان میں جہاں اب یہ بڑی عمارت موجود ہے، رکھا تھا۔ آج ہم سب یہاں جمع ہوئے اور اس عمارت کو جناب ولیمس صاحب کمشنر بہادر کے ہاتھوں کھلتے دیکھا۔ اگرچہ ہماری سوسائٹی کا قیام اس ضلع میں صرف ایک ہی سال سے ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اس قلیل عرصہ میں بھی آپ سب صاحبان کو اس سے کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور پہنچا ہوگا۔ لیکن جو کچھ فائدے اس سے اب تک آپ لوگوں کو حاصل ہوئے ہیں وہ ان فوائد کی نسبت کچھ بھی نہیں ہیں جو ان لکچروں کو سننے سے جو آئندہ اس مکان میں مختلف موضوعات پر دیئے جائیں گے اور بجلی وگیس کی کلوں وغیرہ کے ذریعہ کیے گئے تجربات کو دیکھنے سے آپ لوگوں کو حاصل ہوں گے۔ اس عمارت کے افتتاح سے آپ لوگوں کو یہ بات یاد آئی ہوگی اور اس ضلع میں مدتوں تک اس بات کو یاد رکھا جائے گا کہ جناب برا ملے صاحب بہادر جج کی صدارت کے دوران یہ مکان تعمیر ہوا ہے۔ آج کی اس خوشی میں ایک بڑی کمی یہ رہ گئی ہے کہ سوسائٹی کے نہایت ہمدرد اور خیر خواہ آنریری سکریٹری جناب لفٹنٹ گراہم صاحب بہادر یہاں تشریف نہیں رکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کو اس جلسے میں شریک نہ ہو سکنے کا بہت افسوس ہوگا۔ خدا اس عمارت کو مدت تک قائم رکھے اور اس ضلع کے لوگوں کو اس سے فائدہ پہنچاوے''۔[۲۴]

سید حامد و سید محمود ایک موازنہ:

یہاں یہ بات کافی کھٹکتی ہے کہ سید حامد کا سین ٹیفک سوسائٹی کے جلسوں میں موجودگی کا کہیں کوئی تذکرہ نہیں ملتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہی ہو سکتی ہے کہ سید حامد، سر سید کی خواہشات کے خلاف پڑھنے لکھنے میں زیادہ دلچسپی نہ لیتے ہوں یا پھر انگریزی وغیرہ میں دسترس حاصل کرنے میں والد کی توقعات پر پورے نہ اترتے ہوں جس کی وجہ سے والد کے ان التفات سے محروم رہتے ہوں جن سے سید محمود ہمیشہ سرشار رہتے تھے۔ حالاں کہ سید حامد کی تعلیم کے لیے سر سید نے ہر ممکن کوشش کی تھی۔ بلکہ اسی غرض سے ان کو لے کر خود انگلینڈ گئے تھے۔ لیکن وہاں بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا تھا۔ جس سے سر سید خاصے ناامید ہوئے تھے۔ نواب محسن الملک کے نام انگلینڈ سے لکھے خط مورخہ ۲۰/اگست ۱۸۶۹ء سے سر سید کے احساسات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''حامد کچھ دل پڑھنے پر نہیں لگاتا۔ بہر حال گھر میں پڑھتا ہے۔ سو روپیہ مہینہ کا آدمی نوکر ہے۔ جو تین گھنٹہ آکر حامد کو اور لیٹن محمود کو پڑھاتا ہے۔ مگر حامد کا دل نہیں لگتا''۔[۲۵]

سر سید کو ان کے دونوں بیٹے ''ابا جانی'' کہتے تھے اور سر سید اپنے خطوں میں دونوں بیٹوں کو ''عزیز از جان حامد'' اور ''عزیز از جان محمود'' جیسے القاب سے مخاطب کرتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سرِسید کی اپنے بیٹوں کے لیے والہانہ محبت اور ان کو پڑھا لکھا کر ایک اچھا انسان بنانے کی خواہش ہی نے دونوں بیٹوں کے درمیان انجانے میں ایک جانبدارانہ رویہ واضح کر دیا تھا، جس نے بعد میں دونوں بیٹوں کی شخصیت پر بہت گہرے نقوش مرتب کیے تھے۔

سید حامد اپنے چھوٹے بھائی سید محمود کے مقابلے میں احساس کمتری کا شکار ہوئے اور جب والد کی توقعات کو پورا کرنے میں ناکام رہے تو ردِ عمل کے بطور والد کی توقعات کو ہی مورِدِ الزام ٹھہراتے ہوئے ان سے بدظن ہوئے یہاں تک کہ والد کی اپنی اخلاقی اور سماجی اقدار سے بھی منحرف ہوتے نظر آنے لگے۔

محمود لاڈ و پیار میں بگڑے ہوئے بچے کی مانند احساس برتری کا شکار ہوئے۔ وہ سرکشی کو خود اعتمادی، اپنی رائے کو سب سے افضل اور اپنی ذات کو سب سے اعلیٰ سمجھنے

لگے۔ یہی دونوں بھائیوں کی شخصیت کے بنیادی عناصر تھے جو وقت کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتے رہے اور آخری عمر میں ایک تضاد کی صورت میں عیاں ہوئے جس کی وجہ سے دونوں نے خود اپنی ذات کو زک پہنچا کر یک گونہ سکون محسوس کیا۔

سید حامد نوکری سے معطل کیے گئے۔ سرسید نے ان کو مزید کوئی نوکری کرنے کے بجائے گھر پر خاموش پڑے رہنے کی صلاح دی۔ شراب نوشی ان کی عادت بن چکی تھی۔ جس نے صحت کو برباد کر دیا تھا۔ معقول آمدنی نہ ہونے کے باوجود شاہانہ ٹھاٹ باٹ سے رہنے کی وجہ سے قرض کے بوجھ کے نیچے دبتے چلے گئے۔ سرسید سے ہمیشہ دور رہے۔ سرسید نے بھی کبھی ان کو آگے بڑھانے کی کوئی نمایاں کوشش نہ کی۔ علی گڑھ بھی کم آتے تھے۔ لمبی بیماری کے بعد دہلی میں انتقال ہوا۔ انتقال کے بعد اتنا قرضہ چھوڑا تھا کہ ساہوکاروں نے مقدمات دائر کرنے کی دھمکیاں دیں۔ غرض غیرت مند باپ نے بیٹے کا قرض بھی ادا کیا اور بہو اور پوتی کی کفالت کی طرف سے بھی کبھی غفلت نہیں برتی۔

سید محمود طمطراق کے ساتھ انگلستان میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد واپس آئے۔ والد نے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ لوگوں نے واجب تعظیم دی۔ ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی۔ شمالی ہند کے مسلمانوں میں اس لیاقت کا کوئی دوسرا بیرسٹر نہیں تھا۔ اسی لیے وکالت خوب چمکی۔ بے انتہا روپیہ کمایا اور اسی طرح شاہانہ انداز میں خرچ بھی کیا۔ یورپین طرزِ بود و باش انہیں مرغوب تھی۔ کئی بار (بغرض تفریح) انگلستان کا سفر کیا۔ دوست احباب کی ہر طرح سے مدد کی۔ باپ کے رہنے کے لیے ایک عالی شان بنگلہ خرید کر یورپین انداز میں آراستہ کروایا۔ جوڈیشیل سروس میں داخل ہو کر اول ڈسٹرکٹ جج اور بعد میں ہائی کورٹ کی بینچ پر جسٹس مقرر ہوئے۔ شراب نوشی کی کثرت نے صحت اور ذہن دونوں کی تابانی صلب کر لی تھی۔ اپنی رائے کو مقدم اور اپنی ذات کو افضل سمجھنے کی عادت نے اختلافات کو جنم دیا جس کی وجہ سے نوکری پر بھی لات ماردی۔ بعد میں والد سے بھی اختلافات ہوئے۔ اسی کشمکش میں ازدواجی زندگی کو بھی جہنم بنالیا۔ والد کے انتقال کے بعد خود ان کی جگہ لینے کی سعی میں اپنے اور والد کے ہمدردوں کو بھی اپنا مخالف بنا بیٹھے اور اس طرح سب سے علیحدہ ہو کر سیتاپور میں اپنے چچازاد بھائی کے گھر میں دو سال گزارنے کے بعد داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

اگر سرسید کی خانگی زندگی کی کل روداد کو مختصر طور پر بیان کیا جائے تو وہ بس اتنی ہی ہوگی جتنی اوپر بیان کی گئی ہے۔ اسی روداد کی تفصیلات زیر نظر کتاب کے آئندہ صفحات میں

تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔

ایک قدیم گروپ فوٹوگراف:

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری کے مخطوطات سیکشن میں ایک قدیم گروپ فوٹوگراف موجود ہے جس کی دو کاپیاں ہیں۔ایک ''بلیک اینڈ وہائٹ'' کاپی ہے اور دوسری ''رنگین'' کاپی ہے۔ بلیک اینڈ وہائٹ'' کاپی پر اندراج ہے کہ یہ تصویر محمد علی صاحب (سرسید کے نواسے) نے پہلی جنوری ۱۹۱۲ء کو مدرستہ العلوم کی نذر کی تھی۔ رنگین تصویر کے سلسلے میں اندراج ہے کہ یہ فوٹوگراف جے۔ایچ۔کلارک کا کھینچا ہوا ہے۔جس پر رنگ ایچ۔اے۔مرزا فوٹوگرافر و پینٹر نے کیا ہے۔ساتھ ہی تصویر کھینچنے کی تاریخ اور مقام کے سلسلے میں لکھا ہے۔''۲۵ر دسمبر ۱۸۶۵ء بمقام الہ آباد''۔ غالباً جو بلیک اینڈ وہائٹ فوٹوگراف سید محمد علی نے مدرستہ العلوم کی نذر کیا تھا اس کی ایک کاپی فوٹوگرافر جے۔ایچ۔کلارک نے تیار کی ہوگی جس پر رنگ ایچ۔اے۔مرزا فوٹوگرافر و پینٹر نے کیا ہوگا۔یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تصویر ۲۵ر دسمبر ۱۸۶۵ء کے دن ہی کھینچی گئی ہو۔لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ تصویر علی گڑھ ہی میں ان کے پرانے بنگلے میں کھینچی گئی ہے۔سرسید اس زمانے میں اکثر آگرہ سے فوٹوگرافر بلوا کر گروپ فوٹوگراف کھنچوایا کرتے تھے۔اس کی شہادت انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۶ر اپریل ۱۸۶۷ء میں شائع ہونے والی سائنٹفک سوسائٹی کے اجلاس مورخہ ۲۰ر اپریل ۱۸۶۷ء کی مندرجہ ذیل رپورٹ سے ملتی ہے:

> ''پچھلے ہفتہ کے شروع میں سوسائٹی کے ممبروں کو اطلاع دی گئی تھی کہ روز شنبہ بیسویں ماہِ حال کو تیسرا سالانہ اجلاس سوسائٹی کا منعقد ہوگا اور علاوہ اس کے ایک اور خاص اجلاس بھی ہونا ٹھہرا تھا۔اس لیے کہ ایک فوٹوگرافر جس کو عکسی تصویر کھینچنے والا کہتے ہیں تمام ممبروں کے اجلاس کی ایک تصویر کھینچنے کو آگرہ سے بلایا گیا تھا...... سوسائٹی کے ممبر جو اس روز اس جلسہ میں شریک و موجود تھے ان کا حلیہ نہایت خوبصورت تصویر کھینچنے کے لائق تھا اور وہ رئیس جو طرح بطرح کی عمدہ پوشاکیں پہنے ہوئے تھے بالتخصیص اس سے اور بھی زیادہ رونق و شان شوکت معلوم ہوتی تھی۔سوسائٹی کا مکان ان صاحبوں کے پیچھے

کیمرے سے اتاری گئی یہ سرسید کی سب سے پہلی تصویر ہے۔ جو مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں محفوظ ہے۔

فوٹو گروپ سر سید احمد خاں مع دس دیگر حضرات۔ تصویر پر تحریر ہے کہ یہ گروپ ایچ کلارک نے ۲۵/دسمبر ۱۸۶۵ء کو بمقام آلہ آباد کھینچا تھا۔ تصویر پر رنگ ایچ۔ مرزا دہلوی نے کیا تھا۔ تصویر میں موجود لوگ
۱۔ سید حامد، ۲۔ ملازم (چھجو)، ۳۔ سید محمود، ۴۔ سید زین العابدین، ۵۔ ، ۶۔ مرزا ہنو (ساکن بنارس)، ۷۔ مولوی امداد علی، ۸۔ راجہ جے کشن داس، ۹۔ سر سید احمد خاں، ۱۰۔ مرزا رحمت اللہ بیگ، ۱۱۔ رائے بلدیو بخش (ڈپٹی کلکٹر)
ہمارے مفروضہ کے مطابق یہ تصویر علی گڑھ میں کھینچی گئی تھی۔ اس پر رنگ بیس کی دہائی میں مرزا برادرز کینات پلیس دہلی نے کیا تھا۔ نمبر پانچ پر موجود صاحب سر سید کے بھتیجے سید محمد احمد خاں ہیں۔

جو بیک گراؤنڈ کے طور پر تھا تصویر کشی کے لیے نہایت موزوں
ومناسب تھا مگر افسوس کی یہ بات ہے کہ وہ دن بہت چڑھ گیا تھا اور
اچھی تصویر عکسی کے لائق نہ رہا تھا بعد اس کے سب صاحب سوسائٹی
کے بڑے کمرے میں رونق افروز ہوئے''۔۲۶؎

ہمارا خیال ہے کہ اسی طرح کے کسی موقع پر یہ تصویر علی گڑھ میں سرسید کے پرانے بنگلے پر کھینچی گئی ہوگی جس میں گھر کے افراد کے ساتھ باہر سے آئے ہوئے وہ احباب بھی شریک ہوئے ہوں گے جو سرسید کے ساتھ ہی بطور مہمان ان کے بنگلے میں مقیم ہوں گے۔ اس گروپ فوٹوگراف میں موجود افراد کے نام نیچے ہاتھ سے لکھے ہوئے ہیں۔ یہ نام غالباً بعد میں فوٹوگراف میں موجود لوگوں کی شناخت کر کے درج کیے گئے تھے۔ جو اس طرح ہیں۔

(۱) سید حامد۔ (۲) چھجو (نوکر)۔ (۳) سید محمود۔ (۴) ایم۔زین العابدین۔ (۵) نام کی جگہ خالی چھوڑ دی گئی۔ (۶) مرزا نبو آف بنارس۔ (۷) مولوی امداد علی۔ (۸) راجہ جے کشن داس۔ (۹) سرسید احمد خاں۔ (۱۰) مرزا رحمت اللہ بیگ۔ (۱۱) رائے بلدیو بخش (ڈپٹی کلکٹر) (دیکھیے کتاب کی ابتدا میں موجود تصویر)

اس تصویر میں نمبر ۵ پر جو صاحب موجود ہیں غالباً ان کی شناخت نہ ہو سکی تھی۔ اسی وجہ سے نمبر ۵ پر کسی کا نام درج نہیں کیا گیا تھا۔ چوں کہ اس تصویر میں سرسید کے خاندان کے اس وقت وہاں موجود بھی لوگ موجود ہیں۔ اس لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ اس وقت سرسید کے ساتھ ہی رہنے والے ان کے ایک قریبی عزیز اس تصویر میں شامل نہ ہوئے ہوں۔ اسی لیے ہم یہ یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ تصویر میں نمبر ۵ پر سرسید کے بھتیجے سید محمد احمد خاں کھڑے ہیں ۔ جو اس وقت سرسید کے ساتھ علی گڑھ میں رہائش پذیر تھے۔

اس تصویر میں سب حضرات جس طرح کا لباس زیب تن کیے ہوئے ہیں اس سے ہم نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ اس وقت کے شرفا بغیر کسی امتیاز کے تقریباً ایک ہی طرح کا لباس زیب تن کرتے تھے۔ جو ان کی مخلوط تہذیب کا آئینہ دار تھا۔ اس سلسلے میں حالی نے شکایتاً اپنی رائے ظاہر کی ہے جس سے ہمارے مفروضہ کی تصدیق ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''لباس جس کی نسبت ہمارے بزرگوں کا یہ قول تھا کہ ''الناس
باللّباس'' اور جس سے ایک قوم کی دوسری قوم سے تمیز کی جاتی ہے،
ہندوستان کے مسلمانوں نے اس میں کوئی امتیاز باقی نہیں رکھا۔

انگرکھا، پاجامہ، ٹوپی، عمامہ، پگڑی یا جوتا غرض کہ کوئی چیز مسلمانوں کے لباس میں ایسی نہیں ہے جس پر قومی خصوصیت کا اطلاق ہو سکے۔ ہندو مسلمان میں پہلے صرف الٹے اور سیدھے پردہ کی تمیز تھی مگر جب سے اچکن کا رواج ہوا ہے یہ تمیز بھی باقی نہیں رہی''۔[۲۷]

شرفا میں سر ڈھانکنے کا چلن عام تھا جس کے لیے عموماً ٹوپی، عمامہ، پگڑی وغیرہ کا استعمال کیا جاتا تھا جن کی متعدد اقسام اور نوعیتیں تھیں۔ ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کے بعد انگریز افسران حتی الامکان کوشش کرتے تھے کہ ان کے ہندوستانی ماتحت یورپین لباس اور انگریزی جوتے وغیرہ پہن کر ان کی خدمت میں حاضر نہ ہوں۔ اگر کوئی ہندوستانی یورپین لباس اور جوتے پہن کر کسی انگریز افسر کے اجلاس میں پیش ہو جائے تو اسے انگریز افسر کی توہین کرنے کے مصداق سمجھا جاتا تھا۔ حالاں کہ انگریزوں کا یہ متعصبانہ رویہ ۱۸۶۴ء تک بہت حد تک تبدیل ہو گیا تھا لیکن پھر بھی بعض انگریز افسر کسی نہ کسی حد تک ابھی بھی اس طرح کے معاملات میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرنے سے باز نہیں آتے تھے۔ اس سلسلے میں سرسید کو خود چند تلخ تجربے ہو چکے تھے۔ وہ ان انگریز افسروں سے ملنے سے ہمیشہ کتراتے تھے جن کے حضور میں پیش ہونے کے لیے جوتے اتارنا ضروری ہوں۔

سمیع اللہ خاں۔ روداد اختلاف:

سمیع اللہ خاں صاحب سرسید سے تقریباً ۱۷ سال چھوٹے تھے۔ ان کی پیدائش دہلی میں ۱۹۳۴ء میں ہوئی تھی۔ سمیع اللہ خاں صاحب کا سرسید سے کوئی حقیقی رشتہ نہ تھا۔ مبہم قسم کی دور کی عزیز داری ضرور نکالی جا سکتی ہے۔ ڈیوڈ لیلیویلڈ کے مطابق سمیع اللہ خاں غالباً سرسید کے منجھلے خالو یعنی مولوی خلیل اللہ خاں کے بھائی محمد عزیز اللہ خاں عرف میاں محمد جان کے صاحبزادے تھے۔[۲۸] (حالاں کہ ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ لیلیویلڈ کا یہ بیان صحیح نہیں ہے۔ آغا مرزا کی والدہ منور زمانی بیگم خلیل اللہ خاں کی بیٹی ضرور تھیں لیکن یہ وہ خلیل اللہ خاں نہیں تھے جو سرسید کے خالو تھے۔ غالباً ناموں کی مماثلت کی وجہ سے ڈیوید لیلیویلڈ کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے)۔ سمیع اللہ خاں عرف میاں محمود جان کے بڑے بھائی کا نام شاہ محمد علیم اللہ عرف میاں احمد جان تھا۔ ۲۲ سال کی عمر میں یعنی ۱۸۵۶ء میں سمیع اللہ خاں نے انگریزی

تعینات تھے) کام سیکھنا شروع کیا۔ کتنے عرصے انھوں نے بجنور میں قیام کیا۔ نیز ۱۸۵۷ء کے پر آشوب زمانے میں وہ کہاں تھے۔ اس سلسلے میں ہم کوئی بات وثوق سے نہیں کہہ سکتے ہیں۔ بہرحال ہمیں یہ معلوم ہے کہ ۱۸۵۸ء میں منصفی کا امتحان پاس کر لینے کے بعد ان کا پہلا تقرر کانپور میں ہوا تھا۔ نیز ۴ سال بعد یعنی ۱۸۶۲ء میں انھوں نے لیاقت کے سلسلے کی رسمی پابندیاں پوری کرنے کے بعد ہائی کورٹ میں وکالت شروع کر دی تھی۔ اس وقت ہائی کورٹ کی بینچ آگرہ میں قائم تھی۔ بعد میں جب ہائی کورٹ کی بینچ (۱۸۶۵ء میں) آگرہ سے الہ آباد منتقل ہوئی تو سمیع اللہ خاں بھی آگرہ سے الہ آباد منتقل ہو گئے تھے۔ لیکن ۱۸۷۳ء میں سمیع اللہ خاں نے دوبارہ عدلیہ کی ملازمت اختیار کی اور سب آرڈینٹ جج کے بطور ان کا پہلا تقرر ۱۸۷۳ء میں علی گڑھ میں ہوا۔ ابتدا ہی سے سمیع اللہ خاں اور سر سید کے مابین رفاقت اور رقابت کا ایک عجیب سا رشتہ نظر آتا ہے۔ یہ رفاقت اور رقابت مدرسۃ العلوم کے قیام سے بھی دس پندرہ سال پہلے سے ان دونوں کے درمیان دیکھی جا سکتی ہے جسے ایک طرح سے خاندانی چشمک سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

چوں کہ ۱۸۵۶ء میں سمیع اللہ خاں نے اپنے کیریئر کی شروعات بجنور میں سر سید کی عدالت میں کام سیکھنے ہی سے کی تھی اور منصفی کے امتحان کی تیاری میں بھی ان کی مدد حاصل کی تھی اسی وجہ سے جب سر سید نے ۱۸۶۴ء میں غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی کے قیام کا اعلان کیا اور ان ۱۰۹ لوگوں کے نام پڑھ کر سنائے جنھوں نے سوسائٹی کا ممبر بننا منظور کیا تھا تو ان میں سمیع اللہ خاں کا نام بھی موجود تھا۔ لیکن جلد ہی ایک ایسا وقت آیا جب سمیع اللہ خاں نہ صرف سائنٹفک سوسائٹی کی ممبرشپ سے مستعفی ہو گئے بلکہ سوسائٹی کے سخت مخالف بن گئے تھے انھوں نے اخباروں میں اعلان کروایا تھا کہ جو شخص سائنٹفک سوسائٹی میں شریک ہو گا وہ کافر ہو گا۔ ہم اس سلسلے کی تفصیلات کے لیے حالی کا مندرجہ ذیل اقتباس پیش کرنے کی اجازت چاہیں گے:

> ”جب سائنٹفک سوسائٹی نے الفسٹن کی ہسٹری آف انڈیا کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں شائع کیا۔ اس میں مصنف نے مسلمانوں کی سلطنت ہند کا حال شروع کرنے سے پہلے جہاں اسلام کا آغاز اور عرب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیدا ہونے کا حال بیان کیا تھا وہاں آپ کی نسبت (عیاذاً باللہ) پیغمبر باطل کا لفظ لکھا تھا۔ اردو میں بھی

اس کا اسی طرح ترجمہ بے کم و کاست کیا گیا۔ مگر سر سید نے جارج سیل
کے ترجمہ قرآن اور اس کے دیباچہ سے اور کرنل کینڈی کی کتاب سے
اور نیز تاریخ طبری سے چند مقام جن سے مصنف کے قول کی تردید
ہوسکتی تھی، فٹ نوٹ میں نقل کر دیئے تھے۔ مگر ان نوٹوں سے
مسلمانوں کی ناراضگی کم نہ ہوئی۔ جب یہ حصہ چھپ کر ممبروں کے
پاس پہنچا تو مولوی سمیع اللہ خاں نے اس امر پر کہ پیغمبر کے لفظ کے
ساتھ باطل کیوں ترجمہ کیا گیا، سخت مخالفت کی اور ایک تحریر جس میں
(بقول سر سید کے) ان کے کفر و ارتداد پر اسی لفظ کے ترجمہ ہونے
سے استدلال کیا گیا تھا۔ اخباروں میں شائع کروائی، اس میں یہ بھی
لکھا تھا کہ جو شخص سوسائٹی میں شریک ہو وہ کافر ہے۔ چنانچہ اکثر
مسلمان بزرگوں نے سوسائٹی کی ممبری سے استعفیٰ دے دیا''۔۲۹

بہر حال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سر سید کے ذریعہ قائم کیے گئے اداروں میں سمیع اللہ خاں صاحب ابتدا میں شمولیت کے لیے رضا مند تو ہو جاتے ہیں لیکن ان کے کام کرنے کے انداز اور مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہو پاتے ہیں اور اسی وجہ سے نتیجتاً ان سے علیحدگی اختیار کر لیتے ہیں۔

لندن کے دوران قیام لکھے گئے چند خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ سر سید کی رائے ابتدا سے سمیع اللہ خاں اور ان کے بڑے بھائی کے سلسلے میں بہت خوش کن نہیں تھی۔ وہ لندن سے محسن الملک کے نام لکھے گئے اپنے خط مورخہ ۳ رجولائی ۱۸۶۹ء میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''نہایت افسوس اور رنج کی بات ہے کہ میں احباب کا نام لکھتا ہوں
اور اس میں مولوی سمیع اللہ خاں کا نام نہیں لکھتا اور جو کہ وہ اپنے تئیں
اتقا میں جنید و شبلی و ابوحنیفہ سے مقدم اور لوگوں کو یا فاسق، گنہگار یا
کافر، مرتد سمجھتے ہیں اور دانائی اور دور اندیشی میں بھی اپنے برابر کسی کو
نہیں جانتے اور حقارت کی نگاہ سے ہر ایک کو دیکھتے ہیں اس لیے میں
نہیں چاہتا کہ آپ ان سے کچھ تذکرہ اس کا (چندے کا) کریں اور
حقیقت میں وہ شریک نہیں ہونے کے اور نہ دیں گے۔ آئندہ آپ کو
اختیار ہے''۔۳۰

اسی کے ساتھ سر سید لندن ہی سے محسن الملک کے نام اپنے خط مورخہ ۲۶ رنومبر

۱۸۶۹ء میں سمیع اللہ خاں کے متعلق تحریر کرتے ہیں کہ:

''مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کی طرف سے جو میرے دل میں رنج وملال آیا ہے اس کا مجھ کو رنج ہوا ہے۔ وہ بچے ہیں۔ انھوں نے دنیا نہیں دیکھی۔ دوستی ومحبت کے معاملات وبرتاؤ سے محض ناواقف ہیں۔.........ان کو مزہ محبت اور دوستی کا مطلق معلوم نہیں ہے۔ سچ یہ ہے کہ جس شخص نے ایک گھڑی بھی عشق نہیں برتا وہ نہ خدا کی دوستی کا مزہ جانتا ہے اور نہ انسان کی دوستی کا اور نہ محبت کے لائق ہے۔ ان کی ناتجربہ کاری ہے جو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ میں کسی کے سننے کہنے میں ان کی طرف سے رنجیدہ ہوا ہوں۔''[۳۱]

سرسید نے مندرجہ بالا خطوط میں سمیع اللہ خاں صاحب کی ذات سے متعلق جو صفات گنوائی ہیں وہ صحیح ہوں یا غلط لیکن یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ سمیع اللہ خاں صاحب کو اپنے سرکاری عہدے اور منصب کا احساس اور کسی حد تک غرور ضرور تھا۔ ان کے مزاج میں تختی کے ساتھ ساتھ افسرانہ شان کی بوباس بھی جھلکتی ہے۔ اسی لیے سرسید کا سمیع اللہ خاں صاحب کے بارے میں یہ کہنا کہ: ''دانائی اور دوراندیشی میں اپنے برابر کسی کو نہیں جانتے اور حقارت کی نگاہ سے ہر ایک کو دیکھتے ہیں''۔ کسی حد تک صحیح معلوم ہوتا ہے اور غالباً اسی خصوصیت کی وجہ سے ان کے سرسید سے اکثر اختلافات ہوتے رہتے تھے۔ جو لوگ ان کی دانائی اور دوراندیشی کے قائل ہوجاتے تھے ان سے وہ نہ صرف خوش رہتے تھے بلکہ ان کی ہر معاملے میں حمایت اور مدد بھی کرتے تھے۔

سرسید ہمیشہ ذاتی اختلافات کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے تھے اور ہر آدمی سے (چاہے اس سے اختلاف ہی کیوں نہ رکھتے ہوں) اس کی شخصیت اور مزاج کی مطابقت سے کام لینے کی قدرت رکھتے تھے محسن الملک کی سمیع اللہ خاں کے سلسلے کی وکالت نے سرسید کو جلد اپنے اختلافات کو بھلا کر دوبارہ سمیع اللہ خاں کو اپنے فلاحی کاموں میں شریک کرنے کے لیے آمادہ کرلیا تھا۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ ان ابتدائی اختلافات کے باوجود سمیع اللہ خاں مدرسۃ العلوم کے قیام کے وقت سرسید کے شانہ بشانہ موجود تھے۔ لیکن یہاں بھی ''آغازِ سفر'' اختلافات سے ہی ہوا تھا اور ''قطع تعلق'' پر اس سفر کا اختتام ہوا، جس کی مختصر روداد ہم آئندہ صفحات میں پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

سید محمد احمد خاں و دوسرے عزیز:

سرسید کے بڑے بھائی کے صاحبزادے سید محمد احمد خاں جو ۱۸۴۳ء میں پیدا ہوئے تھے والد کے انتقال کے بعد سے سرسید کی دیکھ ریکھ میں ہی پرورش پاتے رہے تھے اور دس بارہ سال کی عمر سے تعلیم مکمل کرنے کی خاطر سرسید ان کو اپنے ساتھ ہی رکھتے تھے۔ سرسید کے علی گڑھ کے دورانِ قیام بھی سید محمد احمد خاں ان کے ساتھ ہی علی گڑھ میں رہ رہے تھے۔ لیکن ۱۸۶۷ء میں جب کہ ان کی عمر تقریباً ۲۴ سال کی تھی انھوں نے منصفی کا امتحان پاس کرنے کے بعد عدلیہ کی ملازمت اختیار کر لی تھی اور علیحدہ سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کا پہلا تقرر کہاں ہوا تھا۔ اس کے بارے میں ہم کوئی بات وثوق سے نہیں کہہ سکتے ہیں۔ سید محمد احمد خاں کی شادی خاندان ہی میں رشتہ کی ایک بہن سے ہوئی تھی جن کا نام سعیدۃ النساء بیگم تھا۔[۳۲] سید محمد احمد خاں کی ایک ہی بہن تھیں۔ جو عمر میں ان سے بڑی تھیں۔ ان کی شادی غالباً ۱۸۶۱ء کے آس پاس سید میر علی سے ہوئی تھی۔ (شادی کے سنہ کا تقرر ہم نے اس بات سے کیا کہ ان کے بڑے صاحبزادے سید محمد علی کی پیدائش ۱۸۶۲ء کے آس پاس ہوئی تھی) سید محمد علی کے علاوہ ان کے دو بیٹے اور تھے منجھلے صاحبزادے کا نام سید محمود علی اور چھوٹے صاحبزادے کا نام سید احمد علی تھا۔ سید محمود علی کا انتقال اس وقت ہو گیا تھا جب یہ ۱۸۹۲ء میں کالج سے بی اے کا امتحان پاس کر چکے تھے۔ جہاں تک سرسید کے کچھ دوسرے مگر قریبی عزیزوں کا تعلق ہے حالی ایک جگہ تحریر کرتے ہیں کہ:

> ''اپنے خالہ زاد بھائی کے نواسوں کو انھوں نے بالکل اپنی اولاد کی طرح اپنے پاس رکھا اور جب تک وہ انگلستان نہیں گئے ان کی تعلیم میں، تربیت میں، کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا''۔[۳۳]

حالی کا مندرجہ بالا بیان ہمارے لیے ایک معمہ بنا ہوا ہے۔ کیوں کہ سرسید کی والدہ کی دو چھوٹی بہنیں تھیں (یعنی سرسید کی صرف دو خالائیں تھیں) جن میں سے چھوٹی خالہ کی بیٹی (پارسا بیگم) سے خود سرسید کی شادی ہوئی تھی (اور ہمارے مفروضہ کے مطابق ان کا کوئی بھائی نہیں تھا) سرسید کی منجھلی خالہ فاطمہ بیگم کی شادی مولوی خلیل اللہ خاں سے ہوئی تھی۔ ظاہر ہے ان کے صاحبزادے ہی سرسید کے وہ خالہ زاد بھائی ہو سکتے ہیں جن کے نواسوں کا تذکرہ حالی نے مندرجہ بالا بیان میں کیا ہے۔ لیکن ہم باوجود کوشش کے یہ معلوم

کرنے سے قاصر رہے کہ وہ کون سے خالہ زاد بھائی تھے اور ان کے کون سے وہ نواسے تھے جن کو سرسید نے اپنی اولاد کی طرح اپنے پاس رکھا اور جب تک وہ انگلستان نہ گئے ان کی تعلیم وتربیت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ اس کتاب کے قارئین میں سے کوئی صاحب اگر اس سلسلے میں ہماری مدد کر سکیں تو ہم ان کے مشکور ہوں گے۔

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ:

دی علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ یا اخبار سین ٹیفک سوسائٹی ۳۰ ر مارچ ۱۸۶۶ء سے انگریزی اور اردو میں شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ اس کے پہلے ایڈیٹر منشی محمد یار خاں تھے۔ حالاں کہ ادارت کے کل کام کی دیکھ بھال سرسید خود ہی کرتے تھے۔ لیکن گورنمنٹ سروس میں ہونے کی وجہ سے وہ اپنا نام ایڈیٹر کے بطور اخبار میں نہیں لکھ سکتے تھے۔ اسی لیے گزٹ کے شائع کرنے کے سلسلے میں بھی منشی محمد یار خاں نے ہی مورخہ ۶ ر مارچ ۱۸۶۶ء کو ایک اقرارنامہ گورنمنٹ میں داخل کیا تھا جس کی رو سے وہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ یا اخبار سین ٹیفیک سوسائٹی کے مشتہر کرنے والے تھے اور اس لیے وہی اس اخبار کے پہلے ایڈیٹر مقرر کیے گئے تھے۔ منشی محمد یار خاں کے علاوہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے عملے میں منشی چوکھن لال (مترجم) بابو درگا پرشاد (مترجم) اور شیخ فدا علی (لائبریرین جو گزٹ کے دسٹری بیوشن کے انچارج تھے) بھی متعین تھے۔ نیز ان لوگوں کے ساتھ گزٹ کے دفتر میں ایک دفتری یا آفس ریکارڈ کیپر بھی مقرر کیا گیا تھا۔

گورنمنٹ اور عوام سے رابطہ قائم کرنے، رائے عامہ کو ہموار کرنے اور لوگوں تک اپنا نقطہ نظر پہنچانے اور ان کو اپنا ہمنوا و ہم خیال بنانے کے سلسلے میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ سرسید کے لیے سب سے موثر آلہ کار ثابت ہوا تھا۔ سوسائٹی کے وہ مقاصد جو ترجمہ کر کے کتابیں شائع کرنے سے پورے نہ ہو سکے تھے۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے بڑی حد تک انھیں پورا کر دکھلایا تھا۔ مدرسۃ العلوم کے قیام اور اس کے پروان چڑھنے تک انسٹی ٹیوٹ گزٹ عوامی رابطہ کا سب سے موثر آلہ کار بنا رہا تھا۔

سرسید کا علی گڑھ سے بنارس تبادلہ:

اگست ۱۸۶۷ء میں سرسید کا علی گڑھ سے بنارس تبادلہ ہو گیا تھا۔ جہاں انھوں نے ۶ ر اگست ۱۸۶۷ء کو عدالت خفیفہ (اسمال کاز کورٹ) کے جج کے بطور چارج لیا تھا۔

بنارس میں تقریباً ۹ سال ملازمت کرنے کے بعد ۳۱ رجولائی ۱۸۷۶ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوکر اگست ۱۸۷۶ء کے پہلے ہفتہ میں علی گڑھ آکر ''سرسید ہاؤس'' میں رہائش پذیر ہوئے تھے۔ بنارس ہی کے قیام کے دوران مارچ ۱۸۶۹ء سے اکتوبر ۱۸۷۰ء تک سرسید مع اپنے دونوں صاحبزادگان اور ملازم چھجو کے تقریباً ڈیڑھ سال تک انگلینڈ میں بھی رہے تھے۔

سید محمود کو اسکالرشپ:

سید محمود نے دسمبر ۱۹۶۸ء میں میٹرک کا امتحان وکٹوریہ ہائی اسکول بنارس (جس کا الحاق کلکتہ یونیورسٹی سے تھا) سے اول درجہ (یعنی فرسٹ ڈویژن) میں پاس کیا تھا۔ (وہ اگست ۱۸۶۷ء میں علی گڑھ سے بنارس منتقل ہوئے تھے۔ غالباً انھوں نے بنارس پہنچ کر دسمبر ۱۸۶۷ء میں یعنی چار مہینے کے بعد ہی نویں کلاس پاس کی ہوگی۔)

انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۵ رفروری ۱۸۶۹ء کے مطابق مسٹر آر۔ سیمن نے اپنے خط مورخہ ۲۳ رجنوری ۱۸۶۹ء کے ذریعہ سرسید کو مطلع کیا کہ —

> ۱۔ گورنمنٹ کے آرڈر نمبر A-102 کی رو سے مجھے یہ ہدایت کی گئی ہے کہ میں آپ کو مطلع کروں کہ جناب لفٹنٹ گورنر صاحب نے آپ کے صاحبزادے سید محمود کو اس صوبہ سے انگلیند میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے سالِ رواں کے اسکالرشپ کے لیے منتخب کیا ہے۔
>
> ۲۔ گورنمنٹ آف انڈیا کے ہوم ڈیپارٹمنٹ کو مطلع کر دیا گیا ہے کہ آپ کے صاحبزادے ہندوستان سے، آئندہ ماہ مئی میں، سمندر کے راستے (انگلستان کے لیے) روانہ ہوں گے۔[۳۴]

دراصل ان دنوں گورنمنٹ نے ہندوستانی طالب علموں کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے انگلستان بھیجنے کے لیے نو اسکالرشپ دینے منظور کیے تھے۔ جس کے رو سے ہر امیدوار کو تین ہزار روپے کرایہ کے خرچ کے بطور دیئے جانے کے علاوہ چھ ہزار روپے سالانہ دیا جانا منظور ہوا تھا۔ انھیں میں سے ایک اسکالرشپ کے لیے سید محمود کا انتخاب کیا گیا تھا جس کی اطلاع مسٹر آر۔ سیمن کے مندرجہ بالا خط کے ذریعہ سرسید کو دی گئی تھی۔ سرسید نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے بڑے صاحبزادے، سید حامد کو ساتھ لے کر سید محمود کے ساتھ لندن جانے کا قصد کرلیا تھا۔

انگلستان جانے کے لیے سرسید کی درخواست:

انگلستان جانے کی اجازت حاصل کرنے کے لیے جو درخواست سرسید نے گورنمنٹ میں داخل کی تھی اُس کا متن مندرجہ ذیل تھا:

میرا یہ یقین ہے کہ ہندوستان کی دائمی بقا اور برٹش گورنمنٹ (جس کی ملازمت کا مجھے فخر حاصل ہے) کو مستحکم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہندوستانیوں اور یورپین لوگوں کو باہم میل ملاپ کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کیے جانا چاہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ زیادہ سے زیادہ ہندوستانیوں کو یورپ جانے کی ترغیب دی جائے تا کہ وہ خود اپنی آنکھوں سے مغربی تہذیب وتمدن کی حیرت انگیز ترقی کو دیکھ سکیں، اور اس طرح صرف سنی سنائی باتوں کے بجائے خود اپنے مشاہدے سے انگلینڈ کی دولت وثروت، طاقت وحکمت کا اندازہ کر سکیں اور اس طرح ہندوستان کی بقا اور ترقی کے لیے کچھ کارآمد سبق سیکھ سکیں جیسے انگلینڈ کے تجارتی طور طریقے اور اس کی ہر آن بڑھتی دولت وثروت وسائنس کی وجہ سے ہونے والی صنعتی وزراعتی ترقی نیز شہروں واسپتالوں وغیرہ میں رائج صفائی ستھرائی کے عمدہ انتظامات وغیرہ۔ میں اس خواہش کے ساتھ لندن جانا چاہتا ہوں تا کہ اپنے ہم وطنوں کے سامنے ایک مثال قائم کر سکوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ نہ صرف میں خود اس سفر سے مستفید ہوں گا بلکہ اس سفر کے نتائج سے اپنے ہم وطنوں کو آگاہ کر کے ان کی بھی خدمت کر سکوں گا اور وہ بھی وہ سب کچھ سیکھ سکیں گے جو میں خود وہاں سیکھوں گا۔ اور اس طرح میں اُن کو وہ سب کرنے پر آمادہ کر سکوں گا جو میں نے کیا ہے۔ میں یہ جان کر مزید شکر گزار ہوں کہ گورنمنٹ نے ازراہِ کرم ونوازش سید محمود (پسر مولوی سید احمد خاں) کو جنھوں نے اس سال کلکتہ یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پہلے گریڈ میں پاس کیا ہے، اس صوبے سے انگلینڈ کے اسکالرشپ کے واسطے منتخب کیا ہے"۔[۳۵]

سرسید کی اس درخواست سے اُن مقاصد پر پر روشنی پڑتی ہے جن کے حصول کی خاطر سرسید لندن کا سفر کرنا چاہتے تھے۔ جیسا کہ اس درخواست کے متن سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید ابھی تک ''اپنے ہم وطنوں'' کو کارآمد آگاہی دے کر ''ہندوستان'' کی بقا کے لیے کچھ کرنے کی فکر میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ حالانکہ لسانیاتی تنازعہ خاص طور پر ناگری رسم الخط کے مسئلے کا اختلاف اردو، ہندی کے درمیان بڑی خلیج بنتا جارہا تھا۔ لیکن ابھی یہ تنازعہ اتنا نہیں بڑھا تھا کہ سرسید کی ''فکر'' پر اثر انداز ہوسکتا۔ حالاں کہ بعد میں اس مسئلے نے سرسید کی فکر کے دائرے کو مسلمانانِ ہند کی تعلیمی کم مائیگی کو رفع کرنے تک محدود کردیا تھا اور اسی طرز فکر کے نتیجے میں ۱۸۷۵ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج یا مدرسۃ العلوم کا قیام عمل میں آیا تھا۔ بہرحال جب سرسید نے انگلستان جانے کا قصد کیا تو یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ مخالفوں نے کہا کہ اب سید صاحب باقاعدہ عیسائی ہونے کی غرض سے انگلستان جارہے ہیں۔ دوسری طرف حالی جیسے سرسید کے معتقد نے اس سفر کو بھی سرسید کی عین دینی خدمت کے مترادف ٹھہراتے ہوئے لکھا تھا کہ سرسید نے ولیم میور کی کتاب ''دی لائف آف محمد'' کا منہ توڑ جواب لکھنے کے لیے ہی انگلستان جانا منظور کیا تھا۔

ولیم میور کی کتاب کا جواب:

حیات جاوید میں سرسید کے جن کاموں کے بارے میں ''شخصیت سازی'' کی نیت سے واجبی سی مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے اُن میں یہ بات بھی شامل کی جاسکتی ہے کہ سرسید نے ولیم میور کی کتاب ''دی لائف آف محمد'' کا جواب لکھنے کی غرض سے ہی لندن جانے کا قصد کیا تھا۔

دراصل ''حیات جاوید'' کے بین السطور ہی سے یہ بات نکلتی ہے اور وہیں سے عام ہوئی ہے۔ حالاں کہ حالی نے خود بھی اس بات کو مفروضہ کے بطور بھی لکھا تھا کہ:

> ''آخر کار جب انھوں نے دیکھا کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ہندوستان کے تمام کتب خانے برباد ہوگئے ہیں اور جن کتابوں کی اس کے لیے ضرورت ہے وہ یہاں دستیاب نہیں ہوسکتیں تو ان کو ولایت جانے کا خیال ہوا چنانچہ ایک ہی دو برس بعد جب سید محمود کا ولایت جانا قرار پایا تو وہ بھی ان کے ساتھ روانہ ہوگئے''۔[۳۶]

حقیقت یہی معلوم ہوتی ہے کہ ولیم میور کی یہ کتاب جب ہندوستان میں سرسید کی نظر سے گزری تھی۔ اُس وقت اُن کو سخت افسوس ہوا تھا (اس کتاب کا پہلا اور دوسرا حصہ ۱۸۵۸ء میں اور تیسرا اور چوتھا حصہ ۱۸۶۱ء میں شائع ہوا تھا) اور انھوں نے اس کتاب کا معقول جواب لکھنے کا ارادہ کرلیا تھا لیکن جہاں تک ہمارا خیال ہے لندن جانے کی ترجیحات میں اس کتاب کا جواب لکھنا شامل نہ تھا۔ ورنہ وہ لندن سے محسن الملک کو اپنے خط مورخہ ۴/جون ۱۸۶۹ء کو شکایتاً مندرجہ ذیل جملے کیوں لکھتے:

> ''مجھ کو نہایت افسوس ہے کہ بعض احباب نالائق مثلاً مولوی زین العابدین نے میرا ارادہ درباب تحریر جواب کتاب میور صاحب جو نسبت آنحضرت کے لکھی ہے، سست کردیا اور بروقت روانگی سامان اور چندہ کرنے نہیں دیا۔ یہاں اس کے جواب کا اس قدر سامان ہے کہ بیان نہیں ہوسکتا۔ خصوصاً وہ عالم انگریز جس نے وہ کتاب لکھی ہے جن کا پہلے میں نے ذکر کیا ہے ایسا عمدہ شخص اس کے جواب (لکھنے) کے لائق ہے کہ بیان نہیں ہوسکتا۔ بہر حال میں کچھ نہ کچھ نسبت جواب سر ولیم میور صاحب ضرور کروں گا''۔[۳۷]

اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ لندن پہنچنے کے بعد جب سرسید نے وہاں کے کتب خانوں کو دیکھا اور اُن کی ملاقات انگریز عالم جان ڈیوٹ پوٹ سے ہوئی (جنھوں نے حمایت اسلام میں ایک عمدہ کتاب لکھی تھی جس کو سرسید نے انگلینڈ ہی میں اپنے پیسے سے چھپوا کر مشتہر کیا تھا) اور سرسید کو اپنی تحریروں کو انگریزی میں ترجمہ کروانے کے عمدہ امکانات نظر آئے تو ان کو ایک بار پھر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھنے کا خیال آیا، جس کو انھوں نے اپنی عادت کے مطابق پوری تن دہی، لگن اور انہماک کے ساتھ انجام دیا۔

سرسید کا لباس:

سرسید کو ان کے دوستوں نے مشورہ دیا تھا کہ جب وہ انگلینڈ آئیں تو ہندوستانی لباس زیب تن کرکے نہ آئیں ورنہ خواہ مخواہ تماشہ بنے گا۔ مسٹر ہٹن نے انگلینڈ آنے کے لیے سرسید کو ترکی میں رائج کوٹ پتلون (جو بڑی حد تک یورپین طرز کا ہوتا تھا) پہننے کی صلاح دی تھی۔ سرسید نے جب انگلستان جانے کے لیے (ترکی طرز کے) کوٹ پتلون کو اپنایا تو

ان کے اس عمل کو، عام مسلمانوں میں، ان کی انگریز پرستی پر محمول کیا گیا۔ وہیں دوسری طرف حالی نے ان کے اس عمل کو ایک نیک فال قرار دیتے ہوئے انکشاف کیا کہ سرسید نے ترکی طرز کے کوٹ پتلون کو زیب تن کر کے ہندوستانی مسلمانوں کی ایک بڑی خدمت انجام دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''سرسید کو ہمیشہ یہ خیال رہا کہ ہندوستان کے مسلمان بھی اور قوموں کی طرح اپنے لباس میں کوئی خصوصیت اور مابہ الامتیاز پیدا کریں۔ اور چوں کہ بقول ان کے، آج ہندوستان میں کوئی مسلمان اتھارٹی ایسی موجود نہیں ہے، جو ایک نیشنل لباس اختراع کرے اور اس کے رواج دینے پر زور دے اس لیے انھوں نے مسلمانوں کی ایک معزز ترین قوم یعنی ترکوں کا لباس اول خود اختیار کر کے قوم میں ایک مثال قائم کی ہے''۔ ۳۸؎

سرسید سے عقیدت مندی کے تقاضہ کے بطور یہ ضروری نہیں تھا کہ ان کی زندگی کے ہر عمل کو دینی اور قومی خدمت کے رنگ و روغن سے آراستہ کر کے عوام کے سامنے پیش کیا جاتا لیکن ہوا کچھ ایسا ہی اور ''شخصیت سازی'' کی اس دوڑ میں ان کے ہر ادنیٰ اور اعلیٰ عمل کو دینی و قومی خدمت کے رنگ و روغن سے آراستہ کر کے عوام کے سامنے پیش کیا گیا جس کے نتیجہ میں سرسید کی اصل شخصیت پر اکثر و بیشتر ان کے خیر خواہوں اور عقیدت مندوں کی اپنی نیک خواہشات کا ایسا ملمع چڑھ گیا ہے جس سے سرسید کے اصل خد و خال بیشتر دھندھلا گئے ہیں۔ اسی لیے ہم دیکھیں گے کہ حالی کے اس دعوے کے باوجود کہ سرسید ہندوستانی مسلمانوں کے لیے لباس کے سلسلے میں ایک علیحدہ پہچان بنانے کے خواہش مند تھے۔ انھوں نے مدرسۃ العلوم کے طلبا کو کسی مخصوص لباس کو اختیار کرنے کے سلسلے میں کبھی کوئی ترغیب نہیں دی تھی۔

سرسید اور ترکی ٹوپی:

سرسید نے انگلینڈ جانے کے لیے ترکی طرز کے (یورپین) کوٹ پتلون کو اپنا کر یہ بھرم قائم رکھنے کی کوشش کی تھی کہ وہ یورپین لباس کے بجائے اسلامی نژاد ''ترکی'' لباس زیب تن کر کے انگلستان جا رہے ہیں۔ ہندوستانی لباس میں سر ڈھانپنے کا رواج ہمیشہ سے رہا ہے۔ جس کے لیے عمامہ، صافہ، پگڑی اور متعدد اقسام کی ٹوپیاں رائج تھیں۔ غالباً ان

میں سے کوئی بھی ٹوپی یوروپین طرز کے کوٹ پتلون کے ساتھ استعمال کرنے کے لیے متناسب اور ہم پلہ نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اسی لیے سرسید نے اپنے لیے (ترکی طرز کے کوٹ پتلون کے ساتھ) ''فیض کیپ'' کو منتخب کیا جوان کو کوٹ پتلون کے ساتھ استعمال کرنے کے لیے متناسب اور ہم رتبہ نظر آئی۔ یہ ٹوپی عموماً ''مراکو'' کے باحیثیت لوگوں کی پسندیدہ ٹوپی سمجھی جاتی تھی اور غالباً مراکو کے شہر ''فیض'' کے نام پر ہی اس ٹوپی کا نام ''فیض کیپ'' پڑ گیا تھا۔ لیکن بعد میں یہ کس طرح ترکی ٹوپی کہلائی جانے لگی اس سلسلے میں ہم کوئی بات وثوق سے نہیں کہہ سکتے ہیں لیکن ہمارا قیاس ہے کہ اس ٹوپی کو زیادہ عام فہم اور پسندیدہ مسلم پہچان دینے کی نیت سے فیض کیپ کے بجائے ''ترکی ٹوپی'' کہا جانے لگا تھا۔

سرسید نے انگلینڈ سے واپس آنے کے بعد بھی اس ٹوپی کا استعمال جاری رکھا تھا لیکن مدرسۃ العلوم کے طلبا کو خود کبھی اس ٹوپی کے استعمال کرنے کی ترغیب نہیں دی تھی۔ یہاں تک کہ وہ طلبا جو اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ جانے کا قصد کرتے تھے۔ ان کو بھی انگلینڈ میں سوٹ کے ساتھ ترکی ٹوپی پہننے کی صلاح نہیں دی جاتی تھی۔ اس مفروضہ کے ثبوت کے بطور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین (۱۸۹۷ء) میں شائع شدہ تعلیم انگلستان کے (حصہ دوم) سلسلے میں جہاں سوالات کے جوابات تحریر کیے گئے ہیں ان میں اس سوال کے جواب میں کہ انگلستان کے لیے ''کس طرح کے کپڑے وقت روانگی ساتھ لے جانا کافی ہوں گے؟''۔ مندرجہ ذیل کپڑوں کی لسٹ درج کی گئی ہے جو انگلینڈ جاتے وقت ساتھ لے جانا ضروری بتلائے گئے تھے۔

> ''ہلکے فلالین کے سوٹ دو عدد، گرم سوٹ سیاہ ا عدد، بھاری اوورکوٹ ا عدد، سفید قمیض ۶ عدد، کالر ۶ عدد، نکٹایاں ۳ عدد، جرابیں جوڑی ۶ عدد، رومال ۶ عدد دو ہلکے بنیان ۴ عدد، انگریزی ٹوپی ا عدد، رات کے سونے کے کپڑے دو جوڑی (جو کپڑے ہوں وہ انگریزی دوکان کے سلے ہوئے ہونے چاہئیں'')۔ ۳۹ے

قیاس یہ ہی ہے کہ یہ جوابات سرسید خود ہی لکھا کرتے تھے۔ اس جواب میں انگریزی ٹوپی ساتھ لے جانے کا مشورہ تو دیا گیا ہے لیکن اس میں کہیں بھی ''فیض کیپ'' یا ''ترکی ٹوپی'' کے سلسلے کا کوئی اشارہ موجود نہیں ہے۔ سرسید کے زمانے میں مدرسۃ العلوم کے طلبا کے لیے کوئی مخصوص یونیفارم تجویز نہیں کی گئی تھی۔ عام طور پر تصویروں میں طلبا مغربی

طرز کا سوٹ بوٹ زیب تن کیے نظر آتے ہیں۔ ''بُو'' لگانے اور ہاتھ میں عمدہ چھڑی رکھنے کا فیشن (غالباً) عام تھا۔ لیکن بعد کی بیشتر تصویروں میں طلبا سوٹ بوٹ کے ساتھ ''فیض کیپ'' لگائے ہوئے بھی دیکھے جاسکتے ہیں جو غالباً طلبا کے اپنے شوق سے رواج پا رہی تھی۔

کالج میں یونیفارم:

ایم اے او کالج اور اسکول کے طلبا کے لیے پہلی بار یونیفارم کا نفاذ سرسید کے انتقال کے دس گیارہ سال بعد ۱۹۰۹ء میں وقار الملک کے دورِ سکریٹری شپ میں کیا گیا تھا۔ جس میں ٹرکش کوٹ پتلون اور ترکی ٹوپی کو شامل کیا گیا تھا۔ دراصل ترکی ٹوپی (یا فیض) کا استعمال حیدرآباد میں عام تھا۔ اور چوں کہ وقار الملک حیدرآباد میں کافی عرصہ رہنے کے باعث اس کے استعمال سے خاصے مانوس تھے اس لیے اس کو یونیفارم کا حصہ بنانا ان کے لیے واجبی سا عمل تھا۔ اس وقت (یعنی ۱۹۰۹ء میں) جو یونیفارم کالج اور اسکول کے طلبا کے لیے نافذ کی گئی تھی اس کے سلسلے کی مفصل اطلاع ہمیں اجلاس سنڈیکیٹ منعقدہ ۱۹ر دسمبر ۱۹۰۹ء کی روائیداد سے ملتی ہے۔ جس میں درج ہے کہ:

> ''کامل یونیفارم سے سیاہ بلیو بلیک ٹرکش کوٹ اور سفید پتلون یا پتلون نما پائجامہ اور ترکی ٹوپی اور انگریزی جوتا مراد ہے اور یونیفارم ہر طالب علم پر اوقات کالج و اسکول میں عام جلسوں میں یونین کی میٹنگوں اور ڈائننگ ہال وغیرہ میں لازم ہوگا''۔ [۴۰]

علی گڑھ کٹ پائجامہ اور شیروانی:

علی گڑھ کٹ پائجامہ کی ایجاد اور رواج یونیفارم کے سلسلے کے اسی مندرجہ بالا آرڈر کا مرہون منت معلوم ہوتا ہے، جس میں ''سفید پتلون یا پتلون نما پائجامہ'' پہننے کی تلقین کی گئی تھی۔ شیروانی یونیورسٹی کی یونیفارم میں بہت بعد میں شامل کی گئی تھی۔ جہاں تک شیروانی کا تعلق ہے قیاس یہ ہی ہے کہ بطور لباس اس کا ارتقا عہد وسطیٰ کے انگرکھے سے ہی ہوا ہے۔ اس ارتقائی سلسلے میں انگرکھے سے چپکن نے جنم لیا (ترکی لفظ ''چپاں''، لمبی قطع کے لباس کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ اردو لفظ ''چپکن'' اسی ترکی لفظ سے ماخوذ ہو[۴۱]) چپکن سے اچکن نکلی اور اچکن نے ایک طویل سفر طے کرنے کے بعد شیروانی کی صورت اختیار کر لی۔ کچھ لوگ شیروانی کو ٹرکش کوٹ کی تبدیل شدہ شکل بھی گنواتے ہیں۔ حیدرآباد کی

ریاست میں چیکن اور اچکن جیسے لمبے لباس اور ترکی ٹوپی عموماً نوابین اور اہل ثروت لوگوں کے خدمت گاروں کے لباس میں شامل تھی۔ بہر حال کالی شیروانی، سفید پائجامہ اور ترکی ٹوپی (یا فیض کیپ) علی گڑھ میں ۱۹۲۰ء میں یونیورسٹی کے قیام کے بعد ہی یونیفارم کے بطور نافذ ہوئی تھی۔

علی گڑھ میں فیض بنام ترکی ٹوپی:

علی گڑھ میں ترکی ٹوپی حالاں کہ یونیورسٹی کے طلبا کی یونیفارم کا حصہ تھی لیکن پھر بھی طلبا میں مقبولِ عام ہونے کے بجائے مجبوراً رسمی مواقعوں پر استعمال کی جاتی تھی ''نرم قسم'' کی ترکی ٹوپی نمائش جاتے وقت طلبا اپنی جیب میں اس لیے رکھ لیتے تھے تا کہ اگر پراکٹوریل مانیٹروں کا سامنا ہو جائے تو ضابطہ کی کارروائی سے بچنے کے لیے سر پر لگالی جائے۔ یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر ضیاء الدین احمد جو ہمیشہ ترکی ٹوپی کا استعمال کرتے تھے خود اس ٹوپی کی افادیت کے قائل نہیں تھے۔ بلکہ ایک زمانے میں تو انھوں نے اس ٹوپی کے بجائے کسی دوسری قسم کی ٹوپی کو یونیورسٹی کے طلبا کی یونیفارم کا حصہ بنانے کے لیے کافی جستجو بھی کی تھی۔ اس سلسلے میں ہم سر ضیاء الدین کے مندرجہ ذیل مراسلات کا حوالہ پیش کرنا چاہیں گے۔

ہندوستان ٹائمز کے ایڈیٹر مسٹر جوزف کو ترکی ٹوپی (یا فیض کیپ) کے سلسلے میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر ضیاء الدین احمد کے ایک بیان کی ٹائپ شدہ کاپی مورخہ ۱۲/نومبر ۱۹۳۵ء موصول ہوئی تھی لیکن چوں کہ اس پر وائس چانسلر کے دستخط موجود نہیں تھے اس لیے ایڈیٹر نے اسے اخبار میں چھاپنے کے بجائے اپنے ایک خط کے ساتھ اس بات کی وضاحت چاہتے ہوئے کہ یہ واقعی سر ضیاء الدین کا بیان ہے۔ وائس چانسلر کو واپس کر دیا تھا۔ اس خط کے جواب میں سر ضیاء الدین احمد نے جو خط لکھا تھا وہ مندرجہ ذیل ہے:

''ڈیر مسٹر جوزف

میں آپ کے خط مورخہ ۱۲/نومبر ۱۹۳۵ء کے لیے آپ کا مشکور ہوں۔ میں نے خود یہ بیان جاری کیا ہے اور میں آپ کا احسان مند ہوں گا اگر آپ اس کو شائع کر سکیں۔ ذاتی طور پر میں ''فیض'' کے خلاف ہوں، خاص طور پر اس لیے کہ یہ کافی گراں قیمت ٹوپی ہے اور اسی وجہ سے کسی ایسی ٹوپی کو ترجیح دینا چاہوں گا جو مقامی طور پر واجب قیمت میں تیار کی جا سکے اور ہر لباس کے ساتھ استعمال کرنے کے لیے

موزوں ہو۔ میں اس سلسلے میں ضروری اقدامات اٹھا رہا ہوں لیکن چوں کہ ابھی تک کسی مناسب ٹوپی کا انتظام نہ ہوسکنے کی مجبوری کی وجہ سے ہم موجودہ معمول کو بدستور جاری رکھنے کے لیے مجبور ہیں۔ نیز طلبا کے لیے کسی دوسری ٹوپی کو رائج کرنے سے پہلے یونیورسٹی کے قاعدے قانون میں بھی تبدیلی کرنا ضروری ہوگی''۔۴۲

اسی کے ساتھ وائس چانسلر سر ضیاء الدین احمد نے اپنے خط مورخہ ۲۸ نومبر ۱۹۳۵ء بنام انصاری برادرز، چاندنی چوک، دہلی، میں تحریر کیا تھا کہ:

''یہ صحیح نہیں ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی نے اپنے طلبا کے لیے ''فیض'' کا استعمال موقوف کردیا ہے۔ فیض اب بھی ہماری یونیفارم کا حصہ ہے۔ لیکن مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر ''فیض'' کے استعمال پر لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ (i) یہ ٹوپی ملک کے باہر تیار کی جاتی ہے۔ (ii) یہ کافی گراں ہوتی ہے۔ (iii) یہ خاصی وزنی ہوتی ہے۔ (iv) یہ دھوپ سے کوئی تحفظ مہیا نہیں کرتی ہے۔ اگر آپ ایک ایسی ٹوپی کا نمونہ تیار کرسکیں جس کی قیمت آٹھ سے بارہ روپیہ کے اندر ہو اور جو ملک کے اندر ہی تیار کی گئی ہو اور جو دھوپ سے بچاؤ کے لیے بھی استعمال کی جاسکے۔ جس میں تہہ کیا جانے والا دھوپ سے بچاؤ کے لیے 'شید' موجود ہو، تو ہم ایسی ٹوپی کو بخوشی یونیفارم میں شامل کرنے پر غور کرسکتے ہیں''۔۴۳

وائس چانسلر سر ضیاء الدین احمد کے مندرجہ بالا خطوط سے صاف نظر آتا ہے کہ ''فیض کیپ''، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی یونیفارم میں مقبول ہونے کے بجائے مجبوری کے بطور جاری تھی۔ دراصل خلافت، عدم تعاون اور سودیشی کی تحریکوں کے دوران، چرخہ کاتنا، کھادی پہننا اور گاندھی ٹوپی لگانا مسلمانوں میں بڑے پیمانے پر رائج ہو چکا تھا۔ ۱۹۳۵ء تک عام مسلمانوں میں مسلم لیگ کا غلبہ نہیں ہوا تھا۔ ایسے ماحول میں ''فیض کیپ'' جو باہر سے بن کر آتی تھی، بیگانی سی ہوکر رہ گئی تھی اور اسی مجبوری کی بنا پر سر ضیاء الدین احمد اس بوجھ کو علی گڑھ کے سر سے اتار دینا چاہتے تھے۔ اس عمل میں سر ضیاء الدین کو چاہے فوری کامیابی نہ ملی ہو لیکن وقت کے ساتھ علی گڑھ میں ''فیض کیپ'' کا استعمال آہستہ آہستہ مسدود ہوتا چلا

گیا تھا۔ یہاں تک کہ آزادی کے بعد جب ۱۹۴۹ء میں ہم خود پہلی بار علی گڑھ (اسکول میں) آئے تو اس وقت تک فیض کیپ کا چلن تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ ہمارے ہوسٹل کے بیرے مجید میاں کے علاوہ شاید مختار صاحب (سابق پراکٹر) ہی ان گنے چنے اساتذہ میں سے ایک تھے جو باقاعدگی کے ساتھ ''فیض کیپ'' کا استعمال کرتے تھے۔

قصہ ٹوپی کا:

دیکھا جائے تو ہندوستانی سیاست میں ٹوپی نے شروع ہی سے بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ ہندوستان کی جنگِ آزادی کے دوران کھدر کی سفید ''گاندھی ٹوپی'' سب سے زیادہ باعزت اور مقبول پہناوا سمجھی جاتی تھی جو ایک طرح سے انگریزوں کے خلاف آزادی کی لڑائی لڑنے والے وطن پرستوں کی علامت بن گئی تھی۔ چالیس کی دہائی میں اپنی پہچان کے بطور مسلم لیگ نے ''جناح کیپ'' کو رائج کرنے کی کوشش کی تھی۔ آزادی کے فوراً بعد تو رنگا رنگ ٹوپیوں کی جیسے بہار آ گئی تھی۔ کانگریسی سفید گاندھی ٹوپی استعمال کرتے تھے۔ سوشلسٹ لال ٹوپی لگاتے تھے۔ آر ایس ایس کے لوگ کالی ٹوپی پہنتے تھے۔ ریپبلک پارٹی کے ممبر نیلی ٹوپی لگاتے تھے۔ اور جن سنگھ کے ہمدرد زعفرانی ٹوپی سے پہچانے جاتے تھے۔ لیکن آج کل سیاست میں ٹوپی لگا کر اپنی پہچان بنانے کے بجائے بعض پارٹیاں ٹوپی اچھالنے کے انداز کی مہارت سے بھی اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہو رہی ہیں۔

مرزا خداداد بیگ کا انگلستان جانا:

مارچ ۱۸۶۹ء میں سرسید اپنے دونوں صاحبزادگان یعنی سید حامد اور سید محمود اور خادم عظیم اللہ (عرف چھجو) اور مرزا خداداد بیگ کے ساتھ بنارس سے انگلستان جانے کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ سرسید اور ان کے صاحبزادگان کے ساتھ مرزا خداداد بیگ کے لندن جانے کے سلسلے میں ہمیں ہمیشہ یہ تجسس رہا تھا کہ یہ کون صاحب تھے؟ اور کیوں انگلستان گئے تھے؟ اس سلسلے میں ہمیں جو اطلاعات فراہم ہو سکیں وہ درج ذیل ہیں۔

مرزا خداداد بیگ کا دہلی کے ایک متوسط خاندان سے تعلق تھا۔ بچپن میں مرزا خداداد بیگ اور ان کے چچازاد بھائی سرسید کے صاحبزادگان یعنی سید حامد اور سید محمود کے ساتھ ہی کھیلا کرتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے پرآشوب زمانے میں مرزا خداداد بیگ کے بڑے چچا مرزا عاشور بیگ دہلی ہی میں انگریز افواج کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ خداداد بیگ کے

منجھلے چچا مرزا مغل بیگ مع اہل وعیال شہر کے باہر سید حسن رسول نما رحمۃ اللہ کی درگاہ کے آس پاس موجود کھنڈروں میں پناہ گزیں رہے تھے۔ بعد میں وہ اپنے پورے خاندان کے ساتھ الور چلے گئے تھے۔ جہاں ان کے ہم زلف نواب امین اللہ خاں عرف منشی امو جان ریاست کے وزیر اعظم تھے۔ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد ریاست الور سے نکلنا پڑا۔ بعد میں مرزا مغل اپنے بھائی مرزا عباس بیگ کے بلاوے پر سیتاپور پہنچے۔ مرزا عباس بیگ (والد مرزا خداداد بیگ) سیتاپور میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے اور بعد میں بڑے گاؤں سیتاپور کے تعلق دار ہوئے۔ ان کے تین صاحبزادے تھے۔ جن میں سے منجھلے صاحبزادے کا نام مرزا خداداد بیگ تھا۔ ساٹھ کی دہائی کے اواخیر میں یہ تینوں بھائی لکھنؤ میں تعلیم پا رہے تھے۔ ان کے ساتھ ہی ان کے چچازاد بھائی آغا مرزا بیگ (جو بعد میں حیدرآباد کی ریاست میں سرور جنگ کے خطاب سے مشہور ہوئے) بھی تعلیم کی خاطر اپنے چچازاد بھائیوں کے ساتھ لکھنؤ ہی میں رہ رہے تھے۔ ۱۸۶۸ء میں مرزا خداداد بیگ نے کیننگ کالج سے انٹرنس پاس کیا تھا۔ اور سرکار سے انگلستان جانے کے لیے وظیفہ حاصل کیا تھا[۴۴] وہ سرسید کے ساتھ ہی مارچ ۱۸۶۹ء میں انگلستان گئے تھے۔ انگلستان میں وہ سرسید کے ساتھ ہی رہے اور ان کے ساتھ ہی تقریباً ڈیڑھ سال بعد واپس ہندوستان آئے تھے۔ مرزا خداداد بیگ غالباً سول سروس کے امتحان میں شریک ہونے کے لیے انگلستان گئے تھے۔ سرسید ان کی صلاحیتوں اور کارکردگی سے بہت مطمئن نہیں تھے۔ اسی لیے جب ان کے امتحان کا نتیجہ نکلا تو اس وقت سرسید نے اپنے خط بنام محسن الملک مورخہ ۱۵رمئی ۱۸۷۰ء میں تحریر کیا تھا کہ:

> ''مرزا خداداد بیگ امتحان میں ناقص نکلے۔ اور بہت نیچا ان کا نمبر رہا اور آئندہ بھی مجھے توقع نہیں ہے''۔[۴۵]

مرزا خداداد بیگ اکتوبر ۱۸۷۰ء میں سرسید کے ساتھ ہی انگلستان سے واپس ہندوستان پہنچے تھے۔ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد وہ دوبارہ انگلستان واپس چلے گئے تھے۔ جس کی شہادت سید محمود کے ۱۴راگست ۱۸۷۱ء کو کیمبرج سے لکھے ایک خط کے حوالے سے ملتی ہے۔ نیز ۲۶راگست ۱۸۷۱ء کے خط میں بھی ان کی لندن میں موجودگی کا تذکرہ ہے۔ یہ دونوں خطوط حافظ احمد حسن صاحب کے نام لکھے گئے تھے۔ جو اس وقت لندن میں مقیم تھے۔ مرزا خداداد بیگ دوسری مرتبہ لندن کیوں گئے تھے اور کب تک وہاں مقیم رہے تھے اس سلسلے میں ہمیں کوئی باوثوق اطلاع نہ مل سکی لیکن بعد کے چند حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا خداداد

بیگ کافی عرصہ تک اودھ میں تحصیل داری کے عہدے پر بھی متعین رہے تھے۔

انگلستان جانے کی تیاریاں:

سرسید نے انگلستان جانے سے پہلے وہاں کے معاشرے کے بارے میں پوری معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی تھی اور اپنے آپ کو اس طرزِ معاشرت سے متعارف کروانے کے لیے کافی محنت بھی کی تھی۔ مسٹر ساتیہ جو بنارس میں سرسید کے پڑوسی تھے اور سرسید کی کوٹھی سے متصل کوٹھی میں رہا کرتے تھے اس سلسلے میں سرسید کے لیے کافی مددگار ثابت ہوئے تھے۔ طعام وکلام کی جزیات سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے ایسا بندوبست کیا گیا تھا کہ ایک دن شام کا کھانا سرسید مسٹر ساتیہ کے گھر پر نوش فرماتے اور ایک دن مسٹر ساتیہ سرسید کے گھر پر ڈنر تناول فرماتے تھے--- حالی کے بیان کے مطابق سرسید پان زردہ (یعنی پان تمباکو کے ساتھ) بہ کثرت کھاتے تھے اور حقہ پینے کے برسوں سے عادی تھے۔ لیکن انگلستان جانے سے پہلے پان کھانا یک قلم ترک کردیا تھا اور حقہ کے بجائے سگریٹ پینا شروع کردی تھی۔ حالاں کہ انگلینڈ سے واپس آنے کے بعد سگریٹ کے بجائے سگار پینے کو ترجیح دیتے تھے۔ لیکن گھر پر باقاعدہ حقہ پینا دوبارہ شروع دیا تھا اور غالباً پان بھی کھانے لگے تھے۔

انگلستان کے لیے روانگی:

یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو سرسید مع اپنے دونوں صاحبزادگان یعنی سید حامد (عمر ۲۰ سال) وسید محمود (عمر ۱۹ سال) اور مرزا خداداد بیگ (سید حامد کے ہم عمر) و ملازم عظیم اللہ (عرف چھجو) کے ساتھ بنارس سے انگلستان جانے کے لیے روانہ ہوئے اور ۱۵/اپریل ۱۸۶۹ء کو قریب چھ بجے شام بمبئی سے دخانی جہاز ''بڑودا'' کے ذریعہ سفر کا آغاز ہوا۔ سفر کے آخری مرحلے میں ۶/مئی ۱۸۶۹ کو پونے آٹھ بجے (غالباً صبح) پیرس سے روانہ ہوکر تین گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد ۶/مئی ۱۸۶۹ء ہی کی سہ پہر کے قریب لندن پہنچے۔ جہاں عارضی طور پر دوروز ''چیرنگ کراس'' ہوٹل میں قیام کیا بعد میں مستقل قیام کے لیے ۲۱ میکلین برک اسکوائر، لندن، ڈبلیو۔سی میں منتقل ہوگئے۔ انگلستان کے سفر اور لندن کے تقریباً ڈیڑھ سال کے دورانِ قیام میں سرسید نے اپنے سفرنامہ میں متعدد ایسے مشاہدات درج کیے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مغربی رہن سہن اور بودوباش کے طور طریقوں میں گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ مثلاً جس جہاز میں انھوں نے سفر کیا اس کے غسل خانوں میں

گرم اور ٹھنڈے پانی کے نلکوں کی موجودگی، کموڈ میں پانی کے ذریعہ زنجیر کھینچنے پر صفائی کا انتظام، نہانے کے لیے ٹب وغیرہ کی موجودگی، لندن میں رہائشی مکانوں میں سونے، کھانے اور بیٹھنے وپڑھنے وغیرہ کے لیے علیحدہ علیحدہ کمروں کے استعمال وغیرہ کا انھوں نے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ مدرسۃ العلوم کے رہائشی مکانات کا ابتدائی پلان بھی سرسید کے مغربی رہن سہن کے سلسلے میں انہیں مشاہدات کی غمازی کرتا ہے۔ جس میں سرسید نے خواہش ظاہر کی تھی کہ ہر طالب علم کے پاس سونے کے لیے علیحدہ اور پڑھنے ونشست کے لیے علیحدہ کمرا ہواور انہیں سے ملحق غسل خانہ ہو جس میں ''کل'' کے ذریعہ پانی آتا ہو، وغیرہ وغیرہ۔

انگلستان جانے کے لیے روپے کا انتظام:

اس سے پہلے ہم تحریر کر چکے ہیں کہ ۱۸۶۰ء کے بعد سرسید کی اپنی تنخواہ اور پولیٹیکل پنشن کی آمدنی اتنی ہوگئی تھی کہ وہ فارغ البالی کے ساتھ رہنے کے باوجود سال میں تقریباً دو ڈھائی ہزار روپے کی بچت بآسانی کر سکتے تھے۔ ۱۸۶۵ء۔۱۸۶۴ء میں سرسید نے علی گڑھ میں اپنی رہائش کے لیے ایک بڑا بنگلہ خریدا تھا۔ ۱۸۶۹ء میں اپنے صاحبزادگان کے ساتھ انگلستان جانے کے سلسلے میں سرسید کو (اپنے اندازے کے مطابق) تقریباً پندرہ ہزار روپے کی ضرورت تھی۔ اُس وقت خود ان کے پاس پانچ چھ ہزار روپے ضرور موجود ہوں گے۔ اس کے علاوہ بقیہ تقریباً دس ہزار روپے کے لیے انھوں نے اپنا علی گڑھ کا بنگلہ (جو مسیحی قبرستان کے قریب واقع تھا) گروی رکھ کر پانچ ہزار روپے ۸ آنہ فی صد سود کی در پر قرض لیے تھے۔ اسی کے ساتھ مزید پانچ ہزار روپے (بغیر کوئی چیز گروی رکھے) چودہ آنے فیصد سود کی در پر قرض لیے تھے۔ اس طرح تقریباً پندرہ ہزار روپے کا انتظام کرنے کے بعد وہ انگلستان کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ قرض کے دس ہزار روپے کا کل ماہانہ سود ۳۷ روپے ۱۲ آنہ ہوتا تھا جس کا (غالباً) دہلی کی جائداد کی آمدنی میں سے ہر مہینے ادا کیے جانے کا انھوں نے انتظام کردیا تھا۔ انگلستان کے قیام کے دوران سرسید کو کس کس طرح کے خرچے کرنے پڑے اور انھوں نے کس طرح سے مزید روپے کا وہاں انتظام کیا اس کے سلسلے میں ہمیں ان کے مندرجہ ذیل خطوط سے واضح اطلاعات ملتی ہیں جن کے اقتباسات حوالہ جات کے بطور پیش کیے جارہے ہیں۔

۱۔ لندن سے سرسید کا خط بنام محسن الملک مورخہ ۱۸/جون ۱۸۶۹ء

''ایک آدمی ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ میں یہاں بخوبی بہ آرام گزر کرسکتا ہے۔ الا جب کہ آنا جانا چاہیے اور لوگوں سے ملے اور عزت کے

ساتھ آنا جانا چاہیے تو صرف سواری کا خرچ چار سو روپیہ ماہواری پڑے گا''۔۴۶

۲۔لندن سے سر سید کا خط بنام محسن الملک مورخہ ۹ر جولائی ۱۸۶۹ء۔

''اگر حقیقت میں تم چاہو تو بخوبی یہاں آ سکتے ہو اور کچھ بہت روپیہ درکار نہیں ہے دو ہزار روپیہ خرچ آمد و رفت اور دو سو روپیہ ماہواری خرچ قیام ایں جا نہایت کافی ہے۔ پانچ ہزار روپیہ میں ایک برس بھر بخوبی سیر کر سکتے ہو''۔۴۷

سر سید نے جب انگلستان جانے کا ارادہ کیا تو غالباً مندرجہ بالا درسے ہی لندن کے قیام کے دوران ہونے والے اخراجات کا اندازہ لگایا تھا۔ یعنی سید محمود کے کل اخراجات تو گورنمنٹ سے ملنے والی وظیفہ کی رقم سے پورے ہونا تھے۔ اس لیے سر سید کو صرف اپنے اور سید حامد کے ایک سال کے اخراجات کے لیے دس ہزار روپے درکار تھے۔ غالباً اسی رقم میں نوکر کا خرچ بھی شامل ہوگا۔ لیکن نوکر کے کرایہ کے دو ہزار روپیوں کے ساتھ اگر مزید ایک ہزار روپے اس کے قیام و طعام کے ضمنی اخراجات کے بطور شامل کر لیا جائے تو اس طرح کل خرچے کا تخمینہ تقریباً ۱۳ ہزار روپے ہوتا ہے جس میں ''ان دیکھے'' یا ''اتفاقیہ'' اخراجات وغیرہ کے لیے مزید دو ہزار روپے کا اضافہ کرنے کے بعد سر سید تقریباً پندرہ ہزار روپے کا انتظام کر کے انگلستان کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ یہ رقم ایک سال کے خرچے کے لیے مرتب کی گئی تھی لیکن اس میں انھوں نے تقریباً ڈیڑھ سال (سترہ مہینے) وہاں قیام کیا۔ اس عرصہ میں اُن کو کس کس طرح کے ''اتفاقیہ'' اخراجات برداشت کرنا پڑے اور ان کی ادائیگی کا انھوں نے کیا بندوبست کیا تھا اس کا مختصر حال درج ذیل ہے:

سر سید نے ایک خط (بنام محسن الملک) میں لندن سے تحریر کیا تھا کہ:

''ایک انگریز نے جس کا نام مسٹر جان دیوٹ پوٹ ہے، حمایتِ اسلام میں ایک عجیب و غریب کتاب لکھی ہے۔ چوں کہ یہ کتاب بالکل انگریزوں کے مخالف تھی اس کا چھاپہ ہونا اور فروخت ہونا مشکل تھا، میں نے لاگت چھاپہ کی دینی قبول کی اور احباب سے پچاس پچاس روپیہ اس کی لاگت ادا کرنے کو طلب کیے۔''۴۸

لندن ہی سے سر سید اپنے خط مورخہ ۹ر جولائی ۱۸۶۹ء کو تحریر کرتے ہیں کہ:

''حماقت سے اس فرنگی کی کتاب چھپوالی ہے پچاس روپیہ تو خود چندہ
میں دیئے اور اگر اور لوگوں کے پاس سے چندہ نہ آیا تو کئی سو روپیہ کا
دھپہ لگے گا۔ کیوں کہ جن احباب کو لکھا ہے اُن میں سے بعضے ایسے
بھی ہیں جن سے اس کی تعمیل کی توقع نہیں ہے۔ اور وہ کتاب
قریب نصف کے چھپ چکی ہے۔ دو ہفتہ میں تمام ہو جائے گی اور
چھاپہ کل کا بل میرے نام پر پہنچے گا''۔۴۹

(چندہ کرنے کا سرسید کا یہ ابتدائی تجربوں میں سے ایک تھا۔ ابھی وہ اس فن میں پوری طرح ماہر نہیں ہوئے تھے۔ عام طور پر چندے کی پوری رقم تو در کنار ایک تہائی رقم بھی موصول ہو جائے تو غنیمت سمجھنا چاہیے۔ اس لیے قیاس یہی ہے کہ اس مد میں سرسید کو ضرور ''دھپہ'' لگا ہوگا۔ حالاں کہ ہم نے یہ کتاب دیکھی نہیں ہے اس لیے اس کی لاگت کا صحیح اندازہ ہمیں نہیں ہے لیکن پھر بھی قیاس یہی ہے کہ اس مد میں سرسید کو چار پانچ سو روپے اپنے پاس سے دینے پڑے ہوں گے جو ایک غیر متوقع قسم کا ''اتفاقیہ'' لیکن بڑا خرچہ شمار کیا جا سکتا ہے)۔

لندن سے سرسید اپنے خط مورخہ ۲۰/اگست ۱۸۶۹ء میں محسن الملک کو تحریر کرتے ہیں کہ:

''حامد کچھ دل پڑھنے پر نہیں لگاتا ہے۔ بہر حال گھر میں پڑھتا ہے،
سو روپیہ مہینہ کا آدمی نوکر ہے جو تین گھنٹہ آکر حامد کو اور لیٹین محمود کو
پڑھاتا ہے۔ مگر حامد کا دل نہیں لگتا ہے''۔۵۰

سرسید کے انگلستان جانے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ سید حامد کی تعلیم کے سلسلے میں کچھ بہتر بندوبست کرنا چاہتے تھے۔ لندن کے دورانِ قیام (یعنی ڈیڑھ سال تک) کسی انگریز (ٹیوٹر) کے ساتھ روزانہ تین گھنٹے گزارنے میں کم از کم اتنا ضرور ہوا ہوگا کہ سید حامد کی انگریزی سمجھنے، بولنے اور لکھنے و پڑھنے کی استعداد ضرور نسبتاً کچھ بہتر ہو گئی ہوگی— اس سلسلے میں ۱۰۰ روپے مہینے کی ادائیگی ایک بڑا خرچ تصور کیا جا سکتا ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ خرچ سید محمود کی تعلیم کے خرچ کے کھاتے میں شمار کیا جاتا ہوگا جس کی ادائیگی حکومت کی طرف سے وظیفہ کے بطور ملنے والی رقم میں سے کی جاتی ہوگی۔

حمایتِ اسلام میں مسٹر جون ڈیوٹ پوٹ کی کتاب چھپوانے کے بعد سرسید نے مسٹر ولیم میور کی کتاب کے جواب کے بطور انگریزی میں ''مواعظ احمدیہ'' (جو بعد میں خطبات احمدیہ کے نام سے اردو میں شائع ہوئی) لکھ کر شائع کرنے کا قصد کیا اور جس کی

تیاری میں وہ تن من دھن سے مصروف ہو گئے۔ وہ جو کچھ اردو میں لکھتے تھے اس کا ساتھ ہی ساتھ انگریزی میں ترجمہ ہوتا جاتا تھا۔ اسی سلسلہ میں وہ اپنے خط بنام محسن الملک مورخہ ۱۰ ر ستمبر ۱۸۶۹ء میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''انگریزی عبارت لکھنے والے عمدہ اور کم قیمت پر یعنی بہ نسبت ہندوستان کے کم قیمت پر ملے ہیں (یہ) ہندوستان میں ممکن نہ تھا۔ جو شخص کہ میری کتاب انگریزی میں لکھتا ہے اس کی لیاقت کا کوئی انگریز ہندوستان میں نہیں ہے، پس ایسا شخص ہندوستان میں کہاں ملتا''۔ ۵۱؎

اسی خط میں وہ آگے تحریر کرتے ہیں کہ:

''دوسرے بلاشبہ روپیہ کی ضرورت ہے۔ کم سے کم دو ڈھائی ہزار روپیہ خرچ ہوگا آپ وہاں احباب مخلصین سے چندہ کیجیے''۔ ۵۲؎

ستمبر ۱۸۶۹ء تک سرسید کے ابتدائی تخمینہ کے مطابق ''مواعظ احمدیہ'' کا ترجمہ کروانے اور چھپوانے کے سلسلے کے کل اخراجات تقریباً ڈھائی ہزار روپے کے ہوں گے لیکن اس کے برخلاف کتاب پر تقریباً دوگنی لاگت آئی تھی۔ اسی وجہ سے بعد میں سرسید کو ادھار لے کر حساب بے باق کرنا پڑا تھا۔ سرسید اپنے خط بنام محسن الملک مورخہ ۲۷ رمئی ۱۸۷۰ء میں تحریر کرتے ہیں:

''آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۲۶ راپریل معہ ہنڈوی تعدامی بیس پونڈ یعنی دو سو روپے کے پہنچا''۔ ۵۳؎

اس خط سے واضح اطلاع ملتی ہے کہ اس وقت ایک پونڈ کی قیمت ۱۰ روپے کے برابر تھی۔ یہ ۲۰۰ روپے ''مواعظ احمدیہ'' کی اشاعت کے لیے بطور چندہ موصول ہوئے تھے۔ سرسید نے اپنے آٹھ دس دوستوں کو لکھا تھا کہ وہ ۱۰۰ روپے چندہ کتاب کے لیے ارسال کریں جس کے عوض کتاب چھپنے کے بعد اتنی ہی قیمت کی کتابیں چندہ دینے والوں کی خدمت میں پیش کر دی جائیں گی۔ خیال اغلب ہے کہ اس طرح صرف چھ یا سات سو روپے بطور چندہ جمع ہوا تھا۔ جب کہ کتاب کے تیار کرنے اور چھپوانے پر کل خرچ تقریباً ۳۹۴۸ روپے ہوا تھا۔ اسی لیے سرسید نے پریشان ہو کر اپنے خط مورخہ یکم اکتوبر ۱۸۶۹ء میں محسن الملک کو تحریر کیا تھا کہ:

''کسی مہاجن سے میرے لیے ایک ہزار روپیہ قرض لیجیے۔ سود اور

روپیہ میں ادا کروں گا۔ مگر چوں کہ میں یہاں ہوں اس لیے کچھ
بندوبست نہیں کرسکتا۔ ہزار روپیہ بھیجنے کے لیے دہلی لکھا ہے (اور میں
نے لکھا ہے کہ کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک کہ ظروف مسی تک
فروخت کرکر ہزار روپیہ بھیج دو) اگر ہزار روپیہ آپ دونوں صاحب
قرض لے کر مجھے بھیج دیں اور ہزار روپیہ یعنی دہلی سے آوے اور پانچ
چھ سو روپے چندہ کے ذریعہ سے وصول ہو جائے تو کتاب بخوبی
چھپ جائے گی''۔۵۴

سرسید نے کتاب کے سلسلے میں ایک ہزار روپے جو دہلی سے منگوایا تھا اس کے سلسلے میں انھوں نے تحریر کیا تھا کہ جائداد اور کتابیں بیچ کر یہ روپے بھیج دیا جائے۔ دراصل سرسید کی دہلی میں کافی جائداد بصورت کرایہ کے مکانات و دکانیں وغیرہ موجود تھی جس میں سے کوئی چھوٹا مکان یا دوکان بیچ کر یہ روپے بھیجنے کی تلقین کی گئی تھی اور یہ روپے انھیں دہلی سے موصول بھی ہو گیا تھا۔ جہاں تک کتابیں فروخت کرنے کا سوال ہے اکثر لوگ اس سے یہ مطلب اخذ کرتے ہیں کہ انگلستان جانے کے لیے سرسید نے اپنی کتابوں کا ذخیرہ (کلیکشن) فروخت کر دیا تھا۔ میرے خیال میں یہ صحیح نہیں ہے۔ دراصل کتابیں بیچ کر روپے بھیجنے کی بات انھوں نے دہلی لکھی تھی جہاں سرسید کی اُن کتابوں کا ذخیرہ موجود تھا جو وہ وقتاً فوقتاً شائع کرتے رہے تھے۔ انہی کتابوں کے اسٹاک کو کم قیمت پر کتب فروشوں کو دینے کی سرسید نے تلقین کی تھی تا کہ جائداد بیچ کر اگر ایک ہزار روپے کی رقم جمع کرنے میں کسی قسم کی کمی بیشی ہو تو وہ کتابوں کی رقم سے پوری ہو جائے۔

بہر حال وہ اپنے خط مورخہ ۲۷ رمئی ۱۸۷۰ء میں محسن الملک کو تحریر کرتے ہیں کہ:

''کتاب کے خرچ کے نہ سرانجام ہونے کا دوسرا رنج ہے۔ بہ مجبوری
یہاں روپیہ قرض لینا پڑا۔ چنانچہ تین ہزار روپے قرض لینے کی گفتگو ہو
رہی ہے۔ خدا راست لاوے''۔۵۵

غالباً یہ تین ہزار روپیہ کا قرض سرسید نے انگلینڈ میں اپنے ایجنٹ کے ذریعہ کسی بینک سے لیا تھا۔ اول انھوں نے کوشش کی تھی کہ دو ہزار روپے کا قرض ہندوستان میں اپنے دوستوں کے ذریعہ کسی ساہوکار سے ماہانہ سود پر لے لیا جائے لیکن چوں کہ وقت کم تھا اور کتاب کی اشاعت کے سلسلے کے بل ادا کرنے تھے۔ اس لیے اُن کو یہ قرض لینا پڑا۔ اس

طرح انھوں نے کتاب کی تیاری اور چھپائی کے واجبات بے باق کیے۔ اس سلسلے میں وہ اپنے خط مورخہ ۲۸/ جون ۱۸۷۰ء میں محسن الملک کو تحریر کرتے ہیں کہ:

''حساب چھاپہ کتاب ملفوف عریضہ ہذا مرسل خدمت عالی ہے اس کے ملاحظہ سے معلوم ہوگا کہ کل آمدنی اس وقت تک ۱۶۹۱ روپے ہوئی اور خرچ ہوا ۳۹۴۸ روپے۔ فاضل خرچ ہوا ۲۲۵۷ روپے۔ جو روپیہ قرض لیا گیا تھا اس میں سے زرِ فاضل ادا ہوا۔ الا زادِ راہ واسطے مراجعت ہندوستان کے باقی نہ رہا اور اب جب تک کہ اور قرض نہ لیا جاوے مراجعت متعرض ہے''۔۵۶

''مواعظ احمدیہ'' شائع کرنے کے سلسلے کے حساب سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب پر تقریباً ۳۹۴۸ روپے خرچ ہوا تھا جس میں ایک ہزار روپے سرسید نے دہلی سے (ایک چھوٹی جائداد اور کتابوں کا اسٹاک فروخت کر کے) منگوایا تھا اور تقریباً سات سو روپے دوستوں سے بطور چندہ موصول ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ بقایہ ۲۲۵۷ روپے سرسید نے بینک سے جو تین ہزار روپے قرض لیا تھا اس میں سے ادا کیے گئے تھے۔ اس طرح دیکھا جائے تو انگلینڈ سے واپس آنے کے وقت تک سرسید پر کل تقریباً تیرہ ہزار روپیوں کا قرض باقی تھا جس میں تین ہزار روپے کا قرض انگلینڈ کے ایک بینک سے لیا گیا تھا۔

سید محمود کی تعلیم پر اخراجات:

گورنمنٹ سے وظیفہ کے بطور ملنے والی رقم کے علاوہ بھی سرسید کو سید محمود کی انگلستان میں تعلیم حاصل کرنے کے سلسلے میں اپنے پاس سے کافی رقم خرچ کرنا پڑی تھی۔ وہ اس سلسلے میں اپنے خط مورخہ ۲۷/ مئی ۱۸۷۰ء بنام محسن الملک میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''چھجو دست بدستہ آداب عرض کرتا ہے وہ محمود کے ساتھ رہے گا اور اس کے ساتھ کیمبرج جاوے گا۔ محمود کو اپنی تمام پڑھائی اور اخراجات پورے کرنے کے علاوہ اس روپیہ کے جو سرکار سے ملتا ہے تین ہزار روپیہ اور درکار ہوگا۔ سو انشاءاللہ تعالیٰ ہندوستان پہنچ کر ان کو بھیجنے کا بقسط ماہواری و یک مشت بہ فروخت کرائے مکان تجویز کروں گا''۔۵۷

سید محمود کی انگلستان میں تعلیم کے اخراجات کے سلسلے میں سرسید نے اپنے ایک اور خط مورخہ ۶/ نومبر ۱۸۶۹ء میں تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ خط کس کو

لکھا گیا تھا (قیاس یہی ہے کہ یہ خط سر ولیم میور کے نام لکھا گیا تھا) اس خط میں سر سید تحریر کرتے ہیں کہ:

''دام اقبالہم۔ بغرض عرض بندگانعالی متعالی

بعد آدائے آداب وتسلیمات فدویانہ عرض پرواز ہے کہ حضور کا نوازش نامہ مورخہ ۹/اکتوبر پہنچا اور عزت و افتخار بخشا۔ حضور کی اس نوازش مربیانہ کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں ہر طور پر حضور کی طمانیت کرتا ہوں کہ محمود جس کو حضور نے اسکالرشپ کے لیے انتخاب فرمایا۔ ہندوستان اور گورنمنٹ دونوں کے لیے بھی نہایت مفید ہوگا۔ اس کی طبیعت قدرتی اچھی ہے اور اس کا چال چلن لندن میں اور اس کے خیالات یہاں کی...... (ایک لائن پڑھی نہ جا سکی)...... انگلش گورنمنٹ کی نسبت نہایت عمدہ ہیں۔ مجھ کو امید ہے کہ کبھی حضور کو اس کے انتخاب کرنے کا افسوس نہ ہوگا، بلاشبہ حضور عالی سکریٹری آف اسٹیٹ نے جو وظیفہ مقرر کیا نہایت دست گیری کی ورنہ یہاں نوبت فاقہ کشی (تک) پہنچ جاتی۔

یہاں ایسے خرچ پیش آئے ہیں جن کا خیال ہی نہ تھا، محمود کی تحصیلِ قانونی میں جو ''لنکن انز'' میں کرتا ہے معہ فیس، چیمبر بیرسٹر و لیکچر وغیرہ میں ہزار روپیہ خرچ ہوا ہے علاوہ اس کے سو روپیہ ماہواری اس کی پریوت (پرائیویٹ) تحصیل میں خرچ ہوتا ہے۔

ہم تین آدمی (ہیں) اور ایک ہندوستانی نوکر ہمارے ساتھ ہے۔ ہم...... (عبارت پڑھی نہ جا سکی)...... کسی طرح ۷۰۰ روپیہ ماہواری (سے) کم خرچ نہیں ہو سکتا اور جس قدر ماہواری آمدنی ہے وہ کفالت نہیں کرتی، پس ضرور کسی قدر قرض ہمارے ذمہ ہو جائے گا۔

محمود نے چھ مہینے چیمبر بیرسٹر میں لا کی تحصیل کی اور چھ مہینے اور کرنی ہوگی اس کے بعد اس کا ارادہ ایک برس تک پریوت (پرائیویٹ) اور پبلک قانونی لیکچر میں داخل ہونے کا ہے۔ اور اس تمام زمانے میں انگریزی اور لیٹین اور اگر ممکن ہوا تو گریک کی تحصیل بدستور پریوت

جاری رکھے گا جس میں سو روپیہ ماہواری کے حساب سے ڈھائی ہزار روپیہ خرچ ہوگا۔ اپنی فرصت کے (اوقات میں) وہ مجھ سے ہندوستان کے قوانین پڑھتا ہے اور میرے یہاں رہنے تک سب پڑھ لے گا۔
آخیر...... (الفاظ پڑھے نہ جا سکے) ...... آکسفورڈ یا کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہونے کا ہے وہاں داخل ہونے اور رہنے میں ڈھائی سو روپیہ ماہواری سے کم کا خرچ نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں اُس کی ادا کا کسی طرح مجھ میں مقدور نہیں ہے۔ جب کہ میں ہندوستان لوٹ کر آؤں گا مجھ کو نہایت تکلیف ہوگی، بہ نسبت سابق تنخواہ کم ملے گی۔ ہندوستان میں جو قرض کر آیا ہوں وہ ادا کرنا ہوگا اور جو زیادہ خرچ یہاں ہوگا وہ دینا ہوگا۔
با ایں ہمہ میں نے محمود کا دل نہیں توڑا اور اس کی ہمت کو پست نہیں کیا۔ مجھ کو امید ہے کہ یہ تمام تدابیر اور انتظام جو محمود کی تربیت کا ہے وہ حضور کی .... قابل ہوگا، حضور ...... ولارنس ...... عنایت اور نوازش ہمارے حال پر حد سے زیادہ گزر گئی زبان قابلِ ادا شکر کے نہیں ہے۔ میرا رسالہ بابت تعلیم ہندوستان حضور کے ملاحظہ میں گزرا اور مجھ کو نہایت عزت ہوئی جو میں نے لکھا وہ صحیح ہو یا غلط مگر حضور کو واضح ہوگا کہ ہندوستان کا زندہ ہونا صرف تعلیم پر منحصر ہے اور ابھی سررشتہ تعلیم کو لائق طمانیت کرنے میں بہت کچھ باقی ہے اور میرا دل چاہتا ہے کہ حضور کا عہد دولت تاریخ میں اوسکی تکمیل کی یادگار ہو۔
زیادہ حدِ آداب آفتاب دولت و اقبال تابانی۔ ۵۸ــ احقر
فدوی سید احمد۔ از مقام لندن ۲۶ر نومبر ۱۸۶۹ء

قرض کی ادائیگی کا بندوبست:

سرسید کے اس لمبے چوڑے قرض کی ادائیگی کی ایک عمدہ صورت انگلستان ہی میں نکل آئی تھی۔ انھوں نے وہاں یہ مہم شروع کی تھی کہ وہ ہندوستانی افسران جو ولایت جانا چاہتے ہیں ان کو گورنمنٹ تنخواہ کے ساتھ چھٹی دینا منظور کیا کرے۔ ان کو اپنے اس مطالبے کے سلسلے میں اعلیٰ حکام کی رضامندی بڑی حد تک حاصل ہوگئی تھی۔ اس لیے سرسید نے اس

سلسلے میں خود اپنی بھی ایک درخواست حکومت میں پیش کر دی تھی۔اس سلسلے میں انھوں نے اپنے خط مورخہ ۹/جولائی ۱۸۶۹ء کے ذریعہ محسن الملک کو مطلع کیا تھا کہ:

''میں نے یہاں بڑی غل مچائی ہے کہ ہندوستانی افسران کو جو ولایت آنا چاہیں رخصت بلا وضع تنخواہ ملنی چاہیے۔اکثر ممبران انڈیا کونسل کان بھی میری فریاد پر رکھتے ہیں۔ چنانچہ میں نے اپنی درخواست پیش کی ہے۔نقل اس کی آپ کے ملاحظہ کو بھیجتا ہوں اگر یہ ہو گیا تو بلا شبہ آپ کو رخصت پوری تنخواہ پر مل سکے گی''۔۵۹؎

غالباً سرسید کی یہ درخواست منظور کر لی گئی تھی۔اس طرح واپس ہندوستان آنے کے بعد اُن کو ڈیڑھ سال کی تنخواہ اور اتنے ہی عرصے کی پولیٹیکل پنشن کی رقم یک مشت مل گئی تھی۔ یہ رقم تقریباً دس گیارہ ہزار روپے کے قریب ہوگی۔اس طرح سرسید نے بڑے قرضے یعنی پانچ ہزار روپے کا وہ قرضہ جس پر وہ ۱۴ آنہ فیصد کی در سے سود دیتے تھے اور تین ہزار روپے وہ قرضہ جو انھوں نے انگلستان میں ایک بینک سے لیا تھا فوراً ہی ادا کر دیا ہوگا۔اس کے علاوہ وہ مزید رقم جو سید محمود کو تعلیم کے سلسلے میں درکار تھی وہ بھی سرسید بآسانی سید محمود کو ارسال کر سکے ہوں گے۔غرض اس سبیل کے نکل آنے سے سرسید کی مالی مشکلات کا بڑی حد تک مداوا ہو گیا تھا۔حالانکہ اپنے بنگلے کو گروی رکھ کر سرسید نے پانچ ہزار روپے کی جو رقم ۸ آنہ فیصد سود کی در پر قرض لی تھی اُس کو وہ قسط وار اگلے کئی سالوں تک ادا کرتے رہے تھے۔

لسانیاتی تنازعہ و ناگری رسم الخط کا مسئلہ:

اس وقت تک ورنا کیولر اسکرپٹ کا معاملہ ایک بڑا مسئلہ بن چکا تھا۔ پڑھے لکھے لوگوں کا ایک بڑا طبقہ اردو کو عام فہم مقامی (یعنی ورنا کیولر) زبان تو مانتا تھا لیکن اس کو ناگری رسم الخط میں لکھے جانے کی تائید کرتا تھا۔رسم الخط کے سلسلے کا یہ اختلاف اردو اور ہندی کے درمیان ایک بڑی خلیج بنتا جا رہا تھا۔انگریزی حکومت کی پالیسی اس خلیج کو پاٹنے کے بجائے بڑھانے میں معاون ہو رہی تھی۔ سرسید اس طرح کی سبیلیں نکالنے میں مصروف تھے جن کے ذریعہ ورنا کیولر کے بطور اردو کو تقویت دی جا سکے۔ورنا کیولر یونیورسٹی کی تجویز اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ انگلستان کے دورانِ قیام سرسید اس لسانیاتی تنازعہ کی وجہ سے مستقل فکر مند نظر آتے ہیں۔ نیز جب یہ تنازعہ سائنٹفک سوسائٹی کے دروازے پر دستک دینے لگا اور سائنٹفک سوسائٹی کا وہ سیکولر پلیٹ فارم جس کو سرسید نے بہت ہی خلوص، ایمانداری اور نیک

نیتی کے ساتھ تمام ہم وطنوں کی فلاح و بہبود اور ملک کی ترقی کے لیے تعمیر کرنے کی کوشش کی تھی۔ جب اس کی بنیادیں بھی اس تنازع کی چپیٹ میں آکر ہلنے لگیں تو وہ ایک طرح سے خاصے مایوس اور بددل نظر آنے لگے تھے۔ اس سلسلے میں انگلستان سے محسن الملک کے نام اپنے خط مورخہ ۲۹/اپریل ۱۸۷۰ء میں سرسید اپنے رنج و افسوس کا یوں اظہار کرتے ہیں:

''ایک اور خبر مجھے ملی ہے جس کا مجھے کمال رنج و فکر ہے کہ بابو شیو پرشاد صاحب کی تحریک سے عموماً ہندو لوگوں کے دل میں جوش آیا ہے کہ زبان اردو خط فارسی جو مسلمانوں کی نشانی ہے مٹا دیا جائے۔ میں نے سنا ہے کہ انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی کے ہندو ممبروں سے تحریک کی ہے کہ بجائے اخبار اردو ہندی ہو، ترجمہ کتب بھی ہندی میں ہوں۔ یہ ایک ایسی تدبیر ہے کہ ہندو مسلمانوں میں کسی طرح اتفاق نہیں رہ سکتا۔ مسلمان ہرگز ہندی پر متفق نہ ہوں گے اور نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ ہندو علیحدہ اور مسلمان علیحدہ ہو جائیں گے۔ یہاں تک تو کچھ اندیشہ نہیں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر مسلمان ہندوؤں سے علیحدہ ہو کر اپنا کاروبار کریں گے تو مسلمانوں کو زیادہ فائدہ ہوگا اور ہندو نقصان میں رہیں گے۔ الّا اس میں صرف دو امر کا خیال ہے۔ ایک خاص اپنی طبیعت کے سبب سے کہ میں کل اہل ہند، کیا ہندو، کیا مسلمان، کی بھلائی چاہتا ہوں۔ دوسرا بڑا خوف اس بات کا ہے کہ مسلمانوں پر نہایت بداقبالی اور اوبار چھایا ہے۔ وہ جھوٹے اور لغو تعصب میں مبتلا ہیں اور وہ مطلق اپنے نقصان کو نہیں سمجھتے اس پر حسد اور کینہ ان میں باہم بہ نسبت ہندوؤں کے اور جھوٹی شیخی بہت زیادہ ہے اور کسی قدر مفلس بھی ہیں۔ ان وجوہات سے وہ ہرگز اس قابل نہیں ہونے کے جو اپنی بھلائی کے لیے کچھ کرسکیں''۔[۶۰]

اس خط میں سرسید کا یہ جملہ کہ ''میں کل اہل ہند، کیا ہندو، کیا مسلمان، کی بھلائی چاہتا ہوں۔'' ایک طرف ان کی سیکولر فکر اور اہل وطن کی جانب نیک نیتی و خلوص کا آئینہ دار ہے تو دوسری طرف اسی جملے سے ان کی مایوسی اور ناامیدی کی کیفیت کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ محسن الملک نے بابو شیو پرشاد صاحب کی تحریر کے جواب میں احتجاجاً اپنے استعفیٰ

کی پیش کش کرتے ہوئے ایک تحریر گزٹ میں چھپنے کے لیے بھیجی تھی۔ راجہ جے کشن داس صاحب نے اس تحریر کو چھاپنے سے گریز کرتے ہوئے محسن الملک سے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کی درخواست کی تھی۔ محسن الملک نے یہ بات شکایتاً سر سید کو (انگلینڈ) لکھی، سر سید زبان کے تنازعہ سے مایوس اور بددل ضرور تھے لیکن جذباتیت کا شکار نہیں ہوئے تھے۔ وہ ہر مسئلہ پر ٹھنڈے دماغ سے غور کرنے اور تحمل سے کام لینے کے عادی تھے۔ جس کا نمونہ محسن الملک کے نام ان کے اس خط میں دیکھا جا سکتا ہے جو انھوں نے لندن سے ۶ رمئی ۱۸۷۰ء کو لکھا تھا:

> ''مگر تعجب ہے کہ آپ کو بابو شیو پرشاد صاحب کے مسلمانوں کی نسبت چند ہی کلمات، جو کچھ زیادہ سخت نہ تھے، لکھے ایسے برے معلوم ہوئے مگر جو ان کی یعنی مسلمانوں کی نیک نامی، یعنی بدنامی اور خوبی یعنی بدی، ہر روز تمام ہندوستان کے اخباروں میں چھپتی رہتی ہے اور کوئی نالائقی اور پاجی پن کی حرکت ایسی نہیں ہے جو مسلمانوں کی نسبت نہیں لکھی جاتی اور غیر مسلم مسافروں نے جو اپنے سفر ناموں میں مسلمانوں کی نالائقیوں کا حال لکھا ہے اس سے آپ کو کیوں رنج نہیں ہوا۔ صرف اس کا سبب یہ ہے کہ ان حالات سے آپ کو اطلاع نہیں ہوئی۔ میری رائے میں آپ بابو شیو پرشاد کا جواب جن کے چھاپنے سے راجہ جے کشن داس بہادر نے انکار کیا۔ کسی اخبار میں مت چھپوایئے''۔[۱۱]

غرض اسی صبر و تحمل و غور و فکر کے نتیجہ میں سر سید نے انگلستان ہی میں فیصلہ کر لیا تھا کہ جدید علوم کی تعلیم کے لیے وہ ایک کالج قائم کرنے کی کوشش کریں گے جس میں جدید علوم کی تعلیم انگریزی اور ورنا کیولر (یعنی اردو) دونوں زبانوں میں دی جائے گی۔ جس کے نتیجہ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام عمل میں آیا تھا جس میں انگریزی اور اردو میڈیم کے دو علیحدہ علیحدہ شعبے قائم کیے گئے تھے۔

لسانیاتی تنازعہ اور فرقہ واریت:

لسانیاتی تنازعے کی ابتدا فرقہ وارانہ فکر کا نتیجہ تھی یا پھر فرقہ وارانہ تنفر ہی نے لسانیاتی تنازع کو جنم دیا تھا۔ ان سوالات کے سلسلے میں ہم خود کوئی رائے دینے کے بجائے بابو شیو پرشاد صاحب کے ۱۸۸۰ء میں دیئے گئے ایک بیان کا مندرجہ ذیل اقتباس قارئین

کے سامنے پیش کرنا چاہیں گے۔ جس میں انھوں نے احتجاجاً لکھا تھا کہ:

''میں نے ۱۸۶۸ء میں عدالتوں میں رائج رسم الخط کے سلسلے میں ایک یادداشت دائر کی تھی۔ میرا مقصد صرف رسم الخط کے سلسلے میں آواز اٹھانا تھا اور مجھے اس میں کافی حد تک کامیابی بھی ہوئی تھی، حالانکہ تمام مسلم افسران اس سلسلے میں میرے مخالف ہو گئے تھے۔ لیکن اب مجھے یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ ''مجھے میرے حمایتیوں اور ہمدردوں سے بچاؤ'' میرے ہم خیال ہم وطنوں یعنی بے وقوف ہندوؤں نے اس کو ہندی اردو کا سوال بنا دیا ہے اور اسکرپٹ کا مسئلہ پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ انھوں نے ان تمام فارسی الفاظ کے خلاف جہاد شروع کر دیا ہے جو ہمارے گھروں میں ہمارے بچے اور ہماری عورتیں بولتی ہیں جو ہمارے شہروں میں اور گاؤں میں یکساں طور پر رائج ہیں''۔ ۶۲

سرسید کی فکر کا دائرہ مسلمانان ہند کی تعلیمی کم مائیگی کو رفع کرنے تک محدود کرنے میں لسانیاتی تنازع، خاص طور پر رسم الخط کی تکرار نے بہت اہم رول ادا کیا تھا۔ کیوں کہ اسی کے ساتھ فرقہ وارانہ منافرت کو فروغ ملا تھا جس کی وجہ سے سرسید کا اعتماد ہندو مسلم اتحاد سے متعلق تحریکات سے کافی حد تک اٹھ گیا تھا۔ دوسری طرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ تنفر پیدا کرنے میں انگریزی سرکار کی ایما ہی نہیں بلکہ حکمت عملی شامل حال رہی تھی۔ حالانکہ آج کل انگریز مورخ ''برٹش راج'' کو اس الزام سے بری کرنے کے لیے کہ انھوں نے ہندوستان میں ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کی پالیسی اختیار کی تھی یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ ہندوستانی سماج کو تقسیم کرنا تو کجا ہندوستان میں انگریزوں کی سب سے بڑی مشکل یہی تھی کہ اس بری طرح ''منقسم سماج پر کس طور حکومت کی جائے''۔ ۶۳

یہ حقیقت ہے کہ ہندوستانی سماج منقسم ضرور تھا۔ اس میں ذات پات کا بھید بھاؤ، غریب امیر کا امتیاز، رنگ اور نسل کا فرق اور مختلف مذاہب، عقائد، زبانوں اور ثقافتوں کا دور دورہ تھا۔ لیکن اس سب کے باوجود ''کثرت میں وحدت'' کے مترادف ہندوستانی سماج میں ہر ایک کی اپنی جگہ متعین تھی جس کی وجہ سے ایک مخصوص قسم کا توازن قائم تھا۔

ہندوؤں اور مسلمانوں میں جھگڑے بھی ہوتے تھے۔ لیکن وہ صرف ''جھگڑے ہوتے تھے''، ''ہندو مسلم جھگڑے'' نہیں ہوتے تھے۔ انگریزوں نے ہر چیز کو ہندو مسلم

خانوں میں تقسیم کر کے نہ صرف اس سماجی توازن کو متزلزل کر دیا تھا بلکہ ان خانوں میں منقسم لوگوں ہی کو گورنمنٹ سے رابطے، رسائی اور مراعات حاصل کرنے کا مستحق ٹھہرایا تھا۔ جس کی وجہ سے سماج میں فرقہ وارانہ صف آرائی کے ساتھ حریفانہ تناؤ اور کشیدگی پیدا ہوگئی تھی جس نے بعد میں فرقہ وارانہ تنفر کا روپ اختیار کر لیا تھا۔ اس فرقہ وارانہ کشیدگی اور تنفر کو حسب ضرورت استعمال کر کے انگریزوں کی سامراجی حکومت اپنے نوآبادیاتی مقاصد حاصل کرنے میں کوشاں رہتی تھی۔ ظاہر ہے سماج میں جس کشیدگی اور تنفر کو بڑھاوا دینے میں حکومتِ وقت خود شامل ہو اس کے نتائج ہمیشہ بہت بھیانک نکلتے ہیں۔ (گجرات کی حالیہ مثال ہمارے سامنے ہے) ہندوستان میں بھی اس کے نتائج بھیانک ہی نکلے۔ اسی پالیسی کے نتیجے میں ہندوستان کا بٹوارہ ہوا تھا جس کے ثمرہ کے بطور لاکھوں لوگوں کو اپنی جان اور مال کی قربانی دینا پڑی تھی اور ابھی کون کہہ سکتا ہے کہ اس زہر کو سماج کی رگوں سے پوری طرح زائل ہونے میں کتنا عرصہ اور لگے گا۔

قیامِ انگلستان کے سرسید کی ذاتی زندگی پر چند اثرات:

سرسید دراز قد تھے۔ سرخ سپید چہرہ، لمبی داڑھی، چوڑی ہڈی، فربہ بدن اور ہلکی سی نکلی ہوئی توند۔ وہ شروع سے ہی ''اوور ویٹ'' تھے۔ ویسے تندرستی ہمیشہ سے اچھی تھی۔ انگلینڈ کے دورانِ قیام ایک تکلیف ضرور شروع ہوئی تھی جو آخیر دم تک زائل نہیں ہوئی۔ حالی نے اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''ان کے پاؤں اور پنڈلیاں سوج جاتی تھیں اور تلوؤں میں درد ہو جاتا تھا۔ مہینے مہینے دو دو مہینے برابر یہ تکلیف رہتی تھی۔ چند روز کو افاقہ ہو جاتا تھا پھر وہی شکایت پیدا ہو جاتی تھی۔ ان کا یہ مرض آخیر دم تک زائل نہیں ہوا۔''[۶۴]

سرسید کے سراپا کے بارے میں حالی تحریر کرتے ہیں کہ:

> ''رنگ سرخ و سفید، پیشانی بلند، سر بڑا اور موزوں، بھویں جدا جدا، آنکھیں روشن نہ چھوٹی نہ بڑی۔ ناک نسبتاً چہرے کے مقابلے میں کسی قدر چھوٹی۔ کان لمبے، گلے میں دائیں جانب رسولی جو ہمیشہ داڑھی میں چھپی رہتی تھی۔ جسم بہت فربہ، قد لمبا مگر جسم کی فربہی کے سبب میانہ نما۔ ہڈی چکلی، ہاتھ پاؤں اور تمام اعضا نہایت قوی اور

زبردست اور متناسب، بدن ٹھوس، وزن ساڑھے تین من۔''۶۴
(حالانکہ جب سرسید ۱۸۶۹ء میں انگلینڈ گئے تھے تو اس وقت ان کا وزن اتنا نہیں تھا۔ بعد کے بیس برسوں میں ان کا وزن بڑھ گیا تھا۔)

انگلینڈ کے ڈیڑھ سال کے دورانِ قیام سرسید کی بودوباش کے چند طور طریقے اس طرح متاثر ہوئے تھے کہ تاحیات پھر تبدیل نہ ہوئے۔ انگلستان جانے سے پہلے ہی سرسید نے چھری کانٹے سے کھانا کھانے کی مشق شروع کردی تھی لیکن انگلستان سے واپس آنے کے بعد چھری کانٹے سے کھانا کھانا ان کا عام معمول بن گیا تھا اور تاحیات انھوں نے اس عادت کو منقطع نہیں کیا تھا۔ دعوتوں اور رسمی محفلوں میں تو سرسید کے یہاں چھری کانٹے کا استعمال رائج ہی تھا لیکن وہ اپنے روزانہ کے (غیر رسمی) معمول کے کھانے کے اوقات میں بھی کبھی چھری کانٹے کے بغیر کھانا نہیں کھاتے تھے۔ اس سلسلے میں کئی حوالے موجود ہیں (جو آئندہ پیش کیے جائیں گے)۔ دوسرے انگلستان سے واپس آنے کے بعد وہ بیت الخلا کے ہندوستانی طرز کے قدمچوں کے استعمال سے بالکل ہی معذور ہو گئے تھے۔ غالباً یہ ان کے وزن کی زیادتی کی وجہ سے ہوا تھا۔ اسی لیے وہ انگلستان سے واپسی کے بعد ہمیشہ کموڈ کے استعمال کے ہی مرہون رہے تھے۔

بیٹی امینہ کا انتقال:

غالباً اپریل ۱۸۷۰ء میں سرسید کی صغیرسن بیٹی امینہ بیگم کا دہلی میں انتقال ہو گیا تھا۔ بیٹی کے انتقال کی خبر سن کر سرسید کے دل کو کس قدر صدمہ پہنچا ہوگا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ لیکن اللہ کی مرضی کے آگے انسان کو صبر کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس سلسلے میں سرسید نے اپنے خط مورخہ ۱۰ر مئی ۱۸۷۰ء میں لندن سے محسن الملک کو تحریر کیا تھا کہ:

''ہمشیرہ حامد و محمود کے انتقال کا جو صدمہ ہوا وہ بیان سے باہر ہے۔''۶۵

سرسید نے اپنے خط مورخہ ۲۷ر مئی ۱۸۷۰ء کے ذریعہ محسن الملک کو انگلستان سے واپس بمبئی والہ آباد پہنچنے سے متعلق تاریخوں سے مطلع کیا تھا اور چونکہ بیٹی امینہ بیگم کا انتقال ہو چکا تھا اسی لیے لکھا تھا کہ:

''اگرچہ دہلی جانے کو مطلق دل نہیں چاہتا اور گھر میں گھسنے کے خیال سے دل پھٹتا ہے۔ مگر بہ مجبوری بہن اور بھتیجوں کے سبب ایک دن کے لیے جانا پڑے گا۔''۶۶

غرض پردیس میں رہتے بیٹی کے انتقال کی خبر سن کر سرسید کے دل پر سخت صدمہ گزرا تھا۔

انگلستان سے واپسی:

سید محمود نے سرسید کے خط (بنام محسن الملک) مورخہ ۱۰ رمئی ۱۸۷۰ء میں تحریر کیا تھا کہ:

> ''جناب والد صاحب اور برادر صاحب تو اگست میں روانہ ہوں گے اور کم ترین کیمبرج میں جہاں کہ یونیورسٹی ہے علم تحصیل کرنے کے لیے جاوے گا''۔ ۶۷

سید محمود سرسید کے ہندوستان روانہ ہونے کے بعد کیمبرج منتقل ہو گئے تھے۔ عظیم اللہ (عرف چھجو) ذاتی ملازم کے بطور سید محمود کے ساتھ کیمبرج گئے تھے۔ سرسید ایک سال اور پانچ مہینے لندن میں قیام کے بعد ۴ رستمبر ۱۸۷۰ء کو سید حامد کے ساتھ انگلستان سے واپس ہندوستان آنے کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ ۲ را کتوبر ۱۸۷۰ء کو سرسید انگلستان سے واپس بمبئی پہنچے تھے اور اسی مہینہ میں (یعنی اکتوبر ہی میں) انھوں نے بنارس پہنچ کر اپنے عہدے کا چارج سنبھال لیا تھا۔ غالباً بنارس میں دوبارہ چارج لینے سے پہلے وہ ایک دو روز کے لیے دہلی بھی گئے ہوں گے۔

حوالہ جات

۱۔ سرسید احمد خاں اور تاریخ نویسی، مصنفہ: عرفان حبیب، سہ ماہی فکر و آگہی (علی گڑھ نمبر، ۲۰۰۰ء) جلد: ۱۴۔۱۱، صفحہ: ۱۲۶

۲۔ حیات جاوید، مصنفہ: الطاف حسین حالی، ترقی اردو بیورو، تیسرا ایڈیشن (۱۹۹۰ء)، صفحہ ۱۱۴

۳۔ مکتوبات سرسید، مرتبہ: شیخ محمد اسماعیل پانی پتی (۱۹۳۹ء) مجلس ترقی اردو، لاہور، صفحہ: ۱۵

۴۔ حیات جاوید، مصنفہ: الطاف حسین حالی، ترقی اردو بیورو، تیسرا ایڈیشن (۱۹۹۰ء)، صفحہ ۵۲۷

۵۔ ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۹۸

۶۔ سرسید کا خط بنام محسن الملک مورخہ ۲۰ راگست ۱۸۶۹ء، از لندن، مکتوبات سرسید، مصنفہ: شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، صفحہ: ۶۴

۷۔ سرسید کا خط بنام محسن الملک، مورخہ ۱۰ رمئی ۱۸۷۰ء، مکتوبات سرسید، مصنفہ: اسماعیل پانی پتی (۱۹۳۹ء) صفحہ: ۱۱۔۱۱۰

۸۔ خط بنام محسن الملک مورخہ ۱۰ رمئی ۱۸۷۰ء، خطوط سرسید، مرتبہ ڈاکٹر راس مسعود، صفحہ: ۷۹

۹۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، مورخہ ۷ ارنومبر ۱۸۷۷ء میں چندے کا اندراج موجود ہے۔

۱۰۔ ایضاً ایضاً ایضاً مجیب اللہ کا نام دیوار کے کھنڈ نمبر ۵۵ پر کندہ ہے۔

۱۱۔ آپ بیتی، مصنفہ: میر ولایت حسین، مسلم ایجوکیشنل پریس (۱۹۷۰ء)، صفحہ: ۱۲۳

۱۲۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۱۲۴

۱۳۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۱۲۴

۱۴۔ سرسید احمد خاں اور تاریخ نویسی، مصنفہ: عرفان حبیب، فکر و آگہی (علی گڑھ نمبر ۲۰۰۰ء) صفحہ ۱۲۵

۱۵۔ مکاتیب سرسید، مرتبہ: مشتاق حسین، (۱۹۶۰ء)، صفحہ: ۶

۱۶۔ حیات جاوید، مصنفہ: الطاف حسین حالی، ترقی اردو بیورو، تیسرا ایڈیشن (۱۹۹۰ء)، صفحہ: ۱۱۳

۱۷۔ دی لائف اینڈ ورک آف سید احمد، مصنفہ: جی ایف آئی گریہم، (۱۸۸۵ء)، صفحہ: ۶۔۳۷

۱۸۔ حیات جاوید، مصنفہ: الطاف حسین حالی، ترقی اردو بیورو، تیسرا ایڈیشن (۱۹۹۰ء)، صفحہ: ۲۹۶

۱۹۔ سرسید اور سینٹیفک سوسائٹی، مصنفہ: افتخار عالم خاں، مکتبہ جامعہ دہلی (۲۰۰۰) صفحہ: ۶۔۳

۲۰۔ حیات جاوید، مصنفہ: الطاف حسین حالی، ترقی اردو بیورو، تیسرا ایڈیشن (۱۹۹۰ء)، صفحہ:

۲۱۔ سفرنامہ سافرانِ لندن، مصنفہ: سرسید احمد خاں، ناشر و سنہ اشاعت معلوم نہ ہوسکی، صفحہ: ۶۔۲۷

۲۲۔ سرسید اور سینٹیفک سوسائٹی، مصنفہ: افتخار عالم خاں، مکتبہ جامعہ دہلی (۲۰۰۰) صفحہ: ۹۹

۲۳۔ مکتوبات سرسید، مرتبہ: اسماعیل پانی پتی، (۱۹۳۹ء)، مجلس ترقی اردو، لاہور، صفحہ: ۶۳

۲۴۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، مورخہ ۳۰ر مارچ ۱۸۶۶ء، انسٹی ٹیوٹ کی عمارت کا افتتاح ۱۴ر فروری ۱۹۶۷ء

۲۵۔ مکتوبات سرسید، مرتبہ: اسماعیل پانی پتی، (۱۹۳۹ء)، مجلس ترقی اردو، لاہور، صفحہ: ۶۳

۲۶۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، مورخہ ۲۶ر اپریل ۱۸۶۷ء، روداد اجلاس منعقدہ ۲۰ر اپریل ۱۹۶۷ء

۲۷۔ حیات جاوید، الطاف حسین حالی، ترقی اردو بیورو، تیسرا ایڈیشن (۱۹۹۰ء) صفحہ: ۳۷۷

۲۸۔ علی گڑھ فرسٹ جنریشن، مصنفہ: ڈیویڈ لیلیویلڈ، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس (۱۹۹۶ء) صفحہ: ۵۹، حالاں کہ یہ صحیح نہیں ہے کہ آغا مرزا کی والدہ منور زمانی بیگم نواب خلیل اللہ خاں کی بیٹی تھیں۔ لیکن یہ وہ خلیل اللہ خاں نہیں تھے جو سرسید کے خالو تھے۔ غالباً نام کی مماثلث کی وجہ سے ڈیویڈ لیلیویڈ کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے۔

۲۹۔ حیات جاوید، الطاف حسین حالی، ترقی اردو بیورو، تیسرا ایڈیشن (۱۹۹۰ء) صفحہ: ۵۳۷

۳۰۔ سرسید کے خطوط، مرتبہ: وحید الدین سلیم، حالی پریس، پانی پت، صفحہ: ۱۷۔۱۶

۳۱۔ ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۳۷۔۳۵

۳۲۔ خلاصہ رپورٹ، مرزا عابد علی بیگ ٹرسٹی مدرسۃ العلوم مطبع، ریاض ہند، علی گڑھ (۱۹۰۳ء) صفحہ: ۳۳

۳۳۔ حیات جاوید، مصنفہ: الطاف حسین حالی، ترقی اردو بیورو، تیسرا ایڈیشن (۱۹۹۰ء) صفحہ: ۹۵۲

۳۴۔ سرسید کے نام مسٹر آر بیسن کا خط مورخہ ۲۴ر جنوری ۱۸۶۹ء انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۵ر فروری ۱۸۶۹ء

۳۵۔ سرسید کے لندن جانے کی درخواست، بحوالہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، مورخہ ۵ر فروری ۱۸۶۹ء

۳۶۔ حیات جاوید، تالیف: الطاف حسین حالی، ترقی اردو بیورو، تیسرا ایڈیشن (۱۹۹۰ء) صفحہ: ۴۱۸

۳۷۔ مکتوبات سرسید، مرتبہ: شیخ محمد اسماعیل پانی پتی مجلس ترقی ادب لاہور، صفحہ: ۳۴

۳۸۔ حیات جاوید، مصنفہ: الطاف حسین حالی، ترقی اردو بیورو، تیسرا ایڈیشن (۱۹۹۰ء) صفحہ: ۳۷۷

۳۹۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین، جلد: ۵، ماہ اگست ۱۸۹۷ء، نمبر ۸، تعلیم انگلستان دوم صفحہ: ۲۹۳

۴۰۔ روداد اجلاس سنڈیکیٹ منعقدہ: ۱۹ر دسمبر ۱۹۰۹ء، آرکایوز، سرسید اکیڈمی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۴۱۔ ہمایوں نامہ، مصنفہ: گلبدن بیگم، ترقی اردو بیورو، تیسرا ایڈیشن (۱۹۹۶ء)، ضمیمہ، صفحہ: ۸۸

۴۲۔ وائس چانسلر سرضیاء الدین کا خط ہندوستان ٹائمز کے ایڈیٹر مسٹر جوزف کے نام، مورخہ نومبر ۱۹۳۵ء، آرکائیوز، سرسید اکیڈمی، علی گڑھ

۴۳۔ وائس چانسلر سرضیاء الدین کا خط مورخہ ۲۸ر نومبر ۱۹۳۵ء بنام انصاری برادرز، چاندنی چوک، دہلی، آرکائیوز، سرسید اکیڈمی، علی گڑھ

۴۴۔ کارنامہ سروری، مرتبہ: نواب ذوالقدر جنگ، جنگ بہادر، مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (۱۹۳۳ء)

۴۵۔ مکتوبات سرسید، مرتبہ: شیخ محمد اسماعیل پانی پتی مجلس ترقی ادب، لاہور، صفحہ: ۱۱۰۔۱۱۱

۴۶۔ خطوط سرسید، مرتبہ: سید راس مسعود (۱۹۲۲ء) صفحہ: ۲۸

۴۷۔ ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۳۲۔۳۱

۴۸۔ ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۳۵

۴۹۔ مکتوبات سرسید، مرتبہ: شیخ محمد اسماعیل پانی پتی مجلس ترقی ادب، لاہور، صفحہ: ۴۹

۵۰۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۶۳

۵۱۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۶۸۔۶۷

۵۲۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۶۸

۵۳۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۱۱۲

۵۴۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۷۴

۵۵۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۱۱۲

۵۶۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۱۲۳

۵۷۔ خطوط سرسید، مرتبہ: سید راس مسعود، (۱۹۲۲ء)، صفحہ: ۷۹

۵۸۔ مخطوطہ نمبر ۳۲۳، مکاتیب وخطوط، مینسکر پٹ سیکشن، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۵۹۔ مکتوبات سرسید، مرتبہ: شیخ محمد اسماعیل پانی پتی مجلس ترقی ادب، لاہور، صفحہ: ۵۳

۶۰۔ سرسید کے خطوط، مرتبہ: مولوی وحید الدین سلیم، حالی پریس، پانی پت، صفحہ: ۵۹

۶۱۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۶۷

۶۲۔ سپرٹ ازم امنگ انڈین مسلمز، مصنفہ: فرانسز روبنس، وریکاس پبلشنگ ہاؤس، (۱۹۷۵ء)، صفحہ: ۷۴

۶۳۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۱۶۴

۶۴۔ حیات جاوید، تالیف: الطاف حسین حالی، ترقی اردو بیورو، تیسرا ایڈیشن (۱۹۹۰ء)، صفحہ: ۲۰۷

۶۵۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۲۹۴

۶۶۔ مکتوبات سرسید، مرتبہ: اسماعیل پانی پتی مجلس ترقی ادب، لاہور، صفحہ: ۱۱۵

۶۷۔ خطوط سرسید، مرتبہ: ڈاکٹر راس مسعود، (۱۹۲۲)، صفحہ: ۷۰

☆☆☆

باب سوم

سرسید کا دورِ وضعداری
(۱۸۷۰ء تا ۱۸۷۶ء)

۱۸۵۷ء کے خوں چکاں دور کے بعد سے ۱۸۶۹ء میں انگلستان جانے تک کے دس بارہ سال کے عرصہ کے دوران سرسید کی جو وفاداری انگریز حکمرانوں کے تئیں نظر آتی ہے وہ انگلستان سے واپس آنے کے بعد ایک وضعداری کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ جس پر سرسید تا حیات قائم رہے تھے۔ حالانکہ کئی ایسے مواقع آئے جب انگریز حکمرانوں سے ان کے اختلافات ہونے کے قوی امکانات پیدا ہو گئے تھے۔ اکثر وہ انگریز افسران کے حسد و جلن کے سبب، ان کی انتقامی کارروایوں کا بھی شکار ہوئے تھے لیکن اس سب کے باوجود ان کی وضعداری میں کوئی فرق نہ آیا۔ غالباً ان کی شخصیت کا یہ عنصر جاگیردارانہ نظام کی اُن اقدار کی دین تھا جن کی رو سے کسی کے تئیں اپنی وفاداری کو بار بار بدلنا بھی ایک بڑا عیب تصور کیا جاتا تھا۔

لندن سے واپسی کے بعد اہم خانگی معاملات:

انگلستان سے واپس آنے کے بعد جہاں سرسید نے اپنے مجوزہ منصوبے کے مطابق مدرسۃ العلوم کے قیام کے سلسلے میں کام کرنا شروع کیا اور ساتھ ہی مسلمانوں کے مذہبی خیالات کی اصلاح اور روایت پرستی و توہم پرستی کے خلاف آواز اٹھانے کے لیے تہذیب الاخلاق کو جاری کرنے کی کوششیں شروع کیں وہیں خانگی معاملات میں ان کی سب سے بڑی فکر یہ تھی کہ سید حامد برسرِ روزگار ہو جائیں۔ اس سلسلے میں ان کے یورپین دوستوں، خاص طور پر کرنل گریہم جیسے لوگوں نے انہیں مفید مشوروں سے نوازا ہوگا۔ کرنل گریہم اس زمانے میں بنارس ہی میں سپرنٹنڈنٹ پولیس کے بطور تعینات تھے۔ سید حامد کی عمر اس وقت ۲۱ سال کی تھی۔ وہ ایک دراز قد، متناسب جسم کے نہایت ہی خوش شکل نوجوان تھے۔ ایک تصویر میں ان کی شکل وصورت اور بالوں کی ساخت اور کنپٹی پر موجود لمبی لمبی قلموں

کو دیکھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے شیکسپیرین اسٹیج کے کسی نہایت خوب صورت ایکٹر کی تصویر ہو۔[1] پڑھنے میں دلچسپی نہ لینے کے باوجود انگلینڈ میں ڈیڑھ سال تک ایک انگریز ''ٹیوٹر'' کی مدد سے انگریزی کی تحصیل سے ان کی انگریزی زبان لکھنے پڑھنے، سمجھنے اور بولنے کی استعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا تھا۔ ڈیوڈ لیلیویلڈ کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ خطبات احمدیہ کے انگریزی میں ترجمہ کرنے میں بھی سید حامد شامل رہے تھے۔[2] حالانکہ یہ مفروضہ صحیح نہیں ہے کیوں کہ سرسید نے بہت واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ ترجمے کے کام کے لیے انھوں نے علیحدہ سے ایک مترجم کو بہ عوض معقول معاوضہ کے مقرر کیا تھا۔ سید حامد نے بنارس کی کچہری میں سب رجسٹرار کے بطور اپنی ملازمت کی ابتدا کی تھی لیکن بعد میں غالباً کرنل گریہم کے مشوروں اور کوششوں کے نتیجے میں سید حامد کو پولیس کے محکمے میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کی آسامی پر تعینات کر دیا گیا تھا۔ ان کا پہلا تقرر کس جگہ ہوا تھا اس کے بارے میں ہم وثوق سے کوئی بات نہیں کہہ سکتے ہیں۔ لیکن وہ مشرقی اضلاع ہی میں کسی جگہ تعینات ہوئے تھے۔ جو بنارس سے قریب تھی۔ بنارس سے قریب واقع ہونے کا مفروضہ اس لیے ذہن میں آیا کیوں کہ وہ اکثر بنارس آتے رہتے تھے۔ خاص طور پر کالج فنڈ کمیٹی کے اجلاسوں میں وہ اکثر موجود رہتے تھے۔ بہر حال ان کے بنارس آتے رہنے سے سرسید کو تنہائی کا احساس نہیں ہوتا ہوگا۔ ایک حوالے کی بنا پر ہم یہ بات وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ۱۸۷۶ء۔ ۱۸۷۷ء میں سید حامد اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے بطور گورکھپور میں تعینات تھے۔[3] اس کے علاوہ وہ پیلی بھیت اور فتح گڑھ میں بھی تعینات رہے تھے۔

بنارس میں سرسید کے چند معتمد:

سید حامد کی نوکری کے بعد سرسید بنارس میں اپنے نوکروں کے ساتھ تنہا رہ گئے تھے۔ اس زمانے میں نجیب اللہ ان کے خاص ذاتی ملازم کے بطور ان کے ساتھ تھے۔ ان کے دوسرے جاں نثار منشی محمد یار خاں جو سرسید کے ساتھ ہی غازی پور سے علی گڑھ آئے تھے اور سائنٹفک سوسائٹی کے اخبار کے پہلے ایڈیٹر مقرر کیے گئے تھے۔ سرسید کے انگلینڈ سے واپس آنے کے بعد منشی محمد یار خاں علی گڑھ سے مستعفی ہو کر دوبارہ سرسید کے پاس بنارس پہنچ گئے تھے۔ سرسید کے ابتدائی زمانے کے کالج فنڈ کمیٹی کے اجلاسوں اور تہذیب الاخلاق کو جاری کرنے کے سلسلے کے کاموں میں منشی محمد یار خاں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ ایم۔ اے۔ او۔ کالج فنڈ کمیٹی (مجلس خزینۃ التاسیس مدرسۃ العلوم المسلمین) کے بیشتر

اجلاسوں میں منشی محمد یار خاں اور سید حامد کی موجودگی دراصل ''کورم'' (ارکان کی وہ تعداد جن کی موجودگی جلسے کی کارروائی کو جائز قرار دیئے جانے کے لیے ضروری ہوتی ہے) پورا کرنے کی ''مشکل'' کے ایک آسان حل کے بطور دیکھی جا سکتی ہے۔ اس سلسلے میں سرسید کے ذاتی دوست مرزا محمد رحمت اللہ بیگ بھی کافی مددگار ثابت ہوتے تھے جنھیں بہت تھوڑے سے ''نوٹس'' پر بھی سرسید اجلاسوں میں شرکت کرنے کے لیے مدعو کر سکتے تھے۔[۴] اس وقت ''کورم'' کے بطور پانچ ممبروں کی موجودگی ضروری تھی۔ اس طرح سرسید کو شامل کر کے چار ممبر تو بآسانی دستیاب رہتے تھے (حالانکہ سید حامد کو مدعو کرنے میں ایک یا دو دن کا وقفہ ضروری ہوتا ہوگا یا پھر پہلے سے معلوم رہتا ہوگا کہ اتوار کی چھٹی گزارنے کے لیے وہ سنیچر کی شام تک بنارس پہنچ جائیں گے) ایک دو مزید ممبروں کی منظوری کے بعد مجوزہ اجلاسوں کو منعقد کرنے میں سرسید کو کوئی دقّت نہیں ہوتی تھی۔ حالانکہ اس سہولت کے باوجود سرسید کو اکثر ان اجلاسوں میں ''کورم'' پورا ہونے کے سلسلے میں پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ کیوں کہ اکثر اجلاس اچانک چند گھنٹوں کے ''نوٹس'' پر طلب کیے جانے کی ضرورت پڑ جاتی تھی جس کا تذکرہ سرسید کے خطوط میں ملتا ہے۔ ایک خط مورخہ ۱۶ر ستمبر ۱۸۷۴ء بنام سمیع اللہ خاں صاحب میں سرسید اس پریشانی کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''کمیٹی سے مجھ کو آٹھ ہزار روپے دینے کی اجازت ہوئی ہے۔ زیادہ دینے کے لیے اجازت کمیٹی کی درکار ہے، مشکل یہ ہے کہ جب تک پانچ ممبر جمع نہ ہوں کارگزاری نہیں ہو سکتی۔ آج چار بجے ممبر پھر جمع کروں گا اور ان سے اجازت لوں گا''۔[۵]

سرسید کے ذاتی چھاپہ خانے کی منتقلی:

اگست ۱۸۶۷ء میں سرسید کا تبادلہ علی گڑھ سے بنارس ہو گیا تھا اور وہ نو منتخب سکریٹری راجہ جے کشن داس صاحب کو سائنٹفک سوسائٹی اور اس کے اخبار وا پنے ذاتی پریس کا چارج دے کر بنارس چلے گئے تھے۔ یہاں ہم ضمناً یہ بات قارئین کے علم میں لانا چاہتے ہیں کہ جب ۱۲ر اکتوبر ۱۸۶۷ء کو منعقد ہونے والی سائنٹفک سوسائٹی کی جنرل میٹنگ میں شرکت کرنے کے لیے سرسید بنارس سے علی گڑھ آئے تو انھوں نے اس اجلاس میں اپنے ذاتی چھاپے خانے کو معہ تمام دوسرے ساز و سامان کے سائنٹفک سوسائٹی کو دینے کا اعلان کیا تھا۔ اور اس کی باقاعدہ کارروائی مجسٹریٹ کے آفس میں ملکیت منتقل کروانے کی درخواست

داخل کر کے پوری کر دی تھی۔[۶] اس رجسٹریشن میں انھوں نے یہ وضاحت کر دی تھی کہ وہ صرف ''چھاپے خانے'' کی ملکیت سوسائٹی کے نام منتقل کر رہے ہیں لیکن اُن کے رہائشی بنگلے کی جس عمارت میں چھاپہ خانہ اس وقت قائم ہے، وہ عمارت انہی کی ملکیت رہے گی۔ اسی لیے ۱۸۷۴ء تک راجہ جے کشن داس صاحب نے چھاپے خانے کے لیے ایک عمارت سائنٹفک سوسائٹی کے احاطے میں تعمیر کروانا شروع کر دی تھی جسے سمیع اللہ خاں نے مکمل کروایا تھا۔ ۱۸۷۵ء تک یہ چھاپہ خانہ سرسید کے ذاتی بنگلے سے سوسائٹی کے احاطے میں منتقل کروا دیا گیا تھا۔[۷]

(چھاپے خانے کی اس عمارت کی تعمیر کے سلسلے کا ابتدائی حساب علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۰ رفروری ۱۸۷۶ء کے صفحہ ۱۲۵ پر موجود ہے)

سید حامد کی شادی:

سید حامد کے نوکر ہو جانے کے بعد سرسید کو قدرتی طور پر بیٹے کی شادی کی فکر لاحق ہوئی ہوگی۔ سید حامد کی شادی کس سنہ میں ہوئی تھی اس کا اندازہ ہم نے اس بات سے لگایا کہ ہماری ایک اطلاع کے مطابق سید حامد کی اکلوتی صاحبزادی، محمدی بیگم کی شادی سرسید کے نواسے سید محمد علی سے ۱۸۸۸ء میں ہوئی تھی (سید محمد علی سرسید کے بڑے بھائی سید محمد خاں صاحب (مرحوم) کی بیٹی کے بیٹے تھے)۔ اس زمانے میں عام طور پر لڑکیوں کی شادیاں کافی کم عمری ہی میں کر دی جاتی تھیں۔ اگر شادی کے وقت محمدی بیگم کی عمر پندرہ سال بھی تصور کر لی جائے تو اس حالت میں ان کا سنہ پیدائش ۱۸۷۳ء کے آس پاس ہونا چاہیے۔ اس لیے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سید حامد کی شادی ۱۸۷۲ء کے آس پاس ہوئی ہوگی۔ بہر حال ہمارے مفروضات کے مطابق سرسید نے اپنے بڑے صاحبزادے سید حامد کی شادی ۱۸۷۲ء کے آس پاس ''بغیر کسی کروفر کے'' اپنی بڑی بہن (عجبۃ النسا بیگم) کی نواسی سے کر دی تھی۔ (سید حامد کی بیوی حکیم احمد الدین صاحب کی بڑی بہن تھیں۔ اس سلسلے میں ہم کئی حوالے پہلے پیش کر چکے ہیں۔)

سید محمود کی انگلستان سے واپسی:

اکتوبر ۱۸۷۳ء میں سید محمود کیمبرج اور 'لنکن اِن' سے 'بیرسٹر ایٹ لا' ہو کر واپس ہندوستان آئے تھے۔ لوگوں نے انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا تھا۔ سرسید نے بیٹے کی وطن واپسی کی

خوشی میں بنارس میں اپنے گھر پر ہی ایک پر تکلف ''ڈنر'' کا اہتمام کیا تھا۔ کرنل گریہم کے بقول:

> ''یہ اس صوبہ میں اپنی نوعیت کا انوکھا اور پہلا ڈنر تھا جس میں انگریزوں اور مسلمانوں نے ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا تھا غالباً چالیس سے زیادہ لوگ میز پر موجود تھے۔ سید احمد سرہانے کے سرے پر اور میں دوسرے سرے پر بیٹھا تھا۔'' ۸ے

سید محمود بھی اپنے بھائی اور والد کی طرح دراز قد تھے۔ جسم نہایت متناسب۔ رنگ سرخ وسپید۔ چہرے پر عمدہ تراشی داڑھی۔ لباس یورپین زیب تن کرتے تھے۔ ایک طرح سے نہایت جاذب شخصیت کے مالک تھے۔ سید محمود نے وطن واپس آنے کے کچھ عرصے کے بعد الہ آباد کے ہائی کورٹ میں ''پریکٹس'' شروع کردی تھی۔ پہلے ہی دن سے ان کی وکالت چمکنا شروع ہوگئی تھی۔ ہر آدمی اپنے مقدمے میں سید محمود کو ہی اپنا وکیل بنانے کا متمنی نظر آتا تھا۔ ان کی قانون دانی کی شہرت کا یہ حال تھا کہ کسی مقدمہ کی پیروی کے سلسلے میں صرف ان کا نام آجانا ہی مقدمہ کے مدعی کے حق میں فیصلہ ہوجانے کے مترادف سمجھا جانے لگا تھا۔ بڑے بڑے سیٹھ ساہوکار، زمین دار اور جاگیردار، نوابین اور راجے مہاراجے ،غرض اہل ثروت لوگ بڑی بڑی رقمیں خرچ کر کے سید محمود سے اپنے مقدموں کی پیروی کروانے کے متمنی رہتے تھے۔ اس زمانے میں سید محمود نے شہرت اور نام کے ساتھ بے انتہا روپیہ کمایا اور اسی شاہانہ انداز میں خرچ بھی کیا۔

الہ آباد میں سید محمود کی رہائش:

سید محمود الہ آباد میں ایک بہت بڑے یورپین طرز کے بنگلے میں نہایت شان سے رہتے تھے۔ انھوں نے الہ آباد میں جس بنگلے میں کرایہ پر رہائش اختیار کی تھی یہ نہایت وسیع احاطہ پر مبنی بنگلہ فیاض علی خاں کے کورٹ آف وارڈس سے متعلق تھا۔ بعد میں جب سید محمود ہائی کورٹ کے مستقل جج مقرر ہوئے تو انھوں نے اسی بنگلے کو اپنی رہائش کے لیے فیاض علی خاں کے کورٹ آف وارڈس سے خرید لیا تھا اور اس کو محمود منزل کے نام سے موسوم کیا تھا۔ یہ وہی بنگلہ ہے جو آج (اپنی نوتعمیر شکل میں) ''سوراج بھون'' کے نام سے جانا جاتا ہے ۔۱۸۹۴ء میں جب سید محمود نے ہائی کورٹ کی ججی سے استعفیٰ دے دیا تھا اور مستقل سکونت کے لیے علی گڑھ منتقل ہوگئے تھے اس وقت ''محمود منزل'' انھوں نے راجہ جے کشن داس صاحب کے ہاتھ فروخت کردی تھی۔ راجہ جے کشن داس صاحب نے یہ بنگلہ اپنے بیٹے

پر مانند کی رہائش کے لیے خریدا تھا جو اس وقت ہائی کورٹ میں وکالت کر رہے تھے۔ (راجہ جے کشن داس صاحب کے دوسرے دو بیٹوں کے نام جوالہ پرشاد اور جگدیش پرشاد تھے)۔ راجہ صاحب سے ہی یہ مکان موتی لال نہرو نے خریدا ہوگا۔ ۱۹۰۰ء میں موتی لال نہرو نے اسی مکان (سابقہ محمود منزل) کے احاطہ ہی میں آنند بھون کی تعمیر کروائی تھی جو اب بھی سوراج بھون کے قریب موجود ہے۔ (محمود منزل، سوراج بھون اور آنند بھون کی تاریخ کے سلسلے کی یہ اطلاعات اب بھی سوراج بھون کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔)[۹]

مسٹر جارج-ای-اے-راس:

مسٹر جارج-ای-اے-راس (Mr.George E.A.Ross) سید محمود کے ''دلنکن ان'' کے ساتھیوں میں سے ایک تھے۔ وہ ایک سابق لفٹنٹ گورنر کے خاندان سے تھے۔ ان کی پیدائش ہندوستان ہی میں ہوئی تھی۔ لیکن ان کی تعلیم انگلستان میں ہوئی تھی۔ مسٹر راس نے سید محمود کے ساتھ ہی ''دلنکن ان'' سے بارایٹ لا کیا تھا۔ وہ سید محمود کے طالب علمی کے زمانے کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ ۱۸۷۳ء میں سید محمود انگلینڈ سے واپس آ کر الہ آباد ہائی کورٹ میں پریکٹس کرنے لگے تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے مسٹر راس کو الہ آباد آ کر پریکٹس کرنے کی دعوت دی تھی۔ غالباً ۱۸۷۴ء میں مسٹر راس نے ہندوستان آ کر سید محمود کے ساتھ الہ آباد ہائی کورٹ میں قانون کی پریکٹس شروع کر دی تھی۔ ۱۸۷۷ء کے اوائل میں شادی ہو جانے کے بعد مسٹر راس دوبارہ واپس انگلینڈ چلے گئے تھے۔ اگلے چھ سات سالوں میں سید محمود کئی بار (تقریباً تین بار) انگلستان گئے تھے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ وہ اپنے دوست مسٹر راس ہی کی دعوت پر چھٹیاں گزارنے کے لیے انگلینڈ جایا کرتے تھے، جہاں وہ عموماً مسٹر راس ہی کے مہمان ہوتے تھے۔ ڈیوِیڈ لیلیویلڈ کے مطابق سرسید کے خاندان کے لوگوں میں، سینہ بہ سینہ چلی آ رہی روایات کے مطابق، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے خاندان کے افراد سید محمود کی شراب نوشی کی کثرت کے لیے عام طور پر مسٹر جارج-ای-اے-راس ہی کو ذمہ دار ٹھہراتے تھے۔[۱۰] اس بات کی تصدیق ایک ضمنی حوالے سے بھی ہوتی ہے۔ شیخ محمد عبداللہ (پاپا میاں) اپنی سوانح ''مشاہدات وتاثرات'' میں تحریر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ سید محمود نے شراب ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا جس سے ان کی صحت کو کافی فائدہ پہنچا تھا۔ شیخ عبداللہ صاحب نے یہ تو نہیں لکھا کہ یہ واقعہ کب ہوا تھا۔ لیکن غالباً یہ ۱۸۹۶ء کے آس پاس کی بات تھی، وہ اس سلسلے میں آگے تحریر کرتے ہیں کہ:-

''ان ہی دنوں میں ایک انگریز، سید محمود کا دوست بطور سیاح کے سفر کرتا ہوا علی گڑھ ان سے ملنے کے لیے آ گیا۔ وہ کچھ دنوں تک سید محمود کے پاس علی گڑھ میں رہا اور اس کے بعد دونوں مختلف مقامات پر قدیم عمارتیں اور یادگاریں دیکھنے کے لیے نکلے، دہلی، آگرہ، لکھنؤ، بنارس اور دیگر مقامات پر قریب ایک ماہ سے زیادہ گشت لگاتے رہے۔ یہ ان کے دوست کا ان کے پاس آنا ان کے حق میں سم قاتل ہو گیا۔ پرانی مے نوشی کی عادت پھر عود کر آئی......''[۱۱]

ہمیں یقین ہے کہ شیخ عبداللہ صاحب نے اپنے مندرجہ بالا اقتباس میں سید محمود کے جس دوست کی آمد کا تذکرہ کیا ہے وہ مسٹر راس ہی تھے۔اور غالباً انہی واقعات کی وجہ سے سرسید کے خاندان میں سید محمود کی مے نوشی کی کثرت کے لیے مسٹر راس کو مورد الزام ٹھہرایا جاتا تھا۔

سمیع اللہ خاں کا دوسرا دور تعاون:

سمیع اللہ خاں صاحب جو ہائی کورٹ کے آگرہ سے الہ آباد منتقل ہونے کے ساتھ ہی الہ آباد آ گئے تھے اور اب تک ہائی کورٹ میں پریکٹس کر رہے تھے۔لیکن ۱۸۷۳ء میں وہ دوبارہ عدلیہ کی سروس میں شامل ہو گئے تھے۔اس سلسلے میں ان کا پہلا تقرر بطور ''سب جج'' علی گڑھ میں ہوا تھا۔یعنی ۱۸۷۳ء کے آخر میں (یا ۱۸۷۴ء کے شروع میں) جب سید محمود نے الہ آباد ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی اس وقت تک سمیع اللہ خاں ''سب جج'' کے بطور علی گڑھ میں تعینات ہو چکے تھے۔اس لیے یہ کہنا کہ ابتدا میں جب سید محمود نے ہائی کورٹ میں پریکٹس شروع کی تھی تو اس وقت سمیع اللہ خاں نے ان کی کافی مدد کی تھی محض خیال آرائی معلوم ہوتی ہے۔علی گڑھ میں سمیع اللہ خاں صاحب کا قیام مسٹر سی۔جی۔کولین کے بنگلے نمبر ۳ میں تھا جو اب (اپنی نو تعمیر شکل میں) پرانے گیسٹ ہاؤس کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس بنگلے سے ملحق مسٹر کولین کے دو اور بنگلے تھے۔یعنی بنگلہ نمبر ۲ جو اب اسٹاف کلب کہلاتا ہے (اس وقت اس بنگلے میں علی گڑھ کے اسسٹنٹ کلکٹر مسٹر مارشل کرایہ پر رہائش پذیر تھے) اور بنگلہ نمبر ایک جو اس جگہ پر واقع تھا جہاں اب موریسن کورٹ کی عمارت موجود ہے۔مسٹر کولین کے یہ تینوں بنگلے ۱۸۷۴ء میں کالج فنڈ کمیٹی نے ۱۴ ہزار روپے میں خرید لیے تھے۔سرسید کے ذہن میں سمیع اللہ خاں صاحب کے سلسلے میں جو تلخی تھی

وہ اب تک (غالباً محسن الملک کی مصالحت اور وکالت سے) بہت حد تک ختم ہو چکی تھی۔ دوسرے علی گڑھ میں تقرر کے بعد (چھوٹے ہونے کے باوجود) سرکاری عہدے کے لحاظ سے اب سمیع اللہ خاں صاحب ایک طرح سے سرسید کے ہم رتبہ ہو گئے تھے (کیوں کہ سرسید بھی علی گڑھ میں سب جج کی حیثیت سے ہی تعینات ہوئے تھے) ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس امر کا سمیع اللہ خاں صاحب کو احساس بھی تھا۔ جس کا اکثر و بیشتر اظہار ان کے رویہ سے ہوتا رہتا تھا۔ انھوں نے سرسید ہی کی طرح علی گڑھ میں انگریزی طرز کے ایک بہت بڑے بنگلے میں رہائش اختیار کی تھی۔ چوں کہ اب وہ علی گڑھ میں موجود تھے۔ اس لیے کالج فنڈ کمیٹی کی ''علی گڑھ سب کمیٹی'' کے ممبر بھی نامزد ہوئے تھے۔ دوسرے جب ۱۸۷۴ء میں راجہ جے کشن داس صاحب نے (علی گڑھ سے الہ آباد تبادلہ ہو جانے کی وجہ سے) سائنٹیفک سوسائٹی کی سکریٹری شپ سے استعفیٰ دے دیا تھا تو اس وقت سمیع اللہ خاں صاحب ہی پر سب کی نظرِ انتخاب پڑی تھی اور وہ ہی سائنٹیفک سوسائٹی کے سکریٹری منتخب کیے گئے تھے۔ سرسید اختلافات کو جلد بھلا دیتے تھے۔ وہ ہر شخص کی اپنی انفرادیت اور مزاج کی مطابقت سے کام لینے کی قدرت رکھتے تھے۔ بہر حال سمیع اللہ خاں صاحب نے ایک بار پھر سرسید کے کاموں میں اپنے تعاون کے دوسرے دور کی ابتدا خاصے طمطراق سے کی تھی۔ لیکن سرسید کا سمیع اللہ خاں صاحب کی طرف ایک محتاط رویہ رکھنے کے باوجود جلد ہی سرسید، سمیع اللہ خاں صاحب کی طرف سے خاصے پس و پیش میں مبتلا ہو گئے تھے۔ یہ معاملہ اس وقت پیش آیا جب سمیع اللہ خاں صاحب کی رائے کے باوجود (سرسید کی ایما پر) کالج کمیٹی کے ممبران نے علی گڑھ میں فوری طور پر ابتدائی تعلیم کا مدرسہ کھولنے کی تجویز کو رد کر دیا تھا۔ سمیع اللہ خاں صاحب نے اس کو اپنی انا کا سوال بنا لیا تھا۔ اس وقت بقول سرسید:-

> ''سمیع اللہ خاں صاحب نے اور زیادہ ہمت کا کام فرمایا اور ایک علیحدہ خاص کمیٹی اس لیے جمع کی کہ سرمایہ کمیٹی خزانۃ البضاعۃ سے علیحدہ ایک خاص چندہ خاص واسطہ اجرائے ابتدائی تعلیم مدرسۃ العلوم کے کیا جاوے۔''

اس طرح دیکھا جائے تو سمیع اللہ خاں صاحب کی سرسید کے ساتھ تعاون کے دوسرے دور کی ابتدا بھی ایک اختلاف سے ہی ہوئی تھی۔

معاملات سلجھانے کے لیے سرسید کی حکمت عملی:

جس زمانے میں سرسید بہت انہماک کے ساتھ گورنمنٹ سے زمین حاصل کرنے، چندہ جمع کرنے، مختلف بنگلوں اور مکانوں کو خریدنے اور کالج کی عمارتوں کے نقشے وغیرہ بنوانے میں مصروف تھے اور بہت اعلیٰ پیمانے پر وائسرائے ہند کے ہاتھوں کالج کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھوانے کی کوششوں میں تن من دھن سے لگے ہوئے تھے۔ اسی زمانے میں چند ممبران کالج فنڈ کمیٹی، سرسید کے منصوبوں سے بے خبر، اس بات پر اصرار کر رہے تھے کہ ایک ابتدائی مدرسہ (مدرسہ ماتحت) علی گڑھ میں جاری کر دینا چاہیے۔ ظاہر ہے سرسید کا منشا نہ ہونے کی وجہ سے اس خیال کو تقویت نہ مل سکی اور ممبران کی اکثریت نے اس تجویز کو رد کر دیا۔ لیکن سمیع اللہ خاں صاحب نے، جو اس تجویز کے حامیوں میں سے تھے، اس کو اپنی انا کا سوال بنالیا اور علی گڑھ میں ابتدائی مدرسہ جاری کرنے کے واسطے علیحدہ سے ایک کمیٹی بنا کر انھوں نے چندہ جمع کرنا شروع کر دیا تھا۔ سرسید اپنے منصوبوں کی تشکیل میں اس قدر منہمک تھے کہ ان چھوٹی چھوٹی فروعی قسم کی باتوں میں پڑ کر اپنا وقت خراب نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اسی لیے ہر چیز کو درگزر کرتے ہوئے وہ اپنے منصوبوں کی تکمیل میں مصروف رہے۔ لیکن جب مسٹر سی۔ جے۔ کولین کے تین بنگلے کالج کمیٹی کے لیے خرید لیے گئے اور پرانی پریڈ گراؤنڈ کی زمین کے ملنے میں حکومت کی طرف سے رخنے ڈالے جانے لگے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سرسید کو اس بات میں وزن محسوس ہوا کہ نئے خریدے گئے بنگلوں میں سے اگر ایک بنگلے میں ابتدائی اسکول جاری کر دیا جائے تو کالج کے لیے زمین حاصل کرنے کی پیروی کرنے کے لیے ایک عمدہ جواز ہاتھ آ جائے گا جس کی بنا پر گورنمنٹ پر اخلاقی دباؤ بڑھانے میں مدد ملے گی۔ غالباً اسی مصلحت کے مدِ نظر انھوں نے دوسری مرتبہ کمیٹی میں ابتدائی مدرسہ جاری کرنے کی تجویز پیش ہونے پر مخالفت کرنے کے بجائے خاموش رہ کر اپنی رضا مندی کا اظہار کیا اور اس طرح کمیٹی کے اجلاس منعقدہ ۲۵ رفروری ۱۸۷۵ء میں اس سلسلے میں ایک تجویز پاس کر کے "تعلیم ابتدائی یعنی تعلیم صیغہ مدرسہ" جاری کرنے کی اجازت دے دی۔[۱۲] اور اس طرح ۲۴ رمئی ۱۸۷۵ء کو مسٹر کولین کے بنگلہ نمبر ۱ (یعنی موجودہ پرانے گیسٹ ہاؤس والے بنگلے) کے مرکزی ہال میں مولوی محمد کریم صاحب (ڈپٹی کلکٹر علی گڑھ) کی صدارت میں منعقد ایک چھوٹے سے جلسے میں ابتدائی اسکول کے افتتاح کی رسم ادا کی گئی اور پہلی جون سے ابتدائی اسکول کے کلاسوں میں پڑھائی شروع ہو گئی۔ مسٹر کولین

کے بنگلے نمبر۱ (جو تینوں بنگلوں میں سب سے چھوٹا تھا اور ماریسن کورٹ جہاں ہے وہاں واقع تھا) کو بورڈنگ ہاؤس کے بطور استعمال کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ مسٹر ہنری جارج اپمی سڈنس صاحب (جن سے سرسید کی خط وکتابت جاری تھی) نے شاہجہاں پور سے آ کر بطور ہیڈ ماسٹر ۲۳؍جون ۱۸۷۵ء کو اپنے عہدے کا چارج لے لیا۔ اس طرح سمیع اللہ خاں صاحب کے تعاون کے دوسرے دور کے ابتدائی اختلافات سرسید کی حکمت عملی سے کچھ عرصے کے لیے رفع ہوگئے۔ ۱۲؍نومبر ۱۸۷۵ء کو سرسید نے سرولیم میور کو وزیٹر کی حیثیت سے ابتدائی مدرسہ میں مدعو کر کے شاندار استقبالیہ دیا اور بیگم میور کے ہاتھوں ایک درخت لگوا کر میور پارک کا افتتاح کروایا، اس طرح وہ حکومت پر مستقل اخلاقی دباؤ بڑھانے کی سعی کرتے رہے، ان کا حکام سے کہنا تھا کہ میور پارک کا افتتاح ہو چکا ہے، اس لیے ان کو زمین پر جلد دخل درکار ہے تاکہ وہاں فوراً ایک خوبصورت پارک اور اس کی باؤنڈری تعمیر کرنے کا کام شروع کیا جا سکے۔ ان کی یہ حکمت عملی آخرکار کام آئی اور مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد پرانی پریڈ گراؤنڈ کی ۷۴ ایکڑ زمین پر دخل ملنے کی دستاویز مورخہ ۸؍مئی ۱۸۷۶ء کو کالج فنڈ کمیٹی کو مل گئی۔ حالانکہ گورنمنٹ سے زمین کی سند ملنے کی یقین دہانی کے بعد سرسید نے مارچ ۱۸۷۶ء کے پہلے ہفتہ میں کالج کی زمین کی جنوبی باؤنڈری کی داغ بیل ڈلوانا اور ظہور گیٹ اور طالب علموں کی سکونت کے واسطے تعمیر کیے جانے والے چار چھپر کے بنگلوں کی بنیادیں کھدوانا شروع کر دی تھیں۔

اس سلسلے میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۳؍مارچ ۱۸۷۶ء میں سرسید تحریر کرتے ہیں کہ:

> ''اگرچہ ادائے رسم فاؤنڈیشن بالفعل ملتوی ہوگئی ہے مگر کمیٹی نے اجرائے کار تعمیر کو ملتوی نہیں کیا ہے اور یہ تجویز ہوئی ہے کہ دیگر مکانات متعلق کالج کی تعمیر شروع ہو جاوے۔''[۱۳]

سرسید ہاؤس کی خریداری:

سید محمود کا خیال تھا کہ علی گڑھ میں (موجودہ تصویر محل کے قریب) موجود سرسید کا بنگلہ کالج کے احاطہ سے کافی فاصلے پر واقع ہے۔ اس لیے اس کو فروخت کر کے وہ سرسید کی رہائش کے لیے کالج کے احاطہ کے قریب ہی کوئی بڑا بنگلہ خرید لینا چاہتے تھے۔ سید محمود خود اپنے پیسے سے سرسید کے لیے ایک نیا بنگلہ خریدنا چاہتے تھے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ اس طرح

اپنے پرانے بنگلے کو فروخت کر کے سرسید وہ روپیہ ادا کرسکیں گے جو اس بنگلے کو گروی رکھ کر سرسید نے بطور قرض حاصل کیا تھا اور جس کی کچھ رقم ابھی تک باقی تھی۔ کالج کے احاطے کے مشرق میں سڑک کے دوسری طرف (یعنی سیول ایریا میں) اس وقت تین چار بنگلے ہی موجود تھے۔ ان میں سے ایک بنگلہ مسٹر ایچ رابرٹ کا تھا (جو بعد میں تار والے بنگلے کے نام سے موسوم ہوا تھا) دوسرا بنگلہ مسٹر ڈبلو۔ یو۔ کیلے کا تھا۔ اس بنگلے کے احاطے کو دو حصوں میں تقسیم کر کے جنوب کی جانب کے حصہ کو فروخت کر دیا گیا تھا، جس میں ایک بہت بڑی کوٹھی خواجہ محمد یوسف صاحب نے تعمیر کروائی تھی جو اس وقت ''حوض والی کوٹھی'' کے نام سے جانی جاتی تھی (یہ کوٹھی آجکل نہر والی کوٹھی کے نام سے موسوم ہے کیونکہ اس میں نہر کا آفس قائم ہے) کیلے کے پلاٹ کے شمالی حصہ میں پھر دو حصے کیے گئے تھے۔ مغربی حصہ میں ایک بڑا پھوس کا بنگلہ تعمیر کیا گیا تھا جس کو بعد میں ''فلیر ہاؤس'' کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ یہ بنگلہ شروع سے کالج کے پاس کرایہ پر رہا تھا اور بعد میں (یعنی ۱۹۰۷ء میں) اسے کالج نے خرید لیا تھا اب اسی بنگلے کے احاطہ میں دو یکساں پختہ کوٹھیاں بنی ہوئی ہیں جنہیں کالج نے ۱۹۳۰ء میں تعمیر کروایا تھا۔ ''کیلے'' کے احاطہ کے مشرقی حصہ میں ایک نسبتاً چھوٹے بنگلے کی عمارت موجود تھی اس لیے یہ ''بنگلہ خورد'' کے نام سے جانا جاتا تھا اس بنگلے کو بھی سرسید نے کالج کلاسوں کے لیے ۱۸۸۰ء-۱۸۷۹ء میں خرید لیا تھا۔ (دیکھیے نقشہ نمبر۔۱)

مسٹر رابرٹ اور مسٹر کیلے کے بنگلوں کے مشرق میں ایک بہت بڑے احاطہ پر مبنی ایک بڑا بنگلہ موجود تھا۔ یہ مسٹر ایچ۔ڈی۔فرگوسن کا بنگلہ تھا۔ غرض اسی بڑے بنگلے کو سید محمود نے سرسید کی رہائش کے لیے پسند کیا اور غالباً مئی ۱۸۷۶ء میں اس بنگلہ کو مسٹر فرگوسن سے خریدنے کے سلسلے کی تمام کارروائی مکمل کر لی گئی تھی۔ فرگوسن کے بنگلے کو سید محمود نے کتنے میں خریدا تھا اس سلسلے میں ہمیں کوئی یقینی حوالہ تو نہ مل سکا لیکن اس زمانے میں خریدے گئے دوسرے بنگلوں کی قیمتوں (اور بنگلہ کے محل وقوع وغیرہ) کو دیکھتے ہوئے ہمارا خیال ہے کہ مسٹر فرگوسن کا بنگلہ سید محمود نے تقریباً سات یا آٹھ ہزار میں خریدا ہوگا۔ اس بنگلے کو خریدنے کے بعد سید محمود نے اسے سرسید کے رہنے کے واسطے نئے سرے سے یورپین اسٹائل میں آراستہ کروایا تھا۔ اس سلسلے میں کرنل گریہم ۱۸۸۵ء میں تحریر کرتے ہیں کہ:-

''سید احمد کافی عرصہ سے علی گڑھ میں اپنے آرام دہ مکان میں رہ رہے ہیں جو ان کے بیٹے سید محمود نے خرید کر ان کے واسطے یورپین

اسٹائل میں آراستہ کروایا تھا۔ اس مکان میں وہ اپنے کثیر التعداد مہمانوں کی خاطر ومدارات کرتے ہیں، جو ہندوستان کے مختلف مقامات سے آتے ہیں۔''۱۴؎

سرسید کا پرانے بنگلے کو فروخت کرنا:

ہمارے اندازے کے مطابق ۱۸۷۶ء کے اوائل ہی میں سرسید نے اپنے پرانے بنگلے کو فروخت کرنے کا عمل بھی پورا کر لیا تھا۔ اس بنگلے کو سمیع اللہ خاں صاحب نے خریدا تھا۔ سمیع اللہ خاں ۱۸۷۴ء میں کولین کے بنگلے نمبر ۳ میں بطور کرایہ دار سکونت پذیر تھے۔ لیکن جب یہ بنگلہ کالج کمیٹی نے خرید لیا تو سمیع اللہ خاں صاحب نے اسے خالی کر دیا تھا۔ ہمارے مفروضہ کے مطابق اس وقت سمیع اللہ خاں صاحب سرسید کے اصرار پر ان کے پرانے بنگلے (واقع نزد مسیحی قبرستان) میں منتقل ہو گئے ہوں گے جو سرسید کے بنارس تبادلہ ہو جانے کے بعد سے خالی پڑا ہوا تھا۔ اسی لیے جب سرسید نے اس بنگلے کو فروخت کرنے کا ارادہ کیا ہوگا تو سمیع اللہ خاں صاحب کو اس سلسلے میں فوقیت دی ہوگی۔ سمیع اللہ خاں صاحب کے ذریعہ خریدے جانے کے بعد یہ بنگلہ سمیع منزل کے نام سے موسوم ہوا۔ (کچھ عرصہ کے لیے یہ بھوپال ہاؤس کے نام سے بھی جانا جاتا تھا) اس بنگلے کے باقیات ابھی حال تک موجود تھے ۔لیکن پچھلے سال (یعنی ۲۰۰۳ء میں) ان باقیات کو منہدم کر کے اس کے احاطے کی زمین پر ''پلاٹ'' بنا کر فروخت کر دیے گئے جہاں اب متعدد عمارتیں تعمیر ہونا شروع ہو گئی ہیں۔

سرسید کا ریٹائرمنٹ:

سرسید کے خط (بنام سر ولیم میور) مورخہ ۶/جولائی ۱۸۷۶ء کے ذریعہ ان کے ملازمت سے ریٹائر ہونے کی تاریخ کا علم ہوتا ہے۔ وہ اس خط میں تحریر کرتے ہیں کہ:-

''میں پبلک سروس سے ۱۸/جولائی کو ریٹائر ہو جاؤں گا اور علی گڑھ کا قصد کروں گا''۱۵؎

۱۸/جولائی ۱۸۷۶ء کو سرسید کی عمر ۵۸ سال اور سات مہینے ہوئی تھی۔ اس زمانے میں ریٹائرمنٹ کی عمر کیا تھی؟ اس کا تو ہم کو صحیح علم نہیں ہے۔ لیکن ہم کو اتنا اندازہ ضرور ہے کہ اس زمانے میں ریٹائرمنٹ کی عمر ۵۸ سال سے کم ہی تھی۔ بہر حال یہ کہنا کہ سرسید وقت سے پہلے پنشن لے کر علی گڑھ چلے آئے تھے صحیح نہیں معلوم ہوتا ہے یہ ضرور ہے کہ ان کے کام سے

حکام اس قدر مطمئن تھے کہ اگر وہ چاہتے تو ان کی ملازمت کی مدت میں توسیع ہو سکتی تھی۔

سر سید کو کتنی پنشن ملنا مقرر ہوئی تھی اس سلسلے میں حالی لکھتے ہیں کہ:-

''وہ ۳۷ برس سرکاری ملازمت میں رہے اور اس عرصہ میں سو روپیہ سے لے کر آٹھ سو روپیہ ماہوار تک تنخواہ پاتے رہے۔ جب تک سید محمود ہائی کورٹ کے جج رہے ایک ہزار ماہوار باپ کو دیتے رہے۔ نوکری کے بعد آخیر تک چھ سو روپیہ پنشن کی آمدنی رہی مگر کبھی ان کی آمدنی خرچ کو مکتفی نہیں ہوئی۔''[۱۶]

پنشن کے سلسلے میں حالی کا مندرجہ بالا بیان قدر غیر یقینی معلوم ہوتا ہے۔ ہم وثوق سے تو نہیں کہہ سکتے ہیں لیکن مختلف ضمنی شواہد کی بنیاد پر ہمارا خیال ہے کہ سر سید کی پنشن تقریباً تین سو روپیہ ماہوار مقرر ہوئی تھی اس کے علاوہ پولیٹکل پنشن کے بطور ان کو دو سو روپے ماہوار مزید ملتے تھے۔ اس طرح ریٹائرمنٹ کے بعد ان کی ذاتی آمدنی تقریباً پانچ سو روپیہ ماہانہ تھی (خیال اغلب ہے کہ حالی نے اسی مجموعی پنشن کی رقم کو چھ سو روپیہ ماہانہ لکھا ہوگا) جو اس زمانے میں ایک بڑی رقم تصور کی جاتی تھی اور سر سید کے اعلیٰ معیار زندگی کی کفالت کے لیے کافی تھی۔ اس آمدنی میں ہم نے دہلی کی جائداد کی آمدنی کو شامل نہیں کیا ہے۔ سید محمود کتنا روپیہ ماہانہ اپنے والد کو دیا کرتے تھے اس سلسلے میں ہم کو کوئی مستند حوالہ نہ مل سکا۔ لیکن ایک ہزار روپیہ ماہانہ کی رقم قدر فاضل معلوم ہوتی ہے۔ سید محمود کو تقریباً ۶۰۰ روپیہ ماہانہ پنشن ملا کرتی تھی۔ عام طور پر پنشن کی رقم مجموعی تنخواہ کی رقم کی تقریباً نصف ہوا کرتی ہے۔ اس طرح سید محمود کی تنخواہ تقریباً ۱۲۰۰ روپیہ ماہوار آنکی جا سکتی ہے۔ اگر اس کو اور زیادہ فراخ دلی سے آنکا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ سید محمود کی تنخواہ تقریباً ڈیڑھ ہزار روپے ماہوار ہوگی۔ ایسی صورت میں ایک ہزار روپیہ مہینہ سید محمود کا سر سید کو دینا قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا ہے۔

سر سید کا علی گڑھ منتقل ہونا:

سر سید ۱۸ر جولائی ۱۸۷۶ء کو عدلیہ کی سروس سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی غالباً ۳۱ر جولائی ۱۸۷۶ء تک بنارس ہی میں مقیم رہے تھے۔ اس کی شہادت اس جلسے کی روداد سے ملتی ہے جو سر سید کے اعزاز میں الوداعیہ کے بطور ہندو کالج میں منعقد کیا گیا تھا۔ جس میں سر سید کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے بڑی جذباتی تقریریں ہوئی تھیں۔ اسی

لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ۳۱/ جولائی کے بعد یعنی اگست ۱۸۷۶ء کے پہلے ہفتہ کے اوائل میں سر سید مستقل رہائش اختیار کرنے کے ارادے سے بنارس سے علی گڑھ منتقل ہوئے تھے۔ (غالباً ۲/ اگست ۱۸۷۶ء کو وہ علی گڑھ پہنچے تھے) علی گڑھ میں وہ فرگوسن کے خوبصورت بنگلے میں رہائش پذیر ہوئے تھے (آج یہ بنگلہ عرف عام میں ''سر سید ہاؤس'' کے نام سے مشہور ہے) جو سر سید کے علی گڑھ آنے سے پہلے ہی ان کی رہائش کے لیے آراستہ کر دیا گیا تھا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ۲/ اگست ۱۸۷۶ء کو ''سر سید ہاؤس'' میں سر سید کی زندگی کا سب سے طرح دار اور تخلیقی دور شروع ہوا تھا۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ سید حامد کی یہ تصویر سر سید اکیڈمی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، کے سر سید میوزیم میں آویزاں ہے
۲۔ علی گڑھ فرسٹ جنریشن، مصنفہ: ڈیوڈ لیلیویلڈ
۳۔ کالج کے احاطہ کی جنوبی دیوار پر سید حامد کے نام کے ساتھ اسٹینٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس، گورکھپور کندہ ہے
۴۔ کالج فنڈ کمیٹی کے (۱۸۷۴ء کے) اجلاسوں کی رودادوں میں، موجود ممبروں کے ناموں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔
۵۔ سر سید اور فن تعمیر، مصنفہ: افتخار عالم خاں، سر سید اکیڈمی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۲۰۰۱ صفحہ: ۳۴
۶۔ روئیداد سین ٹیفک سوسائٹی، منعقدہ: ۱۶/ اگست ۱۸۶۷ء بحوالہ، سر سید اور سین ٹیفک سوسائٹی، مصنفہ: افتخار عالم خاں، صفحہ: ۴۱
۷۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، مورخہ ۲۰/ فروری ۱۸۷۴ء مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، صفحہ: ۱۲۵
۸۔ دی لائف اینڈ ورک آف سید احمد، مصنفہ: جی ایف آئی گریہم (۱۸۸۵ء)، صفحہ: ۲۵۰
۹۔ بحوالہ: زبانی گفتگو مابین راقم و ڈیوڈ لیلیویلڈ (مارچ ۱۸۰۲ء) علی گڑھ
۱۰۔ ایضاً ایضاً ایضاً
۱۱۔ مشاہدات و تاثرات، مصنفہ: ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ، جمال پرنٹنگ پریس، دہلی (۱۹۶۹ء) صفحہ: ۱۵۴
۱۲۔ روئیداد اجلاس کالج فنڈ کمیٹی، منعقدہ: ۲۵/ فروری ۱۸۷۵ء بمقام بنارس، سر سید اکیڈمی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
۱۳۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، مورخہ مارچ ۱۸۷۶ء، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، صفحہ: ۱۲۹
۱۴۔ دی لائف اینڈ ورک آف سید احمد، مصنفہ: جی ایف آئی گریہم (۱۸۸۵ء)، صفحہ: ۳۸۰
۱۵۔ سر سید کی خط و کتابت، مرتبہ: شان محمد، سر سید اکیڈمی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (۱۹۹۵ء)، صفحہ: ۲۲
۱۶۔ حیاتِ جاوید، مؤلفہ: الطاف حسین حالی، ترقی اردو، بیورو، دہلی، صفحہ: ۴۴۷

☆☆☆

باب چہارم

سرسید کا دورِ طرحداری
(۱۸۷۶ء تا ۱۸۹۰ء)

''سرسید ہاؤس'' میں منتقل ہونے کے بعد سرسید نے اپنی زندگی کے سب سے اہم اختراعی و تخلیقی دور کا آغاز کیا تھا۔ یہ وہ دور ہے جب ہم ان کی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار آتے دیکھتے ہیں اسی کے ساتھ یہ ان کی زندگی کا سب سے خوش آئند اور طرح داری کا دور بھی تھا۔

سرسید ہاؤس:

سرسید ہاؤس ایک عالی شان یورپین اسٹائل کا چھپر کا بنگلہ تھا۔ جس کا لق و دق احاطہ تقریباً ۱۱۸ ایکڑ زمین پر مبنی تھا۔ اس بنگلہ میں چار وسیع بیڈ روم، مع ملحق غسل خانوں کے موجود تھے۔ وسط میں ایک بڑا مرکزی ہال تھا جو ایک گول محراب کے ذریعہ دو حصوں میں منقسم کر دیا گیا تھا۔ اس مرکزی ہال کا ایک حصہ ''ڈرائنگ روم'' اور دوسرا حصہ ''ڈائننگ روم'' کے بطور استعمال کیا جاتا تھا۔

مکان کے چاروں طرف برآمدہ تھا جس کی چھت ''ڈاٹ'' کی تھی۔ مشرق و مغرب کی سمت میں واقع برآمدے کافی کشادہ تھے۔ اس کے علاوہ شمال کی جانب (اصل عمارت سے ملحق) باورچی خانہ، جنس کی کوٹھریاں اور ہندوستانی طرز کے بیت الخلا و خدمت گاروں کے استعمال کے لیے ایک کھپریل کی چھت کا برآمدہ موجود تھا۔

سرسید اس بنگلہ میں رہنے کے لیے آئے تو تنہا تھے۔ لیکن ان کے آتے ہی اُن کے آس پاس ایک محفل جمع ہو گئی تھی۔ بیٹوں کے لیے ایک بیڈ روم (تاکہ جب وہ علی گڑھ آئیں تو اس میں قیام کر سکیں) نواسوں کے لیے دوسرا بیڈ روم، مہمانوں کے لیے تیسرا بیڈ روم اور خود سرسید کی رہائش کے لیے چوتھا بیڈ روم۔ اس طرح جلد ہی اس بڑے بنگلہ کی عمارت میں رہائش کے لیے جگہ کی قلت محسوس ہونے لگی تھی۔ خاص طور پر آفس کا کام کرنے، لکھنے پڑھنے اور کتابوں کو رکھنے کے لیے جگہ کی کمی کا احساس پہلے دن سے ہونے لگا

تھا۔ وقتی طور پر کتابوں کی چند الماریوں کو کھانا کھانے کے بڑے کمرے میں دیوار کے سہارے قرینہ سے لگا دیا گیا تھا۔ دوسرے اس یورپین طرز تعمیر کے بنگلے میں، مسلم معاشرے میں پلی بڑھی خواتین کی رہائش کے لیے بھی کوئی معقول انتظام موجود نہ تھا۔ سرسید کی بہن، بہو، بھاوج اور بھتیجی وغیرہ کبھی نہ کبھی تو علی گڑھ آتی ہی ہوں گی۔ اسی وجہ سے جلد ہی سرسید کو اس مکان میں مناسب توسیع کی فکر لاحق ہوگئی تھی۔ جس کے نتیجہ میں انھوں نے ۱۸۸۱ء تک (اگلے تین سالوں میں) اپنی سہولت اور ضروریات کی مطابقت سے اس بنگلہ کی عمارت میں مناسب اضافے اور توسیع کی تھی جس کا بیان ہم آئندہ درج کریں گے۔ (جب سرسید ہاؤس کو خریدا گیا تھا اس وقت اس میں کم وبیش اتنی ہی مکانیت موجود تھی جتنی کہ اس وقت سرسید ہاؤس کی ''نوتعمیر'' عمارت میں موجود ہے۔ (سرسید کے ذریعہ کیے گئے اضافوں کو موجودہ ''نوتعمیر'' عمارت کے نقشہ میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔) (دیکھیے نقشہ نمبر۔۲)

سرسید ہاؤس کا احاطہ:

سرسید ہاؤس کے لق ودق احاطہ کے آس پاس مٹی کی تین چار فٹ اونچی (کچی) دیوار موجود تھی۔ جس کے سہارے مختلف اقسام کے پیڑ ''باڑ'' کے بطور لگے تھے جن میں خار دار جھاڑیوں کے علاوہ پستہ قد کھجور کے درخت بھی شامل تھے۔ اس احاطہ کا مرکزی دروازہ جنوب کی جانب (مغربی کونے میں) واقع تھا۔ اس بنگلہ میں آنے جانے کے لیے (موجودہ) بیک روڈ کا استعمال کیا جاتا تھا۔ احاطہ کے جنوبی حصہ میں (یعنی کوٹھی کے سامنے) آم کا باغ لگا تھا۔ (جس میں دوسرے پھلوں کے پیڑ بھی موجود تھے)۔ مرکزی دروازے سے آنے والی سڑک اس باغ سے گزر کر ایک پان کی شکل کا (بیضاوی) دائرہ سا بناتی ہوئی بنگلے کے ''پورٹیکو'' سے گزرتی تھی جس کی وجہ سے بنگلے میں آنے اور جانے کے لیے بآسانی ایک ہی سڑک کا استعمال کیا جاسکتا تھا۔

احاطہ کے اندر بنگلہ کی عمارت کے مشرق میں کرکٹ کھیلنے کا میدان تھا (اب اس میدان میں خلیق احمد نظامی ریسرچ سینٹر کی جدید عمارت تعمیر کی جارہی ہے) کرکٹ کے میدان سے ملحق ہی ٹینس کھیلنے کا کورٹ تھا۔ احاطہ کے اندر مختلف جگہوں پر تین پختہ کنوئیں موجود تھے۔ (غالباً ایک کنوئیں کا بعد میں اضافہ ہوا تھا) کرکٹ میدان اور ٹینس کورٹ میں پانی دینے کے لیے ان کے اطراف پختہ نالیاں موجود تھیں۔ کرکٹ میدان کے شمال میں

سرسید ہاؤس (قدیم)

سرسید ہاؤس (جدید)
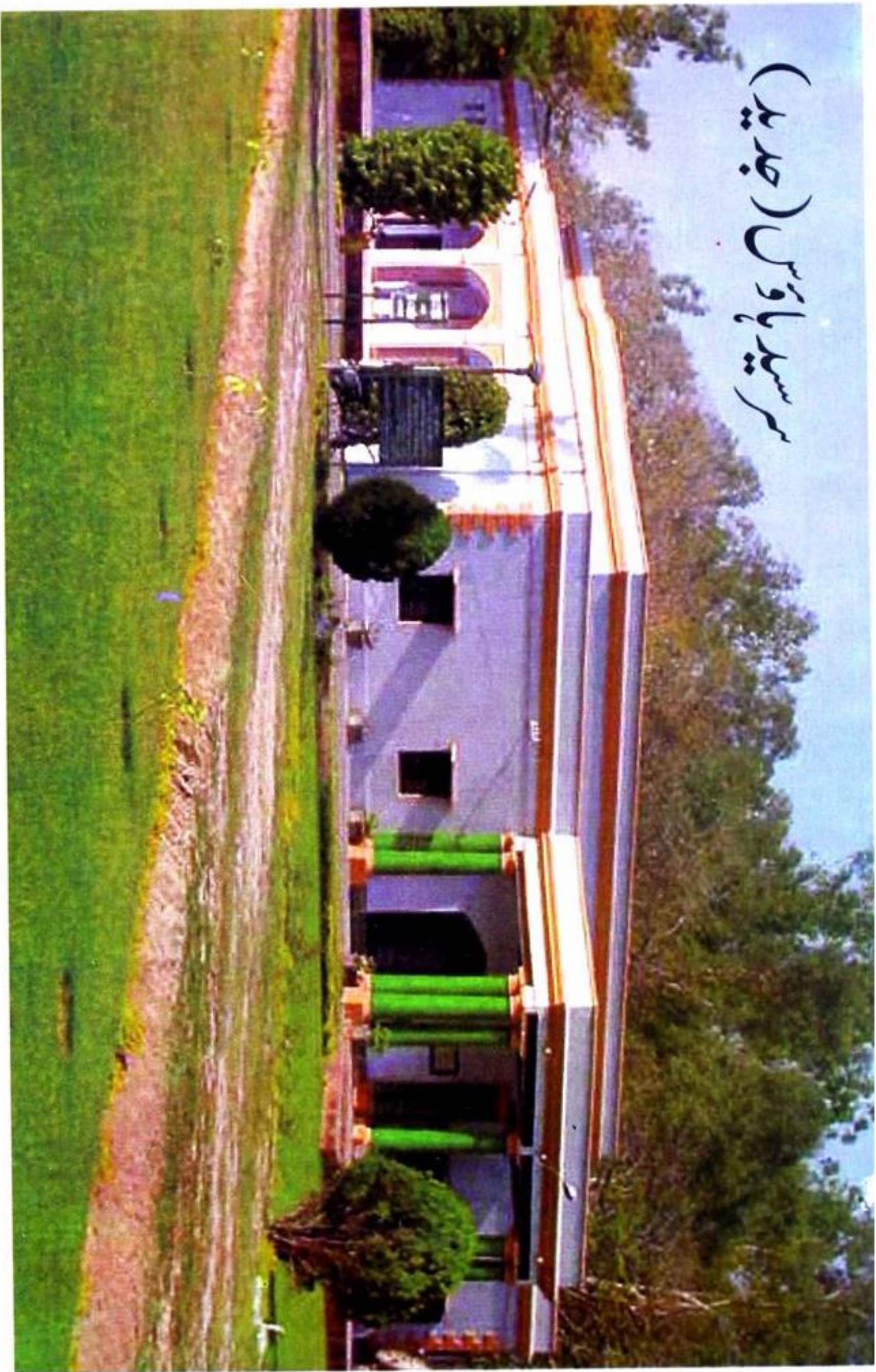
ایک بڑا کمرا اور اس کے سامنے ایک سہ دری، پویلین کے بطور تعمیر کروائی گئی تھی۔ جس کو کھیلوں سے متعلق متفرق سامان کو اسٹور کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ (بعد کے کاغذات میں اس کمرے اور سہ دری کو مکتب کے نام سے موسوم کیا گیا ہے جو ایک طرح سے اس کا ثانوی استعمال تھا) کنوؤں سے پانی نکالنے کے لیے بیلوں کے ذریعہ ''پل'' چلانے کا انتظام موجود تھا۔ احاطہ کے شمالی حصہ میں کاشت بھی کی جاتی تھی۔ بنگلہ کی عمارت کے سامنے پان کی شکل کا وسیع لان تھا جس کے آس پاس پھولوں کی کیاریاں موجود تھیں۔ احاطے کے جنوبی حصہ کے مشرقی کونے میں ایک بڑے احاطے کے اندر گھوڑوں کے لیے اصطبل، مویشیوں کے لیے باڑہ اور نوکروں کی رہائش کے لیے شاگرد پیشہ موجود تھا۔ اس احاطے کا ایک بڑا پھاٹک تھا، جو اب بھی موجود ہے، اس پھاٹک کی بناوٹ کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ احاطہ اور اس کا پھاٹک سرسید ہی نے سرسید ہاؤس کو خریدنے کے بعد تعمیر کروایا تھا۔

۱۹۰۳ء میں، سید محمود کے انتقال کے بعد اسی احاطہ میں مشرف جہاں بیگم صاحبہ نے اپنی رہائش کے لیے ایک جدید کوٹھی تعمیر کروائی تھی، جو آج کل ''پیلی کوٹھی'' کے نام سے پہچانی جاتی ہے، لیکن اس کوٹھی سے ملحق سابق باڑے کا پھاٹک اور شاگرد پیشے کے باقیات ابھی تک موجود ہیں۔

سرسید ہاؤس میں پہلی تقریب:

سرسید دسمبر ۱۸۷۵ء سے ہی اس تگ و دو میں مصروف نظر آتے ہیں کہ کس طرح وائسرائے ہند کے ہاتھوں سے، ایک عالیشان تقریب میں کالج کی عمارتوں کا سنگِ بنیاد رکھوایا جاسکے۔ لیکن وائسرائے ہند سے اس تقریب کے لیے وقت لینا اور تاریخ مقرر کروانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ محمد مسعود شاہ کے خط بنام سرسید مورخہ ۹/ دسمبر ۱۸۷۵ء سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس وقت سے اس تقریب کو منعقد کرنے کے لیے نہ صرف کوشاں تھے بلکہ ابتدائی تیاریاں بھی بڑے انہماک سے کر رہے تھے۔ انسٹی ٹیوٹ گارڈن کے مالی ضمیرالدین کو پھولوں کے ایک ہزار گملے تیار کرنے کی تلقین کی گئی تھی۔ (ایک ہزار گملے ۵۰ روپے میں خریدے گئے تھے) سوسائٹی کی عمارت کے احاطے اور سڑکوں کی ناپ تول کروائی گئی تھی، تاکہ ان کے دونوں کناروں پر روشنی کا انتظام کیا جاسکے۔ دغدغی اور جھنجھنیوں کے نمونے تیار کروائے گئے تھے۔[1] سرسید اس وقت کے وائسرائے ہند، لارڈ نارتھ بروک کے

ہاتھوں سنگِ بنیاد نصب کرنے کی رسم ادا کروانا چاہتے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے اسی زمانے میں لارڈ نارتھ بروک واپس انگلینڈ چلے گئے تھے اور سنگِ بنیاد نصب کرنے کی تقریب التوا میں پڑ گئی تھی۔ اس سلسلے میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ذریعہ مطلع کیا گیا تھا کہ:

''لارڈ نارتھ بروک وائسرائے اور گورنر جنرل ہندوستان، واپس انگلینڈ جانے کی وجہ سے مدرسۃ العلوم کا سنگِ بنیاد نصب نہ کر سکیں گے''۔[۲]

حالاں کہ اسی تقریب کی تیاری کے بطور سرسید نے مارچ ۱۸۷۶ء میں کالج کی جنوبی باؤنڈری اور ظہور گیٹ نیز طلبا کی رہائش کے لیے (شین کے بنگلہ کے احاطہ میں) چار پھوس کے چھوٹے بنگلوں کی تعمیر کا کام شروع کروادیا تھا۔ اس سلسلے میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۳/مارچ ۱۸۷۶ء میں سرسید تحریر کرتے ہیں کہ:

''اگرچہ ادائے رسم فاؤنڈیشن بالفعل ملتوی ہوگئی ہے، مگر کمیٹی نے اجرائے کارِ تعمیر کو ملتوی نہیں کیا ہے اور یہ تجویز ہوئی ہے کہ دیگر مکانات متعلق کالج کی تعمیر شروع ہوجاوے اور طالب علموں کے رہنے کے مکانات، پارک اور باغ بننا شروع ہوجاوے؛ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مدرسۃ العلوم کی زمین کی پیمائش ہورہی ہے اور سرخ سرخ جھنڈیاں اس میں استادہ ہیں اور نہایت خوش نما سڑکیں اور خوبصورت چمنوں کی داغ بیل لگائی جارہی ہے۔ کرکٹ کھیلنے کی زمین درست ہوتی ہے اور چاہ عنایت اللہ خاں کی کھدائی شروع ہوگئی ہے اور ظہور حسین دروازے کے لیے پتھر مول لیا گیا ہے اور اس کی بنیاد پڑ رہی ہے۔ اس کی تعمیر کی تاریخ کا مادہ ''ظہور حسین'' نکالا گیا ہے اور ایک ضلع مدرسۃ العلوم کے جس میں مکانات سکونت طالب علمان تعمیر ہوں گے بنیاد کھدنی شروع ہوئی ہے۔ غرض کہ گو رسم فاؤنڈیشن موسمِ سرما پر ملتوی کی گئی الا کارِ تعمیر نہایت سرگرمی سے جاری ہے''۔[۳]

لارڈ نارتھ بروک کے واپس انگلینڈ چلے جانے کے بعد سرسید نے اپنے خط مورخہ ۴/فروری ۱۸۷۶ء کے ذریعہ وائسرائے ہند کے بجائے شمالی مغربی صوبہ کے لفٹننٹ گورنر سرجان اسٹریچی کو اس رسم کو انجام دینے کے لیے مدعو کیا تھا۔[۴] لیکن اسی عرصہ میں

لارڈ نارتھ بروک کی جگہ پر لارڈ لٹن وائسرائے مقرر کر دیئے گئے تھے۔ لارڈ لٹن کے آنے کے بعد ایک بار پھر وائسرائے ہند کے ہاتھوں سنگِ بنیاد نصب کروانے کی کوششیں شروع کر دی گئی تھیں اور انھیں جلد ہی اس میں کامیابی بھی حاصل ہوگئی تھی۔ لارڈ لٹن نے کالج کی عمارتوں کا سنگِ بنیاد نصب کرنے کی رسم ادا کرنے کا دعوت نامہ قبول کر لیا تھا اور یہ طے ہو گیا تھا کہ کالج کے فاؤنڈیشن کی رسم وائسرائے ہند، لارڈ لٹن کے ہاتھوں جنوری ۱۸۷۷ء میں انجام دی جائے گی۔

سر سید ہاؤس کی نوعیت:

سر سید نے وائسرائے ہند کے پرائیویٹ سکریٹری کو لکھے اپنے خط مورخہ ۷؍ اکتوبر ۱۸۷۶ء کے ذریعہ درخواست کی تھی کہ اپنے علی گڑھ کے دورانِ قیام اگر ہز ایکسیلینسی ان کے ذاتی مکان میں قیام فرمائیں تو انھیں بے حد مسرت ہوگی۔ وہ تحریر کرتے ہیں کہ:

> ''میں آپ کا بے حد ممنون ہوں گا اگر آپ لارڈ لٹن صاحب تک کمیٹی کی اس خوشی اور مسرت کے اظہار کو پہنچا سکیں جو حضور والا کے ہمارے کالج کے سنگ بنیاد رکھنے کی دعوت قبول کرنے سے ہم لوگوں کو ہوئی ہے۔ بد قسمتی سے لارڈ لٹن صاحب کا قیام علی گڑھ میں بہت مختصر ہوگا، لیکن پھر بھی میں اس کو اپنی عزت افزائی سمجھوں گا اگر وہ یہ چند گھنٹے علی گڑھ میں میرے مکان پر گزارنا قبول فرماویں۔ امید ہے آپ اس سلسلے میں ہز ایکسیلینسی کی منظوری حاصل کر لیں گے۔ میں اس عزت افزائی کے لیے درخواست نہ کرتا اگر ابھی حال میں، میں نے فوج کا ایک پرانہ بنگلہ اپنی رہائش کے لیے نہ خرید لیا ہوتا جو کالج کی زمین کے قریب ایک مناسب موقع پر واقع ہے جس کی وجہ سے مجھے یہ درخواست کرنے کی جرأت ہوئی کہ یہاں حضور کی رہائش کا انتظام اتنی ہی عمدگی سے ہو سکے گا جتنا علی گڑھ میں موجود کسی اور جگہ ممکن ہوگا۔ اگر حضور والا میری یہ درخواست منظور فرماتے ہیں تو میں بلا تعمل کہوں گا کہ ان کے اس عمل سے نہ صرف میری عزت افزائی

ہوگی بلکہ پوری قوم کی عزت افزائی ہوگی۔ جس کا میں ایک فرد ہوں اور ہم اس احسان کو کبھی فراموش نہ کرسکیں گے"۔ ۵

اس خط سے یہ دیکھلانا مقصود تھا کہ سرسید کا علی گڑھ میں موجود بنگلہ (موسومہ حال، سرسید ہاؤس) کوئی معمولی بنگلہ نہیں تھا۔ یہ اس قدر عالیشان بنگلہ تھا کہ سرسید خود وائسرائے کو یہ لکھنے کی جسارت کررہے ہیں کہ اس بنگلے میں ان کی رہائش کا انتظام اتنی ہی عمدگی سے ہوسکے گا جتنا کہ علی گڑھ میں موجود کسی اور بنگلہ میں ممکن ہوگا۔ یعنی سرسید کا بنگلہ، اُس وقت علی گڑھ میں موجود چند اُن بنگلوں میں سے ایک تھا جن کو وائسرائے کی رہائش اور قیام کے شایانِ شان سمجھا جاسکتا تھا۔ غالباً سرسید اور سید محمود نے اس بنگلے کو خریدنے (یا انتخاب کرنے) کے وقت یہ بات ذہن میں رکھی ہوگی کہ بنگلہ اس نوعیت کا ہو جس میں آئندہ ہندوستان کے وائسرائے اور گورنر جنرل تک کو مدعو کرنے کی جسارت کی جاسکے۔

اس خط کے بعد یہ طے ہوگیا کہ کالج کے فاؤنڈیشن کی رسم وائسرائے ہند لارڈ لٹن کے ہاتھوں ۸؍جنوری ۱۸۷۷ء کو انجام دی جائے گی اور اس سلسلے میں علی گڑھ کے دورانِ قیام وائسرائے ہند، سرسید کے ذاتی مہمان ہوں گے اور ان کے ذاتی مکان (سرسید ہاؤس) ہی میں قیام اور طعام فرمائیں گے۔ ظاہر ہے اس کے بعد سرسید نے پورے انہماک کے ساتھ فاؤنڈیشن کے اجلاس کی تیاریاں شروع کردی تھیں۔

فاؤنڈیشن کی تقریب کی تیاریاں:

وائسرائے ہند کے پروگرام کے مطابق ۸؍جنوری کو علی گڑھ پہنچنے کے بعد انھیں ناشتہ سرسید کے بنگلے ہی پر کرنا تھا۔ اسٹریچی ہال کے مقام پر منعقد ہونے والے جلسے میں شریک ہوکر سنگِ بنیاد کی رسم ادا کرنی تھی۔ لنچ سرسید ہی کے بنگلے پر نوش فرمانا تھا۔ لنچ کے بعد سرسید ہاؤس ہی میں کچھ دیر آرام کرنے کے بعد سہ پہر کو واپس جانے کے لیے روانگی تھی۔ رات کو (بقیہ مہمانوں کے لیے) ڈنر انسٹی ٹیوٹ کے ہال کے اندر ہونا قرار پایا تھا۔ جس میں مہمانِ اعزازی کے بطور شمالی مشرقی صوبہ کے لفٹنٹ گورنر صاحب کو مدعو کرنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ سرسید نے مہمانوں کی خاطر مدارات کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس سلسلے میں سرسید کا میسرز جی۔ ایف۔ کھیلنا رائنڈ کو (ہیڈ آفس نمبر۴، اسپلانڈ ے روڈ، کلکتہ) کے نام لکھے مندرجہ ذیل خط (مورخہ ۲۵؍اکتوبر ۱۸۷۶ء) کو بطور مثال پیش کیا

جا سکتا ہے۔

''ہزایکسیلینسی لارڈلٹن کی تشریف آوری آئندہ ۷ یا ۸/جنوری کو کالج کمیٹی کی ایما پر کالج کا سنگِ بنیاد رکھنے کے لیے متوقع ہے۔ کمیٹی ہزایکسیلینسی اوران کے عملے کو بریک فاسٹ یا لنچ یا پھر دونوں دینے کا انتظام کرے گی اوراسی روز ایک ڈنر بھی اُن یورپین حضرات کے اعزاز میں دیا جائے گا جواس موقع پر مدعو کیے جائیں گے۔تقریباً ۵۰ یا ۶۰ لوگ مدعو ہوں گے اوراگر جناب لفٹنٹ گورنر صاحب نے ڈنر کا دعوت نامہ قبول کرلیا تو یہ تعداد کافی بڑھ سکتی ہے۔ وائسرائے صاحب کی ڈنر میں موجودگی متوقع نہیں ہے۔اس لیے ہم آپ سے توقع کرتے ہیں کہ آپ ہمیں مطلع فرمائیں کہ اگران لوگوں کی تفریحِ طبع کے لیے شراب (وائن) کا مکمل انتظام وسپلائی آپ اپنے ذمہ لیں تو آپ کی کیا شرائط ہوں گی۔ ہر چیز نہایت اعلیٰ قسم کی ہونی چاہیے۔آپ ہی کو شراب بھی سپلائی کرنی ہوگی۔ ہماری کمیٹی صرف فرنیچر کا انتظام کرے گی''۔[۶]

فاؤنڈیشن کی تقریب کے سلسلے کی تیاریاں بہت پہلے سے شروع ہوگئی تھیں۔ مارچ ۱۸۷۶ء میں سرسید نے پریڈگراؤنڈ کی زمین کو ہموار کرواکر سڑکوں وغیرہ کی داغ بیل ڈلوانا شروع کردی تھی۔ پارک اور سڑکوں کے کنارے سائے دار پیڑ لگوانے کا کام بھی برسات کے موسم کے شروع ہونے تک کروادیا گیا تھا۔جس کا حوالہ ہمیں حسابات کے رجسٹروں کے مندرجہ ذیل اندراجات سے ملتا ہے۔[۷]

۲۹/جولائی ۱۸۷۶ء، محصول روانگی درختان،اشوکہ، برائے پارک-۱۹روپے۱۰آنہ

۲۹/جولائی ۱۸۷۶ء، قیمت درختان اشوکہ برائے پارک ۲۰۰ (عدد)-۲۴روپے

۲۹/جولائی ۱۸۷۶ء، کرایہ گاڑی جس پر درخت اسٹیشن تک گئے-۷آنہ

۳۰/جولائی ۱۸۷۶ء، قیمت صندوق جس میں درخت اشوکہ کے بھیجے گئے واسطہ پارک-۳روپے۱۱آنہ

یہ درخت ۲۹/جولائی ۱۸۷۶ء کو بنارس سے علی گڑھ بھیجے گئے تھے۔اندراجات سے اندازہ ہوتا ہے کہ حساب بنارس ہی میں درج کیا گیا ہے۔جس سے ہمارے اس

مفروضہ کو تقویت ملتی ہے کہ سرسید ۱۸؍جولائی ۱۸۷۶ء کو ریٹائر ہونے کے بعد بھی ۳۱؍جولائی تک بنارس ہی میں مقیم رہے تھے اور غالباً پہلی یا دوسری اگست ۱۸۷۶ء کو بنارس سے علی گڑھ مستقل رہائش اختیار کرنے کے ارادے سے منتقل ہوئے تھے۔ جولائی کے بعد اکتوبر میں سرسید نے آگرہ سے پھلواری منگوا کر سب جگہ لگوائی تھی۔ خاص طور پر انسٹی ٹیوٹ کی بلڈنگ اور سرسید ہاؤس کے احاطے میں۔ یہ پھلواری انسٹی ٹیوٹ گارڈن کے ہیڈ مالی ضمیر الدین آگرہ سے خود خرید کر لائے تھے اور انہی کی نگرانی میں یہ کیاریوں میں لگوائی گئی تھی۔ اس سلسلے میں حسابات کے رجسٹر میں مندرجہ ذیل اندراجات موجود ہیں۔[۸]

۲۷؍اکتوبر ۱۸۷۶ء، خرید درختان، از تاج گنج - ۵ روپے

۲۷؍اکتوبر ۱۸۷۶ء کرایہ ریل آمد و رفت ضمیر الدین از علی گڑھ تا تاج گنج - ۲ روپے

۲۷؍اکتوبر ۱۸۷۶ء کرایہ یکہ ضمیر الدین از اسٹیشن تا تاج گنج - ۴ آنہ

۲۷؍اکتوبر ۱۸۷۶ء مزدوری درختان از تاج گنج تا اسٹیشن - ۹ آنہ

۲۷؍اکتوبر ۱۸۷۶ء خوراک ضمیر الدین - ۵ آنہ

مندرجہ بالا اندراجات سے یہی دکھلانا مقصود تھا کہ سرسید کتنی دور اندیشی کے ساتھ اپنے منصوبے تیار کرتے تھے اور کسی تقریب کی تیاریوں کے سلسلے میں جزئیات کا کتنا خیال رکھتے تھے۔ اکتوبر کے آخیر میں کیاریوں میں پھلواری کی پود آگرہ سے منگوا کر اس لیے لگوائی گئی تھی کہ جب جنوری کے پہلے ہفتہ میں فاؤنڈیشن کی تقریب منعقد ہو تو اس وقت تک ان میں باقاعدہ پھول کھلنا شروع ہو جائیں۔

فاؤنڈیشن کی تقریب کی تیاریوں کی نوعیت:

سرسید نے کس اعلیٰ پیمانے پر فاؤنڈیشن کے فنکشن کے انتظامات کیے تھے۔ ان تیاریوں کے سلسلے میں کتنی محنت کی گئی تھی اور کس کس طرح کی جزئیات کا خیال رکھا گیا تھا ان تفصیلات کا اندازہ اس زمانے کے حسابات کے رجسٹروں کے اندراجات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ہم یہی مناسب سمجھتے ہیں کہ نومبر ۱۸۷۶ء کے وسط سے ۱۲؍جنوری ۱۸۷۷ء تک (یعنی تقریباً دو مہینوں) کے حسابات کے رجسٹروں میں موجود خرچ کے ''چیدہ چیدہ'' اندراجات کو یہاں نقل کر دیں، تاکہ ان کی بنا پر قارئین خود فاؤنڈیشن کی تقریب کے سلسلے کی تیاریوں کی ایک مربوط تصویر اپنے ذہن میں مرتب کر سکیں۔

رجسٹروں میں حسابات کے اندراجات (عہد وسطی کی طرز پر) ''عربی رقوم'' میں درج کیے جاتے تھے۔ جن کو ہم نے ''عربی رقوم'' سے واقفیت رکھنے والوں کی مدد سے پڑھوا کر اردو ہندسوں میں درج کر دیا ہے (جن میں ہمارے خیال سے غلطیوں کے امکانات کافی ہیں) جہاں رقوم کو پڑھنے میں دقت ہوئی تھی۔ وہاں جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہے۔

۵رنومبر ۱۸۷۶ء محصول ریل آمد بکس جس میں برتنوں کے نمونہ تھے۔ از کلکتہ۔ متعلق فاؤنڈیشن۔ ۴ روپے

۵رنومبر ۱۸۷۶ء ٹوکرہ جس میں فانوس رکھے گئے۔ ۱۰ عدد۔ متعلق فاؤنڈیشن۔ ۵ آنہ

۵رنومبر ۱۸۷۶ء گھاس برائے ٹوکرہ جس میں فانوس رکھے گئے۔ ۱۰ عدد۔ متعلق فاؤنڈیشن ۱ آنہ

۵رنومبر ۱۸۷۶ء مزدوری جھاڑ و فانوس۔ متعلق فاؤنڈیشن۔ ۱۰ آنہ

فاؤنڈیشن کے فنکشن کی اصل تیاریاں نومبر ۱۸۷۶ء کے پہلے ہفتہ سے شروع کر دی گئی تھیں۔ ۵رنومبر کو کلکتہ سے مختلف برتنوں کے نمونے منگوائے گئے تھے۔ تاکہ ان میں سے جو برتن پسند کیے جائیں ان کے لیے آرڈر دیا جا سکے۔ نمونہ کے بطور آئے یہ برتن انتخاب کیے جانے کے بعد ۹رنومبر کو واپس کلکتہ بھیجے گئے تھے۔ مندرجہ ذیل اندراجات کے ساتھ کیفیت کے خانے میں راقم نے قارئین کی آسانی کے لیے اپنی رائے درج کی ہے۔[9]

تاریخ	رقم	کیفیت
۷رنومبر ۱۸۷۶ء محصول روانگی خطوط بنام رئیسان۔ بابت جلسہ فاؤنڈیشن	۲ روپیہ ۵ آنے	
۷رنومبر ۱۸۷۶ء بابت اجرت چھاپہ کتبہ ظہور حسین دروازہ بموجب بل ڈاکٹر لارنس صاحب	۶ روپے ۸ آنے	یہ کتبہ اب بھی ظہور حسین گیٹ پر لگا ہے۔
۸رنومبر ۱۸۷۶ء محصول ریل آمد شیشہ آلات از دہلی مرسلہ بخشی انعام اللہ خاں صاحب	۳ روپے ۱۵ آنے	''شیشہ آلات'' کا استعمال چینی کے برتنوں کے لیے بھی کیا جاتا تھا
۸رنومبر ۱۸۷۶ء محصول ریل آمد دو عدد کوچ از دہلی مرسلہ۔ بخشی انعام اللہ خاں صاحب	۲ روپے ۵ آنے	

۸/نومبر ۱۸۷۶ء محصول روانگی خطوط و چٹھی متعلق فاؤنڈیشن ۶ آنہ ۶ پائی

۹/نومبر ۱۸۷۶ء بابت روانگی صندوق جس میں چینی کے برتن کلکتہ واپس کیے گئے۔ ۴روپے ۳ آنے — جو نمونے کے برتن کلکتہ سے دو دن پہلے آئے تھے واپس کیے گئے

۹/نومبر ۱۸۷۶ء مزدوری گاڑی جس پر خیمہ وغیرہ ریلوے اسٹیشن سے آیا ۲روپے

۱۵/نومبر ۱۸۷۶ء محصول تار برقی روانگی بنام مہاراجہ دزیا نگرام بطلب خیمہ وغیرہ متعلق فاؤنڈیشن ۳روپے

۱۶/نومبر ۱۸۷۶ء رائے کشن کمار صاحب کے نوکر کو جو شیشہ آلات لے کر آیا تھا بسبب کم ہو جانے محصول ریل کے دیا گیا متعلق فاؤنڈیشن ۸ آنہ

۱۸/نومبر ۱۸۷۶ء مزدوری ۴نفر کہار جو ہاتھرس سے شیشہ آلات لائے تھے متعلق جلسہ فاؤنڈیشن ۳روپے — شیشہ آلات سے مراد چینی کے برتن بھی ہوتا تھا

۲۰/نومبر ۱۸۷۶ء محصول ریل آمد کرسیاں وغیرہ از بنارس مرسلہ رائے نرینداس متعلق فاؤنڈیشن ۶روپے ۵ آنہ

۲۰/نومبر ۱۸۷۶ء محصول ریل آمد خیمہ وغیرہ از بنارس مرسلہ شیونرائن بہادر متعلق فاؤنڈیشن ۳۸روپے ۱۰ آنہ — ۳۸روپے محصول ریل کے بطور ادا کرنا فاضل رقم معلوم ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے یہاں رقم پڑھنے میں غلطی ہوئی ہو یا پھر یہ بہت بڑا خیمہ ہو۔ حالانکہ اسٹیشن سے اسے لانے کی مزدوری اتنی زیادہ نہیں ہے۔

۲۰/نومبر ۱۸۷۶ء بابت مزدوری خیمہ از اسٹیشن ریلوے تا مدرسہ۔ متعلق فاؤنڈیشن ۱۲ آنہ

۲۰/نومبر ۱۸۷۶ء بابت مزدوری کرسیاں از اسٹیشن تا سوسائٹی ۔متعلق فاؤنڈیشن ۴ آنہ

۲۰/نومبر ۱۸۷۶ء محصول ریل آمد و رفت الٰہی بخش چپراسی از علی گڑھ تا آگرہ جو ایڈریس لے کر واسطہ درستگی کے ڈیمٹن صاحب کے پاس گیا تھا۔ متعلق فاؤنڈیشن ۲روپے — ایسا محسوس ہوتا ہے کہ الٰہی بخش چپراسی کے سپرد اہم ذمہ داریاں کی جاتی تھیں

۲۰/نومبر ۱۸۷۶ء مزدوری دری و قالین متعلق فاؤنڈیشن ۸ آنہ

۲۰/نومبر ۱۸۷۶ء، خوراک کہار جو دری و قالین لے کر آئے تھے۔ متعلق فاؤنڈیشن	۱ آنہ	
۲۰/نومبر ۱۸۷۶ء، محصول ریل احمد خاں چپراسی جو پنڈراول گیا تھا۔	۵ آنہ ۶ پائی	سرسید کے آفس میں الٰہی خاں کے علاوہ احمد خاں چپراسی بھی تھے
۲۳/نومبر ۱۸۷۶ء، محصول ریل لمپ ہا مرسلہ مسٹر اسمتھ از بنارس	۳ روپے ۶ آنہ	پہلے اسمتھ صاحب نے بنارس سے ایک گاڑی بھی تحفتاً اسکول کے لیے بھیجی تھی ساتھ ہی گیس کے ہنڈوں کا ایک سیٹ سوسائٹی کی نذر کیا تھا
۲۳/نومبر ۱۸۷۶ء، مزدوری صندوق لمپ آمداز بنارس از اسٹیشن تا کوٹھی	۴ آنے	
قیمت لمپ ہا واسطے سین ٹیفک سوسائٹی ہال کے جس کی قیمت سوسائٹی سے لے لی گئی	۸۰/روپے	
۲۳/نومبر ۱۸۷۶ء، فیس منی آرڈر جو بنام اسمتھ صاحب بھیجا گیا۔	۲ روپے	غالباً وہ بنارس کے مشہور تاجر تھے
۲۴/نومبر ۱۸۷۶ء، محصول روانگی خطوط مدرسہ متعلق فاؤنڈیشن	۱۱ آنے ۶ پائی	
۲۴/نومبر ۱۸۷۶ء، مزدوری دری آمداز مکان دھیرج لال فاؤنڈیشن	۴ آنے	
۲۵/نومبر ۱۸۷۶ء، محصول روانگی خطوط وچٹھی متعلق فاؤنڈیشن	۲ روپے ۱۳ آنے	
۲۵/نومبر ۱۸۷۶ء، محصول روانگی ۳ عدد صندوق آمداز میرٹھ جس میں چینی کے برتن تھے	۲ روپے ۱۱ آنے	
۲۵/نومبر ۱۸۷۶ء، مزدوری برائے صندوق از اسٹیشن تا کوٹھی	۸ آنے	
۲۷/نومبر ۱۸۷۶ء، مزدوری کہاران جو ہاتھرس سے شیشہ آلات لائے، متعلق فاؤنڈیشن	۲ روپے ۴ آنے	

تفصیل	رقم	کیفیت
۲۷؍نومبر ۱۸۷۶ء کرایہ گاڑی جس پر خیمہ بلند شہر سے آیا متعلق فاؤنڈیشن	۹ روپے	
۲۷؍نومبر ۱۸۷۶ء اجرت چھاپہ خطوط دعوت فاؤنڈیشن	۴ روپے	فاؤنڈیشن کی تقریب کے دعوت نامے نومبر تک چھپ کر تیار ہو چکے تھے۔
۲۷؍نومبر ۱۸۷۶ء قیمت کاغذ	۲ روپے ۳ آنے	
۲۷؍نومبر ۱۸۷۶ء مزدوری ۶ عدد ہانڈی لمپ آمد از دتاولی	۲ آنے	اسماعیل خاں صاحب رئیس دتاولی کے ذریعہ لمپ ملے ہوں گے
۲۸؍نومبر ۱۸۷۶ء محصول ریل آمد و رفت الٰہی بخش چپراسی از علی گڑھ تا آگرہ جو ایڈریس لے کر گیا تھا	۲ روپے	ایڈریس ڈینٹن صاحب کے ذریعہ تیار کروایا گیا تھا۔
۲۸؍نومبر ۱۸۷۶ء خوراک الٰہی بخش چپراسی	۴ آنے	
۲۸؍نومبر ۱۸۷۶ء روانگی خطوط متعلق فاؤنڈیشن	۴ آنے ۶ پائی	
۲۸؍نومبر ۱۸۷۶ء محصول روانگی تار برقی بنام کنگ ہملٹن متعلق کمیٹی تہنیت خطاب شہنشاہی	۲ روپے	
۲۸؍نومبر ۱۸۷۶ء روانگی پارسل کارپٹ بمقام کلکتہ متعلق فاؤنڈیشن	۴ آنے	
۲۹؍نومبر ۱۸۷۶ء اجرت قلیان جو شطرنجی بلند شہر سے لائے متعلق فاؤنڈیشن	۲ روپے ۱۲ آنے	
۳۰؍نومبر ۱۸۷۶ء بابت محصول ریل آمد خیمہ از آگرہ مرسلہ مولوی عبدالقیوم صاحب	۳ روپے ۱۰ آنے	
۳۰؍نومبر ۱۸۷۶ء محصول ریل ڈنر سیٹ از کلکتہ	۱۵ روپے ۴ آنے	برتن کلکتہ سے آئے تھے
یکم دسمبر ۱۸۷۶ء کرایہ آمد و رفت الٰہی بخش چپراسی جو ایڈریس لے کر ڈینٹن صاحب کے پاس گیا تھا	۲ روپے	
یکم دسمبر ۱۸۷۶ء مزدوری کہاران جو جھاڑ لے کر دھیرج لال کے مکان پر سے آئے	۴ روپے ۳ آنے ۶ پائی	دھیرج لال صاحب کے یہاں سے اس سے پہلے دری بھی آئی تھی۔

تاریخ	تفصیل	رقم	کیفیت
۲/دسمبر ۱۸۷۶ء	محصول روانگی خطوط و روئیداد تہنیت خطاب شہنشاہی	۱۱روپے ۶ پائی	
۳/دسمبر ۱۸۷۶ء	محصول روانگی چٹھیات بنام یورپین جنٹلمین بابت جلسہ فاؤنڈیشن	۵روپے ۸ آنے	یعنی جلسے سے ایک مہینہ پہلے ہی دعوت نامہ روانہ ہو گئے تھے
۴/دسمبر ۱۸۷۶ء	محمد عبدالشکور خاں صاحب بابت چندہ تہنیت		تہنیت کا خطاب کنگ ہملٹن اینڈ کو کلکتہ نے تیار کیا تھا اس کا کل خرچ محمد عبدالشکور خاں صاحب و محمد عنایت اللہ خاں صاحب اور اسماعیل خاں صاحب نے بطور چندہ دیا تھا
۴/دسمبر ۱۸۷۶ء	خطاب شہنشاہی	۲۰۰روپے	
	محمد عنایت اللہ خاں صاحب بابت چندہ تہنیت خطاب شہنشاہی،	۲۰۰روپے	
	فیس خط رجسٹری جس میں نوٹ بھیجے گئے بنام ہملٹن بمقام کلکتہ	؟	
۵/دسمبر ۱۸۷۶ء	محصول ریل پتھر اٹھانے کی کل-متعلق	۹روپے ۷ آنے	یہ "چین پولی" روڑکی سے منگوائی گئی تھی، گویا یہ مشین ایک مہینہ پہلے ہی منگوالی گئی تھی
۵/دسمبر ۱۸۷۶ء	فاؤنڈیشن		
۵/دسمبر ۱۸۷۶ء	مزدوری گاڑی جس پر کل آئی-متعلق فاؤنڈیشن	۲روپے	
	محصول روانگی کاغذ چرمی و چٹھی بنام کنگ ہملٹن متعلق تہنیت کمیٹی	۳روپے	
۵/دسمبر ۱۸۷۶ء	بابت پیکنگ و مرمت میز راجہ شمبھو نرائن سنگھ بموجب بل- ڈاکٹر ہوپر صاحب-متعلق فاؤنڈیشن	۲۰روپے ۱۱ آنے	
۵/دسمبر ۱۸۷۶ء	بابت فیس منی آرڈر جو بنام ہوپر صاحب بھیجا گیا۔	۶ آنے	اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۰روپے پر ۲روپے منی آرڈر فیس لگتی تھی
۵/دسمبر ۱۸۷۶ء	محصول ریل احمد خاں چپراسی جو چرمی کاغذ لے کر واسطہ دستخطوں کے پنڈراول گیا متعلق تہنیت	۶ آنے	
۶/دسمبر ۱۸۷۶ء	محصول ریل آمد ٹکڑا ہا سے میز از بنارس مرسلہ ڈاکٹر ہوپر صاحب متعلق فاؤنڈیشن	۲۷روپے	

۶؍دسمبر ۱۸۷۶ء مزدوری گاڑی جس پر میز ریلوے اسٹیشن سے آئی۔متعلق فاؤنڈیشن ۲روپے

۶؍دسمبر ۱۸۷۶ء محصول روانگی چٹھیاں بنام یورپین جنٹلمین۔متعلق فاؤنڈیشن ۹آنے

۶؍دسمبر ۱۸۷۶ء محمد اسمٰعیل خاں صاحب بابت چندہ تہنیت خطاب شہنشاہی ۲۰۰روپے

۷؍دسمبر ۱۸۷۶ء مزدوری ۳عدد دری مرسلہ لوکمن داس متعلق فاؤنڈیشن ۵آنے

۷؍دسمبر ۱۸۷۶ء بابت درستگی بوتل فاؤنڈیشن ۲روپے

۷؍دسمبر ۱۸۷۶ء قیمت ۳بیڑی متعلق فاؤنڈیشن ۶۴روپے

۴۰- فاؤنڈیشن اسٹون کے ساتھ یہ بوتل بنیاد میں رکھی گئی تھی، لفظ بیٹری ٹارچ کے لیے لکھا ہے یا پھر کسی خاص قسم کی بیٹریاں منگوائی گئی تھیں؟

۷؍دسمبر ۱۸۷۶ء قیمت پھوندنا واسطہ جھنڈیوں کے ۱۰۶ عدد متعلق فاؤنڈیشن ۲روپے ۱۰آنے

۷؍دسمبر ۱۸۷۶ء مزدوری خیمہ ۶ عدد راجہ جگت سنگھ بہادر متعلق فاؤنڈیشن ۲روپے

۱۱؍دسمبر ۱۸۷۶ء مزدوری خیمہ راجہ مادھوراؤ جو بریلی سے آیا متعلق فاؤنڈیشن ۲روپے

۱۱؍دسمبر ۱۸۷۶ء بابت ٹانکا لگوائی ہانڈی لمپ (معہ مزدوری) اسمٰعیل خان صاحب متعلق فاؤنڈیشن ۲روپے

۱۱؍دسمبر ۱۸۷۶ء مزدوری صندوق محمولہ ظروف چینی آمداز آگرہ ۸آنے

۱۱؍دسمبر ۱۸۷۶ء مزدوری ۶ عدد صندوق محمولہ ظروف چینی آمداز دہلی ۸آنے

تاریخ و تفصیل	رقم	حاشیہ
۱۱؍دسمبر ۱۸۷۶ء، مزدوری خیمہ وغیرہ جو کوٹھی سے مدرسہ گیا	۲ روپے	
۱۱؍دسمبر ۱۸۷۶ء، محصول ریل آمد صندوق محمولہ ظروف چینی از دہلی	۲ روپے ۱۴ آنے	
۱۱؍دسمبر ۱۸۷۶ء، محصول روانگی خطوط متعلق فاؤنڈیشن	؟	
۱۱؍دسمبر ۱۸۷۶ء، محصول ریل عبداللہ چپراسی جو کاغذ چرمی لے کر بلند شہر گیا متعلق فاؤنڈیشن	۲ روپے	
۱۲؍دسمبر ۱۸۷۶ء، بابت اخراجات روانگی اسباب از دہلی بموجب خط محمد اکرام اللہ خاں	۲۴ روپے	
۱۲؍دسمبر ۱۸۷۶ء، تنخواہ جیون خاں ابتدائی یکم نومبر لغایت ۱۲؍دسمبر ۱۸۷۶ء، ۱۲؍دسمبر	۲۱ روپے	جیون خان فراش غالباً دہلی میں سرسید کے آبائی مکان میں کام کرتے تھے جہاں سے عارضی طور پر انھیں علی گڑھ بلایا گیا تھا۔
کرایہ ریل جیون خاں فراش روانگی دہلی	۲ روپے	
۱۴؍دسمبر ۱۸۷۶ء، محصول ریل آمد اسباب از کلکتہ میز وکرسی وغیرہ متعلق فاؤنڈیشن	۱۳۵ روپے ۱۱ آنے	ریل کے کرایہ کی رقم سے اندازہ ہوتا ہے کہ کافی فرنیچر کلکتہ سے منگوایا گیا تھا
۱۴؍دسمبر ۱۸۷۶ء، ڈیمارج اسباب آمد از کلکتہ	۲ روپے	
۱۴؍دسمبر ۱۸۷۶ء، محصول ریل آمد ورفت الٰہی بخش از علی		
۱۴؍دسمبر ۱۸۷۶ء، گڑھ تا آگرہ جو ڈینٹن صاحب کے پاس پروگرام لے گیا	۲ روپے	
۱۴؍دسمبر ۱۸۷۶ء، محصول ریل حاشیہ کارپٹ آمد از کلکتہ	۴ روپے	
مزدوری اسباب از اسٹیشن تا کوٹھی	۳ روپے	
۱۷؍دسمبر ۱۸۷۶ء، روانگی ایڈریس بنام سید محمود اسکوائر متعلق فاؤنڈیشن	۱ آنہ	اس رقم سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ فرنیچر بہت زیادہ تھا۔
۱۷؍دسمبر ۱۸۷۶ء، قیمت ٹون برائے فرش متعلق فاؤنڈیشن	۲ روپے	
۱۷؍دسمبر ۱۸۷۶ء، مزدوری فرش آمد از پنڈراول متعلق فاؤنڈیشن	۴ آنہ	
۱۷؍دسمبر ۱۸۷۶ء، مزدوری فرش آمد از مکان دھیرج لال صاحب	۴ آنہ	

۱۸/دسمبر ۱۸۷۶ء محصول ریل آمد صندوق بتی وغیرہ متعلق
فاؤنڈیشن ۲روپے ۶آنہ

۱۸/دسمبر ۱۸۷۶ء محصول ریل خیمہ وغیرہ آمد از آگرہ متعلق
فاؤنڈیشن ۲روپے ۴آنہ

۱۸/دسمبر ۱۸۷۶ء مزدوری اسباب آمد از اسٹیشن ریلوے ۸آنہ

۱۸/دسمبر ۱۸۷۶ء اجرت تانکہ نکوائی لمپ متعلق فاؤنڈیشن ۱۴آنے

۱۹/دسمبر ۱۸۷۶ء بابت کرایہ گلاس وظروف نقرہ چھری کانٹا
وغیرہ جو ایف ایس صاحب کو دیا گیا ؟

۱۹/دسمبر ۱۸۷۶ء محصول ریل آمد ظروف چینی از میرٹھ ۲روپے ۸آنہ

۱۹/دسمبر ۱۸۷۶ء مزدوری اسباب از اسٹیشن ریلوے ۸آنہ

۲۰/دسمبر ۱۸۷۶ء کرایہ گاڑی متعلق فاؤنڈیشن ۴روپے

۲۰/دسمبر ۱۸۷۶ء کرایہ گاڑی جس پر خیمہ بلند شہر سے آیا ۳روپے

۲۰/دسمبر ۱۸۷۶ء سلائی فرش سوسائٹی ۴روپے

۲۰/دسمبر ۱۸۷۶ء بابت اجرت طلاکرائی - ایڈریس تہنیت کے ۱۵روپے — تہنیت کے ایڈریس پر سونے کا کام کروایا گیا تھا۔

۲۰/دسمبر ۱۸۷۶ء محصول ریل آمد ورفت الٰہی بخش از علی
گڑھ تا دہلی ؟

۲۰/دسمبر ۱۸۷۶ء بابت خوراک ۲یوم الٰہی بخش کو دیا ۸آنہ

۲۰/دسمبر ۱۸۷۶ء اجرت چھاپہ ایڈریس انگریزی جلسہ
فاؤنڈیشن ۲۴روپے — رقم سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ بڑی تعداد میں ایڈریس چھپوایا گیا تھا

۲۰/دسمبر ۱۸۷۶ء قیمت کاغذ ۴روپے ۴آنہ ۳پائی

۲۰/دسمبر ۱۸۷۶ء اجرت چھاپہ خطوط جلسہ فاؤنڈیشن ؟

۲۱/دسمبر ۱۸۷۶ء محصول روانگی ایڈریس بنام سید محمود
صاحب متعلق فاؤنڈیشن ۴آنہ

۲۱/دسمبر ۱۸۷۶ء منجملہ اخراجات ڈنر متعلق فاؤنڈیشن حوالہ
الٰہی خاں خانساماں ۷۰روپے — الٰہی خاں محسن الملک کے ذاتی خانساماں تھے اور غالباً حیدرآباد سے

۲۲/دسمبر ۱۸۷۶ء اجرت درختاں الغایت ۲۱/دسمبر ۱۸۷۶ء ۵۰روپے ۱آنہ ۶پائی — اس تقریب کے لیے بلائے گئے تھے

۲۳/دسمبر ۱۸۷۶ء مزدوری درختان آمد از سوسائٹی متعلق فاؤنڈیشن	۲ روپے	
۲۳/دسمبر ۱۸۷۶ء بابت طیاری کرنی متعلق فاؤنڈیشن	۵۰ روپے	نقل پذیر ہلکے ٹوائیلیٹ کی ایک کھیپ آگرہ سے منگوائی گئی تھی
۲۳/دسمبر ۱۸۷۶ء محصول ریل آمد پاخانہ از آگرہ متعلق		
۲۳/دسمبر ۱۸۷۶ء فاؤنڈیشن	۲ روپے	
۲۳/دسمبر ۱۸۷۶ء دیمارج بابت متعلق فاؤنڈیشن	۱ آنہ	
کرایہ گاڑی آمد پاخانہ از اسٹیشن	۸ آنے	
۲۴/دسمبر ۱۸۷۶ء بابت تقسیم مد صفائی گھاس کوٹھی سید احمد خاں معرفت منشی کنہیالال	۱۲۱ روپے	
۲۴/دسمبر ۱۸۷۶ء مزدوری ڈیرہ متعلق فاؤنڈیشن	۲ روپے	
۲۴/دسمبر ۱۸۷۶ء مزدوری دری متعلق فاؤنڈیشن	۴ آنہ	
۲۴/دسمبر ۱۸۷۶ء بابت کرایہ گاڑی جس پر اسباب وغیرہ آگرہ سے آیا۔ متعلق فاؤنڈیشن	۲۱ روپے	
۲۶/دسمبر ۱۸۷۶ء بابت ایڈریس طلاکرائی	۲۵ روپے	ایڈریس تہنیت اور ایڈریس دونوں پر سونے کا کام کروایا گیا تھا غالباً یہ طلاگری دہلی میں کی گئی تھی۔
۲۶/دسمبر ۱۸۷۶ء محصول ریل آمد ورفت الٰہی بخش جو ایڈریس لے کر دہلی گئے۔	؟	
۲۶/دسمبر ۱۸۷۶ء خرید دو عدد چھکڑے	۳۶ روپے ۱۲ آنہ	
۲۶/دسمبر ۱۸۷۶ء کرایہ ریل آمد ورفت الٰہی بخش از علی گڑھ تا چندوسی	۲ روپے ۴ آنہ	
۲۶/دسمبر ۱۸۷۶ء خوراک الٰہی بخش بابت ۶ یوم	۱۲ آنہ	
۲۷/دسمبر ۱۸۷۶ء محصول ریل آمد تیل متعلق فاؤنڈیشن	۱۹ روپے ۱ آنہ	گیس کے ہنڈوں کی روشنی کے لیے بڑی مقدار میں بتیاں اور تیل منگوایا گیا تھا۔
۲۷/دسمبر ۱۸۷۶ء محصول ریل آمد بتی متعلق فاؤنڈیشن	۹ روپے ۳ آنے	
۲۷/دسمبر ۱۸۷۶ء مزدوری تیل بتی آمد از اسٹیشن متعلق فاؤنڈیشن	۸ آنہ	

۲۸/دسمبر ۱۸۷۶ء، محصول ریل آمد شراب از کلکتہ	۱۵۱روپے۱۴آنے	مہمانوں کی خاطر تواضع کے
۲۸/دسمبر ۱۸۷۶ء، مزدوری شراب آمد از اسٹیشن ریلوے	۳روپے	لیے بڑی مقدار میں عمدہ
۲۸/دسمبر ۱۸۷۶ء، محصول ریل آمد خیمہ وغیرہ	۵روپے۵آنہ۶پائی	شراب کلکتہ سے منگوائی گئی تھی

۳۰/دسمبر ۱۸۷۶ء کے اندراجات میں سڑک صفائی کے لیے بڑی رقم کا اندراج ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ یہ صفائی بار بار کروائی گئی تھی اور ۳۰/دسمبر تک ۶ مرتبہ یہ عمل کیا جا چکا تھا اور ہر دفعہ ۱۵روپے سے ۲۵روپے تک خرچ ہوئے تھے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کم از کم تیس چالیس صفائی والے اس کام پر معمور ہوں گے۔

۳۰/دسمبر ۱۸۷۶ء، بابت تیاری قلمدان حوالہ مولوی سمیع اللہ خاں صاحب	۱۵۰روپے	
۳۰/دسمبر ۱۸۷۶ء، محصول ریل آمد و رفت الٰہی بخش چپراسی	؟	ایڈریس رول کر کے خوبصورت نلکی
از علی گڑھ تا دہلی جو ایڈریس لینے گیا	۲آنہ	میں رکھا گیا تھا نجیب اللہ سرسید
۳۰/دسمبر ۱۸۷۶ء، نل واسطہ رکھنے ایڈریس کے		کے ذاتی ملازم تھے دوسرے معتمد
۳۰/دسمبر ۱۸۷۶ء، کرایہ ریل آمد و رفت منشی چراغ علی		ملازمین میں الٰہی بخش کا نام لیا
صاحب و نجیب اللہ و الٰہی بخش و ذوالفقار		جا سکتا ہے۔ چراغ علی صاحب
خاں از علی گڑھ تا آگرہ جو بینک میں		قریبی اور با اعتماد لوگوں میں تھے۔
روپے جمع کرنے گئے	۱۰روپے۸آنے	اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ بڑی
۳۰/دسمبر ۱۸۷۶ء، بابت کرایہ گاڑی منشی چراغ علی صاحب	۳روپے۵آنے	رقم بینک میں جمع کروائی گئی
۳۰/دسمبر ۱۸۷۶ء، فیس ہوٹل منشی چراغ علی	۶روپے۴آنے	ہوگی۔
۳۰/دسمبر ۱۸۷۶ء، خوراک نجیب اللہ و الٰہی بخش وغیرہ	۲روپے۴آنے	
۳۰/دسمبر ۱۸۷۶ء، محصول ریل آمد خیمہ وغیرہ از بنارس		بنارس سے بڑا خیمہ آیا تھا
مرسلہ راجہ شمبھو نرائن سنگھ	۷۶روپے۱۱آنہ	
۳۰/دسمبر ۱۸۷۶ء، بابت قیمت بلی اور بانس معرفت ہولاسی		اس رقم سے اندازہ ہوتا ہے کہ
مستری متعلق فاؤنڈیشن	۸۰روپے	کتنا بڑا شامیانہ بنایا گیا ہوگا
		جس میں ۸۰روپے کی بانس
		بلی لگی تھی

۳۰/دسمبر ۱۸۷۶ء منجملہ اخراجات ڈنر فاؤنڈیشن حوالہ الٰہی خاں خانساماں	۲۰۰ روپے	الٰہی خاں باعبھروسہ خانساماں تھے جن کی تحویل میں بڑی بڑی رقمیں دی جاسکتی تھیں
۳۰/دسمبر ۱۸۷۶ء کرایہ ریل آمد و رفت از علی گڑھ تا دہلی مولوی سمیع اللہ خاں و سید احمد خاں و نجیب اللہ وجیون خاں فراش	؟	
۳۰/دسمبر ۱۸۷۶ء نجیب اللہ وجیون خاں فراش	۲۸ روپے ۱۰ آنہ ۳ پائی	غالباً دربار شاہی میں شرکت کے لیے سرسید و سمیع اللہ خاں دہلی گئے ہوں گے۔ ذاتی نوکر اور فراش ساتھ تھے
۳۰/دسمبر ۱۸۷۶ء خرید فانوس فاؤنڈیشن	۲۴ روپے	
۳۰/دسمبر ۱۸۷۶ء مزدوری فانوس	۱ آنہ	
۳۰/دسمبر ۱۸۷۶ء کرایہ ریل آمد و رفت سید احمد خاں و مولوی سمیع اللہ خاں و نجیب اللہ از علی گڑھ تا آگرہ	۲۲ روپے ۱۳ آنہ	
۳۰/دسمبر ۱۸۷۶ء منجملہ خرچ ڈنر فاؤنڈیشن حوالہ الٰہی خاں خانساماں	۴۰۰ روپے	الٰہی خان کو پہلے بھی بڑی رقمیں دی جاچکی ہیں
۳۰/دسمبر ۱۸۷۶ء بابت (؟) جو درزیوں کو دیا گیا معرفت لالہ کنھیالال	۶۹ روپے ۵ آنے	یہ بڑی رقم درزیوں کو کس لیے دی گئی تھی معلوم نہ ہوسکا۔
۳۰/دسمبر ۱۸۷۶ء محصول ریل آمد پردہ بول از کلکتہ متعلق فاؤنڈیشن	۲۳ روپے ۱ آنہ	یہ کس قسم کا پردہ تھا؟ لیکن سامان کافی تھا جس کی اسٹیشن سے ڈھلائی دو روپے سے زیادہ ہوئی تھی
۳۰/دسمبر ۱۸۷۶ء مزدوری اسباب پردہ وغیرہ از اسٹیشن ریلوے	۲ روپے ۲ آنہ	
۳۰/دسمبر ۱۸۷۶ء مزدوری دری۔متعلق فاؤنڈیشن	۱ آنہ	
۳۰/دسمبر ۱۸۷۶ء چرٹ متعلق فاؤنڈیشن	۶ روپے	
۳۰/دسمبر ۱۸۷۶ء کرایہ گاڑی بابت ۳ یوم متعلق فاؤنڈیشن	۳۱ روپے	
۳۰/دسمبر ۱۸۷۶ء صابن	۴ روپے	
۳۰/دسمبر ۱۸۷۶ء ہیر برش۔متعلق فاؤنڈیشن	۶ روپے ۱۲ آنہ	
۳۰/دسمبر ۱۸۷۶ء کنگھی متعلق فاؤنڈیشن	۲ روپے ۲ آنہ	

تفصیل	رقم	کیفیت
۳۰ر دسمبر ۱۸۷۶ء، گلاس برائے روشنی	۶ روپے ۲ آنہ	
۳۰ر دسمبر ۱۸۷۶ء، ٹوتھ بروش	۲ روپے	
۳۰ر دسمبر ۱۸۷۶ء، تھان نکری ۱۴۶ عدد برائے فرش مدرسہ متعلق فاؤنڈیشن	۱۶۴ روپے ۳ آنہ	
۳۰ر دسمبر ۱۸۷۶ء، منجملہ ڈنر فاؤنڈیشن بحوالہ الٰہی خاں خانساماں	۱۰۰ روپے ۶ آنہ	
۳۰ر دسمبر ۱۸۷۶ء، خرید چق واسطہ خیموں کے	۵ روپے ۶ آنہ	
۳۰ر دسمبر ۱۸۷۶ء، کہار واسطے درستی خیموں کے	۲ روپے	
۳۰ر دسمبر ۱۸۷۶ء، سلائی چق خیمہ	۲ روپے ۸ آنہ ۹ پائی	
۳۰ر دسمبر ۱۸۷۶ء، ڈوری سوت	۳ روپے ۱۱ آنہ ۲ پائی	
۳۰ر دسمبر ۱۸۷۶ء، رسی سوت	۱۵ روپے ۶ آنہ ۳ پائی	
۳۰ر دسمبر ۱۸۷۶ء، سوت واسطہ سلائی فرش وغیرہ	۴ روپے ۵ آنہ ۳ پائی	
۳۰ر دسمبر ۱۸۷۶ء، سوتلی	۳ روپے ۴ آنہ	
۳۰ر دسمبر ۱۸۷۶ء، تیل میٹھا	۱۲ روپے ۸ آنہ	
۳۰ر دسمبر ۱۸۷۶ء، تیل رینڈی	۱۰ روپے	
۳۰ر دسمبر ۱۸۷۶ء، تھان قند ۳ عدد واسطہ جھنڈیوں کے	۲۰ روپے ۳ آنہ ۹ پائی	
۳۰ر دسمبر ۱۸۷۶ء، تھان قند...... برائے وردی (یا درزی بھی پڑھا جاسکتا ہے)	۳ روپے ۱۵ آنہ	
۳۰ر دسمبر ۱۸۷۶ء، بکس دیا سلائی ۳ درجن	۲ روپے	ایک دیا سلائی کی ڈبیہ کی قیمت
۳۰ر دسمبر ۱۸۷۶ء، بتی گاڑی کی تین بنڈل	۲ روپے	ساڑھے تین پیسے کے قریب تھی
۳۰ر دسمبر ۱۸۷۶ء، تھان لنکلاٹ واسطہ چاندنی کے	۲۰۴ روپے ۱۲ آنہ ۶ پائی	
۳۰ر دسمبر ۱۸۷۶ء، کرایہ گاڑی واسطہ تہنیت نظام	۶ روپے	دربار شاہی میں شرکت کے
۳۰ر دسمبر ۱۸۷۶ء، قیمت یک جلد ڈائرکٹری متعلق تہنیت خطاب شہنشاہی	۲ روپے	لیے نظام حیدرآباد دہلی آئے ہوئے تھے۔ انھیں بھی کالج
۳۰ر دسمبر ۱۸۷۶ء، کرایہ ریل آمد و رفت از علی گڑھ تا دہلی متعلق تہنیت خطاب شہنشاہی	۱۴۲ روپے ۸ آنہ	نے ایک ایڈریس سمیع اللہ خاں کے ذریعہ دہلی میں پیش کیا تھا

۳۰ر دسمبر ۱۸۷۶ء، خوراک منشی عطاء اللہ صاحب متعلق تہنیت

خطاب شہنشاہی	۱۰روپے
۳۰ر دسمبر ۱۸۷۶ء، سلائی موچی خیمہ وغیرہ متعلق فاؤنڈیشن	۱۴روپے
۳۰ر دسمبر ۱۸۷۶ء، تولیا تین درجن متعلق فاؤنڈیشن	۲۹روپے
یکم جنوری ۱۸۷۷ء، محصول روانگی کارڈ انوائی ٹیشن متعلق فاؤنڈیشن	۳روپے ۱۰آنہ
۴ر جنوری ۱۸۷۷ء، سید احمد خاں کے پاس بھیجا گیا	۳۰۰روپے — شاہی دربار کے سلسلے میں سرسید دہلی میں مقیم تھے۔
۵ر جنوری ۱۸۷۷ء، محصول ریل آمد شامیانہ راجہ شمبھو نرائن سنگھ بہادر از بنارس	۱۰روپے ۱۰آنہ
۵ر جنوری ۱۸۷۷ء، مزدوری شامیانہ از اسٹیشن متعلق فاؤنڈیشن	۸آنہ
۵ر جنوری ۱۸۷۷ء، پارچہ ململ	۲روپے

فاؤنڈیشن کا جلسہ:

اس طرح ۸ر جنوری ۱۸۷۷ء کا وہ دن آ ہی گیا جس کے لیے پچھلے کئی مہینوں سے تیاریاں کی جارہی تھیں۔ ۸ر جنوری کی صبح نو بجے ایک اسپیشل ٹرین کے ذریعہ وائسرائے کی پارٹی پٹیالہ سے علی گڑھ پہنچی۔ اسٹیشن پر تمام سول حکام استقبال کے لیے اور کل پولیس حکام انتظام کے لیے موجود تھے۔ کالج کمیٹی کی طرف سے کنور لطف علی خاں صاحب (پریسیڈنٹ)، راجہ سید باقر علی خاں صاحب (وائس پریسیڈنٹ) اور سید احمد خاں صاحب (سکریٹری کمیٹی) ریلوے اسٹیشن پر استقبال کے لیے موجود تھے۔ ان کے ساتھ ہی مسٹر پولک (کمشنر)، مسٹر چیز (ڈسٹرکٹ جج) اور مسٹر جیمس کولوین (ضلع کلکٹر) ہز ایکسیلینسی کو خوش آمدید کہنے کے لیے مستعد تھے۔ وائسرائے ہند کی آمد کے سلسلے میں اخبار سائنٹیفک سوسائٹی مورخہ ۱۲ر جنوری ۱۸۷۷ء میں درج ہے کہ:

> ''حضور وائسرائے جب گاڑی میں سے باہر تشریف لائے نہایت مہربانی اور اخلاق سے سب سے مصافحہ فرمایا اور سواریاں جو تمام

مہمانوں کے لیے حاضر تھیں اُن میں سوار ہوکر سرسید احمد خاں بہادر سی ایس آئی کے گھر میں تشریف لے گئے اور وہیں فروکش ہوئے''۔[۱۰]

اخبار سین ٹیفک سوسائٹی ہی سے یہ اطلاع بھی فراہم ہوتی ہے کہ وائسرائے کی پارٹی ۱۰ لوگوں پر مشتمل تھی یعنی حضور لارڈ لٹن اور لیڈی لٹن صاحبہ، لارڈ اور لیڈی ڈون۔ جناب ٹھارنٹی صاحب، جناب کرنل برن صاحب، ڈاکٹر بارنیٹ صاحب، کیپٹن روس صاحب اور کیپٹن ولیر صاحب (یہ دونوں اے ڈی سی تھے) اور جناب ملٹری سکریٹری صاحب۔ وائسرائے صاحب کے سرسید کی کوٹھی میں فروکش ہونے کے بعد سرسید احمد خاں صاحب نے اپنے یورپین مہمانوں اور کالج کمیٹی کے چند ممبران کو وائسرائے کی خدمت میں پیش کیا۔ حضور وائسرائے نہایت مہربانی سے ہر ایک سے ملے اور مصافحہ فرمایا۔ جن لوگوں کو حضور وائسرائے کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا ان کے نام اس طرح تھے۔

مسٹر کین، مسٹر ڈینٹن (جو آگرہ سے آئے تھے)، مسٹر روس (سید محمود کے دوست جوالہ آباد سے آئے تھے)، سید محمود صاحب، کنور لطف علی خاں صاحب، راجہ سید باقر علی خاں صاحب، مولوی سید امداد علی خاں صاحب، مولوی سید فریدالدین احمد خاں بہادر، مولوی محمد سمیع اللہ خاں بہادر، سید ظہور حسین صاحب، محمد عنایت اللہ خاں صاحب، خواجہ محمد یوسف صاحب، مولوی زین العابدین صاحب بہادر، مرزا محمد رحمت اللہ بیگ صاحب، منشی محمد صدیق صاحب، محمد مسعود علی خاں صاحب، مولوی سید محمد ابوسعید صاحب، مولوی سید شمس الہدیٰ صاحب، خان بہادر محمد حیات خاں صاحب، خان بہادر محمد برکت علی خاں صاحب، مولوی محمد کریم خاں بہادر، سید اقبال علی صاحب۔

تعجب ہے کہ اس لسٹ میں سرسید کے دیرینہ دوست کرنل جی ایف آئی گراہیم کا نام شامل نہیں ہے۔ حالاں کہ وہ اُس روز علی گڑھ میں موجود تھے۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ:

> ''۷رجنوری کی رات کو ہم (یعنی گراہم اور ان کی بیگم صاحبہ) سید احمد خاں کے مہمان کی حیثیت سے علی گڑھ گئے۔ تاکہ لارڈ لٹن کے ہاتھوں اُن کے کالج کا سنگِ بنیاد رکھنے کا منظر دیکھ سکیں۔ چونکہ وائسرائے کی پارٹی سید احمد کے مکان میں ٹھہرنے والی تھی اسی وجہ سے انھوں نے ہمیں قریب کے ایک مکان میں ٹھہرایا اور ہماری شاہانہ خاطر و مدارات کی گئیں''۔[۱۱]

جن لوگوں کے نام اوپر درج ہیں وہ اس رسمی ملاقات کے بعد اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے تھے۔ حضور وائسرائے کے ناشتہ اور لنچ کا انتظام سرسید ہاؤس ہی میں کیا گیا تھا۔ اس رسمی ملاقات کے بعد حضور وائسرائے نے سرسید کے ڈائننگ روم میں ''حاضری (یعنی ناشتہ) تناول فرمائی''۔ ناشتہ کی میز پر ۲۴ لوگ موجود تھے جن میں صرف تین ہندوستانی تھے (یعنی سید احمد خاں، خان بہادر محمد حیات خاں اور سید محمود) اور اکیس یورپین مہمان تھے۔ ان ۲۱ لوگوں میں دس حضور وائسرائے کی پارٹی کے لوگ اور گیارہ مقامی انگریز افسران و دیگر مہمان تھے جن میں چھ کے نام اس طرح تھے مسٹر پولک (کمشنر)، مسٹر چیز (ڈسٹرکٹ جج)، مسٹر جیمس کولوین (ضلع کلکٹر)، مسٹر کین، مسٹر ڈینٹن اور مسٹر روس۔ بقیہ پانچ لوگوں میں خیال اغلب ہے کہ مسٹر گراہیم بھی شامل ہوں گے حالاں کہ ہم یہ وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ گراہیم کی بیگم صاحبہ اس موقع پر موجود نہیں تھیں کیوں کہ سرسید نے یہ بات واضح طور پر لکھی ہے کہ ناشتہ کی میز پر موجود ۲۴ لوگوں میں صرف دو خواتین ہی موجود تھیں (یعنی وائسرائے کی اہلیہ اور مسٹر ڈون کی بیگم صاحبہ جو وائسرائے کی پارٹی کے ساتھ ہی آئی تھیں)۔ ہو سکتا ہے کہ بقیہ چار یورپین لوگوں میں مسٹر سڈنس (اسکول کے ہیڈ ماسٹر بھی شامل ہوں) حالاں کہ اس کا امکان کم ہی ہے کیوں کہ ناشتہ کے فوراً بعد وائسرائے صاحب کو اسکول کے معاینہ کے لیے جانا تھا جہاں مسٹر سڈنس اُن کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ سرسید کے لکھنے کے مطابق ناشتہ کی میز پر موجود ۲۴ لوگ اس طرح تھے۔

''پس ان چوبیس شخصوں میں تین مسلمان اور اکیس حکام یورپین اور دو لیڈی صاحبان شریک تھیں''۔ [۱۲]

کھانے کی میز پر مہمانوں کی نشست اس طرح تھی کہ میز کے وسط میں وائسرائے لارڈ لٹن تشریف فرما تھے اُن کے عین مقابل میز کے دوسری طرف لیڈی لٹن تشریف رکھتی تھیں۔ وائسرائے لارڈ لٹن کے دائیں طرف سید احمد خاں اور بائیں طرف لیڈی ڈون کی نشست تھی اسی طرح میز کے دوسری طرف لیڈی لٹن کے دائیں طرف مسٹر چیز اور بائیں طرف مسٹر پولک تشریف فرما تھے۔ باقی مہمان ان لوگوں کے دائیں اور بائیں میز کے دونوں اطراف اپنی اپنی مقررہ جگہوں پر قرینے سے بیٹھے تھے۔ [۱۳]

عمدہ فرنیچر، بہترین کراکری، چاندی کی کٹلری اور زرق برق پوشاکوں میں ملبوس بیرے اور ٹبلر مہمانوں کی خاطر داری میں مستعدی سے مصروف تھے۔ ناشتہ کرنے کے بعد

وائسرائے لارڈلٹن اپنی پارٹی کے ساتھ اُس کوٹھی میں تشریف لے گئے جس میں بالفعل مدرسۃ العلوم کے (ابتدائی درجوں کے) طالب علم پڑھتے تھے۔ یہ کوٹھی وہی تھی جو آج کل پرانے گیسٹ ہاؤس کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اسکول کی عمارت میں پہنچنے کے بعد سید احمد خاں نے مسٹر سڈنس (ہیڈ ماسٹر)، بابو چکرورتی (قائم مقام سیکنڈ ماسٹر)، مولوی محمد اکبر صاحب اور مولوی عباس صاحب (مدرسان عربی) کو واسطہ ملازمت کے وائسرائے صاحب کے سامنے پیش کیا۔ مدرسہ کا معاینہ کرنے کے بعد وائسرائے اوران کی پارٹی سید احمد خاں کی کوٹھی (یعنی سرسید ہاؤس) پر واپس تشریف لے آئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی پروگرام کے مطابق، کالج کمیٹی کی طرف سے کنور لطف علی خاں صاحب (پریسیڈنٹ)، محمد حیات خاں صاحب، راجہ شمبھو نرائن سنگھ بہادر، راجہ جے کشن داس صاحب بہادر اور رائے کشن کمار صاحب، حضور وائسرائے کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اُن کا استقبال کرنے کے بعد مقام جلسہ فاؤنڈیشن میں تشریف لے چلنے کی درخواست کی اور اس طرح ان لوگوں کی پیشوائی میں حضور وائسرائے کی پارٹی کا قافلہ سرسید ہاؤس سے روانہ ہوا اور اُس جگہ پہنچا جہاں ایک کشادہ اور نہایت خوبصورت شامیانہ تیار کیا گیا تھا جس میں لوگ قرینے سے اپنی اپنی مقررہ نشستوں پر بیٹھے حضور وائسرائے کے جلوس کی آمد کے منتظر تھے۔ دور باؤنڈری کے قریب واقع میدان میں یہ تاریخی منظر دیکھنے کے لیے عام لوگوں کا اژدھام جمع ہو گیا تھا۔ وہیں ایک طرف سیکڑوں مہمانوں کی سواریاں، یعنی بگھیاں، گھوڑے گاڑیاں، گھوڑے اور ہاتھی قرینے سے کھڑے تھے۔ شامیانہ کے قریب پہنچنے کے بعد مندرجہ ذیل لوگوں کی ہمراہی میں، نہایت عمدگی کے ساتھ ترتیب دیئے گئے جلوس کے ساتھ، وائسرائے صاحب شامیانے میں جلوہ افروز ہوئے۔[۱۴]

مسٹر پولک (کمشنر)، مسٹر چیز (جج)، مسٹر کولوین (کلکٹر)، خان بہادر محمد حیات خاں صاحب، راجہ شمبھو نرائن سنگھ بہادر، راجہ جے کشن داس صاحب بہادر، راجہ کمار صاحب، کنور محمد لطف علی خاں صاحب، راجہ سید باقر علی خاں صاحب، سید احمد خاں صاحب، مولوی سید امداد علی خاں صاحب، مولوی فریدالدین احمد خاں صاحب، مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب، سید ظہور حسین صاحب، مولوی محمد کریم خاں صاحب، محمد عنایت اللہ خاں صاحب، خواجہ محمد یوسف صاحب، منشی محمد صدیق صاحب اس جلوس میں شریک تھے۔

''جب جلوس شامیانے میں داخل ہوا تو وہاں موجود تمام حاضرین نے کھڑے

ہو کر اپنی تعظیم پیش کی اور اس طرح حضور وائسرائے اپنی کرسی زریں پر رونق افروز ہوئے۔ مسٹر چیز صاحب (جج) نے حضور وائسرائے سے ایڈریس پڑھے جانے کی اجازت چاہی اور حضور وائسرائے کی اجازت سے سید محمود نے نہایت عمدگی سے ایڈریس پڑھا۔ اس ایڈریس کے بعد'' حضور وائسرائے نے اس کا جواب نہایت خوبی اور بے انتہا فصاحت اور شیریں بیانی سے فرمایا''۔ ایڈریس کا جواب ختم ہونے کے بعد۔

''سید احمد خاں صاحب آگے بڑھے اور عرض کیا کہ اب حضور کے دستِ مبارک سے بنیاد کا پتھر رکھا جاوے اور حضور وائسرائے سید احمد خاں بہادر کے ساتھ معہ مصاحبین جلوس کے اُس مقام پر تشریف لائے جہاں فاؤنڈیشن ہونے کو تھا۔ کنور لطف علی خاں صاحب نے ایک بوتل جس میں تمام حالات بناء مدرسۃ العلوم کے چھپے ہوئے معہ سکہ ہائے طلائی ونقری ومسی رکھے ہوئے تھے حضور وائسرائے کے سامنے پیش کیا اور حضور ممدوح نے اپنے دستِ مبارک سے اس کو بنیاد کے اُس خانہ میں رکھ دیا جو اُس کے لیے بنایا گیا تھا۔ پھر مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب نے ایک تختی مسی (تانبہ کی) جس پر انگریزی و فارسی میں مدرسۃ العلوم کی بنیاد رکھے جانے کا مختصر حال کندہ تھا پیش کی اور حضور ممدوح کی اجازت سے اس کو با آواز بلند پڑھا اور اس خانہ کے منھ پر جس میں بوتل رکھی گئی تھی ڈھانک دیا۔ پھر راجہ سید باقر علی صاحب نے کرنی نقرہ (چاندی کی کرنی) جو نہایت خوبصورت بنی ہوئی تھی اور مولوی محمد کریم صاحب نے تاشِ نقری (چاندی کا تشت) میں مصالح پیش کیا حضور وائسرائے نے ''کرنی'' کے سرے پر تھوڑا سا مصالح لے کر پتھر پر لگا دیا پھر مسٹر نیٹس صاحب (مسٹر نولیس) انجینئر نے وہ مصالح تمام پتھر پر پھیلا دیا اور سنگِ بنیاد جو تیس من کا وزنی اور ایک جرِ ثقیل کی کل میں آویزاں تھا اس کو حضور وائسرائے نے چھوڑ دیا اور وہ نیچا ہونا شروع ہوا اور بنیاد پر رکھ گیا۔ پتھر صحیح طور پر رکھے جانے کے بعد حضور وائسرائے نے تین بار موگری سے اس کو ٹھوکا اور زبانِ مبارک سے یہ ارشاد فرمایا کہ ''یہ پتھر ٹھیک رکھا گیا'' بعد اس

کے حضور ممدوح پھر کرسی اجلاس پر رونق افروز ہوئے''۔ ۱۵؎

خان بہادر محمد حیات خاں صاحب نے حضور ممدوح اور لیڈی لٹن کا بنیاد کا پتھر رکھنے کے لیے شکریہ ادا کیا جس کے جواب میں حضور ممدوح نے اپنی اور لیڈی لٹن کی جانب سے بنیاد کا پتھر نصب کرنے کے واسطے یہاں مدعو کیے جانے کے لئے اپنی مسرت کا اظہار فرمایا اور کالج کی ترقی کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ اس طرح یہ جلسہ ختم ہوا اور حضور وائسرائے اور ان کی پارٹی کے لوگ واپس سید احمد خاں کی کوٹھی میں رونق افروز ہوئے۔ جہاں وائسرائے صاحب اور اُن کے مصاحبین نے نہایت پر تکلف لنچ نوش فرمایا اور اس طرح تین بجے ریلوے اسٹیشن پہنچے اور آگرہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ رات کو سائنٹفک سوسائٹی کے پر رونق اور نہایت آراستہ ہال میں ایک شاندار ڈنر کا اہتمام کیا گیا۔ اس ڈنر کے اختتام کے بعد فاؤنڈیشن کی تقریب کی کل کارروائی نہایت عمدگی اور کامیابی کے ساتھ انجام پذیر ہوئی۔

حالاں کہ منتظمین کے لیے اگلے کئی روز ابھی بہت کام باقی تھا۔ جو سامان (یعنی فرنیچر، تنبو، خیمے، برتن وغیرہ) جہاں سے آیا تھا اسے واپس کرنا تھا۔ انعام واکرام تقسیم کرنا تھے۔ لوگوں کے حسابات بے باق کرنے تھے جس کا اندازہ حساب کے رجسٹروں میں موجود اندراجات سے کیا جا سکتا ہے۔ جن میں سے چند درج ذیل ہیں۔ ۱۶؎

۹ رجنوری ۱۸۷۷ء	انعام تماشہ متعلق فاؤنڈیشن	۳۰ روپے
۹ رجنوری ۱۸۷۷ء	انعام کوچوانان متعلق فاؤنڈیشن	۵ روپے
۹ رجنوری ۱۸۷۷ء	انعام خانساماں متعلق فاؤنڈیشن	۵ روپے
۹ رجنوری ۱۸۷۷ء	کرایہ ریل دو نفر آدمی از علی گڑھ تا کلکتہ	۲۹ روپے
۹ رجنوری ۱۸۷۷ء	خوراک ہندو صاحبان بموجب فرد حساب گلزاری لال	۱۱ روپے ۸ آنہ ۳ پائی
۹ رجنوری ۱۸۷۷ء	خوراک ہندو صاحبان معرفت مرلی دھر	۵ روپے ۹ آنہ ۳ پائی
۹ رجنوری ۱۸۷۷ء	انعام کوچوانان متعلق فاؤنڈیشن	۳ روپے
۹ رجنوری ۱۸۷۷ء	انعام خدمت گاران متعلق فاؤنڈیشن	۵ روپے
۹ رجنوری ۱۸۷۷ء	کرایہ بنگلہ وگاڑی متعلق فاؤنڈیشن	۱۸۰ روپے
۱۰ رجنوری ۱۸۷۷ء	بابت قیمت سگریٹ متعلق فاؤنڈیشن	۱۵ روپے

۱۰ر جنوری ۱۸۷۷ء	مزدوری اسباب ڈینٹن صاحب "	۸ آنہ
۱۰ر جنوری ۱۸۷۷ء	محصول روانگی ریل ۵ عدد ڈیرہ معہ شامیانہ راجہ جگت سنگھ بہادر	۱۶ روپے ۹ آنہ
۱۰ر جنوری ۱۸۷۷ء	محصول ریل دوست محمد خلاصی راجہ جگت سنگھ متعلق فاؤنڈیشن	۲ روپے
۱۰ر جنوری ۱۸۷۷ء	محصول ریل روانگی ڈیرہ بمقام بریلی بنام مادھوراؤ متعلق فاؤنڈیشن	۵ روپے ۸ آنہ
۱۰ر جنوری ۱۸۷۷ء	محصول روانگی خلاصی ملازم راؤ مادھوراؤ متعلق فاؤنڈیشن	۲ روپے ۱ آنہ ۳ پائی
۱۰ر جنوری ۱۸۷۷ء	محصول ریل آمد ڈیرہ از آگرہ متعلق فاؤنڈیشن	۳ روپے ۴ آنہ
۱۰ر جنوری ۱۸۷۷ء	محصول ریل روانگی ڈیرہ بمقام آگرہ متعلق فاؤنڈیشن	۳ روپے ۴ آنہ
۱۰ر جنوری ۱۸۷۷ء	مزدوری گاڑی جس پر بریلی کا خیمہ گیا متعلق فاؤنڈیشن	۸ آنہ
۱۰ر جنوری ۱۸۷۷ء	مزدوری ڈیرہ راجہ جگت سنگھ وغیرہ از کوٹھی تا اسٹیشن متعلق فاؤنڈیشن	۲ روپے
۱۴ر جنوری ۱۸۷۷ء	انعام امیر خاں خانساماں متعلق فاؤنڈیشن	۲۵ روپے
۱۴ر جنوری ۱۸۷۷ء	کرایہ ریل آمد و رفت امیر خاں خانساماں متعلق فاؤنڈیشن	۱۳ روپے

نوٹ: یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ امیر خاں خانساماں کہاں سے بلائے گئے تھے۔ لیکن چونکہ ان کو آمد و رفت کے لیے ریل کے کرایہ کے بطور ۱۳ روپے دیئے گئے تھے۔ اس لیے خیال اغلب ہے کہ وہ دہلی اور آگرہ یا مراد آباد جیسے قریب کے شہروں کے بجائے نسبتاً دور کے کسی شہر سے آئے ہوں گے، ہو سکتا ہے وہ الہ آباد سے بلائے گئے ہوں (الہ آباد میں سید محمود کے پاس کوئی اچھا خانساماں ضرور ہوگا)۔

فاؤنڈیشن کے سلسلے میں کامگاروں کا ذکر:

حساب کے رجسٹروں کے اندراجات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ الٰہی بخش، عبداللہ، احمد خاں اور نبی بخش اُس زمانے میں کالج اور کالج کے سکریٹری (یعنی سرسید احمد خاں) کے آفس میں چپراسیوں کے بطور مامور تھے۔ اس کے علاوہ متعدد لوگ جن میں فراش، صفائی والے، کوچوان، سائیس، چوکیدار، خانساماں، خلاصی و دیگر اقسام کے خدمت گاران کے نام بھی حساب کے رجسٹر سے فراہم ہوتے ہیں۔ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ نجیب اللہ عام طور پر، سرسید کے ذاتی ملازم ہونے کی حیثیت سے ان کے ساتھ ہی دہلی اور آگرہ آتے جاتے تھے۔ جہاں بھروسہ کے آدمی کی مخصوص کام کے لیے ضرورت ہوتی تھی وہاں نجیب اللہ کے بعد الٰہی بخش چپراسی یا احمد خاں چپراسی کو فوقیت دی جاتی تھی۔ جس سے ہم نے یہی نتیجہ نکالا کہ اُس زمانے میں ''سرسید ہاؤس'' میں نجیب اللہ کے بعد الٰہی بخش اور احمد خاں چپراسی خاصے معتبر اور بارسوخ سمجھے جاتے تھے۔ الٰہی خاں خانساماں محسن الملک کے ذاتی خانساماں تھے اور اُن کے پاس ایک لمبے عرصے سے کام کر رہے تھے۔ سرسید کے انگلینڈ سے محسن الملک کے نام لکھے خط مورخہ ۱۶ رمارچ ۱۸۷۰ء میں ان کا تذکرہ ملتا ہے جس میں سرسید لکھتے ہیں کہ: ''الٰہی خاں خانساماں کو سلام پہنچے'' ۔[۱۷] چونکہ محسن الملک اُس زمانے میں حیدرآباد میں تھے اس لیے ہمارا خیال ہے کہ الٰہی خاں خانساماں کو فاؤنڈیشن کی تقریب کے لیے حیدرآباد سے ہی بلایا گیا ہوگا اور فاؤنڈیشن کے سلسلے میں ہونے والے بریک فاسٹ، لنچ اور ڈنر وغیرہ کے انتظامات کا انہیں ذمہ سونپا گیا ہوگا اسی وجہ سے بڑی بڑی رقمیں ان کی تحویل میں دیئے جانے کے اندراجات حساب کے رجسٹروں میں ملتے ہیں۔ الٰہی بخش خاں خانساماں کے علاوہ دوسرے خانساماں امیر خاں بھی اس کام پر مامور تھے۔ جیسا کہ ہم اوپر تحریر کر چکے ہیں ہمارا مفروضہ ہے کہ غالباً انہیں الہ آباد سے بلایا گیا تھا اور شاید وہ سید محمود کے ذاتی خانساماں تھے۔ جیون خاں فراش شاید سرسید کے دہلی والے مکانوں میں کام کرتے تھے اور ان کے پرانے ملازم تھے۔ اسی وجہ سے سرسید نے ان کو فاؤنڈیشن کی تقریب کے سلسلے میں کام کرنے کے لیے بہت پہلے سے علی گڑھ بلا لیا تھا جہاں وہ تقریباً ڈیڑھ مہینے تک مقیم رہے تھے۔ غرض فاؤنڈیشن کی تقریب کے بخیر و خوبی تکمیل پانے کے بعد سرسید نے نئے سرے سے اپنی توجہ دوسرے ضروری کاموں کی طرف مبذول کرنی شروع

کی اور اس طرح ''سرسید ہاؤس'' میں ہونے والا پہلا بڑا جشن بخیر و خوبی انجام پذیر ہوا۔

شبلی کی بنگلیہ:

''سرسید ہاؤس'' کے احاطے میں بنگلہ کی اصل عمارت کے عقب میں یعنی شمال مغرب کی جانب احاطہ کی مغربی دیوار سے ملحق ایک چھوٹا سا پھوس کا بنگلہ موجود تھا۔ اس بنگلے کے وسط میں ایک ہال تھا جس کے چاروں طرف برآمدہ تھا۔ برآمدے کے چاروں کونوں پر چار کوٹھریاں تھیں۔ مرکزی ہال پر چھپر کی دبیز چھت تھی۔ برآمدوں کی چھت کھپریل کی تھی۔ ہم یہ وثوق سے نہیں کہہ سکتے ہیں کہ جب مسٹر فرگوسن سے یہ بنگلہ خریدا گیا تھا اُس وقت اس کے احاطے میں یہ چھوٹا بنگلہ موجود تھا یا اسے بعد میں سرسید نے خود تعمیر کروایا تھا۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ فرگوسن سے بنگلہ خریدنے کے بعد ہی سرسید نے اپنے آفس کے اسٹاف کے لیے یہ ''بنگلیہ'' تعمیر کروائی ہوگی۔ دراصل جولائی ۱۸۷۷ء میں اسی طرح کے چار بنگلے سرسید نے فرسٹ کلاس بورڈروں کی رہائش کے لیے شین کے بنگلے (یعنی موجودہ اسٹوڈینٹ یونین) کے احاطے میں بھی تعمیر کروائے تھے۔ غالباً اُسی وقت اُسی طرح کا ایک چھوٹا بنگلہ انھوں نے سرسید ہاؤس کے احاطے میں بھی تعمیر کروایا تھا۔ لیکن بعد میں (یعنی ۱۸۸۰ء کے بعد) جب انھوں نے ''سرسید ہاؤس'' کی عمارت میں اپنی ضروریات کے مطابق توسیع کی تو اس ''بنگلیا'' کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی اسی وجہ سے جب مولانا شبلی کا ۱۸۸۳ء میں کالج میں تقرر ہوا اور اُن کو شہر میں رہائشی دقتیں پیش آئیں تو سرسید نے انہیں اس بنگلیہ میں سکونت اختیار کرنے کی پیش کش کی جسے انھوں نے بخوشی منظور کرلیا اور اپنے آئندہ علی گڑھ کے دورانِ قیام (یعنی ۱۸۹۸ء تک) وہ ''سرسید ہاؤس'' کے احاطے میں موجود اسی ''بنگلیہ'' میں قیام پذیر رہے تھے۔ اسی وجہ سے یہ ''بنگلیہ'' عرفِ عام میں ''شبلی کی بنگلیہ'' کے نام سے مشہور ہوگئی تھی۔ (اب اس بنگلیہ کے آثار بھی ختم ہوگئے ہیں)۔

سرسید کا ایڈیٹر مقرر ہونا:

سمیع اللہ خاں صاحب کی سائنٹفک سوسائٹی کی سکریٹری شپ کے زمانے میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ (یعنی اخبار سین ٹیفک سوسائٹی) کی ادارت کا کام اسماعیل خاں صاحب کے سپرد کردیا گیا تھا۔ سرسید کے (اگست ۱۸۷۶ء میں) علی گڑھ آجانے کے بعد محمد اسماعیل خاں صاحب نے غیر رسمی طور پر ہی سہی اخبار کی ادارت کے سلسلے کا کل کام سرسید کے سپرد

کر دیا تھا۔ اپریل ۱۸۷۷ء میں محمد اسماعیل خاں صاحب نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی ادارت سے با قاعدہ استعفیٰ دے دیا تا کہ اب سر سید خود اس کی ادارت کی ذمہ داری با قاعدہ طور پر قبول کر سکیں۔ اخبار سائنٹفک سوسائٹی مورخہ ۴؍مئی ۱۸۷۷ء میں اس سلسلے میں مندرجہ ذیل اطلاع شائع ہوئی تھی۔

''اطلاع۔ مولوی محمد اسماعیل صاحب نے اس اخبار کی ایڈیٹری سے استعفیٰ دے دیا اور وہ استعفیٰ منظور ہو گیا۔ بالفعل بہ نظر بعض وجوہ کے ایڈیٹری اس اخبار کی سید احمد خاں بہادر سی ایس آئی لیف آنریری سکریٹری اس سوسائٹی کے سپرد کی گئی ہے جس کو وہ بہ نظر ترقیِ اخبار اور ترقیِ کاروبار سین ٹیفک سوسائٹی کے بلا کسی معاوضہ کے انجام دیں گے۔'' [۱۸]

سمیع اللہ خاں کا تبادلہ و اختیارات کی منتقلی:

۱۸۷۴ء میں جب راجہ جے کشن داس صاحب کا علی گڑھ سے تبادلہ ہو گیا تھا اُس وقت اُن کی جگہ پر سمیع اللہ خاں صاحب سائنٹفک سوسائٹی کے سکریٹری مقرر ہوئے تھے۔ اسی کے ساتھ ۱۸۷۵ء میں جب علی گڑھ میں ابتدائی مدرسہ قائم کیا گیا تھا اس وقت بھی اس مدرسہ کی ''انتظامی امور کی کمیٹی'' کے سکریٹری بھی سمیع اللہ خاں صاحب ہی مقرر کیے گئے تھے۔ اس طرح سر سید کے ۱۸۷۶ء میں علی گڑھ آنے تک دونوں اداروں کے کل اختیارات سمیع اللہ خاں صاحب ہی کے ہاتھوں میں تھے۔ جون ۱۸۷۷ء میں سمیع اللہ خاں صاحب کا تبادلہ علی گڑھ سے مراد آباد ہو گیا تھا۔ ۱۰؍جون ۱۸۷۷ء کی سہ پہر ساڑھے چار بجے سمیع اللہ خاں صاحب بذریعہ ریل مراد آباد کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ سمیع اللہ خاں صاحب کے علی گڑھ سے روانہ ہونے سے پہلے اجلاس ممبران سین ٹیفک سوسائٹی علی گڑھ منعقدہ ۷؍جون ۱۸۷۷ء میں طے ہوا کہ:

''مولوی سمیع اللہ خاں نے تجویز پیش کی کہ ''جو کہ اب میں اس ضلع سے جاتا ہوں کہ عہدہ سکریٹری کی نسبت کوئی مناسب انتظام کمیٹی سے کیا جائے۔'' مولوی خواجہ محمد یوسف صاحب نے بیان کیا کہ سید احمد خاں صاحب لیف آنریری سکریٹری سوسائٹی علی گڑھ میں تشریف رکھتے ہیں اور انھوں نے اپنی سکونت علی گڑھ کی اختیار کر لی ہے پس

بحیثیت عہدہ آنریری لیف سکریٹری کے نہایت مناسب ہے کہ وہ
سب کام سکریٹری کا انجام دیں گے اور مجھے کچھ شبہ نہیں ہے کہ سید
احمد خاں صاحب کو اس میں کچھ عذر ہوگا۔
مولوی سمیع اللہ خاں صاحب نے فرمایا کہ مسٹر جی آئی واٹسن صاحب
بہادر جو سوسائٹی کے پریسیڈنٹ تھے انھوں نے اپنے خط کے ذریعہ
اس عہدے سے مستعفیٰ ہونے کی اطلاع دی ہے اس لیے میں تحریک
کرتا ہوں کہ سید احمد خاں بہادر سی ایس آئی جو بانی اس سوسائٹی کے
ہیں وہ پریسیڈنٹ کیے جائیں۔ سید احمد خاں اپنی کرسی سے کھڑے
ہوئے اور کہا کہ جو تحریک صاحب پریسیڈنٹ نے کی اُس کا میں دلی
شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس تحریک کی تائید جو میرے معزز دوست نے
فرمائی اُس کا شکریہ ادا کرنے سے اپنی احسان مندی کو دو چند کرتا
ہوں۔ مگر جو خدمت سوسائٹی کی میرے سپرد ہے میں اُس کو پسند کرتا
ہوں اور اعلیٰ عہدے اُن لوگوں کے لیے رکھنا چاہتا ہوں جو مجھ سے
زیادہ لائق ہیں۔ پس میں تحریک کرتا ہوں کہ عہد پریسیڈنٹی جب
تک کہ اُس کے لائق کوئی دستیاب ہو خالی رہے"۔[۹]

اس طرح سوسائٹی کے کل اختیارات ایک بار پھر سرسید کے ہاتھوں میں آگئے
حالاں کہ سمیع اللہ خاں صاحب نے ایک آخری کوشش کے بطور سرسید کے نام کی سوسائٹی کی
پریسیڈنٹی کے عہدے کے لیے تحریک کی تھی جس کو سرسید نے بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ
درگزر کرتے ہوئے سوسائٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے کام کرنے کی اپنی رضامندی ظاہر
کردی تھی۔

اسی تاریخ یعنی ۷رجون ۱۸۷۷ء کو "کمیٹی منتظم مدرسۃ العلوم" کا بھی ایک اجلاس
منعقد ہوا تھا جس میں مندرجہ ذیل تجویز کے ذریعہ سرسید کو اس کمیٹی کا بھی سکریٹری مقرر کیا
گیا تھا (سرسید ابھی تک اس کمیٹی کے صرف وائس پریسیڈنٹ تھے)۔

ممبروں نے آپسی مباحثہ کے بعد امور مندرجہ ذیل کو بالاتفاق منظور کیا:
۱۔ اہتمام بورڈنگ ہاؤس کا مولوی محمد کریم صاحب پریسیڈنٹ کے
متعلق رہے گا اور سکریٹری کے ذمہ ضروری امور کی اعانت ہوگی۔

۲۔ سید احمد خاں بہادر سی ایس آئی کا استعفیٰ عہدہ وائس پریسیڈینٹی کمیٹی سے منظور ہوا۔

۳۔ سید احمد خاں سی ایس آئی اس کمیٹی کے سکریٹری مقرر ہوئے۔

۴۔ وائس پریسیڈنٹ کی تجویز کسی آئندہ اجلاس پر ملتوی رہے''۔[۲۰]

اس طرح سمیع اللہ خاں صاحب کے علی گڑھ سے اس تبادلے کی وجہ سے مدرسۃ العلوم اور سین ٹیفک سوسائٹی کے کل اختیارات سرسید کو منتقل ہو گئے تھے اور اختیارات کی منتقلی کا یہ عمل (جس میں خاصی تاخیر ہو چکی تھی) نہایت آسانی اور شائستگی کے ساتھ مکمل ہو گیا تھا۔ میرے خیال میں سمیع اللہ خاں صاحب کا یہ تبادلہ ایم اے او کالج کی تاریخ کا ایک اہم سنگ میل ہے۔

وائسریگل کونسل کی ممبری:

۱۸۷۸ء میں سرسید وائسرائے کی کونسل کے ممبر مقرر کیے گئے تھے۔ غالباً یہ ممبری دو سال کے لیے تھی لیکن لارڈ رپن نے اُن کو دوبارہ ممبری کے لیے منتخب کیا تھا۔ وہ کتنے عرصہ تک کونسل کے ممبر رہے تھے اس کے بارے میں حیاتِ جاوید میں جو اطلاعات حالی نے فراہم کی ہیں وہ بہت واضح نہیں ہیں۔ حالی لکھتے ہیں کہ:

''۱۸۷۸ء میں سرسید کو لارڈ لٹن نے وائسریگل لیجسلیٹو کونسل کا ممبر مقرر کیا اور ان کے بعد دوسری دفعہ لارڈ رپن نے اُن کو ممبری کونسل کے لیے انتخاب کیا''۔[۲۱]

اسی سلسلے میں حالی مزید تفصیلات بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ:

''لارڈ رپن کے عہد میں جس قدر زمانہ کہ سرسید کے کونسل میں شریک رہنے کا تھا اُس کے پورا ہونے میں ابھی چند روز باقی تھے اور اُن کے پورا کرنے کے لیے کلکتے جانے میں مدرسہ وغیرہ کے کاموں میں حرج واقع ہوتا تھا اس لیے انھوں نے بذریعہ تار کے کونسل سے استعفیٰ بھیج دیا مگر اس کے بعد سنہ ۱۸ء میں جب کہ اضلاعِ شمال مغرب میں کونسل قائم ہوئی اُن کو لوکل گورنمنٹ نے اپنی کونسل کے لیے پھر انتخاب کیا اور اُس وقت سے لے کر سنہ ۱۸ء تک وہ برابر اُس

میں ممبر رہے۔ آخر پھر اُن کو مدرسہ ہی کے کاروبار کی ضرورت اور نیز ضعیفی کی وجہ سے استعفیٰ دینا پڑا''۔۲۲

سرسید کب سے کب تک وائسرائے کی کونسل کے ممبر رہے تھے اور کب انھوں نے اس ممبری سے استعفیٰ دیا تھا نیز دوبارہ وہ کس سنہ میں اضلاع شمال مغرب میں کونسل قائم ہونے کے بعد اس کونسل کے ممبر نامزد ہوئے تھے اور کب تک اس کے ممبر رہے تھے غالباً ان تاریخوں کے سلسلے میں حالی کو خود پوری معلومات نہ تھی اسی وجہ سے انھوں نے سنہ لکھنے کی جگہ خالی چھوڑ دی تھی (جس کو وہ تصدیق کرنے کے بعد پُر کرنا چاہتے ہوں گے جو وہ کسی وجہ سے نہ کر سکے ہوں گے)۔

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۰ر جولائی ۱۸۷۸ء میں شائع شدہ مندرجہ ذیل خبر سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید پہلی مرتبہ جولائی ۱۸۷۸ء میں وائسرائے کی کونسل کے ممبر نامزد ہوئے تھے۔

''ہز ایکسیلینسی حضور وائسرائے و گورنر جنرل بہادر نے سید احمد خاں بہادر سی ایس آئی مقیم علی گڑھ کو صاحب گورنر جنرل بہادر ہند کی کونسل واضع آئین وقوانین کا ایک ایڈیشنل ممبر مقرر فرمایا ہے''۔۲۳

اس طرح دو سال کی ممبری کی مدت ختم ہونے کے چند روز پہلے جولائی ۱۸۸۰ء میں انھوں نے کونسل کی ممبری سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ لیکن کرنل گراہم کے حوالے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ۱۸رنومبر ۱۸۸۴ء کو جب وائسرائے لارڈ رپن کالج میں تشریف لائے تھے اُس وقت سرسید ہنوز وائسرائے کی کونسل کے ممبر تھے۔ کیوں کہ اُس روز کرنل گراہم لارڈ رپن کے اعزاز میں دیئے گئے ڈنر میں شریک ہوئے تھے اور سرسید و سید محمود کو وائسرائے کے ساتھ بیٹھے دیکھ کر رشک سے انھوں نے لکھا تھا کہ:

''ہندوستان میں شاید ہی کوئی ایسا خاندان ہوگا جس میں بیک وقت باپ وائسرائے کی کونسل کا ممبر اور بیٹا ہائی کورٹ کا جج ہو۔''۲۴

گریہم کے اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ نومبر ۱۸۸۴ء میں سرسید ہنوز وائسرائے کی کونسل کے ممبر تھے (اور سید محمد ہائی کورٹ کے عارضی جج متعین ہو چکے تھے) اس طرح ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جولائی ۱۸۸۰ء میں کونسل کی ممبری سے مستعفی ہونے کے تقریباً دو سال بعد ۱۸۸۲ء میں اضلاع شمال مغرب میں کونسل قائم ہونے کے بعد سرسید

دوبارہ اس کونسل کے ممبر نامزد ہوگئے تھے۔ اس طرح خیال اغلب ہے کہ وہ دو مختلف ادوار میں تقریباً چار سال تک وائسریگل کونسل کے ممبر رہے تھے۔ اس عرصہ میں انھوں نے چیچک کے ٹیکے کے بل اور قاضیوں کے تقرر کے بل کے مسودے کونسل میں پیش کیے تھے اور دونوں بل پاس ہونے کے بعد قانون بنے تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے مسودۂ قانون وقفِ خاندانی بھی کونسل میں پیش کیا تھا۔ اسی کے ساتھ بعض امور پر کونسل میں کی گئی اُن کی تقریریں معرکتہ الآرا قرار دی گئی تھیں۔ سرسید کونسل میں عموماً انگریزی ہی میں تقریر کرتے تھے۔ جس کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ پہلے وہ اردو میں خود اپنی تقریر لکھتے تھے جس کا عمدہ انگریزی ترجمہ کروایا جاتا تھا بعد میں اسی انگریزی ترجمہ کو سرسید اپنے ہاتھ سے اردو رسم الخط میں لکھ کر کونسل میں پڑھا کرتے تھے۔[۲۵] (یہاں ہم یہ بات واضح کرنا چاہیں گے کہ بعد کی اطلاع کی بنا پر اب ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ سرسید دو سال تک یعنی ۱۸۷۸ء سے جولائی ۱۸۸۰ء تک وائسرائے کی کونسل کے ممبر رہے تھے۔ بعد میں وہ شمالی مغربی صوبہ کی کونسل کے ممبر ۱۸۸۷ء میں ہوئے تھے اور دو ٹرم یعنی چھ سال (۱۸۹۳ء) تک اس کے ممبر رہے تھے۔)[۲۶]

ایجوکیشن کمیشن کی ممبری:

۱۸۸۲ء میں سرسید ایجوکیشن کمیشن کے ممبر مقرر ہوئے تھے لیکن کمیشن کے طریقۂ کار سے سرسید متفق نہیں تھے اسی لیے انھوں نے کمیشن کے کام کرنے کے طریقوں کے متعلق کچھ تجاویز کمیشن کے سامنے پیش کیں لیکن کمیشن کے پریسیڈنٹ نے کام کی زیادتی کے مدِ نظر سرسید کی تجاویز کو قبول کرنے سے معذوری ظاہر کی جس کی وجہ سے سرسید نے کمیشن کی ممبری قبول کرنے سے معذرت چاہ لی۔ جب لارڈ رپن کو اس کی اطلاع ملی تو انھوں نے سرسید سے درخواست کی کہ وہ سید محمود کو اپنی جگہ کمیشن کی ممبری قبول کرنے کے لیے راضی کریں اور خود کمیشن کے سامنے شہادت دیں۔ چنانچہ یہ تجویز منظور کرتے ہوئے سید محمود سرسید کی جگہ کمیشن کے ممبر مقرر کیے گئے اور سرسید نے اس کمیشن کے سامنے نہایت وضاحت اور بیباکی کے ساتھ مختلف سوالات کے جوابات کے بطور اپنی شہادت ریکارڈ کروائی۔ ایجوکیشن کمیشن کے سامنے دی گئی سرسید کی یہ شہادت اب انگریزی اور اردو دونوں میں شائع ہونے کے بعد دستیاب ہے۔

سید محمود کا ڈسٹرکٹ جج مقرر ہونا:

۱۸۷۸ء کے اواخر یا ۱۸۷۹ء کے اوائل میں سید محمود اپنی ہائی کورٹ کی پریکٹس (یعنی وکالت) کو خیر باد کہہ کر مستقل رہائش کے ارادے سے علی گڑھ منتقل ہو گئے تھے۔ اس سے پہلے ان کے دوست مسٹر جارج آئی اے روس (جو سید محمود کے ساتھ ہی الہ آباد ہائی کورٹ میں وکالت کرتے تھے) اپنی پریکٹس ختم کر کے انگلینڈ منتقل ہو چکے تھے جہاں انھوں نے شادی کرنے کے بعد مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ سید محمود کو یہ احساس ہو رہا تھا کہ اتنے بڑے پیمانے پر کالج کو منظم کرنے میں سرسید کو اُن کی مدد کی ضرورت ہوگی اور حقیقت بھی یہ ہے کہ سید محمود کی قانون دانی اور انگریزی کی لیاقت کی وجہ سے وہ واقعی سرسید کے لیے بہت مددگار ثابت ہو سکتے تھے۔ لیکن سید محمود ابھی چند مہینے ہی علی گڑھ میں گزار پائے تھے کہ جولائی ۱۸۷۹ء میں ان کا عدلیہ کی سروس میں انتخاب ہو گیا اور وہ ڈسٹرکٹ جج کے بطور رائے بریلی میں تعینات کر دیے گئے۔ سرسید کے مطابق وائسرائے کی ایما پر سید محمود نے عدلیہ کی سروس میں جانا منظور کیا تھا۔ اس طرح کم اگست ۱۸۷۹ء کو سید محمود نے رائے بریلی میں اپنے عہدے کا چارج لے لیا تھا۔

سرسید ہاؤس میں چہل پہل:

۱۸۷۹ء میں جتنے عرصہ سید محمود علی گڑھ میں مقیم رہے اُس زمانے میں سرسید کونسل کی ممبری کی وجہ سے زیادہ تر کلکتے اور شملے میں مقیم رہے تھے لیکن سید محمود کی علی گڑھ میں موجودگی کی وجہ سے سب کام باقاعدگی سے انجام پاتے رہے تھے۔ اُس وقت سرسید ہاؤس'' میں سید محمود کے علاوہ اُن کی چچازاد بہن کے تین صاحبزادگان یعنی سید محمد علی سید محمود علی اور سید احمد علی بھی سرسید ہاؤس ہی میں رہتے تھے۔ دہلی سے سید محمود کی چچازاد بہن اور اُن کے شوہر (یعنی والد اور والدہ سید محمد علی) سرسید کی بہن اور اُن کی صاحبزادیاں و سید حامد اور اُن کی بیگم صاحبہ اور صاحبزادی نیز سید احمد الدین (سرسید کی بہن کے نواسے) اور سید محمود کے چچازاد بھائی خان بہادر سید محمد احمد خاں صاحب بھی مع اپنے اہل و عیال کے اکثر آتے جاتے رہتے تھے۔ گھر مہمانوں اور عزیز و اقارب سے بھرا رہتا تھا۔ چھٹی کے دن سید محمد علی اور سید محمود علی اور اُن کے دوستوں کے ساتھ کرکٹ کے میچ کھیلے جاتے تھے۔ شام میں ٹینس کی پریکٹس ہوتی تھی۔ ٹینس کھیلنے میں سید محمود کے علاوہ سید محمد علی اور اُن کے ہم جماعت

و دوست حمید اللہ خاں (سمیع اللہ خاں صاحب کے صاحبزادے) پیش پیش رہتے تھے۔ سرسید ہاؤس میں عمدہ ٹینس کورٹ کی موجودگی اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ سرسید خود بھی ٹینس کے کھیل سے شغف رکھتے تھے۔

سرسید کا کلکتہ، شملہ اور نینی تال میں قیام:

کونسل کی ممبری کے دوران ۱۸۷۹ء اور ۱۸۸۰ء میں سرسید کا زیادہ تر وقت کلکتے اور شملے میں گزرا کرتا تھا۔ وائسرائے موسم سرما میں کلکتے میں اور موسم گرما میں شملہ میں قیام کرتے تھے۔ یعنی موسمِ گرما میں گورنمنٹ کا دارالخلافہ شملہ منتقل ہو جاتا تھا۔ اضلاعِ شمال مغرب کا دارالخلافہ بھی موسم گرما میں نینی تال منتقل ہو جاتا تھا جہاں لفٹنٹ گورنر کا گرمیوں میں قیام رہتا تھا۔

سرسید کے تمام شائع شدہ خطوط (اور وہ غیر شائع شدہ خطوط جو مجھے دستیاب ہو سکے) ان کو تاریخ وار ترتیب دینے سے ہمیں معلوم ہوا کہ بعض اوقات وہ لمبے عرصہ تک کلکتہ، شملہ یا نینی تال سے خطوط لکھتے رہے تھے۔ جس سے ہم نے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی ہے کہ وہ کب اور کتنے عرصہ کے لیے کلکتہ، شملہ اور نینی تال میں مقیم رہے تھے۔ مثلاً ہمارے اس مفروضہ کے مطابق دسمبر ۱۸۷۹ء سے مارچ ۱۸۸۰ء تک تقریباً چار مہینے سرسید کلکتہ میں مقیم رہے تھے۔ اسی طرح مئی ۱۸۷۹ء سے ستمبر ۱۸۷۹ء تک تقریباً پانچ مہینے وہ شملہ میں مقیم رہے تھے۔ اسی طرح دسمبر ۱۸۷۹ء سے فروری ۱۸۸۰ء تک یعنی دو مہینے کے لیے وہ دوبارہ کلکتہ میں موجود تھے۔ لیکن چوں کہ اگست ۱۸۷۹ء میں سید محمود ڈسٹرکٹ جج کی حیثیت سے رائے بریلی منتقل ہو گئے تھے اس لیے اب سرسید کی علی گڑھ میں موجودگی ضروری ہو گئی تھی غالباً اسی وجہ سے سرسید نے جولائی ۱۸۸۰ء میں کونسل کے اجلاس کے خاتمہ کے بعد کونسل کی ممبری سے استعفیٰ دے دیا تھا (حالاں کہ ان کا کونسل کی ممبری کا ٹرم ختم ہونے میں چند دن ہی باقی تھے) سرسید کے خطوط کی ترتیب سے ملنے والی اطلاع کی بنیاد پر ہم کو یہ بھی اطلاع فراہم ہوتی ہے کہ مئی ۱۸۸۲ء سے اکتوبر ۱۸۸۲ء تک یعنی تقریباً ۶ مہینے سرسید کا قیام نینی تال میں رہا تھا۔ اسی طرح اگست ۱۸۸۸ء سے اکتوبر ۱۸۸۸ء تک یعنی تقریباً تین مہینوں تک وہ نینی تال میں مقیم رہے تھے۔

کلکتہ میں سر سید کا پتہ:

سر سید کے کلکتے سے لکھے خطوط پر مندرجہ ذیل پتے درج ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ کلکتے کے دورانِ قیام ان کے پتے مختلف اوقات میں بدلتے رہے تھے۔

۱۔ دسمبر ۱۸۷۸ء میں ان کا کلکتہ کا پتہ تھا:

۱۰۰ نمبر وکٹوریا مِنس، کلکتہ (غالباً یہ عارضی پتہ تھا)

۲۔ مارچ ۱۸۷۹ء میں ان کا کلکتہ میں پتہ تھا:

ڈوورہال، بالی گنج، کلکتہ (یہی مستقل پتہ تھا)

۳۔ ۲۹ جنوری ۱۸۸۲ء کے ایک خط پر ان کا پتہ درج تھا۔

۲۵۔ تھیٹر روڈ، کلکتہ (یہ بھی غالباً عارضی پتہ تھا)

سر سید کلکتہ میں اپنے گھر کے پتے کے سلسلے میں اپنے خط مورخہ ۱۵/دسمبر ۱۸۷۹ء بنام مولوی ممتاز علی از کلکتہ تحریر کرتے ہیں کہ:

''میرے محلّہ کا انگریزی نام تو آپ کو معلوم ہے۔ مگر گاڑی والے یہ نام کمتر سمجھتے ہیں اس محلّہ کو ہندوستانی 'باہمنی چھتہ' کہتے ہیں پس اگر شاید میرا آدمی نہ ملے تو جس گاڑی بان سے کہو گے لے آئے گا۔ اسٹیشن پر کثرت سے گاڑیاں کرایہ پر ملتی ہیں''۔ ۲۷

ہمارا خیال ہے کہ سر سید کا محلّہ بالی گنج عرفِ عام میں 'باہمنی چھتہ' کہلاتا تھا اور یہی ان کا کلکتہ میں رہائشی پتہ تھا۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۷/جنوری ۱۸۷۹ء سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ جس میں ان کے کلکتہ کے پتہ کے سلسلے میں مندرجہ ذیل اطلاع شائع ہوئی تھی۔

اطلاع:

''ہماری سوسائٹی اور مدرسۃ العلوم کے سکریٹری آنریبل سید احمد خاں بہادر سی ایس آئی ممبر لیجسلیٹیو کونسل گورنر جنرل آف انڈیا نے کلکتہ میں بمکان مندرجہ ذیل قیام فرمایا ہے پس جن صاحب کو ان سے خط وکتابت کرنی ہو ان کے نام کے خطوط مندرجہ ذیل نشان پر روانہ فرمائیں۔ ۲۸

"Dover Hall, 10. Bàlliganj, Calcutta"

سر سید کلکتہ میں ایک بڑے بنگلے میں مقیم ہوئے تھے جو ۱۰۔ بالی گنج پر واقع تھا۔ اس کا اشارہ نواب آغا مرزا صاحب کی سوانح سے ملتا ہے۔ جس میں درج ہے کہ جب وہ نظام حیدر آباد کے ساتھ ۱۸۸۴ء میں کلکتہ گئے تھے اس وقت کپتان کلارک نے ان کو مندرجہ ذیل احکام دیئے تھے۔

''تم سید صاحب کے مخالف ہو، میں جو حکم دیتا ہوں وہ انتظام کرو اور تم خود بھی سید صاحب کے بنگلہ پر جا کر ان سے ملاقات کرو''۔[۲۹]

کلارک کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کلکتہ میں ایک بنگلہ میں وہ رہتے تھے۔ اس سلسلے میں نواب آغا مرزا صاحب آگے تحریر کرتے ہیں کہ:

''میں سید صاحب کی ملاقات کو گیا سید صاحب نے صاحب لوگوں کی طرح اول مجھ کو برآمدے میں منتظر رکھا۔ اس کے بعد اندر بلایا اور صاحب بہادر کی طرح دو تین منٹ ملاقات کر کے رخصت کر دیا''۔[۳۰]

گو کہ نواب آغا مرزا صاحب نے مندرجہ بالا بیان سر سید کی مخالفت میں لکھا ہے۔ لیکن اس سے کم از کم یہ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ کلکتہ میں سر سید کی رہائش کس نوع کی تھی۔

سر سید نے اپنے ایک خط مورخہ ۲۹ر جنوری ۱۸۸۲ء بنام سید حامد از کلکتہ میں اپنا پتہ ۲۵۔ تھیٹر روڈ، کلکتہ درج کیا تھا۔ غالباً یہ بھی ایک عارضی پتہ تھا۔ اس خط کے سلسلے کی تفصیل درج ذیل ہے۔

سر سید کے خط بنام سید حامد کی تفصیل:

سر سید نے ۲۹ر جنوری ۱۸۸۲ء کو جو خط سید حامد کے نام ۲۵۔ تھیٹر روڈ، کلکتہ سے لکھا تھا وہ ڈاکٹر نسرین بصیر کے مرتب کیے ہوئے 'خطوط سر سید' میں شائع ہوا تھا۔ لیکن اس پر غلطی سے تاریخ ۲۹ر جنوری ۱۸۹۲ء شائع ہو گئی تھی۔[۳۱] جس کی وجہ سے راقم کو خاصی دشواری پیش آئی تھی۔ کیوں کہ ۱۸۹۲ء میں سر سید کلکتہ میں موجود نہیں تھے۔ (اسی وجہ سے خط کی تاریخ مشکوک نظر آئی) اصل مخطوطہ میں موجود خط سے موازنہ کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ صریحاً کتابت کی غلطی تھی۔ اس خط کے متن اور اس کے جواب (یا ردِ عمل) کے بطور سید حامد کے

(دہلی) لکھے خط پر موجود تاریخ سے بھی یہ وضاحت ہو جاتی ہے کہ یہ دونوں خطوط ۱۸۸۲ء ہی میں لکھے گئے تھے قارئین کی دلچسپی کے لیے ہم ان خطوط کو ذیل میں درج کر رہے ہیں۔

ا۔ سرسید کا خط بنام سید حامد از کلکتہ

''۲۵۔ تھیٹر روڈ، کلکتہ

عزیز از جان حامد

آج دہلی سے خط آیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری طبیعت زیادہ علیل ہے۔ فی الفور تم اپنا مفصل حال لکھو کہ طبیعت کا کیا حال ہے۔ اگر ضرورت ہے۔ بیماری ہے رخصت لو، ڈاکٹر کے سٹیفکیٹ پر رخصت لو۔ بہر حال مفصل حال لکھو اور صحت (و) طبیعت کا مفصل حال لکھو۔ والسلام

خاکسار سید احمد

کلکتہ ۲۹ رجنوری ۱۸۸۲ء''۔۳۲

(نوٹ: 'خطوط سرسید' میں اس خط کی تاریخ ۲۹ رجنوری ۱۸۹۲ء درج ہے۔ جو صریحاً کتابت کی غلطی ہے)

مندرجہ بالا خط کے ردِ عمل کے بطور سید حامد نے پیلی بھیت سے احمد الدین صاحب کو مندرجہ ذیل خط دہلی لکھا تھا جس پر ۲ رفروری ۱۸۸۲ء کی تاریخ درج ہے۔ (حالاں کہ یہ خط ۲ رجنوری ۱۸۸۲ء کو لکھا گیا تھا لیکن ۲ رجنوری کے بجائے ۲ رفروری تحریر کر دینا ایک عام سی غلطی ہے۔ جو عموماً ہوتی رہتی ہے) لیکن اس خط میں سنہ صحیح درج کیا گیا ہے۔ سید حامد کا یہ خط نسرین بصیر کی مرتب کردہ 'خطوط سرسید' میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ اس لیے ابھی تک غیر شائع شدہ ہے۔

کیمپ پیلی بھیت

۲ رجنوری ۱۸۸۲ء

بھائی احمد الدین

لیجیے یہ کیا بات ہے۔ کون زیادہ علیل ہے۔ بے فائدہ کی فکر محض خیالی باتیں ہیں۔ اور قدرا اگر طبیعت علیل ہو (بھی) جاوے تو اس کو بڑھانا

کیا فائدہ۔ معلوم نہیں کہ کس نے ابا جانی صاحب قبلہ کعبہ کو لکھا یقین
ہے کہ جناب آپا خانصاحبہ نے لکھا ہوگا۔ اونہی کو وہم زیادہ ہوا کرتا
ہے۔ میں بالکل اچھا ہوں، اور محمد میر کے پاس سے جواب آیا تو دس
بارہ دن میں دہلی آتا ہوں۔ آپ کا خط مدت سے نہیں آیا۔ وہاں کے
حالات تحریر کرو۔ باقی سب خیریت ہے۔ فقط خاکسار، سید حامد
دو ایک دن میں روانہ روپیہ کرتا ہوں۔ ۳۳؎

شملے اور نینی تال میں سر سید کی رہائش:

کونسل کی ممبری کے دوران گرمیوں کے موسم میں سر سید کئی کئی مہینوں تک شملے میں مقیم رہتے تھے۔ شملے سے لکھے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ شملہ پارک ہوٹل میں ہی قیام کرتے تھے۔ ہمیں سر سید کے ایک خط سے اس طرح کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں بھی ان کے پاس ایک مکان یا کاٹج تھا جو شملہ پارک ہوٹل کے احاطہ میں واقع تھا وہ اپنے اس خط میں حالی کو لکھتے ہیں کہ وہ اپنے شملے آنے کی ان کو پیشگی اطلاع دے دیں تاکہ وہ اپنا نوکر اور سواری ان کو لینے کے لیے بھیج دیں۔ ''ورنہ میرے مکان تک آنے میں نہایت تکلیف ہوگی''۔ چوں کہ یہاں انھوں نے لفظ 'مکان' کا استعمال کیا ہے اسی وجہ سے ہم کو خیال آیا کہ وہ شملہ پارک ہوٹل کے کسی ایک یا دو کمروں میں نہ رہ کر کسی ایسی جگہ رہتے تھے جسے 'مکان' کہا جا سکتا تھا۔ نینی تال میں بیشتر ان کا قیام 'بٹرس کیسل' (Buttres Castle) میں رہتا تھا۔ نینی تال میں راجہ جے کشن داس صاحب کی ایک کوٹھی موجود تھی۔ (ہوسکتا ہے ''بٹرس کیسل'' اسی کوٹھی کا نام ہو) جس میں ایک حصہ ہمیشہ سر سید کے قیام کے لیے وقف رہتا تھا۔ جس کو وہ جس طرح چاہتے تھے اپنی مرضی سے استعمال کرتے تھے۔ اس سلسلے میں شہادت کے بطور سر سید کا خط بنام مولوی زین العابدین مورخہ ۷ رمئی ۱۸۸۹ء پیش کیا جا سکتا ہے جس میں سر سید تحریر کرتے ہیں کہ:

''تمہارا خط پہنچا۔ میرا نینی تال جانا چند کاموں کے انجام پر موقوف ہے۔ جو ٹھیک معلوم نہیں کہ کب انجام ہوں گے۔ تم اپنا وقت کیوں ذائع کرتے ہو۔ راجہ صاحب کا مکان موجود ہے۔ جو کمرے میرے متعلق ہیں ان میں تو راجہ صاحب کو بھی مداخلت کا اختیار نہیں ہے۔

پس فی الفور مع زین الدین چلے جاؤ۔ تمہاری بیماری سے میں سخت پریشان ومتردد ہوں''۔۳۴؎

سرسید جب شملے یا نینی تال میں ہوتے تھے تو ان کے مہمان بھی ان کے ساتھ وہاں پہنچتے رہتے تھے اس سلسلے میں مولانا شبلی نعمانی کا خط، اپنے والد شیخ حبیب اللہ صاحب کے نام ملاحظہ کیجیے جو مورخہ ۲۵ رمئی ۱۸۸۷ء کو نینی تال سے لکھا گیا تھا۔

''جس کوٹھی میں میں ہوں بہت بلندی پر نہیں ہے تاہم دو دن کی مشق میں نیچے تک پہنچنے اور واپس آنے میں میرا دم ٹوٹ جاتا ہے اور کئی جگہ ٹھہرنا پڑتا ہے۔ جس کوٹھی میں میں ہوں سید صاحب کے حقیقی بھتیجے بھی مع اہل وعیال کے تشریف فرما ہیں اور مجھ کو بھی مشکل سے جگہ ملی۔ یقیناً اگر میاں محمد آتے تو نہایت تکلیف اور سید صاحب پر بار ہوتا۔ میرا پتہ یہ ہے:
نینی تال کوٹھی نمبر ۱۶۰، ایڈونیسٹو ایار پاٹا فرودگاہ سید احمد خاں۔۳۵؎

بہر حال مولانا شبلی نعمانی کے اس خط سے نینی تال میں 'بٹرس کیسل' کے علاوہ سرسید کے ایک دوسرے پتہ کا بھی علم ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ کوٹھی سرسید نے اپنے بھتیجے خان بہادر سید محمد احمد خاں صاحب اور دوسرے مہمانوں کی رہائش کے لیے عارضی طور پر کرایہ پر لے لی ہو۔

سرسید اور شملے کی مسافرت:

سرسید کے زمانے میں شملہ جانے کے لیے ریل اور بس کی سہولیات موجود نہیں تھیں کیوں کہ ہماری اطلاع کے مطابق شملے کے لیے ریل کی آمد ورفت ۱۹۱۲ء کے آس پاس شروع ہوئی تھی۔ مجھے تجسس تھا تو صرف اس لیے کہ ریل اور بس کی سہولیات کی غیر موجودگی میں سرسید ساٹھ سال کی عمر میں کس طرح شملہ تک کا سفر طے کیا کرتے تھے۔ میں نے مختلف ذرائع سے اس سلسلے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن پھر خود سرسید ہی کے ایک خط سے مجھے اس زمانے میں موجود ''ٹونگہ سروس'' کے بارے میں معلومات حاصل ہوئی۔ سرسید اپنے خط بنام خواجہ الطاف حسین حالی، مورخہ ۱۶ راگست ۱۸۷۹ء میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''شملہ میں میرے لیے اس سے بڑھ کر کون سی نعمت ہوسکتی ہے کہ چند روز آپ کی صحبت رہے۔ میرا رمضان سچ مچ عید ہوجاوے گا۔ آپ بلاتعمل تشریف لائیں۔ مکان، دل، آنکھیں سب حاضر ہیں۔ موسم یہاں کا اچھا ہے اتفاقیہ علالت دوسری چیز ہے۔ معمولی بیماری کا ہر جگہ ہونا لازمی ہے۔ سردی بہت نہیں ہے۔ نہایت ملائم ٹھنڈک ہے۔ بارش اکثر ہوتی ہے۔ جو کسی قدر ناگوار ہے۔ آپ تشریف لائیے۔ میری دانست میں کچھ نقصان اور مضرت سردی کے سبب متصور نہیں ہے۔ لیکن تین امر کا خیال ہے۔ اول یہ کہ جب آپ کالکا سے چلیے اگرچہ ٹونگہ چھتری دار ہوگا تو بھی ایسا سامان جو بارش سے محفوظ رکھے ضرور ساتھ ہو۔ دوسرے کالکا سے قبل روانگی تار برقی میرے پاس پیشتر روانگی از کالکا بھیج دیجیے گا۔ تاکہ میں اس مقام پر جہاں تک ٹونگہ آتا ہے اپنا نوکر اور جھپان بھیج دوں گا ورنہ میرے مکان تک آنے میں نہایت تکلیف ہوگی۔ تیسرے کالکا سے تانگہ پر نہ آیئے گا۔ ٹونگہ میں آیئے گا۔ جس میں دو ٹٹو ہوتے ہیں۔ انبالہ سے ڈاک والے سے بندوبست ہوجاتا ہے۔ ساڑھے نو روپیہ میں شملہ تک پہنچادیتا ہے۔ انبالہ سے ڈاک گاڑی اور کالکا سے ٹونگہ۔ اگر ارادہ شریف مصمم ہوگیا ہو تو اس عریضہ کا جواب فوراً ارقام فرمایئے گا۔

والسلام

خاکسار سید احمد، شملہ پارک ہوٹل

۱۶/اگست ۱۸۷۹ء ۳۶

غرض اس خط سے ہمیں معلوم ہوا کہ کالکا سے شملے تک کا سفر ٹونگہ نامی دو گھوڑوں کی بگھی (یا گاڑی) میں طے کیا جاتا تھا۔ 'ٹونگہ' اور 'تانگہ' میں نمایاں فرق یہ تھا کہ ٹونگے میں دو گھوڑے جوتے جاتے تھے لیکن تانگے میں ایک ہی گھوڑا ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ٹونگہ میں سفر کرنے والے مسافروں کے لیے راستے میں قیام اور طعام کا عمدہ انتظام بھی موجود رہتا ہوگا۔ جہاں گھوڑوں کو بھی تازہ دم کیا جاتا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ مقررہ فاصلہ طے کرنے کے بعد گھوڑوں کو بدلے جانے کا انتظام کیا جاتا ہو۔ بار برداری و نقل و حمل کا یہ انتظام نہایت اعلیٰ

درجہ کا ہوتا ہوگا۔ کیوں کہ گرمیوں میں وائسرائے خود اوران کا پورا اسٹاف اسی ''ٹونگہ سروس'' کے ذریعہ ہی کالکا سے شملے تک کا سفر طے کیا کرتے تھے۔ غالباً ٹونگہ سروس کا ٹھیکہ دیا جاتا تھا اوراس کے عمدہ نظم ونسق کوقائم رکھنے پرکڑی نظر رکھی جاتی تھی۔ عرصہ ہوا مجھے پروفیسر جمال خواجہ صاحب نے برسر تذکرہ بتلایا تھا کہ وہ ایک ایسے صاحب کو جانتے ہیں جن کے دادا کے پاس ٹونگہ سروس کا ٹھیکہ ہوا کرتا تھا۔

موسم کے سلسلے میں سرسید کی ترجیحات:

جہاں تک سرسید کا تعلق ہے وہ گرمیوں کے بجائے موسم سرما کوترجیح دیتے تھے۔ موسم گرما میں مئی جون کی خشک گرمی ان کواتنی ناگوار نہیں گزرتی تھی جتنی برسات کے زمانے کی ''امس'' کی گرمی۔ کیوں کہ مئی جون کی خشک گرمی میں خس کی ٹٹیاں لگا کر گھر کے اندر کا درجۂ حرارت بآسانی کم کیا جا سکتا ہے۔ نیز کمروں میں موجود بڑے بڑے فرشی پنکھوں کی ہوا کافی راحت بخشتی ہے۔ لیکن برسات کے موسم میں یعنی اگست، ستمبر اوراکتوبر کے مہینوں میں جب مرطوب ہوا کے ساتھ امس کی گرمی یا حبس ہوتا تھا اس سے سرسید بہت پریشان رہتے تھے۔ اسی لیے گرمیوں میں جب وہ پہاڑ پر جاتے تھے تو اکثر برسات کے مہینے وہیں گزارنے کے بعد ہی علی گڑھ واپس آنا پسند کرتے تھے۔ حالاں کہ عام طور پر موسم گرما میں پہاڑوں پر جانے والے لوگ برسات شروع ہونے کے بعد واپس میدانوں میں اتر آتے ہیں۔ لیکن سرسید برسات کے موسم میں علی گڑھ میں کافی پریشان رہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اسی موسم میں سب سے زیادہ بیماریاں پھیلتی ہیں۔ ان کی خواہش تھی کہ کالج کی جو چھٹیاں مئی، جون اور جولائی کے مہینوں میں ہوتی ہیں وہ بھی اگست ستمبر اوراکتوبر کے دوران ہوا کریں تو بہتر ہے۔ ویسے عام طور پر گرمی کے موسم میں بیمار ہو جانے کا تذکرہ ان کے اکثر خطوط میں ملتا ہے۔ مثلاً وہ اپنے خط بنام سید ممتاز علی، مورخہ ۲رمئی ۱۸۸۱ء میں علی گڑھ سے تحریر کرتے ہیں کہ:

> ''میں فضل الٰہی سے بخیریت ہوں۔ گرمی کے موسم میں حسب معمول میری طبیعت کسی قدر علیل ہو جاتی ہے۔ ویسے ہی اس گرمی میں بھی ہوئی۔ مگر کوئی خاص علالت نہیں ہے معمولی بات ہے۔ آپ کے ملنے کو نہایت دل چاہتا ہے''۔۳۷

سرسید اور علاج ومعالجہ:

سرسید چوں کہ خود حکمت میں شد بد رکھتے تھے اور مطب بھی کر چکے تھے نیز ہومیو پیتھک طریقہ علاج سے بھی خاص شغف تھا۔ اس لیے اپنی چھوٹی موٹی بیماریوں کا علاج خود ہی تجویز کر لیتے تھے۔ لیکن اپنی صحت کے سلسلے میں انگریز ڈاکٹروں سے ہمیشہ مشورہ کرتے رہتے تھے۔ علی گڑھ میں رہائش کے ابتدائی زمانے میں وہ ڈاکٹر کلکلی سے رجوع کیا کرتے تھے۔ جو ان کے ذاتی دوستوں میں شمار کیے جاتے تھے اور علی گڑھ میں سول سرجن کے بطور تعینات تھے۔ انہیں کے ساتھ ڈاکٹر کلارک اور ڈاکٹر جیمس آر جیکسن (دونوں علی گڑھ میں سول سرجن رہے تھے) سے بھی ان کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ ۱۸۸۵ء میں علی گڑھ کے سول سرجن ڈاکٹر ایلس تو سرسید کے پڑوسی تھے کیوں کہ انھوں نے سرسید کی ایما پر سرسید ہاؤس کی مغربی باؤنڈری سے ملحق کالج کے بنگلے موسومہ ''بنگلہ خورد'' میں کرایہ پر رہائش اختیار کی تھی۔ علاج کے سلسلے میں وہ ڈاکٹروں سے مشورہ کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ ویسے دیکھا یہ گیا ہے کہ علی گڑھ میں موجود انگریز ڈاکٹروں، خاص طور پر سول سرجنوں سے سرسید کے تعلقات ہمیشہ استوار رہے تھے۔

ہمارا ایک جزوی مشاہدہ یہ بھی ہے کہ علاج کے مشوروں کے بطور سرسید اکثر صوفی سنتوں کو بھی ٹٹولتے رہتے تھے۔ ایک انگریز بنام کرنل الکٹ جو تھیاسوفیکل سوسائٹی کے بانی تھے نومبر ۱۸۸۳ء میں علی گڑھ آئے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کی روحانیت اور وجدانی کمالات کا انگریزوں کے حلقوں میں کافی چرچا تھا۔ سرسید کے کان تک بھی ان کی یہ شہرت پہنچی تھی۔ سرسید نے اپنے خط مورخہ نومبر ۱۸۸۳ء کے ذریعہ اپنی رسولی کے علاج کے سلسلے میں کرنل الکٹ سے اس طرح رجوع کیا تھا:

> ''میرے گلے میں ایک رسولی ہے۔ اور اسی جگہ پر میرے والد کے گلے میں بھی رسولی تھی۔ میں نے سنا ہے کہ ایک مسلمان درویش کی توجہ سے وہ رسولی بالکل سلب ہوگئی تھی پس اگر آپ بھی از راہ مہربانی اپنی توجہ سے میری رسولی ختم کر دیں تو میں آپ کی خدمت میں جب آپ ارشاد فرمائیں حاضر ہو جاؤں''۔ [۳۸]

معلوم نہیں کرنل الکٹ نے اس سلسلے میں کیا جواب دیا تھا۔ لیکن اس خط کی رسید کے بطور کرنل الکٹ کے سکریٹری مسٹر دامودر، کے ماوالنکار نے مورخہ ۱۲ر نومبر ۱۸۸۳ء کو سرسید کو مطلع کیا تھا کہ ''کرنل الکٹ نے مجھ کو ہدایت کی ہے کہ میں آپ کی چھٹی کا شکریہ ادا کروں''۔

سرسید کی علی گڑھ میں مصروفیات:

جنوری ۱۸۷۸ء سے مدرستہ العلوم میں ایف، اے کی کلاسیں کھل گئی تھیں جس کی شہادت علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۱۷ر نومبر ۱۸۷۷ء میں موجود مندرجہ ذیل اشتہار سے فراہم ہوتی ہے۔

اشتہار

''جو کہ مدرستہ العلوم مسلمانانِ واقع علی گڑھ میں جنوری ۱۸۷۸ء سے ایف اے کلاس کھلنے والے ہیں اس لیے ایک پروفیسر کی جس نے کلکتہ یونیورسٹی کا امتحان ایم اے میتھمیٹکس میں پاس کیا ہو درکار ہے اس عہدہ کے امیدواروں کو پندرہ دسمبر ۱۸۷۷ء تک راقم کے پاس درخواستیں بھیجنی چاہئیں۔ تنخواہ ودیگر امور کی نسبت جو اس سے متعلق ہوں راقم سے خط وکتابت کرنی چاہیے''۔

سید احمد سکریٹری کمیٹی منتظم مدرستہ العلوم ۳۹

غرض یکم جنوری ۱۸۷۸ء سے ایم اے او کالج میں باقاعدہ کالج کے کلاسوں کی تعلیم شروع ہو جانے کے بعد سرسید کو کالج کے لیے عمارتیں تعمیر کرانے کے کام کو جلد از جلد شروع کرنے کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ اس وقت تک اسکول کی کلاسیں دو پھوس کے بنگلوں میں قائم تھیں۔ انگلش میڈیم اسکول کی کلاسیں کولن کے بنگلہ نمبر ۲ میں ہوتی تھیں (جو آج کل پرانے گیسٹ ہاؤس کے نام سے جانا جاتا ہے) اور اردو میڈیم اسکول کی کلاسیں (جو ۱۸۷۶ء میں شروع ہو گئی تھیں) پرانے گیسٹ ہاؤس والے بنگلے کے سامنے سڑک کی دوسری طرف موجود ایک بڑے پھوس کے بنگلے میں قائم کی گئی تھیں۔ (یہ بنگلہ فلر ہوس کے نام سے موسوم ہوا تھا۔ اب منہدم ہو چکا ہے)۔ اس بنگلہ کو سب سے پہلے ۱۸۷۵ء میں انگریز ہیڈ ماسٹر مسٹر سڈنس کی رہائش کے لیے کالج نے کرایہ پر لیا تھا لیکن جب ۱۸۷۶ء میں اس میں اردو میڈیم اسکول کی کلاسیں قائم کرنے کی تجویز ہوئی تو سرسید نے سڈنس صاحب کی

رہائش کے لیے (غالباً) بنگلہ خورد کرایہ پر لے کر انہیں اس میں منتقل کر دیا تھا اور فلر ہاؤس میں اردو میڈیم کلاسیں قائم کی گئی تھیں۔ یہ ایک بہت بڑا پھوس کا بنگلہ تھا۔ جگہ کی قلت کی وجہ سے جب یکم جنوری ۱۸۷۸ء میں کالج کی ایف اے کی کلاسیں جاری کی گئیں تو ان کے لیے بھی اسی بنگلہ میں (اسکول کی اردو میڈیم کلاسوں کے ساتھ ہی) جگہ فراہم کی گئی تھی۔ کچھ ہی عرصہ بعد سرسید نے کالج کی کلاسوں کے لیے ایک اور کوٹھی خرید لی تھی۔ جس میں کالج کی انگلش میڈیم کی کلاسیں منتقل کر دی گئی تھیں۔ لیکن کالج کی اردو میڈیم کی کلاسیں بدستور 'فلر ہاؤس' میں جاری رہی تھیں۔ راقم کی کتاب 'سرسید اور فن تعمیر' میں سرسید کی ان کاوشوں کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے جو انھوں نے کالج کی عمارتوں کی تعمیر کے سلسلے میں کی تھیں۔
اس سلسلے میں کالج کی عمارتوں کے ترمیم شدہ نقشوں کے لیے گورنمنٹ کی منظوری حاصل کرنے کے سلسلے میں انہیں کافی انتظار کرنا پڑا تھا۔ لیکن ۱۸۷۸ء میں سرسید کے وائسرائے کی کونسل کے ممبر نامزد ہونے کے بعد اتنا فائدہ ضرور ہوا تھا کہ یہ نقشے گورنمنٹ کی منظوری کے ساتھ ۱۸۷۸ء کے اواخر تک سرسید کو موصول ہو گئے تھے اور اس طرح جنوری ۱۸۷۹ء میں کالج کی اصل عمارتوں کی تعمیر کے اہم کام کی ابتدا ممکن ہو سکی تھی حالاں کہ اس وقت سرسید خود کلکتے میں موجود تھے۔ علی گڑھ میں کالج کی عمارتوں کی تعمیر کی ابتدا بڑے پیمانے پر علی گڑھ ڈسٹرکٹ کے انگریز انجینئر کی نگرانی اور دیکھ ریکھ میں ہوئی تھی جن کو کالج فنڈ کمیٹی نے اپنے اجلاس منعقدہ ۲۹ر جولائی ۱۸۷۷ء میں کالج کی عمارتوں کی تعمیر کو عمدگی سے انجام دینے کے لیے مندرجہ ذیل اختیارات دیئے تھے۔

دفعہ ۲۔ ضمن ۱: صاحب ڈسٹرکٹ انجینئر اس بات کے ذمہ دار ہوں گے کہ مکان کی تعمیر نقشہ کے بموجب ہو۔ مگر تجویز مکان کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔

دفعہ ۲۔ ضمن ۲: نقشہ یا اسپیسی فیکیشن میں اجرائے کام کے وقت بلا استفسار کالج کمیٹی یا ان کے قائم مقاموں کے کوئی تبدیلی نہیں کرنی چاہیے۔

دفعہ ۲۔ ضمن ۳: ڈسٹرکٹ انجینئر کو مفصلہ ذیل امور میں کامل اختیارات ہوں گے۔

(۱) موقوف کرنا یا سزا دینا خراب کاریگروں کو۔

(۲) توڑ ڈالنا خراب تعمیر کا۔

(۳) خراب مصالحہ کو پھکوا دیئے جانے کا حکم دینا۔

(۴) چونے کے موقع تعمیر پر پھونکے جانے کا حکم دینا تا کہ بخوبی صاف

کیا جاوے اور تازہ استعمال میں آوے۔

دفعہ ۲۔ ضمن ۴: صاحب ڈسٹرکٹ انجینئر کو اپنے حکم کی تعمیل کرانے کے واسطے جرمانہ وسزا موقوفی کے حکم دینے کا اختیار کامل ہوگا۔[۴۰]

یہاں ضمناً تعمیر کا تذکرہ ''مطالعات سرسید'' کے ان ماہر محققوں کی اطلاع کے لیے کیا گیا ہے جنھوں نے اس سلسلے میں قیاسی مبالغہ آرائی کے ریکارڈ بنانے کی کوشش کی ہے۔

ایک صاحب تحریر کرتے ہیں کہ:

''وہ (یعنی سرسید) خود صبح سویرے عمارتوں کی داغ بیل ڈلواتے تھے۔ بنیادیں کھدواتے تھے۔ معماروں اور سنگ تراشوں کو دن بھر دھوپ میں کھڑے ہوکر ہدایات دیتے تھے اور شام کو مزدوری بھی خود تقسیم کرتے تھے۔''

ایک دوسرے جید محقق تحریر کرتے ہیں کہ:

''سرسید مئی جون کی تپتی ہوئی دوپہر میں جب سوا نیزے پر آفتاب ہوتا تعمیرات کا خود معائنہ کرتے اور تعمیرات کی ایک ایک جزیات کی بیک وقت نگرانی کرتے اور کام کرنے والوں کو تیزی سے کام پر بڑھائے جاتے۔ کبھی کبھی ان پر وہ اضطرابی کیفیت طاری ہوتی کہ جب تک معماروں کے ساتھ پتھر نہ اٹھواتے انہیں چین نہ آتا''۔[۴۱]

ہمارے خیال میں سرسید کے عقیدت مندوں کی اسی طرح کی قیاسی مبالغہ آرائی کی حامل تحریروں ہی نے سرسید کی اصل شخصیت کو بہت حد تک مسخ کرنے میں معاونت کی ہے۔ حالاں کہ جب کالج کی اصل عمارتوں کی تعمیر کے کام کی بڑے پیمانے پر ابتدا ہوئی تھی اس وقت سرسید کلکتہ میں قیام پذیر تھے۔ لیکن یہ ان کی تنظیمی صلاحیت ہی تھی کہ جس کی وجہ سے ان کی علی گڑھ میں غیر موجودگی کے باوجود ہر کام نہایت باقاعدگی اور خوش اسلوبی سے انجام پارہا تھا۔

سرسید سے سمیع اللہ خاں صاحب کی رقابت و رفاقت:

اگست ۱۸۷۶ء میں جب سرسید مستقل سکونت کے ارادے سے بنارس سے علی گڑھ منتقل ہوئے تھے۔ اس وقت علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم (کے ابتدائی اسکول) اور سائنٹفک سوسائٹی کے کل اختیارات سمیع اللہ خاں صاحب کے ہاتھوں میں مرکوز تھے۔ سرسید کے علی

گڑھ آنے کے تقریباً ایک سال بعد یعنی جون ۱۸۷۷ء میں جب سمیع اللہ خاں صاحب کا تبادلہ مراد آباد ہو گیا تھا اس وقت مجبوراً سمیع اللہ خاں صاحب کو یہ اختیارات سرسید کو منتقل کرنا پڑے تھے۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ سمیع اللہ خاں صاحب اور سرسید کے درمیان ایک عجیب قسم کی رقابت اور رفاقت کا رشتہ نظر آتا ہے۔ سمیع اللہ خاں صاحب سرسید پر تنقیدی نظر بھی رکھتے تھے اور ان کی تقلید بھی کرتے تھے۔ ان کی تنقید سرسید کی اصلاح کے لیے کم اور اپنا استحقاق ثابت کرنے کے لیے زیادہ ہوتی تھی۔ دوسری طرف وہ اپنے کیریئر اور اپنی ذاتی ترقی و نشو و نما کے لیے سرسید کی تقلید کرتے تھے اور ان کے قدموں پر قدم رکھ کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ سمیع اللہ خاں صاحب نے بھی سرسید ہی کی طرح اپنے لیے عدلیہ کی سروس کا انتخاب کیا تھا۔ وہ بھی عوامی فلاح و بہبود کے کام کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کی بھی انگریز افسروں سے اچھی رسم و راہ تھی۔ انھوں نے بھی اپنے صاحبزادے (حمید اللہ خاں صاحب) کو انگلستان میں تعلیم دلوانے کا فیصلہ کیا تھا اور سرسید ہی کی طرح وہ خود بھی اپنے صاحبزادے کے ساتھ انگلستان تشریف لے گئے تھے۔ (ہماری اطلاع کے مطابق سمیع اللہ خاں صاحب ۱۶/اپریل ۱۸۸۰ء کو تین طالب علموں کے ساتھ بطورِ سرپرست انگلستان روانہ ہوئے تھے اور چھ مہینے انگلینڈ میں رہنے کے بعد ۲۱/نومبر ۱۸۸۰ء کو واپس علی گڑھ پہنچے تھے۔ جہاں ہوسٹل کے ایک جلسہ میں ان کا انگلستان کے سفر سے بخیر و عافیت واپس تشریف لانے کے سلسلے میں خیر مقدم کیا گیا تھا)۔ سرسید ہی کی طرح سمیع اللہ خاں صاحب نے بھی انگلستان کے سفر کے متعلق ایک سفرنامہ تحریر کیا تھا۔ لیکن ہمیں یہ کہنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ سمیع اللہ خاں صاحب کے ان سب تقلیدی امور میں آمد کم اور آورد زیادہ نظر آتی ہے۔ انگلستان سے واپس آنے کے بعد بھی سمیع اللہ خاں صاحب مراد آباد ہی میں تعینات رہے تھے۔ ۱۸۸۱ء میں ان کا تبادلہ دوبارہ علی گڑھ ہو گیا تھا جہاں وہ ۱۸۸۵ء تک مقیم رہے تھے۔ اب سمیع اللہ خاں صاحب کو کالج کے معاملات میں وہ اختیارات حاصل نہیں تھے جو پہلے نہ صرف انہیں حاصل تھے بلکہ جن کے وہ عادی ہو گئے تھے اور اسی لیے انہیں دوبارہ حاصل کرنے کے متمنی بھی تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سرسید کی سیاسی اور سماجی حیثیت اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ جس کی اب تقلید کرنا بھی کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں تھی۔ اسی وجہ سے ۱۸۸۲ء کے بعد سمیع اللہ خاں صاحب کے ترکش میں سرسید کے لیے صرف تنقید کے تیر ہی باقی رہ گئے تھے وہ بھی سرسید پر اب سامنے سے استعمال نہیں کیے

جا سکتے تھے۔ بلکہ اپنے چند ہم خیال لوگوں کے درمیان غیبت کے زہر میں بجھا کر چلائے جاتے تھے۔ جس کی وجہ سے رقابت کا لاوا اب ان کے اندر ہی اندر سلگتا رہتا تھا۔ جو اسی کی دہائی کے اواخر میں ایسا پھوٹا کہ ذاتی تعلقات تک ہمیشہ کے لیے منقطع ہو گئے تھے۔

سمیع اللہ خاں صاحب کے صاحبزادے حمید اللہ خاں صاحب مدرسۃ العلوم کے ان چند طالب علموں میں سے ایک تھے جن کا سب سے پہلے اس اسکول میں داخلہ ہوا تھا۔ سرسید کے نواسے سید محمد علی ان کے ہم جماعت تھے جن سے حمید اللہ خاں صاحب کی اسکول ہی کے زمانے سے دوستی تھی۔ حمید اللہ خاں صاحب کا سرسید ہاؤس میں آنا جانا تھا۔ وہ اپنی اکثر شامیں سید محمد علی کے ساتھ سرسید ہاؤس میں ٹینس کھیلنے میں گزارتے تھے۔ حمید اللہ خاں سرسید کی اپنے خاندان کے ایک بزرگ کی طرح ہی عزت کرتے تھے اور ہمیشہ سرسید کو گھر کے دوسرے افراد کی طرح 'سرکار' ہی کہا کرتے تھے۔ جب ۱۸۸۶ء میں حمید اللہ خاں انگلستان سے قانون کی پڑھائی مکمل کر کے واپس آئے تو ان کی خوب آؤ بھگت کی گئی۔ سمیع اللہ خاں صاحب نے بیٹے کی آمد پر ایک پُر تکلف دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ سرسید نے اعلان کیا کہ مدرسۃ العلوم کے پہلے طالب علم کی انگلستان میں تعلیم مکمل کر کے واپس آنے کی خوشی میں کالج کی عمارت میں اسٹریچی ہال کے مشرق میں تعمیر کیا جانے والا کلاس روم ان کے نام سے موسوم کیا جائے گا اور ''حمید اللہ خاں لیکچر روم'' کہلائے گا۔ اس کے لیے انھوں نے اسی وقت چندہ بھی کھول دیا تھا۔ سمیع اللہ خاں صاحب نے بیٹے کی انگلستان سے کامیابی کے ساتھ واپسی کے سلسلے میں جس دعوت کا اہتمام کیا تھا اس کا حال حمید اللہ خاں صاحب نے اپنی ڈائری میں اس طرح لکھا تھا:

> ''۳۰/ اکتوبر کو ایک بڑی دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا، جس میں ہندوستانی دوستوں کے لیے گھر کے قریب ہی ایک نہایت کشادہ شامیانے میں دسترخوان بچھا کر کھانا کھلانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ انگریزوں اور ان ہندوستانیوں کے لیے جن کو انگریزوں کے ساتھ ایک ہی میز پر بیٹھ کر کھانا نوش فرمانے میں کوئی اعتراض نہ تھا، انگلش ڈنر کا اہتمام انسٹی ٹیوٹ کے ہال میں کیا گیا تھا۔ ہندو دوستوں کے لیے ایک علیحدہ شامیانے میں کھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ یہ شامیانہ سرکار کے گھر کے قریب لگایا گیا تھا اور یہاں کھانے کے انتظام کی کل

ذمہ داری راجہ جیکشن داس صاحب کے سپرد کی گئی تھی۔ ہندوستانی ڈنر ساڑے سات بجے شروع ہوا تھا اور انگلش ڈنر ساڑے آٹھ بجے شروع ہوا تھا اس لیے مجھے دونوں میں شمولیت کا موقع مل گیا تھا۔ میں جب ڈنر سے پانچ منٹ پہلے انسٹی ٹیوٹ ہال پہنچا تو مجھے احساس ہوا کہ سرکار (یعنی سرسید) کا موڈ کچھ خراب ہے۔ دراصل میرے والد صاحب اس بات سے متفق نہیں تھے کہ سرکار ڈنر کے دوران اُن لوگوں کے ناموں کا اعلان کریں جنھوں نے میرے انگلستان سے واپس آنے کے سلسلے میں کالج میں بنائے جانے والے ایک لیکچر روم کے لیے چندہ دیا ہے۔ اس سلسلے میں پچھلے چوبیس گھنٹوں سے دونوں کے درمیان تکرار چل رہی تھی اور دونوں ہی اپنے اپنے موقف سے ہٹنے کو تیار نہ تھے۔ بہر حال میں نے کسی طرح والد صاحب کو یہ کہہ کر آمادہ کرلیا کہ وہ (یعنی سرسید) بزرگ ہیں اس لیے جو وہ چاہتے ہیں انہیں کر لینے دیجیے اور اس طرح معاملہ رفع دفع ہوا''۔۴۲

اس واقعے سے جہاں ایک طرف حمید اللہ خاں صاحب کی سمجھ داری اور سلجھی ہوئی طبیعت کی گواہی ملتی ہے وہیں اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ سمیع اللہ خاں صاحب کتنی معمولی معمولی باتوں پر سرسید سے اختلاف روا رکھتے تھے اور کس طرح ہر بات کو اپنی انا کا مسلہ بنا لیتے تھے۔

حمید اللہ خاں ایک ذہین، با اخلاق اور خوش طبع انسان تھے۔ انگلستان سے واپسی کے بعد جتنے عرصے وہ علی گڑھ میں رہے، ان کا زیادہ تر وقت سرسید ہاؤس میں سرسید اور سید محمد علی کے ساتھ گزرتا تھا۔ جس کا اندازہ ان کی ڈائری کے مندرجہ ذیل اندراجات سے لگایا جا سکتا ہے:

''۲ر نومبر (۱۸۸۶ء): میں نے صبح کا ناشتہ سرکار کے ساتھ کیا اور تقریباً پورا دن ان کے ساتھ گزارا''۔۴۳

''۶ر نومبر (۱۸۸۶ء): صبح کا ناشتہ سرکار کے ساتھ کیا اور چوں کہ حامد علی خاں صاحب کی تقریر کے ہندوستانی ترجمہ کی بہت جلدی تھی اسی لیے میں نے ان کے لیے (یعنی سرسید کے لیے) یہ کام انجام دیا''۔۴۴

''۱۶رنومبر (۱۸۸۶ء): آج کا دن میں نے قانون کے مطالعہ میں صرف کیا۔لیکن سہ پہر کو سرکار کے یہاں گیا اور محمد علی کے ساتھ ٹینس کھیلی''۔۴۵

''۱۷رنومبر (۱۸۸۶ء): شام پانچ بجے ٹینس کھیلی اور اس کے ایک گھنٹہ بعد گھر آ کر کھانا کھایا''۔۴۶

حمید اللہ خاں صاحب نے بعد میں نظام کی سرکار میں عدلیہ کی سروس میں رہ کر بہت ترقی کی تھی۔انہیں نواب سر بلند جنگ بہادر کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔ان کی شادی ۱۸۹۴ء میں نواب آغا مرزا بیگ خاں بہادر (سرور جنگ) کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی وہ حیدر آباد منتقل ہو گئے تھے۔نواب آغا مرزا بیگ (سرور جنگ) سمیع اللہ خاں صاحب کے عزیز تھے۔ان کی والدہ سمیع اللہ خاں صاحب کی چچازاد بہن تھیں۔سرور جنگ میر محبوب علی خاں صاحب کے اتالیق تھے اور ایک زمانے میں نظام کی سرکار میں سب سے بااثر اور بااختیار شخص مانے جاتے تھے۔اسّی کی دہائی کے اواخر میں جب سمیع اللہ خاں صاحب سے سرسید کے ذاتی تعلقات تک منقطع ہو گئے تھے اس وقت اس آگ کی تپش حیدر آباد تک بھی پہنچی تھی۔ جہاں نواب آغا مرزا بیگ سرسید کے رفیق محسن الملک کو (اور کسی حد تک وقار الملک کو بھی حالاں کہ وقار الملک سمیع اللہ خاں صاحب کی ماتحتی میں کام کر چکنے کی وجہ سے ان سے ذاتی ربط رکھتے تھے) نیچا دکھلانے پر کمربستہ ہو گئے تھے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ نواب آغا مرزا بیگ صاحب کی وجہ سے ہی ان دونوں حضرات کو ۱۸۹۲ء کے آس پاس، آغا مرزا بیگ صاحب کو رشوت دینے کی کوشش کرنے کے الزام میں نظام سرکار کی ملازمت سے علیحدہ ہونا پڑا تھا۔۴۳ ظاہر ہے کہ اس ماحول نے حمید اللہ خاں صاحب کو بھی متاثر کیا ہو گا اسی لیے نوے کی دہائی میں وہ بھی سرسید سے قطعی لاتعلق ہو گئے تھے۔

سرسید ہاؤس کی عمارت میں توسیع:

جولائی ۱۸۸۰ء میں وائسرائے کی کونسل کی ممبری سے استعفیٰ دینے کے بعد سرسید کالج کے کاموں کی مصروفیات کی وجہ سے علی گڑھ میں زیادہ وقت گزارنے لگے تھے۔اس وقت انہیں اپنے گھر میں جگہ کی کمی کا شدت سے احساس ہونے لگا تھا۔اس گھر میں دو بڑے ہال اور چار بیڈ روم تھے۔سرسید کو اپنے پڑھنے لکھنے، لوگوں سے ملنے جلنے اور اپنے آفس کے

کاموں کوانجام دینے کے لیے جگہ کی قلت محسوس ہوتی تھی۔ ساتھ ہی اس انگریزی طرزِ تعمیر کی عمارت میں مشرقی ماحول میں پروردہ خواتین کی رہائش کے لیے بھی مناسب مکانیت موجود نہیں تھی۔ انہی سب وجوہ کی بنا پر سرسید نے غالباً ۱۸۸۱ء۔۱۸۸۰ء کے درمیان سرسید ہاؤس کی عمارت میں نمایاں توسیع کی تھی۔ جس کی تفصیلات نقشہ میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ (دیکھیے نقشہ نمبر ۲)

سرسید نے اپنی ضروریات کے تحت سرسید ہاؤس کی عمارت کے مغرب میں ایک بڑا ہال (۳۳ فٹ لمبا اور ۲۱ فٹ چوڑا) تعمیر کروایا تھا۔ جس کے چاروں طرف آٹھ فٹ چوڑا برآمدہ تھا۔ یہ ہال ایک طرح سے ان کا ''لیونگ روم'' (یعنی رہائشی کمرا) تھا اور یہی ان کی اسٹڈی اور آفس تھا۔ وہ دن میں سارا کام اسی ہال میں کرتے تھے اور یہیں روز کے آنے جانے والے لوگوں، کالج کے طلبا اور اسٹاف ممبروں نیز اپنے بے تکلف دوستوں سے ملاقات کرتے تھے...... اصل عمارت کے شمال میں دو بڑے کمرے (۱۶ فٹ چوڑے اور ۲۴ فٹ لمبے) خواتین کی رہائش کے لیے تعمیر کروائے گئے تھے۔ جن کے ساتھ چاروں طرف سے محصور ایک کشادہ صحن بھی موجود تھا۔ اور جہاں سے باہر آنے جانے کے لیے ایک علیحدہ دروازہ اور پورٹیکو تعمیر کروایا گیا تھا۔ سرسید نے رہائشی عمارت میں توسیع کے ساتھ ساتھ سرسید ہاؤس کے احاطہ میں موجود کرکٹ فیلڈ کے جنوب میں ایک کشادہ کمرا اور اس کے سامنے ایک سہ دری بھی تعمیر کروائی تھی جس کو ہم ایک طرح سے ان کا ذاتی کرکٹ پویلین کہہ سکتے ہیں لیکن اس کمرے کی تعمیر کا اصل مقصد کھیل کا سامان (خاص طور پر ٹینس کورٹ کے پردے جال اور کرکٹ کے بلے وکٹ وغیرہ) اسٹور کرنے کے لیے جگہ مہیا کروانا تھا۔ یہ سہ دری بعد میں مکتب کے نام سے موسوم ہوئی۔

سرسید ہاؤس کے احاطے کے جنوبی حصہ کے مشرقی کونے میں (جہاں اب پیلی کوٹھی کے نام سے ایک عمارت موجود ہے) مویشیوں کے لیے ایک باڑھ اور گھوڑوں کا اصطبل نیز مالیوں، سائیسوں ودوسرے ملازمین کے لیے شاگرد پیشے کی عمارتیں موجود تھیں۔ ان سب کو ایک احاطہ میں محصور کیا گیا تھا جس کا ایک مشرقی طرز کا بڑا پھاٹک تعمیر کروایا گیا تھا، جو اب بھی موجود ہے۔ سرسید ہاؤس میں موجود باغ اور زرعتی ضروریات وآبپاشی کے لیے کنوؤں سے پانی نکالنے کے لیے کم از کم ایک یا دو جوڑی اچھے بیل رکھنا ضروری تھے۔ ساتھ ہی دودھ دہی کی ضروریات کے تحت ایک دو دودھ دینے والے مویشی بھی موجود رہتے تھے۔ سرسید کی بگھی دو گھوڑوں والی تھی۔ جس کے لیے اکثر ''جوڑی'' کا لفظ

استعمال کیے جانے کے حوالے ملتے ہیں۔ اس لیے ان کے اصطبل میں دو گھوڑے تو ہمیشہ موجود رہتے تھے۔ حالاں کہ نوے کی دہائی میں سید راس مسعود کے لیے دادا نے ایک چھوٹی بگھی علیحدہ سے خرید لی تھی۔ یہ ایک گھوڑے کی بگھی تھی اور راس مسعود کی بگھی کہلاتی تھی۔ اس طرح نوے کی دہائی میں سر سید کے اصطبل میں تین گھوڑے ہمیشہ موجود رہتے تھے۔ ان کے علاوہ اکثر ایسے حوالے بھی ملتے ہیں کہ فرسٹ کلاس بورڈنگ کے طلبا کے ایک دو گھوڑے جگہ کی کمی کی وجہ سے عارضی طور پر سر سید اپنے اصطبل میں رکھے جانے کی اجازت بھی دے دیتے تھے۔ راجہ جیکشن داس صاحب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب وہ سر سید ہاؤس میں آکر مقیم ہوتے تھے تو اکثر اپنا سبز ٹٹو بھی ساتھ لاتے تھے۔ غرض ہم کہہ سکتے ہیں کہ سر سید ہاؤس کے باڑے کے احاطہ میں مویشیوں، گھوڑوں اور ان کی دیکھ بھال کرنے والے ملازمین کی ریل پیل رہتی تھی۔

اسی باڑے کی محصور قطعہ زمین میں ۱۹۰۳ء میں مشرف بیگم صاحبہ نے سید محمود کے انتقال کے بعد اپنی رہائش کے لیے ایک کوٹھی تعمیر کی تھی جو اب بھی موجود ہے اور پیلی کوٹھی کے نام سے جانی جاتی ہے۔

دہلی کے مکان میں توسیع:

جیسا ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ سر سید ضروریات سے فارغ ہونے کے لیے کموڈ کے استعمال کے عادی تھے۔ جس کی وجہ سے انہیں دہلی میں اپنے آبائی مکان میں جا کر رہنے میں خاصی قباحت ہوتی تھی اسی وجہ سے سر سید ہاؤس میں توسیع کے بعد انھوں نے سب سے پہلے اپنی توجہ اس بات پر مرکوز کی کہ دہلی کے مکان میں اپنی ضروریات کے مطابق مناسب ردو بدل اور توسیع کی جائے۔ اس سلسلے میں خاص توجہ اس بات پر دی گئی تھی کہ بیڈ روم سے ملحق ایک عمدہ غسل خانہ (ٹوائیلیٹ) جلد از جلد تعمیر کروالیا جائے جس کی شہادت ۱۸۸۳ء میں سر سید کے حکیم احمد الدین صاحب کو لکھے مندرجہ ذیل خط (مورخہ ۱۸ر ستمبر ۱۸۸۳ء) سے ملتی ہے:

"عزیز حکیم احمد الدین صاحب

تمہارا خط پہنچا، تم نے جو حساب متفرقات اور بابت اخراجات دالان بالا خانہ لکھ کر بھیجا ہے۔ اس سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ جو روپیہ میں نے

تم کو دیا ہے یا تمہارے پاس بھیجوں، اس کو نہ کسی حساب میں دو نہ کسی کام میں خرچ کرو، وہ واسطے تعمیر غسل خانہ وغیرہ بھیجا جاتا ہے اور کسی کام میں ہر گز مت خرچ کرو، نہ کسی حساب میں دو اور صرف تعمیرِ غسل خانہ میں خرچ کرو، جس کے لیے ہی روپیہ دیا جاتا ہے۔ حساب بھیجتے رہو۔ بذریعہ اس خط کے ایک چیک بینک بنگال دہلی بر تعدادی سو روپیہ کی مرسل ہے۔ اس میں سے پچاس روپیہ تو ہمشیرہ صاحبہ کو بابت تنخواہ دو ماہ کے دے دو اور مبلغ پچاس روپیہ واسطے اخراجات تعمیر غسل خانہ وغیرہ تم لے لو۔ اب تمہارے پاس اسّی روپیہ پہنچے اس روپیہ کو بجز خرچ تعمیر غسل خانہ کے اور کسی کام میں صرف نہ کرو اور یہاں سے واپس جا کر غسل خانہ کی تعمیر جب سے تم نے شروع کی ہے پانزدہ (۱۵) روز بعد حساب مد بھیجتے رہو"۔ [۴۸]

اس خط سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید کو غسل خانے کی تعمیر کے سلسلے میں کس قدر عجلت بلکہ حاجت تھی اس غسل خانے کی نوعیت کیسی تھی اور اس میں کموڈ رکھے جانے کا مخصوص اہتمام کس طرح کیا گیا تھا اس کی شہادت ہمیں سرسید کے مندرجہ ذیل خط بنام حکیم احمد الدین، مورخہ ۲۵ ستمبر ۱۸۸۳ء سے ملتی ہے۔

"عزیزی احمد الدین

تمہارا خط اور حساب مد ہفتہ گزشتہ کا پہنچا۔ محراب دار دروازہ جو مکان جدید میں آمد و رفت کا بنے گا اس کے آگے چھجہ سنگین یا اور کسی چیز کے لگانے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے اس فقرہ کا مطلب کے غسل خانہ کی چھت کی بلندی برآمدے کے کمرے کے برابر رہنی چاہیے اور جس کوٹھری میں پاٹ رکھا جاوئے گا اس کی چھت غسل خانہ سے نیچی رکھنی چاہیے۔ بخوبی میں نہ سمجھا مگر جس طرح خواجہ شرف الدین خاں صاحب فرماتے ہیں اس کے مطابق بناؤ۔ انھوں نے بہت سی باتیں زبانی پوچھ لی تھیں جس طرح وہ فرماتے ہیں ٹھیک ہوگا اور جب دیواریں زیادہ بلند ہو جاویں اور ضرورت ہو تو مجھے لکھو کہ میں خود آ کر بتا جاؤں گا۔ شروع ماہ آئندہ میں تم کو مدد کے اور خرچ

کے بھی روپیہ بھیجوں گا''۔۴۹؎

دہلی کے مکان میں ہونے والی تعمیری توسیع اور ردوبدل کے سلسلے میں لکھے گئے سرسید کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید نے وہاں اپنے مکان کے مردانے حصہ میں ایک کشادہ بیڈروم اور اس سے ملحق ایک عمدہ غسل خانہ تعمیر کروایا تھا اور اس تعمیر کے مکمل ہونے کے بعد بیڈروم کو خود اپنی پسند کے مطابق عمدگی سے آراستہ بھی کیا تھا۔ جس کے لیے نواڑ کے پلنگ، عمدہ پردے اور کرسیاں وغیرہ وہ علی گڑھ سے بذریعہ ریل بھیجتے رہے تھے۔ جس کی شہادت سرسید کے مندرجہ ذیل خطوط سے فراہم ہوتی ہے:

(۱) سرسید کا خط بنام احمدی بیگم (جو سرسید کی چہیتی پوتی، یعنی سید حامد کی اکلوتی صاحبزادی تھیں۔ ہمارے اندازے کے مطابق جب یہ خط لکھا گیا ہے اس وقت ان کی عمر گیارہ یا بارہ سال کی ہوگی۔) مورخہ ۲۵/ مارچ ۱۸۸۴ء۔

''عزیز از جان احمدی بیگم

تمہارا خط پہنچا۔ تم نے دو خط بلانے کے لیے بھیجے تھے۔ مگر ہماری بوا صاحب نے کوئی خط نہیں بھیجا نہ بلانے کا پیغام بھیجا اسی لیے میں بھی نہیں آیا۔ اب اس خط میں تم نے ان کی طرف سے بھی بلاوے کا پیغام بھیجا ہے اب میں آؤں گا مگر اس پر ان کے دستخط نہیں ہیں تم نے ان کی طرف سے لکھ دیا ہے یا خود انھوں نے لکھا ہے۔ میں دو پلنگ اور شطرنجیاں کل روانہ کروں گا۔ پلنگوں کو نواڑ سے بنوار کھنا اور اگر گرمی ہو تو باہر کے مکان میں جو سونے کا کمرا ہے اس میں ایک پنکھا بنوا کر لٹکوا رکھنا جب سب چیز تیار ہو جاوے تو مجھے خبر کرو میں چلا آؤں گا''۔۵۰؎

والسلام

خاکسار سید احمد، علی گڑھ

۲۵/ مارچ ۱۸۸۴ء

اس خط سے ہمیں یہ اطلاع بھی ملتی ہے کہ سرسید کے خاندان میں خواتین کم عمری میں ہی پڑھنے لکھنے میں خاصی مہارت حاصل کر لیتی تھیں۔ کم از کم سرسید کی پوتی احمدی بیگم گیارہ بارہ سال کی عمر میں اپنے دادا سے باقاعدہ خط وکتابت کرتی تھیں۔ ساتھ ہی سرسید کی

بڑی بہن (بوا صاحب یعنی عجبۃ النسا بیگم جو سرسید سے تقریباً ۱۲ سال بڑی تھیں۔ ۱۸۸۴ء میں ان کی عمر تقریباً اسّی سال کی تھی) بھی خواندہ تھیں اور اپنے دستخط کر سکتی تھیں۔

نوتعمیر بیڈ روم کی آرائش کے لیے جو دوسرا سامان سرسید نے دہلی بھیجا تھا اس کی چند تفصیلات ہمیں ان کے مندرجہ ذیل خط (بنام حکیم احمد الدین صاحب) مورخہ ۲۵ / مارچ ۱۸۸۴ء سے ملتی ہیں۔ یہ خط بھی اسی روز لکھا گیا تھا جس روز انھوں نے اپنی پوتی احمدی بیگم کو مندرجہ بالا خط لکھا تھا:

''دو شطرنجیاں اور دو لال بانات کے پردے آج تمہارے پاس روانہ کیے ہیں۔ یہ دونوں دریاں اس کمرے کی ہیں جو سونے کے لیے بنایا گیا ہے۔ سونے کے کمرے میں ایک دروازہ ایک دالان میں ہے اور ایک دروازہ ایک میں یعنی بڑا کمرا دوہرا جو بیٹھنے کا ہے اس طرف دروازے سونے کے کمرے کے ہیں۔ ان دونوں کے ہی یہ دو پردے ہیں۔ یہ پردے لمبے ہوں گے ان کو دونوں دروازوں کے لائق بنوالو۔ بانس وغیرہ حسب دستور ڈلواؤ اور جلد تیار کرالو، میں شروع اپریل میں آؤں گا اس وقت تک تیار ہو جاویں۔ شطرنجیاں سید حامد کے گھر میں رکھوا دو اور سمجھا دو کہ احتیاط سے رکھی جاویں۔ میلی اور خراب نہ ہونے پاویں''۔ ۵۱

اس خط سے ایک جزوی مفروضہ ہم نے یہ بھی بنایا ہے کہ سید حامد اور ان کی فیملی کے لیے دہلی کے مکان میں ایک علیحدہ حصہ یا مکان موجود تھا جس میں ان کی اہلیہ اور بیٹی رہتی تھیں۔ ۱۸۸۴ء میں سید حامد اپنی نوکری کے سلسلے میں جہاں بھی تعینات ہوں لیکن ان کی اہلیہ اور بیٹی عموماً دہلی ہی میں رہتے تھے۔

سرسید اپنے خط بنام حکیم احمد الدین مورخہ ۲۹ / مارچ ۱۸۸۴ء میں علی گڑھ سے پلنگ وغیرہ روانہ کرنے کی اطلاع ان الفاظ میں دیتے ہیں:

''دو پلنگ مع لکڑی ہائے چھتری وڈنڈا مرسل ہیں اس میں ایک کو نواڑ سے بنوالو، دوسرے کی بھی نواڑ ہمارے پاس ہے جب آؤں گا تو لیتا آؤں گا بلٹی اسباب کی ملفوف ہے''۔ ۵۲

اس خط کے چند روز بعد ہی اپنے خط (بنام حکیم احمد الدین) مورخہ ۲ / اپریل

۱۸۸۴ء کے ذریعہ سرسید کرسیاں روانہ کرنے کی مندرجہ ذیل اطلاع دیتے ہیں:

''چھ عدد کرسیاں یہاں سے روانہ کی ہیں۔ بلٹی ان کی ملفوف ہے اسٹیشن پر سے لے آؤ اور احتیاط سے رکھو۔ ۶/اپریل کو سالانہ اجلاس مدرسہ کا ہوگا۔ اس کے بعد وہاں آؤں گا''۔

اس طرح اپریل ۱۸۸۴ء تک دہلی کے مکان میں ایک عمدہ بیڈ روم اور اس سے ملحق غسل خانہ نہ صرف تعمیر ہوگیا تھا بلکہ بڑی حد تک ضروری فرنیچر وغیرہ سے آراستہ بھی کردیا گیا تھا۔ انہی خطوط کی بنا پر ہم سرسید ہاؤس میں موجود سونے کے کمروں کے فرنیچر و دوسرے آرائشی اشیا کے استعمال کا ایک مبہم سا اندازہ ضرور لگا سکتے ہیں۔ یعنی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عام طور پر سرسید ہاؤس میں سونے کے کمروں میں نواڑ سے بنی مسہریاں یا بڑے سائز کے پلنگ استعمال کیے جاتے تھے جن پر ڈنڈوں کی مدد سے چھتری لگانے کا انتظام بھی ہوتا تھا۔ ایسے پلنگوں کے لیے عرفِ عام میں ''چھپر کھٹ'' کی اصطلاح بھی استعمال کی جاتی تھی۔ چھتریوں پر مچھر دانی ڈال کر سونے والے کو مچھروں سے محفوظ رکھا جاسکتا تھا۔ کمروں میں شطرنجیوں (دریوں) کے عمدہ فرش بچھائے جاتے تھے۔ دروازوں پر عمدہ موٹے اونی کپڑے (بانات) کے رنگین پردے لٹکائے جاتے تھے۔ (دہلی کے بیڈ روم کے لیے سرسید نے لال بانات کے پردوں کا انتخاب کیا تھا) پردوں کو لٹکانے کے لیے بانس کا استعمال کیا جاتا تھا (عموماً پردوں میں نیفے بنا کر بانس کے اوپر پہنا دیئے جاتے تھے) بانس کی مدد سے پردے لٹکائے بھی جاتے تھے اور بانس کی مدد سے انہیں لپیٹ کر باندھا بھی جاتا تھا۔ ہر بیڈ روم میں نواڑ کی مسہریوں یا پلنگوں کے علاوہ دو ایک کرسیاں اور میزیں بھی موجود رہتی تھی۔ گرمی کے موسم میں عمدہ فرشی پنکھے چھت میں ٹانگے جاتے تھے۔

سید محمود کی انگلستان کی مسافرت:

عام خیال یہی ہے کہ ۱۸۸۳ء میں مسٹر سڈنس کے استعفیٰ دینے کے بعد پرنسپل کے عہدے کے لیے کسی مناسب آدمی کا انتخاب کرنے کی غرض سے سید محمود دوسری بار انگلستان تشریف لے گئے تھے۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۷۸ء اور ۱۸۸۴ء کے درمیانی چھ سالوں میں سید محمود نے کئی بار انگلستان کا سفر کیا تھا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ مسٹر تھیوڈور بیک کے انتخاب کے وقت سید محمود لندن ہی میں موجود تھے اور مسٹر تھیوڈور بیک کو کالج کے پرنسپل کی

آسامی کے لیے منتخب کیے جانے کے عمل میں ان کا پورا دخل تھا۔ لیکن یہ بات کہ سید محمود پرنسپل کی آسامی کے لیے کسی مناسب آدمی کا انتخاب کرنے کی غرض سے ہی دوسری بار لندن تشریف لے گئے تھے صحیح نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جب مسٹر سڈنس نے استعفیٰ دیا اس سے کافی پہلے سے سید محمود لندن ہی میں موجود تھے۔ اس کی شہادت سر سید کے خط بنام سید محمود مورخہ ۸/ مئی ۱۸۸۳ء سے بخوبی دستیاب ہوتی ہے۔ وہ اپنے اس خط میں تحریر کرتے ہیں کہ:

عزیز از جان محمود

تمہارے جانے کے بعد ایک جدید امر خلاف توقع یہ پیش آیا کہ مسٹر سڈنس نے استعفیٰ دے دیا۔ حقیقت میں ان کی صحت درست نہیں ہے۔ انھوں نے نہایت مجبوری سے استعفیٰ دیا ہے۔ غالباً پہاڑ میں انھوں نے کسی اسکول میں بندوبست کیا ہے۔ اگر ہم ان کو سال بھر کی رخصت بھی دے دیں تو کچھ فائدہ نہیں ہے۔ کیوں کہ بہ تحقیق معلوم ہو گیا ہے کہ وہ آئندہ پہاڑ کے نیچے نوکری کرنا نہیں چاہتے ہیں اور بہ لحاظ صحت کے بھی مجبور ہیں۔ انھوں نے جو چٹھی لکھی ہے اس کی نقل مرسل ہے۔ مگر وہ چاہتے ہیں کہ سوائے خاص شخصوں کے کسی کو معلوم نہ ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک پروفیسر جو انگلش لٹریچر اور فلاسفی میں نہایت لائق ہو ولایت سے بلایا جائے اس کو چار سو روپیہ ماہوار تنخواہ دیں گے اگر تمہاری رائے ہوگی تو بقدر کرایہ بنگلہ اس کی تنخواہ میں اور اضافہ کر دیں گے۔ غالباً جو شخص ہندوستان میں آنا چاہے گا وہ کچھ شرطیں بھی کرنی چاہے گا اور تم کو اختیار ہے کہ جو مناسب شرطیں چاہو اس سے کرو۔ بڑی خواہش یہ ہے کہ وہ تمہارے ساتھ بہ ماہ نومبر یہاں آجاوے۔ اس وقت سڈنس صاحب پرنسپل موجود ہوں گے اور اس کے بعد بھی دو مہینے تک بدستور پرنسپل رہیں گے۔ جب وہ جانے لگیں گے اس وقت نسبٹ صاحب کو یا اس شخص کو جو ولایت سے آیا ہوگا جس طرح مناسب معلوم ہوگا پرنسپل کر دیا جاوے گا۔ غرض اس شخص سے پرنسپل کرنے کا کچھ وعدہ نہ کیا جاوے بلکہ ہمارے اختیار

میں رہے۔ وقت پر جیسا مناسب ہوگا کیا جاوے گا۔ مسٹر نسبٹ بھی پنجاب میں نوکری چاہتے ہیں اور کچھ توقع بھی ملی ہے۔ اگر وہ پرنسپل نہ ہوں گے تو غالباً وہ بھی استعفیٰ دے دیں گے اور ہم کو ایک اور شخص کی ضرورت پڑے گی۔ پس ایک شخص کو تو تم اپنے ساتھ لاؤ اور ایک شخص سے ایسا بندوبست کرلو کہ اگر ضرورت کے وقت بلانے کی حاجت ہو تو فی الفور بلالیا جاوے۔ اس امر پر نہایت توجہ کرو اور کسی نہایت لائق شخص کو منتخب کرو اور نسبت تنخواہ و شرائط کے بھی جو امر تمہاری رائے میں مناسب ہو اسی کے مطابق کرنے کا تم کو اختیار ہے۔ میں نے دو کاپیاں قواعد مدرسۃ العلوم کی تمہارے پاس روانہ کی ہیں تاکہ جس سے تم گفتگو کرو اس کو دکھا سکو تاکہ وہ جان لے کہ اس کو کمیٹی کے ماتحت کام کرنا پڑے گا۔ یہ امر جو پیش آیا ہے کچھ کم توجہ کے لائق نہیں ہے۔ ہم اس بھروسے پر کہ تم وہاں انتظام کرو گے یہاں کچھ نہیں کرتے۔ پس اگر وہاں سے اس کا بندوبست ہونا ممکن نہ ہو تو جلد اطلاع کرنی چاہیے۔ والسلام۔ [۵۳]

سید احمد۔ علی گڑھ۔ ۸/ مئی ۱۸۸۳ء

اس خط سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مئی ۱۸۸۳ء میں جب سر سید نے یہ خط لکھا اس سے کافی پہلے سے سید محمود انگلستان میں موجود تھے۔ اس خط سے یہ اطلاع بھی ملتی ہے کہ وہ نومبر ۱۸۸۳ء میں واپس ہندوستان آنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ سر سید کے خط بنام مولوی امتیاز علی صاحب مورخہ ۲۱/ نومبر ۱۸۸۳ء سے تصدیق ہو جاتی ہے کہ سید محمود ۲۱/ نومبر ۱۸۸۳ء کو واپس علی گڑھ پہنچ گئے تھے۔[۵۴] یہ غالباً سید محمود کا انگلستان کا آخری سفر تھا۔ لیکن اس سے پہلے یعنی ۱۸۷۸ء سے ۱۸۸۳ء تک کے درمیانی عرصہ میں انھوں نے کئی بار انگلستان کا سفر کیا تھا ڈیویڈ لیلیویلڈ نے بھی سید محمود کے کئی بار انگلستان جانے کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ سید محمود اپنے دوست مسٹر جارج ای۔ اے۔ راس اور ان کی بیگم صاحبہ کی دعوت پر انگلستان جایا کرتے تھے اور لندن کے دورانِ قیام وہ انہیں کے مہمان ہوا کرتے تھے۔ ۱۸/ فروری ۱۸۷۹ء کو سید محمود انگلستان جانے کے لیے کلکتہ سے بمبئی کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ اس کی واضح اطلاع ہمیں سر سید کے خط بنام خواجہ محمد یوسف صاحب مورخہ ۱۵/ فروری ۱۸۷۹ء سے

ملتی ہے۔جس میں وہ تحریر کرتے ہیں کہ:

''سید محمود ولایت جاتے ہیں۔اٹھارھویں فروری کو یہاں سے بمبئی روانہ ہوں گے۔ میرا ارادہ بھی ہے کہ پندرھویں مارچ تک یہاں سے روانہ ہوں۔ ۱۹ر فروری کو کونسل کا اجلاس ہوگا۔اس وقت سب حال معلوم ہو جاوے گا۔ ہفتہ اول مارچ میں وائسرائے یہاں سے روانہ ہو جاویں گے اور غالباً کوئی اجلاس کونسل کا نہ ہوگا۔ پس دوسرے ہفتہ میں روانہ ہوں گا۔ متعاقب سب ٹھیک حالاتِ تواریخ لکھوں گا''۔۵۵

۱۸۷۳ء میں تعلیم مکمل کر کے واپس آنے کے بعد یہ ان کا انگلستان کا پہلا سفر تھا لیکن ۱۸۷۹ء سے ۱۸۸۳ء کے درمیانی وقفہ میں وہ کتنی بار انگلستان گئے تھے یہ ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے ہیں۔لیکن خیال اغلب ہے کہ انھیں جب کبھی کوئی لمبی چھٹی یا فرلو پر جانے کا موقع ملتا تھا وہ انگلستان کے سفر پر روانہ ہو جاتے تھے۔اس طرح انھوں نے غالباً دو مزید سفر انگلستان کے اور کیے تھے۔ حالی نے سید محمود کے انگلستان کے ان سفروں کو تفریحی سفر قرار دیا ہے۔وہ حیاتِ جاوید میں ایک جگہ برسرِ تذکرہ لکھتے ہیں کہ:

''جب سید محمود دوسری بار تفریحاً انگلستان کو گئے اور کیمبرج میں اپنے دوستوں سے ملے تو معلوم ہوا کہ یونیورسٹی کا سرمایہ بہت بڑھ گیا ہے''۔۵۶

ہم تو یہی قیاس کر سکتے ہیں کہ یا تو سید محمود کا کسی قسم کا کوئی جذباتی لگاؤ تھا جو انہیں ولایت جانے کے لیے آمادہ کرتا رہتا تھا یا پھر تعلیم کے سلسلے میں ولایت میں گزارے ہوئے چار سال کے عرصے میں وہاں کے معاشرے، تہذیب اور کلچر نے سید محمود کی شخصیت پر اتنے گہرے نقوش مرتب کر دیئے تھے جس کی وجہ سے وہ کافی عرصہ تک اس طرزِ زندگی اور معاشرے کی طرف متوجہ ہوتے رہے تھے۔ حالاں کہ ہمارے اندازے کے مطابق یہی وہ عرصہ ہے جب سید محمود کی شراب نوشی کی عادت نے بتدریج اعتدال کی حدود سے تجاوز کرنا شروع کر دیا تھا۔

سید محمود کا ہائی کورٹ میں تقرر:

سید محمود پہلی اگست ۱۸۷۹ء کو رائے بریلی کے سیشن جج مقرر ہوئے تھے اس کے بعد وہ کتنے عرصہ تک رائے بریلی میں رہے اور کب ہائی کورٹ کے عارضی یا قائم مقام جج مقرر ہوئے تھے اور کس تاریخ سے وہ ہائی کورٹ کے مستقل جج مقرر ہوئے تھے اس سلسلے میں ہمیں صحیح اطلاع نہیں ہے لیکن بعض حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۸۲ء میں کچھ عرصہ کے لیے ان کا ہائی کورٹ کے جج کے بطور عارضی تقرر ہوا تھا۔

خیال اغلب ہے کہ سید محمود فروری ۱۸۸۶ء میں پہلی بار ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے تھے۔ اس مفروضہ کی بنیاد انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۴/مارچ ۱۸۸۵ء میں شائع ہونے والی سمیع اللہ خاں صاحب کے تقرر کے سلسلے کی مندرجہ ذیل خبر ہے:

''سمیع اللہ خاں سب جج علی گڑھ رائے بریلی کے سول جج آنریبل سید محمود کی جگہ مقرر کیے جاویں گے جو مسٹر ٹرل کے کام پر واپس آنے کے بعد رخصت فرلو پر تشریف لے جاویں گے مگر یہ تقرر آخیر اپریل تک نفاذ پذیر ہوگا''۔ ۵۷

اس خبر کی رو سے سمیع اللہ خاں رائے بریلی میں سید محمود کی جگہ پر سول جج مقرر ہوئے تھے۔ ظاہر ہے یہ جگہ سید محمود کے الہ آباد ہائی کورٹ میں جج مقرر ہونے کی وجہ سے خالی ہوئی ہوگی۔ ۲۳/اپریل ۱۸۸۵ء کو سمیع اللہ خاں صاحب لکھنؤ پہنچے تھے۔ سمیع اللہ خاں صاحب کے رائے بریلی میں چارج لینے کے بعد ہی سید محمود رخصت (فرلو) پر تشریف لے گئے ہوں گے اور اس طرح تقریباً نو مہینے رخصت (فرلو) پر رہنے کے بعد فروری ۱۸۸۶ء میں سید محمود نے ہائی کورٹ کے جج کی حیثیت سے چارج لے لیا ہوگا۔ ان کے ہائی کورٹ کے مستقل تقرر کے سلسلے میں ہمارا خیال ہے کہ وہ فروری ۱۸۸۶ء میں ہائی کورٹ کے مستقل جج مقرر ہو گئے تھے۔ اس مفروضہ کی بنیاد سید محمود کا خط بنام چیف سکریٹری (گورنمنٹ آف انڈیا) مورخہ ۸/ستمبر ۱۸۹۳ء ہے جس میں سید محمود نے تحریر کیا ہے کہ:

''میں نے اب تک ہائی کورٹ کے جج کی حیثیت سے سات سال اور سات مہینوں کی سروس مکمل کی ہے''۔ ۵۸

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ستمبر ۱۸۹۳ء سے سات سال اور سات مہینے پہلے وہ ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے تھے۔ سید محمود کے اس بیان سے ہی ہم نے نتیجہ اخذ کیا کہ ان کا ہائی کورٹ کے جج کے بطور باقاعدہ تقرر فروری ۱۸۸۶ء میں ہوا ہوگا۔

سر سید ہاؤس میں انگریز مہمان:

علی گڑھ کے باہر سے آنے والے وہ انگریز جو سر سید کے ذاتی مہمان ہوتے تھے اور سر سید ہاؤس ہی میں بطور مہمان قیام کرتے تھے۔ ان کے ناموں کی ایک لمبی فہرست تیار کی جا سکتی ہے۔ جس میں کرنل جی ایف آئی گراہیم کا نام سرِ فہرست ہوگا۔ جو ۱۸۸۲ء میں آگرہ میں متعین تھے۔ اس فہرست میں ایک اہم نام مسٹر کینتھ ڈینٹن کا بھی ہوگا جو آگرہ کالج کے پرنسپل تھے۔ ایم۔ اے۔ او کالج میں جدید علوم کی تعلیم کی نگرانی کے لیے جو ۲۱ رکنی کمیٹی بنائی گئی تھی مسٹر ڈینٹن اس کمیٹی کے صدر تھے۔ مسٹر سڈنس اور مسٹر جان ایلیٹ بھی اس کمیٹی کے ممبر تھے۔ (مسٹر جان ایلیٹ پریسیڈنسی کالج کلکتہ میں نیچرل سائنس کے پروفیسر تھے) سر سید ایم۔ اے۔ او کالج کے تعلیمی امور کے سلسلے میں مسٹر ڈینٹن سے صلاح مشورہ کرتے رہتے تھے۔ وہ اس سلسلے میں اکثر علی گڑھ آتے رہتے تھے۔ وہ عموماً سر سید ہاؤس ہی میں قیام کرتے تھے۔ ان کے سفر خرچ اور طعام و قیام کے سلسلے کے اخراجات کے اندراجات گاہے گاہے کالج کے جمع و خرچ کے رجسٹروں میں مل جاتے ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے طعام کا انتظام کالج کے ذمہ ہی ہوتا تھا لیکن لنچ اور ڈنر میں جو خرچ شراب وغیرہ مہیا کروانے پر ہوتا تھا وہ سر سید اپنی جیب سے ادا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں اخراجات کے رجسٹر مورخہ ۹ ردسمبر ۱۸۸۲ء کے مندرجہ ذیل اندراج ملاحظہ فرمائیں:

> ''بابت اخراجات مسٹر ڈینٹن صاحب (رقم پڑھی نہ جا سکی) جو ممبروں کے چندے سے لیے جائیں گے علاوہ قیمت شراب مسٹر ڈینٹن صاحب''۔ ۵۹

میری یادداشت میں اخراجات کے رجسٹروں کا اسی طرح کا ایک اور حوالہ بھی محفوظ ہے (جس کا کارڈ میں تلاش نہ کر سکا) جس میں ڈینٹن صاحب کے ڈنر کے اخراجات کے سلسلے میں درج تھا کہ:

> ''بابت اخراجات ڈنر مسٹر ڈینٹن صاحب، الاشراب جو مولوی صاحب نے اپنی جیب سے ادا کیے''۔

غرض ڈینٹن صاحب کے قیام و طعام کے اخراجات کالج ہی ادا کرتا تھا لیکن ڈنر میں جو شراب فراہم کی جاتی تھی اس کی قیمت سر سید اپنی جیب سے ادا کرتے تھے۔ یہ وطیرہ

دوسرے ان انگریز مہمانوں کے سلسلے میں بھی روا رکھا جاتا تھا جو کالج کے کام سے آکر سرسید ہاؤس میں قیام کرتے تھے۔

سرسید ہاؤس میں سر ایلفریڈ لائل کی آمد:

کالج کی اصل عمارتوں کی تعمیر کی ابتدا جنوری ۱۸۷۹ء میں ہوئی تھی۔ اس وقت لٹن لائبریری، اسٹریچی ہال اور نظام میوزیم کے ساتھ اس لائن میں تعمیر ہونے والی دوسری تمام عمارتوں کی بنیادیں کھدوا کر بھروادی گئی تھیں۔ لٹن لائبریری کے مشرق میں واقع عمارتوں کی لائن میں دس کمرے انگلش میڈیم اسکول کی کلاسوں کے واسطے اور انہیں سے ملحق ۱۲ بورڈ ینگ کے کمرے (ایس ایس ایسٹ میں) تعمیر ہونا شروع ہوئے تھے۔ بورڈ ینگ کے یہ بارہ کمرے ستمبر ۱۸۸۰ء تک بن کر تیار ہوگئے تھے اور پہلی اکتوبر ۱۸۸۰ء میں ان پختہ کمروں میں فرسٹ کلاس بورڈرز رہنے لگے تھے جو پھوس کے چھوٹے بنگلوں سے شفٹ ہوکر یہاں آئے تھے۔ اسکول کی کلاسوں کے لیے تعمیر کیے جانے والے دس کمرے بھی ۱۸۸۱ء کے اوائل تک تیار ہوگئے تھے۔ (یہ وہ کمرے ہیں جن میں عرصہ تک اردو ڈیپارٹمنٹ اور لافیکلٹی قائم رہے تھے) اس عمارت میں اسکول کی کلاسوں کو شفٹ کرنے کے بجائے کالج کی کلاسوں کو شفٹ کیا گیا تھا اور انگلش میڈیم اسکول کی کلاسیں حسب دستور کولن کے بنگلہ نمبر ۳ (یعنی موجودہ پرانے گیٹ ہاؤس) ہی میں قائم رہی تھیں۔ یہ تمہید اس لیے ضروری سمجھی گئی کہ ۱۸۸۳ء میں اس عمارت میں کالج کے کلاسوں کے افتتاح کی رسم سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اسی تاریخ سے اس عمارت میں کالج کی کلاسیں شروع ہوئی تھیں۔ اس عمارت میں کالج کے کلاسوں کی باقاعدہ رسم افتتاح (تقریباً ایک سال بعد) ۵رفروری ۱۸۸۳ء کو شمالی مغربی صوبہ کے لفٹنٹ گورنر سر ایلفریڈ لائل کے ہاتھوں ادا کی گئی تھی۔

اس موقع پر سر الفریڈ لائل بھی سرسید ہاؤس ہی میں سرسید کے مہمان کے بطور تشریف لائے تھے۔ یہ دوسرے لفٹنٹ گورنر تھے جو سرسید ہاؤس میں قدم رنجہ ہوئے تھے۔ ان سے پہلے ۱۸۸۰ء میں سر جان اسٹریچی شمالی مغربی صوبہ کے لفٹنٹ گورنر کی حیثیت سے سرسید ہاؤس میں تشریف لاچکے تھے۔

سر جان اسٹریچی کی آمد:

سرسید ہاؤس میں ایک اور معزز مہمان کے بطور سر جان اسٹریچی ۱۰ر دسمبر ۱۸۸۰ء

کو تشریف لائے تھے۔ شمالی مغربی صوبہ کے لفٹنٹ گورنر سر جان اسٹریچی سے سرسید کے دیرینہ ذاتی مراسم تھے۔ کالج کے لیے گورنمنٹ سے زمین مہیا کروانے میں انھوں نے سرسید کی بہت مدد کی تھی۔ اسٹریچی کی بیوی ایک اچھی آرٹسٹ تھیں۔ انھوں نے سرسید کا ایک روغنی پورٹریٹ بھی بنایا تھا۔ سرسید اس پورٹریٹ کے لیے اکثر الہ آباد جاکر آرٹسٹ کے سامنے بیٹھتے تھے۔ سر جان اسٹریچی سول سروس سے ریٹائر ہونے سے پہلے سرسید کی درخواست پر عجلت میں تھوڑا سا وقت نکال کر ۱۰ر دسمبر ۱۸۸۰ء کو علی گڑھ تشریف لائے تھے۔ دراصل ان کی علی گڑھ میں یہ آمد سرسید کو الوداع کہنے کے لیے ہی تھی لیکن سرسید نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسٹریچی ہال کے چبوترے پر (یعنی جہاں بنیادیں بھری گئی تھیں) ایک عارضی شامیانہ نصب کرواکر سر جان اسٹریچی کے ہاتھوں ہی اسٹریچی ہال کا سنگ بنیاد رکھوانے کی رسم بھی ادا کروادی تھی۔ حالاں کہ اسٹریچی ہال کی تعمیر کا اصل کام تقریباً پانچ سال بعد (یعنی ۱۸۸۵ء) ہی میں شروع ہوسکا تھا۔ ہم کو اس طرح کے حوالے بھی ملے ہیں کہ اس وقت تک سر جان اسٹریچی کی آنکھوں میں جالا (یعنی کیٹریکٹ) آگیا تھا جس کی وجہ سے ان کی بینائی تقریباً ختم ہوگئی تھی اسی وجہ سے وہ جلد از جلد انگلستان پہنچنا چاہتے تھے تاکہ اپنی آنکھوں کا آپریشن کرواسکیں۔ یوں تو سر جان اسٹریچی پہلے بھی سرسید کی دعوت پر علی گڑھ آچکے تھے لیکن سرسید ہاؤس میں یہ ان کی پہلی آمد تھی (اور آخری بھی) سر جان اسٹریچی کے ہندوستان سے واپس انگلستان چلے جانے کے بعد بھی ان کے صاحبزادے مسٹر آرتھر اسٹریچی ہندوستان ہی میں مقیم رہے تھے اور الہ آباد ہائی کورٹ میں پریکٹس کرتے تھے۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے ہم یہ بھی بتلانا چاہیں گے کہ مسٹر آرتھر اسٹریچی ایم اے او کالج کے پرنسپل تھیوڈور بیک اور پروفیسر ریلے کے قریبی عزیز بھی ہوگئے تھے۔ ان کی شادی پروفیسر ریلے کی سگی بہن سے ہوئی تھی۔ پروفیسر ریلے کی دوسری بہن کی شادی مسٹر تھیوڈور بیک سے ہوئی تھی جو کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے تھے۔ اس طرح مسٹر آرتھر اسٹریچی اور مسٹر تھیوڈور بیک آپس میں ہم زلف تھے۔ شمالی مغربی صوبہ کے لفٹنٹ گورنر سر چارلس کریستھ ویٹ نے جب ۱۲ر نومبر ۱۸۹۴ء کو اسٹریچی ہال کی رسم افتتاح ادا کی تھی اس موقع پر مسٹر آرتھر اسٹریچی اور سر جان اسٹریچی کی بیگم صاحبہ خاص طور پر مدعو کی گئی تھیں۔ انھوں نے اس تقریب میں مہمانِ خصوصی کے بطور الہ آباد سے آکر شرکت کی تھی۔ قانونی معاملات میں مسٹر آرتھر اسٹریچی ایک طرح سے کالج کے قانونی مشیر کی حیثیت سے کام

کرتے تھے اور اہم قانونی معاملات میں ان کی رائے شریکِ حال رہتی تھی۔

مسٹر سڈنس، نسبٹ اور سرسید:

مسٹر ہنری جارج اِیمی سڈنس کا تقرر بطور ہیڈ ماسٹر ۲۳ر جون ۱۸۷۵ء سے عمل میں آیا تھا۔ مسٹر سڈنس شاہجہاں پور سے علی گڑھ آئے تھے۔ جب وہ علی گڑھ آئے تھے اس وقت ان کی عمر تقریباً ۲۳ سال کی تھی۔ ان کے مرحوم والد بنگال آرمی میں کیپٹن تھے جن کا انتقال سڈنس کی پیدائش سے چند مہینے پہلے ہو گیا تھا۔ سڈنس کی تعلیم آکسفورڈ میں ہوئی تھی لیکن انھوں نے گریجویشن مکمل نہیں کیا تھا۔ ان کا تقرر سرسید نے مسٹر ڈینٹن کی سفارش پر کیا تھا۔ پہلے سال مسٹر سڈنس کا قیام ''فلر ہاؤس'' میں رہا تھا بعد میں کالج نے ان کی رہائش ''بنگلہ خورد'' میں منتقل کر دی تھی۔ یہ بنگلہ سرسید ہاؤس کے مشرقی احاطہ سے ملحق واقع تھا۔ بعد میں یعنی ۱۸۷۸ء میں کالج کے کلاسوں کے قائم ہونے کے بعد وہ کالج کے پہلے پرنسپل مقرر کیے گئے تھے۔[۶۰] اور ۱۸۸۱ء سے ان کی رہائش کولن کے بنگلہ نمبر ۲ (یعنی موجودہ اسٹاف کلب) میں منتقل ہو گئی تھی جس کو کالج کمیٹی نے پرنسپل کی رہائش کے لیے وقف کر دیا تھا۔[۶۱] حالاں کہ مسٹر سڈنس کافی عرصہ تک سرسید کے پڑوسی بھی رہے تھے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسٹر سڈنس کا سرسید ہاؤس میں بہت آنا جانا نہیں تھا۔ بلکہ سرسید سے ان کا رسمی قسم کا، کام کے سلسلے کا ہی رابطہ رہتا تھا۔ اسی طرح کا رسمی تعلق سرسید کا مسٹر نسبٹ سے بھی تھا جو سڈنس کے پرنسپل ہونے کے بعد ۱۸۸۰ء میں ہیڈ ماسٹر کے بطور مقرر ہوئے تھے۔ حالاں کہ مسٹر تھیوڈور بیک کے پرنسپل ہونے کے بعد خود مسٹر بیک اور اس زمانے کے دوسرے انگریز پروفیسروں سے سرسید کے ذاتی تعلقات تھے۔ وہ سب سرسید کو اپنا بزرگ مانتے تھے اور سرسید بھی ان کو اپنے خاندان کے ایک فرد ہی کی طرح سمجھتے تھے اور ان سے نہایت محبت اور شفقت کا برتاؤ کرتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کی سرسید ہاؤس میں آمد و رفت عام تھی۔

احوالِ سید حامد:

سید حامد کی زندگی کے متعلق بہت زیادہ اطلاعات فراہم نہیں ہوتی ہیں لیکن ہم نے ان کی زندگی کے سلسلے میں مختلف شواہد کی بنا پر ایک تصویر بنانے کی کوشش کی ہے۔ یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ وہ پولیس میں (ڈی۔ ایس۔ پی کے بطور) ملازم ہو گئے تھے۔ لیکن بعد کے شواہد سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ملازمت کے سلسلے میں ان کی کارکردگی اطمینان بخش نہیں

تھی۔ دسمبر ۱۸۸۳ء میں وہ چھٹی پر تھے اور دہلی میں موجود تھے۔ یہ چھٹی کس قسم کی تھی اس کا تو ہمیں علم نہ ہوسکا لیکن یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہ عام قسم کی چھٹی نہ تھی کیوں کہ اس چھٹی کے دوران انہیں تنخواہ نہیں مل رہی تھی (ہوسکتا ہے وہ نوکری سے عارضی طور پر معطل کر دیئے گئے ہوں) سرسید بھی ان کی طرف سے فکرمند نظر آتے ہیں جس کی شہادت ان کے خط بنام حکیم احمد الدین مورخہ ۸/دسمبر ۱۸۸۳ء سے موصول ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''سو روپیہ کا منی آرڈر مرسل ہے اس کا روپیہ وصول کر کے سید حامد کی بیوی کو دے دو اور ان کو سمجھا دو کہ جب تک سید حامد رخصت پر ہیں اور نوکری پر نہیں جاتے ہیں پچاس روپے مہینہ میں ان کو گھر کے خرچ کے بھی بھیجتا رہوں گا''۔۶۲

یہ روپے سرسید پابندی کے ساتھ سید حامد کی بیگم کو تقریباً چار مہینوں تک (یعنی اپریل ۱۸۸۴ء تک) بھیجتے رہے تھے۔ اپریل ۱۸۸۴ء کے بعد یہ روپے انھوں نے سید حامد کی بیگم کو بھیجنا بند کر دیئے تھے۔ جس سے ہم نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ اپریل ۱۸۸۴ء کے بعد سید حامد دوبارہ نوکری پر بحال ہو گئے تھے لیکن وہ زیادہ عرصہ تک اپنی ملازمت جاری نہ رکھ سکے تھے اور ایک سال بعد ہی ملازمت سے دستبردار ہو کر دہلی واپس آ گئے تھے۔ سرسید اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود سید حامد اور ان کی بیگم صاحبہ اور ان کی صاحبزادی کے خیال سے غافل نہیں تھے لیکن وہ سید حامد کی طرف سے ناامید ضرور تھے اور چاہتے تھے کہ اب وہ خاموشی سے گھر پر رہیں اور فی الحال کوئی دوسری ملازمت کرنے کے خیال کو دل سے نکال دیں۔ اس سلسلے کی شہادت سرسید کے خط بنام حکیم احمد الدین مورخہ ۹/نومبر ۱۸۸۵ء سے فراہم ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''مرزا سرور حسین خان بہادر مدراس سے یہاں آئے ہیں اور کل یہاں سے دہلی جاویں گے۔ وہ کہتے تھے کہ میں سید حامد کو اپنے ساتھ مدراس لے جاؤں گا۔ تم سید حامد کو یہ خط دکھا دو اور ان سے کہہ دو کہ مرزا سرور حسین صاحب کتنا ہی اصرار کریں وہ ہرگز مدراس جانا قبول نہ کریں۔ کسی طرح پر ان کے ساتھ جانے پر رضامند نہ ہوں، ہرگز ہرگز نہ جاویں۔ اس خط کو دکھلانے کے بعد چاک کر دو''۔۶۳

سید حامد کن حالات میں نوکری سے علیحدہ ہوئے تھے اس کا تو ہمیں صحیح علم نہیں

ہے لیکن مندرجہ بالا خط سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید، سید حامد سے خاصے ناراض تھے اسی وجہ سے سید حامد کو خط لکھنے کے بجائے حکیم احمد الدین صاحب کے ذریعہ سید حامد تک اپنی ہدایتیں پہنچوارہے تھے اوراس ناراضگی کی وجوہ بھی تھیں۔ سید حامد نہ صرف نوکری سے دستبردار ہو چکے تھے بلکہ خاصے مقروض بھی تھے۔ آمدنی کا کوئی مستقل ذریعہ نہ ہونے کے باوجود شاہانہ ٹھاٹ باٹ کے ساتھ رہنے سہنے میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ سرسید اس سلسلے میں کافی فکرمند نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے خط بنام حکیم احمد الدین مورخہ ۳۱ / دسمبر ۱۸۸۵ء میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''سید حامد کے نوکر جن کی تنخواہ چڑھ رہی ہے کہاں ہیں اور کیوں کر ان کی تنخواہ بھیج کر موقوف کیے جاویں گے۔ بالتصریح مع ان کے ناموں اور ہر ایک کی تنخواہ واجب الادا کی تعداد لکھ بھیجو اور یہ بھی لکھو کہ کس طرح ان کی تنخواہ بھیجی جاوے گی''۔ ۶۴

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جب سید حامد اپنی ملازمت سے سبکدوش ہوئے (یا کردیئے گئے) اس وقت ان کو اتنی بھی فرصت نہیں ملی تھی کہ دہلی منتقل ہونے سے پہلے وہ اپنے نوکروں وغیرہ کو ملازمت سے موقوف کر کے وہاں کے اپنے رہائش کے انتظام کو ختم کر سکتے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ دہلی آئے ہوئے ہوں اور وہاں ہی ان کو نوکری سے موقوف کیے جانے کا پروانہ ملا ہو۔ غالباً سید حامد جب اپنی ملازمت سے علیحدہ ہوئے اس وقت ان کی پوسٹنگ باندہ میں تھی اور وہاں وہ کافی قرض بھی چھوڑ آئے تھے جس کی شہادت سرسید کے خط بنام حکیم احمد الدین مورخہ ۲۰ / جنوری ۱۸۸۶ء سے فراہم ہوتی ہے۔ جس میں وہ تحریر کرتے ہیں کہ:

''ابھی تک روپیہ کا بندوبست نہیں ہوا ہے مگر یہ بات جو تم نے لکھی ہے کہ ''باندہ*'' کا قرض بغیر اس کے کہ سید حامد وہاں جاویں دیا نہیں جا سکتا ہے یہ سب نہایت لغو بات ہے قرضہ ادا کرنے کو وہاں جاویں اور دو تین روپیہ خرچ سفر میں ہو۔ مع ہذا ان کا وہاں جانا کسی طرح پسند نہیں ہے۔ بس ان سے کہو کوئی دوسری تدبیر و سبیل بناویں جس سے وہ روپیہ دفعتاً یا رفتہ رفتہ بھیجا جا سکے''۔ ۶۵

(نوٹ: نسرین بصیر نے اس لفظ کو ''باندی'' پڑھا تھا جو ان کے ذریعہ مرتب کیے

ہوئے ''خطوط سر سید'' میں موجود ہے۔لفظ 'باندی' کی وجہ سے ہمارے ذہن میں سید حامد کے ملازمت سے علیحدہ کیے جانے کے بارے میں مختلف خیالات آئے تھےلیکن شکر ہے کہ مخطوطے میں موجود اصل خط میں یہ لفظ 'باندہ' نکلا جسے غلطی سے 'باندی' پڑھ لیا گیا تھا۔)٦٦

سید حامد کن حالات میں ملازمت سے دستبردار ہوئے تھے،ان کی کس طرح کی ساکھ تھی اور سر سید ان کے سلسلے میں کس قدر ناامید ہو چکے تھے اس کی ایک جھلک سر سید کے خط بنام حکیم احمد الدین مورخہ ۲۱ر دسمبر ۱۸۸۷ء میں صاف نظر آتی ہے۔اس خط میں سر سید تحریر کرتے ہیں کہ:

''یہ خط صرف اس مطلب کے لیے لکھتا ہوں کہ سید حامد کو جو غلطی پڑی ہوئی ہے وہ رفع ہو جاوے۔انھوں نے چاہا کہ بسبب ان امور کے جو پیش آئے ہیں حیدر آباد چلے جائیں۔وہ سمجھتے ہیں کہ وہاں ان کے دوست ہیں۔یہ خیال ان کا کہ وہاں ان کے دوست ہیں محض غلط ہے۔ان سے پوچھو کہ وہ کس کو اپنا دوست سمجھتے ہیں،ایک شخص بھی وہاں ان کے آنے پر راضی نہیں ہے۔جب انھوں نے استعفیٰ دیا تو حیدر آباد کے لوگوں کو اندیشہ ہوا کہ اب ایسا نہ ہو کہ سید حامد کو حیدر آباد بھیجنے کے لیے میں کہوں۔سب نے میرے پاس خط بھیجے تھے کہ ان کو حیدر آباد بھیجنے کا ہرگز ارادہ نہ کیجیے گا وہ اپنی صاف دلی سے لوگوں کو دوست سمجھتے ہیں مگر ان کی غلطی ہے باوجود یہ کہ وہ لوگوں کو دوست سمجھ کر دھوکا کھا چکے ہیں پھر وہی خیالات دوستی کے ان کے دل میں ہیں۔ان کو سمجھاؤ وہ ان خیالات کو دور کریں۔حیدر آباد میں ہر ایک شخص اس بات کو بھی ناگوار سمجھے گا کہ وہ چند روز بطور مہمان بن کر وہاں ٹھہریں۔دوستی کیسی،کسی قسم کی توقع بہبودی ان لوگوں سے رکھنی محض نادانی ہے۔جو مصیبت خدا کی مرضی سے پڑی ہے اس کو برداشت کرنا چاہیے۔جہاں تک ہم سے ہو سکتا ہے اس کی تدبیر کرتے ہیں۔ان کو دروازہ بند کر کے اپنے گھر میں بیٹھا رہنا چاہیے جب تک خدا ان مشکلات کو دور کرے''۔٦٧

اسی کے ساتھ اس تمام عرصہ میں (یعنی جب سے سید حامد نوکری سے دست بردار

ہوئے تھے) سرسید بہت پابندی اور تواتر کے ساتھ سید حامد کی بیگم کو پچاس روپیہ مہینہ ان کے گھر کے اخراجات کے لیے بھیجتے رہے تھے اور اکثر و بیشتر سو یا دوسو روپے (جو کافی بڑی رقم شمار کی جاسکتی ہے) علیحدہ سے سید حامد کو بھی ارسال کرتے رہتے تھے۔ غالباً یہ روپے سید حامد کے ذاتی اخراجات کے علاوہ علاج معالجہ کے لیے بھی درکار ہوتا ہوگا۔ ہمارا خیال ہے کہ سید حامد شراب پینے کی لت کے ساتھ ساتھ تپ دق کے موذی مرض میں بھی مبتلا ہو گئے تھے۔ (جو جنوری ۱۸۹۴ء میں مہلک ثابت ہوا) جن کے شواہد سرسید کے ان جملوں سے ملتے ہیں جو سرسید حکیم احمد الدین کے خطوں میں سید حامد کی خیریت دریافت کرنے کے سلسلے میں گاہے گاہے لکھتے رہتے تھے۔ جن میں سے چند درج ذیل ہیں :

خطہ مورخہ ۲۷/جون ۱۸۹۰ء

''مجھ کو صاف طور پر لکھو کہ سید حامد کا کیا حال ہے انھوں نے شراب چھوڑی یا نہیں جو کچھ حال ہو وہ مفصل لکھو''۔ ۶۸

خط مورخہ ۱۴/ستمبر ۱۸۹۰ء

''سید حامد کی طبیعت کا حال لکھو کہ کس طرح پر ہے۔ باری کے دن ان کو بخار آیا کہ نہیں''۔ ۶۹

خط مورخہ ۲۱/ستمبر ۱۸۹۰ء

''تم نے سید حامد کی صحت وکیفیت مزاج کی بابت کوئی خط نہیں لکھا تردد ہے۔ ان کی صحت سے اطلاع دو''۔ ۷۰

خط مورخہ ۲۱/جنوری ۱۸۹۲ء

''ایک خط موسومہ سید حامد جس میں دوسو روپے کا چیک ملفوف ہے ان کو دے دو اور لکھو کہ اب ان کی طبیعت کیسی ہے''۔ ۷۱

سرسید اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود اپنے خاندان کے ایک ایک فرد کی خیر وعافیت وفلاح و بہبود کا خیال رکھتے تھے وہ پچھلے کئی برسوں سے اپنی بڑی بہن عجبۃ النسا بیگم کو ان کے خرچ کے واسطہ ۲۵ روپے مہینہ دیتے تھے (اور یہ عمل بہن کے ۱۸۹۴ء میں انتقال تک جاری رہا تھا) نیز ان کے ذہن میں اپنی پوتی (سید حامد کی صاحبزادی) کی شادی کی فکر بھی موجود تھی اسی لیے آہستہ آہستہ ان کے جہیز کا بندوبست بھی کر رہے تھے۔ اس مفروضہ کی بنیاد سرسید کے مندرجہ ذیل خط بنام حکیم احمد الدین مورخہ ۲۷/جنوری ۱۸۸۵ء پر ہے جس میں

اس سلسلے کی ایک مبہم سی جھلک نظر آتی ہے۔

''بوا صاحبہ سے کہہ دینا کہ میں نے دو تھان زربفت کے اور دو تھان مشروع کے اور ایک سرخ دوشالہ۔ احمد بیگم کے لیے لیا ہے۔ بہت اچھا ہے اگر احمدی بیگم کے کام میں یہ چیزیں آویں تو لیتا آؤں ورنہ نہ لاؤں جواب جلد بھیجو'' ۔۷۲

سرسید نے اپنی اکلوتی پوتی کی شادی کروانے کی ذمہ داری بخوبی نبھائی اور سید حامد کے (۱۸۹۴ء میں) انتقال کے بعد نہ صرف اپنی بہو کی تاحیات کفالت کی بلکہ سید حامد نے جو قرضہ چھوڑا تھا اسے بھی ادا کیا تھا۔

انگریز پروفیسران و سرسید ہاؤس:

مسٹر ہنری جارج ایمپی سڈنس صاحب کے مستعفی ہونے کی خواہش ظاہر کرنے کے نتیجہ میں پرنسپل کے عہدے کے لیے مسٹر تھیوڈور بیک کا انتخاب کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں سید محمود نے (جو اس وقت انگلستان میں موجود تھے) سر جان اسٹریچی کے صاحبزادے مسٹر آرتھر اسٹریچی کی سفارش پر مسٹر تھیوڈور بیک کا انتخاب کیا تھا۔ مسٹر آرتھر اسٹریچی ہی نے مسٹر تھیوڈور بیک کو سید محمود سے متعارف کروایا تھا۔ مسٹر بیک کی عمر اس وقت تقریباً ۲۳ سال کی تھی (وہ سید محمود سے تقریباً ۱۲ سال چھوٹے تھے) وہ کیمبرج میں یونین کے صدر کی حیثیت سے بھی خاصی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ وہ ایک ذہین اور باصلاحیت نوجوان تھے۔ مسٹر تھیوڈور بیک علی گڑھ پہنچتے ہی سرسید کے دل کو بھا گئے۔ بیک کو بھی سرسید میں پدرانہ شفقت کا پرتو نظر آیا۔ اس طرح دونوں کے درمیان جلد ہی شفقت، اعتماد اور اتحاد کے ساتھ کام کرنے کا رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ حالاں کہ مسٹر تھیوڈور بیک کافی عرصے پہلے علی گڑھ پہنچ گئے تھے لیکن انھوں نے اپنے عہدے کا چارج یکم فروری ۱۸۸۴ء کو لیا تھا۔ مسٹر سڈنس ایک طرح سے کم گو، علیحدگی پسند اور محتاط طبیعت کے انسان تھے اس کے برخلاف مسٹر تھیوڈور بیک خوش مزاج و خوش گفتار، بے تکلف اور ملنسار قسم کے انسان تھے۔ انھوں نے علی گڑھ آتے ہی اپنے آس پاس اپنے دوستوں اور مداحوں کی ایک محفل جمع کر لی تھی۔ ایک ہی سال کے اندر انھوں نے دو مزید انگریز پروفیسران کے تقرر کی اجازت حاصل کر لی تھی اور اس طرح اپنے دو عزیز اور ہم عمر دوستوں یعنی ہیرلڈ کوکس اور ڈبلیو۔ اے۔ ریلے کو علی گڑھ بلا لیا تھا (یہ

دونوں بھی کیمبرج اسٹوڈنٹ یونین میں خاصے فعال رہ چکے تھے) ان دونوں کے پروفیسر کے بطور کالج میں تقرر کے بعد نہ صرف یہ کہ بیک کی تنہائی ختم ہوگئی تھی بلکہ کام کرنے کے لیے دیرینہ دوستوں کی ایک عمدہ ٹیم بھی تیار ہوگئی تھی جس کو سرسید کی پدرانہ شفقت، سید محمود کی برادرانہ رفاقت، علی گڑھ میں موجود دیگر بزرگوں کی ستائش اور حکومتِ وقت کے افسروں کا تعاون حاصل تھا۔ غرض بیک نے علی گڑھ کو اور علی گڑھ نے بیک کو اپنا لیا تھا۔ اب علی گڑھ بیک کا گھر بن چکا تھا۔ جہاں سرسید ہاؤس کو وہی اہمیت حاصل تھی جو کسی نوجوان کے لیے اپنے آبائی مکان کی ہوسکتی ہے۔ اس زمانے میں ان نوجوان انگریز پروفیسروں کے لیے ''سرسید ہاؤس'' کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ حالاں کہ مسٹر کوکس اور مسٹر ریلے صرف دو سال ہی علی گڑھ میں رہے تھے۔ لیکن ان کے انگلستان واپس چلے جانے کے بعد بھی تھیوڈور بیک کی محفل اسی طرح آراستہ رہی تھی۔ کیوں کہ جو خلا مسٹر کوکس اور مسٹر ریلے کے واپس انگلستان چلے جانے کی وجہ سے پیدا ہوا تھا اس کو بیک کے دوسرے دو ہم عصر (اور عزیز) دوستوں یعنی مسٹر تھیوڈور ماریسن اور مسٹر ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنالڈ کے تقرر نے پر کر دیا تھا۔ (یہ دونوں بھی کیمبرج ہی کی پیداوار تھے) یہ نوجوان انگریز پروفیسر شام کے وقت اپنے خالی اوقات میں اگر یورپین کلب میں موجود نہ پائے جاتے تو ضرور ''سرسید ہاؤس'' میں موجود ہوتے تھے۔ ''سرسید ہاؤس'' کے پورٹیکو کے قریب زین کسے گھوڑوں کی موجودگی اس بات کی شاہد ہوتی تھی کہ مسٹر بیک اور ان کے دوست سرسید ہاؤس میں موجود ہیں۔ یہ لوگ اکثر وہاں ٹینس سے بھی شغل کرتے تھے۔

ان نوجوانوں سے سرسید ان کے مزاج اور دلچسپیوں کی مطابقت سے مختلف معاملات میں مشورے کرتے رہتے تھے۔ بیک ایک طرح سے سیاسی اور سماجی معاملات کے مشیر سمجھے جاتے تھے۔ جب کہ مسٹر ماریسن سے سرسید کالج میں ڈسپلن، اسپورٹس اور مختلف قسم کے بیرونِ نصاب سرگرمیوں کے سلسلے میں مشورہ کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ علمی اور تحقیقی کاموں کے سلسلے میں سرسید عموماً مسٹر آرنالڈ سے رجوع کیا کرتے تھے۔ گو کہ مسٹر کوکس اور مسٹر ریلے انگلستان واپس جا چکے تھے لیکن اس کے بعد بھی ان کے مشورے ہمیشہ بیک، ماریسن اور آرنالڈ کے شاملِ حال رہتے تھے۔ ان سب نوجوانوں کی دوستی اور رفاقت کو علی گڑھ کے قیام نے مضبوط رشتوں کی ڈور میں باندھ دیا تھا۔ اب یہ ایک دوسرے کے صرف دوست ہی نہ تھے بلکہ قریبی عزیز دار بھی بن گئے تھے اور یہ سب عزیز داریاں علی گڑھ

کے دورانِ قیام ہی عمل پیرا ہوئی تھیں۔ غالباً ان رشتوں کے سلسلے میں ایک بزرگ کی حیثیت سے سرسید کی ایما بھی شامل رہی ہوگی۔ مسٹر ریلے کی ایک بہن کی شادی سرجان اسٹریچی کے صاحبزادے مسٹر آرتھر اسٹریچی سے ہوئی تھی (جو اس وقت الہ آباد ہائی کورٹ میں پریکٹس کررہے تھے) مسٹر ریلے کی دوسری بہن کی شادی خود مسٹر تھیوڈور بیک سے ہوئی تھی۔[۳] مسٹر تھیوڈور ماریسن کی بیگم صاحبہ مسٹر بیک کی کزن تھیں۔ مسٹر آرنالڈ کی شادی (۱۸۹۲ء میں) مسٹر بیک کی بھانجی سے ہوئی تھی۔[۴] یہ سب خواتین اپنے شوہروں کے ساتھ کالج کے کیمپس ہی میں سکونت پذیر رہی تھیں۔ حالاں کہ ۱۸۸۸ء سے پہلے تک کوئی انگریز خاتون کالج کیمپس کے اندر سکونت پذیر نہ تھی۔ بیک پہلے شخص تھے جن کی بہن (مس جیسے بیک) اپنے والدین کے ساتھ ۱۸۸۸ء میں علی گڑھ آئی تھیں لیکن والدین کے واپس چلے جانے کے بعد وہ اپنے بھائی کے پاس ہی رہنے کے لیے علی گڑھ میں رُک گئی تھیں۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ہی (یعنی ۱۸۹۰ء کے بعد) مسٹر تھیوڈور بیک (شادی ہوجانے کے بعد) اپنی بیوی کو بھی علی گڑھ لے آئے تھے۔ بیک کے بعد مسٹر ماریسن اور مسٹر آرنالڈ کی بیگمات بھی اپنے شوہروں کے ساتھ کالج کیمپس کے بنگلوں میں رہنے لگی تھیں۔ اب سرسید اکثر بعض معاملات میں ان خواتین سے بھی مشورے طلب کرنے لگے تھے۔ سرسید نے جب مسٹر بیک کے والد کے انتقال کے بعد ان کی یاد میں کالج کے کیمپس کے اندر ایک کلاک ٹاور تعمیر کروانے کی تجویز رکھی تھی اس وقت انھوں نے جو خط مسٹر بیک کو لکھا تھا اس میں مسز بیک اور مسز ماریسن سے بھی مشورہ کرنے کی تلقین کی تھی۔ مسٹر بیک نے اس خط کے جواب میں جو خط لکھا تھا اس میں یہ بھی تحریر کیا تھا کہ ہم لوگ کسی وقت اس سلسلے میں آپ سے بات کرنے (سرسید ہاؤس میں) حاضر ہوں گے اور اس وقت میں آپ کو کتابوں میں موجود کچھ تصویریں بھی دکھلانا چاہوں گا تاکہ اپنی بات کی وضاحت کرسکوں (وغیرہ وغیرہ) ان خواتین نے آئندہ کیمپس کی زندگی میں ایک نمایاں رول ادا کیا تھا۔ کالج کے اساتذہ اور طلبا مختلف مواقعوں پر ان پروفیسروں کے بنگلوں پر ان خواتین کی مہمان نوازی سے بہرہ مندہ ہوتے رہتے تھے اور ان کے رہائشی طور طریقوں اور زندگی گزارنے کے سلیقہ سے متاثر ہوتے تھے۔ کیمپس میں موجود طلبا نے غالباً پہلی مرتبہ خواتین کو گھوڑوں پر سوار ہوکر مردوں کے شانہ بشانہ سیر کرتے ہوئے اسی زمانے میں دیکھا ہوگا۔

لارڈ رپن سرسید ہاؤس میں:

لارڈ رپن وائسرائے ہند ۱۸ر نومبر ۱۸۸۴ء کو کالج میں تشریف لائے تھے اور سرسید کے مہمان ہونے کے ناطے انھوں نے لنچ سرسید ہاؤس ہی میں نوش فرمایا تھا۔ لارڈ رپن کی آمد کے سلسلے میں سرسید نے جس طرح کی تیاریاں کی تھیں اس سے ان کی انتظامی صلاحیتوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے دوسرے اب سرسید میں جس طرح کی خود اعتمادی پیدا ہوگئی تھی اس کی جھلک بھی صاف نظر آتی ہے۔ اس سلسلے میں سرسید کا خط مورخہ ۸ر نومبر ۱۸۸۴ء (بنام ضلع مجسٹریٹ، علی گڑھ) بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس خط میں سرسید تحریر کرتے ہیں کہ:

> ”ہمیں یقینی اطلاع ملی ہے کہ ہزا یکسیلینسی وائسرائے ہند، ۱۸ر نومبر کو کالج میں تشریف لا رہے ہیں جہاں ان کو ایک ایڈریس (سپاسنامہ) بھی پیش کیا جاوے گا۔ اس سلسلے میں میری آپ سے درخواست ہے کہ برائے مہربانی ہزا یکسیلینسی کی آمد کے سلسلے میں مندرجہ ذیل انتظامات کرنے میں آپ میری مدد فرمائیں۔
>
> ۱۔ امید ہے کہ آپ ان سڑکوں پر جن سے گزر کر ہزا یکسیلینسی کالج میں تشریف لائیں گے لال جھنڈے لگانے کی اجازت مرحمت فرمائیں گے۔
>
> ۲۔ ہزا یکسیلینسی کو سپاسنامہ دینے کے لیے جلسہ واقع اسٹریچی ہال میں کافی لوگ جمع ہوں گے ان میں کوئی اجنبی شخص داخل نہ ہو سکے اس مقصد کے تحت اسٹریچی ہال میں داخلے کے لیے میرے دستخطوں کے ساتھ مندرجہ ذیل پروانے (یا ٹکٹ) جاری کیے جا رہے ہیں۔
>
> (i) یورپین اور مقامی شرفا کے لیے ٹکٹ
>
> (ii) طلبا کے لیے ٹکٹ
>
> (iii) خدمت گاروں کے لیے ٹکٹ
>
> ۳۔ آپ سے میری درخواست ہے کہ ایک گارد یورپین انسپکٹر کے ساتھ کالج کے دروازے پر تعینات کر دیا جائے اور انسپکٹر کو ہدایت

دے دی جائے کہ وہ صرف ان لوگوں ہی کو داخلے کی اجازت دے جن کے پاس مندرجہ بالا تین میں سے کسی ایک قسم کا داخلے کا پروانہ (ٹکٹ) موجود ہو۔ میں اُن تینوں پروانوں (ٹکٹوں) کے نمونے جن پر میرے دستخط موجود ہیں اس خط کے ہمراہ منسلک کر رہا ہوں تاکہ انہیں انسپکٹروں کو دے دیا جائے تاکہ کسی غلطی کا امکان نہ رہے۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی مقامی جنٹلمین جسے جلسے میں آنے کی دعوت دی گئی ہو اور وہ اپنا داخلے کا پروانہ بھول آیا ہو ایسی حالت میں میری تجویز ہے کہ مولوی خواجہ محمد یوسف صاحب ہزایکسیلینسی کے آنے تک انسپکٹر کے ساتھ موقع پر موجود رہیں گے کیوں کہ وہ تمام مقامی شرفا سے واقف ہیں جن کو مدعو کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی انسپکٹر کو یہ بھی ہدایت دی جائے کہ اگر کوئی مقامی شخص اپنا ٹکٹ بھول آیا ہو اور خواجہ محمد یوسف صاحب اسے داخلے کی اجازت دیں تو ایسی صورت میں انسپکٹر کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ انسپکٹر کو یہ بھی سمجھا دیا جائے کہ جیسے ہی مہمان اپنی گاڑیوں سے اتریں ان کی گاڑیاں کالج کے مغرب میں واقع گراؤنڈ کی طرف بھیج دی جائیں تاکہ کوئی گاڑی کالج کے گیٹ کے سامنے کھڑی نہ رہے اور وائسرائے کی سواری آنے میں کسی قسم کی کوئی روکاوٹ نہ ہو۔

۴۔ دوسرے پولیس کے گارد کی ضرورت اسٹریچی ہال پر بھی ہوگی (یاد رہے کہ ابھی اسٹریچی ہال کی تعمیر شروع بھی نہیں ہوئی تھی لیکن اس مقام پر جو شامیانہ تیار کیا جاتا تھا اسے اسٹریچی ہال ہی کہا جاتا تھا) ہزایکسیلینسی کے کالج دیکھنے اور طلبا سے ملنے کے بعد طلبا کو اندر داخل ہونے کی اجازت دی جائے گی اور کالج کے دروازے بند کر دیئے جائیں گے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ یہاں بھی پولیس کے سپاہی تعینات کر دیئے جائیں۔ اس پولیس گارد کو یہ ہدایت بھی دی جائے کہ اس کے سپاہی ان جگہوں پر تعینات رہیں گے جہاں میں یا بورڈنگ کے منیجر صاحب ان کی تعیناتی مناسب سمجھیں گے۔ میرے

خیال میں اس گارد میں کم از کم آٹھ سپاہی اور ایک افسر شامل ہونا چاہیے جہاں تک میرا اندازہ ہے یہاں چار مختلف جگہوں پر ایک ایک سپاہی کی ضرورت ہوگی اور کم از کم چار سپاہی اور ایک افسر اسٹریچی ہال کے دروازے پر درکار ہوں گے۔

۵۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ایک پولیس کا گارد اور کچھ گھوڑ سوار میرے گھر پر اس وقت تک موجود رہیں کہ جب تک ہز ایکسیلینسی وہاں موجود رہیں گے۔ مجھے امید ہے کہ آپ خود جو مناسب اور سب سے بہتر بندوبست ہوسکتا ہے وہ کریں گے۔ کیا کچھ گھوڑ سوار اس وقت ہز ایکسیلینسی کی سواری کے ساتھ بھی ہوں گے جب وہ یہاں تشریف لائیں گے یا جب وہ یہاں سے تشریف لے جائیں گے تا کہ سڑکوں پر انتظام عمدگی کے ساتھ کیا جاسکے۔

۶۔ وہ سب سڑکیں جن پر سے ہز ایکسیلینسی کی سواری گزرے گی عمدگی سے صاف ہوگئی ہیں سوائے ایک سڑک کے جو میرے گھر کی طرف آتی ہے جسے دیکھ ریکھ اور آپ کی توجہ کی ضرورت ہے''۔۵ے

انگریز کلکٹر کو لکھے گئے اس خط کی تحریر کے انداز سے احساس ہوتا ہے کہ اس وقت تک سرسید کی حیثیت انگریز افسران کی نظروں میں بہت مستحکم ہوچکی تھی۔ اب وہ ضلع کے انگریز کلکٹر سے ایک سیڑھی اوپر کھڑے ہوکر بات کرتے نظر آتے ہیں۔ ۱۸ر نومبر ۱۸۸۴ء کو جب وائسرائے صاحب کالج میں تشریف لائے تو کالج کے گیٹ سے اسٹریچی ہال تک جہاں جلسہ ہونا تھا وائسرائے صاحب کی سواری کو معزز شہریوں نے خود کھینچ کر پہنچایا تھا۔ سید محمود نے ہز ایکسیلینسی کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا تھا۔ جلسے کے خاتمے کے بعد وائسرائے صاحب نے لنچ ''سرسید ہاؤس'' ہی میں نوش فرمایا تھا اس موقع پر کرنل گراہیم علی گڑھ میں موجود تھے وہ تحریر کرتے ہیں کہ:

''جلسے کے بعد ہم لوگ سید احمد خان صاحب کے گھر گئے جہاں پر ایک پر تکلف لنچ وائسرائے اور چند دوسرے مہمانوں کی آمد کا منتظر تھا۔ سید احمد وائسرائے کے بائیں اور جسٹس محمود لارڈ رپن کے دائیں بیٹھے تھے۔ یہ بہت دلچسپ نظارہ تھا۔ آج ہندوستان میں شاید

ہی کوئی ایسا خاندان ہوگا اور نہ شاید آئندہ بھی کوئی ایسا خاندان ہوگا جس میں بیک وقت باپ وائسرائے کی کونسل کا ممبر اور بیٹا ہائی کورٹ کا جج ہو'' ۔۷۶

کرنل گرایہم اس روز کے ''لنچ'' کے بارے میں مزید تحریر کرتے ہیں کہ:

''یہ لنچ جس میں بمبئی سے لائی گئی پامفریٹ (مچھلی) اویسٹرز، اور ڈرائی شیمپین (فرانسیسی شراب) شامل تھی بہت ہی مرغوب اور دل پسند تھا'' ۔۷۷

(کرنل گرایہم کے اس بیان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سرسید ہاؤس میں وقتاً فوقتاً دی جانے والی ضیافتوں کا معیار کیا ہوتا تھا) لنچ کے بعد وائسرائے کی پارٹی سین ٹیفک سوسائٹی کی عمارت (یعنی علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ) پہنچی جہاں چند مقامی لوگوں کے ساتھ وائسرائے اور ان کی پارٹی میں شامل لوگوں کا ایک گروپ فوٹوگراف کھینچا گیا اور ایڈریس پڑھے گئے اس کے فوراً بعد وائسرائے مقامی شرفا کے مجمع کے تحسین آفریں نعروں کے ساتھ رخصت ہوئے اور آگرہ کے لیے روانہ ہو گئے۔

ہمارا یہ خیال صحیح ثابت نہیں ہوا کہ وائسرائے ہند یا صوبہ کے لفٹنٹ گورنر وغیرہ جیسے اعلیٰ مرتبہ لوگوں کی آمد کے موقع پر سرسید کے شریک کار اور رفقا سرسید ہاؤس میں جمع ہوتے تھے اور اس طرح کی ضیافتوں میں برابر کے شریک رہتے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وائسرائے لارڈ لٹن اور وائسرائے لارڈ رپن دونوں کی آمد کے مواقعوں پر صرف سرسید، سید محمود اور محمد حیات خاں صاحب (کالج فنڈ کمیٹی کے پریسیڈنٹ) ہی لنچ میں وائسرائے کے ساتھ شامل ہوئے تھے۔ سرسید کے شریک کار اور قریبی رفقا، وائسرائے کے سامنے رسماً پیش کیے جاتے اور ان سے مصافحہ کرنے ہی کو اپنی خوش قسمتی خیال کرتے تھے۔ علی گڑھ اور آس پاس کے دوسرے روسا تو چند گزوں کے فاصلے سے حاکمِ وقت کے دیدار کو ہی اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ ان سب لوگوں کے لیے سرسید ان کے اور حاکمِ وقت کے درمیان رابطے کا ایک اہم اور غالباً واحد ذریعہ تھے۔ اسی لیے سرسید کی خوشنودی ان کے لیے نہ صرف اہم تھی بلکہ حکومتِ وقت کی نظروں میں ان کے مرتبہ کی اہمیت کی حامل بھی تھی۔

سرسید کی پہلی سوانح:

ستمبر ۱۸۸۴ء میں کرنل جی ایف گراہیم کو سرسید کی سوانح عمری لکھنے کا خیال آیا تھا۔ (ہم نے اس کتاب میں اکثر ان کا نام کرنل گراہم یا کرنل گریہم لکھا ہے۔ دراصل سرسید ان کا نام 'گریہم' ہی لکھتے تھے لیکن اسے گراہم بھی لکھا جا سکتا ہے) وہ اس زمانے میں آگرہ میں تعینات تھے۔ انھوں نے سرسید سے اجازت لینے کے بعد ہی یہ سوانح لکھنا شروع کی تھی۔ جس کو ۱۸۸۵ء کے اواخر میں انھوں نے انگلینڈ سے شائع کیا تھا۔ اس کا عنوان تھا ''دی لائف اینڈ ورک آف سید احمد'' اس میں ۱۶ ابواب اور ۲ ضمیمہ جات ہیں (جن میں سے ایک کالج کے نووارد پرنسپل مسٹر تھیوڈور بیک کا تصنیف کردہ ہے) کتاب ۴۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس سوانح میں سرسید کی زندگی کا ۱۸۶۳ء سے ۱۸۸۴ء تک کا احوال نہایت عقیدت مندی کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ اس سوانح کے ذریعہ سرسید کی زندگی کو ایک انگریز افسر کی نظر سے دیکھا جا سکتا ہے۔ کرنل گریہم نے اس کتاب میں سرسید کے یورپین انداز کی بود و باش کی عمدہ عکاسی کی ہے۔ وہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ:

> ''سید احمد کافی عرصہ سے علی گڑھ میں اپنے آرام دہ مکان میں رہ رہے ہیں، جو ان کے بیٹے سید محمود نے خرید کر ان کے واسطے یورپین اسٹائل میں آراستہ کروایا تھا۔ اس مکان میں وہ اپنے کثیر التعداد مہمانوں کی خاطر مدارات کرتے ہیں، جو ہندوستان کے مختلف مقامات سے آتے رہتے ہیں۔ ان میں مسلمان، سکھ، ہندو اور انگریز سب ہی شامل ہوتے ہیں۔ ان کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ ساری فضا علم و ادب کی خوشبو سے معطر رہتی ہے۔ ان کا رہائشی کمرا جس میں وہ اپنے دن کا زیادہ تر وقت میز کے سامنے بیٹھ کر گزارتے ہیں (سرسید ہاؤس کی موجودہ نوتعمیر عمارت میں اب یہ بڑا ہال موجود نہیں ہے) کتابوں اور اخباروں سے بھرا رہتا ہے۔ ان کے کھانے کے کمرے کی دیواروں کے سہارے کتابوں کی الماریاں ہیں جو انگریزی کی معیاری کتابوں سے بھری ہوئی ہیں اور ان کی لائبریری، ایک وسیع اور شاندار کمرا ہے جو مختلف اقسام کی کتابوں

سے بھرا ہوا ہے جس میں لاتعداد مذہبی کتابیں ہیں جو وہ قرآن اور بائبل وغیرہ کی تفسیر لکھنے میں استعمال کرتے ہیں۔ان کتابوں میں سید محمود کی وہ کتاب بھی شامل ہے جوانہیں کیمبرج میں سب سے اچھا انگریزی مضمون لکھنے کے لیےانعام میں ملی تھی۔ڈرائینگ روم میں وہ ڈپلوما موجود ہے جس کی رو سے سید احمد کوایشیاٹک سوسائٹی کا فیلو بنایا گیا تھااور سید احمد خاص طور پراس پرفخر کرتے ہیں۔اس کے سامنے کی دیوار پر قدِ آدم (روغنی) پورٹریٹ ان کے دوست سر جان اسٹریچی کا ہے۔جس میں وہ جیتے جاگتے محسوس ہوتے ہیں۔اسی کے ساتھ سالار جنگ، لارڈلٹن اورنظام حیدرآباد کے پورٹریٹ بھی آویزاں ہیں۔ان کے دن خوشگواری اورسکون سے گزر رہے ہیں۔ چار بجے صبح بیدار ہوکر وہ اخباروں کے آرٹیکل، اپنی کتابیں وپمفلٹ لکھنے میں مصروف ہوجاتے ہیں، اپنے ذاتی ملاقاتیوں اورآفس کے کام سے آئے ہوئے لوگوں سے ملتے ہیں اوراپنے کالج کی کمیٹی کی سکریٹری شپ کے مشکل فرائض کو نہ صرف دن بھرانجام دیتے ہیں بلکہ اکثر وبیشتر رات گئے تک ان میں مصروف رہتے ہیں، ان کے یہاں کھانا یورپین طریقہ سے کھایا جاتا ہے، وہ ہرطرح کی شراب سے سخت پرہیز کرتے ہیں۔عام طور پر رات کے کھانے کے بعد احباب کی محفل میں شریک ہوتے ہیں۔وہ دل کھول کر ہنستے ہیں اور لطیفوں کاعام آدمیوں کی طرح خوب لطف لیتے ہیں''۔۸ے

سر سید کا یورپین طرزِ بودوباش:

گریہم کے بیان میں موجود مندرجہ بالا تفصیلات سے ہمیں سر سید کی زندگی کے شب وروز کی کچھ جھلکیاں دیکھنے کو ضرور مل جاتی ہیں۔اس میں اگر ہم چند دوسرے لوگوں کے مشاہدات بھی شامل کرلیں تو ہم ''سر سید ہاؤس'' کے شب وروز کی ایک واضح تصویر تیار کرسکتے ہیں جو کچھ اس طرح کی ہوگی۔

سر سید ہاؤس میں ڈرائینگ روم، ڈائنگ روم، بیڈروم ولیونگ روم (رہائشی

کمرا) وغیرہ علیحدہ علیحدہ تھے ہر بیڈ روم سے ملحق ڈریسنگ روم اور باتھ روم موجود تھے جن کی صفائی ستھرائی اور آرائش کا عینی بیان عنایت اللہ صاحب نے بخوبی فراہم کیا ہے:

''جس کمرے میں سید صاحب کی نشست تھی اس کے قریب ہی ایک کمرہ (یعنی بیڈ روم) والد کے لیے مخصوص کردیا گیا تھا وہیں ہمارا اسباب رکھا گیا تھا۔ کچھ دیر سید صاحب کے پاس ٹھہر کر جب والد اس کمرے میں آئے تو ہم دونوں بھائی بھی ان کے ساتھ آئے۔ اس کمرے میں جو غسل خانہ تھا اس کا چینی کا سامان اتنا صاف ستھرا اور میرے لیے عجیب تھا کہ بغیر اجازت کسی چیز کو برتنے کی ہمت نہ ہوئی۔ کپڑے بدلنے کے کمرے میں (یعنی ڈریسنگ روم) جو آئینہ دار خوبصورت میز تھی اس پر کچھ چیزیں شیشہ کی بھی رکھی تھیں مگر ان سب کو مجھ سے سخت دشمنی تھی۔ کیوں کہ جہاں میں نے خوش ہوکر کسی چیز کو ہاتھ لگایا اور وہ آپ سے آپ ٹوٹ کر گر پڑتی تھی''۔[۷۹]

ڈرائینگ روم میں قدِ آدم (روغنی) تصویریں آویزاں تھیں۔ سرسید صبح سویرے بیدار ہونے کے عادی تھے۔ ان کے آس پاس ان کے نجی ملازم (مجیب اللہ) کے علاوہ باوردی چپراسی (الٰہی بخش واحمد خاں) بیرے اور بٹلر مختلف خدمات کو انجام دینے کے لیے موجود رہتے تھے۔ بیروں اور بٹلر کی موجودگی کی عینی شہادت عنایت اللہ دہلوی کے مندرجہ ذیل بیان سے ملتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ کھانا کھانے کے لیے:

''سب لوگ میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تین چار سفید پوش ملازم اور ایک بہت لمبی داڑھی کا دبلا پتلا سوکھا مگر بے حد چست و چالاک اور تیز خانساماں طرح طرح کے کھانے سامنے لاتا تھا اور سب لوگ چمچوں سے حسب ضرورت کھانا اپنی رکابی میں نکال کر کھاتے تھے''۔[۸۰]

(نوٹ: انگریزوں کے یہاں بیرے اور بٹلر عموماً سفید لباس میں اور چپراسی رنگین لباس میں ملبوس ہوتے تھے۔ یہاں جن سفید پوش ملازموں کا ذکر کیا گیا ہے وہ چپراسی نہیں ہوسکتے تھے بلکہ بیرے یا بٹلر ہوں گے)۔

سرسید صبح ۴ بجے بیدار ہونے کے بعد اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہوجاتے تھے اور دن بھر مختلف کاموں کو انجام دینے میں مصروف رہتے تھے۔ جس میں

تصنیف وتالیف اور مطالعے کے علاوہ لوگوں سے ملنا اور کالج واپنے آفس کے سلسلے کے کاموں کو انجام دینا شامل ہوتا تھا۔ رات کو کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر دوستوں کی صحبت سے بھی لطف اندوز ہوتے تھے۔ طرزِ بود وباش یورپین تھی خاص طور پر کھانا یورپین طریقہ سے کھایا جاتا تھا جس میں میز کرسی اور چھری کانٹے کا استعمال لازم وملزوم تھا۔ جس کے واضح اشارے عنایت اللہ دہلوی کی تحریر میں ملتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> آدمی نے آکر کہا ''کھانا میز پر ہے'' اس پر سب لوگ اٹھے اور کھانے کے کمرے میں آئے یہاں پھر میری آنکھوں کے لیے عجیب وغریب منظر تھے۔ میز پر نہایت سفید چادر چینی کے برتن، شیشے کے گلاس، چاندی کے چمچے، ہاتھی دانت کے دستے کی چھریاں میز پر رکھی تھیں۔ میز پر دو بڑے شاندار لیمپ روشن تھے۔ پنکھا چل رہا تھا''۔ ۸۱

اسی سلسلے میں آگے تحریر کرتے ہیں کہ:

> ''چھریاں اور چاندی کے کانٹے تو میں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے تھے''۔ ۸۲

ہمارے اس مفروضہ کی شہادت کے بطور کہ سرسید روزمرہ کے معمول کا کھانا بھی ہمیشہ چھری کانٹے ہی سے کھاتے تھے، ہم مولوی عبدالحق صاحب کا بیان کردہ ایک واقعہ قارئین کے علم میں لانا چاہتے ہیں۔ ایک بار عبدالحق صاحب اپنے ایک ہم جماعت طالب علم کے ساتھ ڈرل کے سلسلے میں پرنسپل کے ذریعہ تجویز کردہ یونیفارم کے بارے میں شکایت کرنے کی غرض سے سرسید کے پاس گئے تھے۔ اسی وقت سرسید کے رہائشی کمرے (یعنی وہ بڑا ہال جہاں سرسید دن میں کام کرتے تھے) ہی میں موجود ایک ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگا دیا گیا۔ سید محمود بھی وہاں آگئے (یہ بالکل عام معمول کا کھانا تھا) سرسید اور سید محمود نے عبدالحق صاحب اور ان کے ساتھی کو کھانا کھانے کے لیے مدعو کیا۔ لیکن جب انھوں نے تکلف کیا تو کہا اچھا آکر ہمارے ساتھ میز پر بیٹھ جاؤ۔ وہیں باتیں ہوتی رہیں۔ انہیں باتوں کے دوران سرسید نے پرنسپل کے ذریعہ نافذ کیے گئے یونیفارم کے قاعدے پر اپنی سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور خاصے برہم ہو گئے جس کا تذکرہ عبدالحق صاحب نے مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے:

> ''یہ سنتے ہی سید صاحب جلال میں آگئے۔ کانٹا ایک طرف اور چھری

دوسری طرف جا پڑی۔ فرمانے لگے۔ اس میں ایک پیچ ہے وہ میری عمر بھر کی محنت کو خاک میں ملانا چاہتا ہے''۔۸۳؎

یہاں اس واقعہ کے اصل متن سے درگزر کرتے ہوئے ہم صرف یہ دکھلانا چاہتے تھے کہ عام معمول کا کھانا بھی سرسید چھری کانٹے سے ہی کھاتے تھے جس کی عینی شہادت مولوی عبدالحق صاحب کے تحریر کردہ اس واقعہ سے ملتی ہے۔ ایک دوسری جگہ عبدالحق صاحب سرسید کی یورپین بود وباش کی تاویلیں پیش کرتے ہوئے یہ جتلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ اصل میں اس وقت کے مسلمان شرفا کے طرز کی ہی زندگی گزارتے تھے۔ وہ اس سلسلے میں تحریر کرتے ہیں:

''کھانا وہ بے شک میز پر کھاتے تھے اور حسب ضرورت چھری کانٹا بھی استعمال کرتے تھے لیکن کھانا ان کا ہندوستانی ہوتا تھا وہی کھانا جو عموماً مسلمان شرفا کے ہاں کھایا جاتا ہے''۔۸۴؎

(نوٹ: حالاں کہ ہمیں عبدالحق صاحب کے اس بیان سے بھی اختلاف ہے۔ ہمارے خیال میں سرسید انگریزی کھانوں کو ترجیح دیتے ہوں گے کیوں کہ ہندوستانی کھانوں (مثلاً قورمہ اور چپاتی یا نان وغیرہ) کو چھری کانٹے سے کھانے میں قباحت ہوتی ہوگی۔ پھر ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ سرسید پامفریٹ اور اویسٹرز جیسے کھانوں کے ذائقوں سے واقف تھے)۔

سرسید کی یورپین بود وباش کے سلسلے کی تاویلیں پیش کرتے ہوئے عبدالحق صاحب آگے تحریر کرتے ہیں کہ:

''سید احمد خاں کے ظاہرہ حال سے دھوکا ہوسکتا ہے کہ وہ اونچے درجے کے انگریزوں کی طرح ماند و بود کرتے ہیں۔ گورنروں کو مہمان رکھتے ہیں ان کے ہم نوالہ ہیں۔ جس کے دل میں ایسا واہمہ گزرے اس کو اس بات پر بھی نظر کرنی چاہیے کہ سید کو چار و نا چار فیل بانوں کے ساتھ دوستی رکھنا پڑتی ہے۔ اور وہ بڑے پھاٹک بغیر نہیں ہوسکتی۔ اگر انگریزوں کی طرح ہائی لائف نہ رکھیں تو اعلیٰ درجے کا انگریز یا اعلیٰ درجہ کا نیٹو ان کی طرف رخ نہ کرے''۔۸۵؎

بہر حال پبلک امیج بنانے کی خاطر کچھ بھی کہا جائے لیکن یہ حقیقت ہے کہ سرسید

کی بودوباش اور رہن سہن یورپین طرز کا تھا۔ سرسید ہاؤس میں سونے، جاگنے، کھانے اور کام کے اوقات میں وقت کی پابندی برتی جاتی تھی۔ سرسید کے یہاں وہ فراغت اور بے فکری کا ماحول نظر نہیں آتا ہے جو اس زمانے کے جاگیردارانہ نظام کے پروردہ روساء کے یہاں عموماً ملتا تھا اور جن کے وقت گزاری کے مشاغل ہی ان کی مصروفیات کے موجب ہوتے تھے۔ سرسید کو اپنی مصروفیات ہی میں سے کبھی کبھی فراغت کے کچھ لمحے دوسروں کے لیے نکالنا پڑتے تھے۔ اس لیے یہ فرض کرلینا کہ سرسید کے شرکائے کار اور احباب اکثر اوقات ''سرسید ہاؤس'' میں جمع ہوکر سرسید کی صحبت سے فیض یاب ہوتے رہتے تھے صحیح معلوم نہیں ہوتا ہے۔

موسم کے لحاظ سے علی گڑھ گرمیوں میں سخت گرم اور سردیوں میں نہایت سرد رہتا ہے۔ لیکن ''سرسید ہاؤس'' جیسے 'خس پوش' بنگلے کے اندر فضا خوشگوار بنانے کے لیے وہ سب لوازمات موجود تھے جو انگریزوں کے اس زمانے کے رہائشی بنگلوں میں ہوتے تھے۔ سرسید ہاؤس میں مشرق اور مغرب میں موجود برآمدوں کے دروں پر کینولس کے موٹے پردے لگے ہوئے تھے جنھیں چرخیوں اور سوت کی رسیوں کی مدد سے لپیٹا یا کھولا جاسکتا تھا۔ گرمیوں کی دوپہر میں لو اور تپش سے محفوظ رکھنے کے لیے پردے کھول دیئے جاتے تھے۔ دروازوں پر خس کی ٹٹیاں لگادی جاتی تھیں۔ کمروں میں فرشی پنکھوں کا انتظام ہوتا تھا۔ رات اور دن کے لیے پنکھے کھینچنے والے علیحدہ علیحدہ مامور تھے۔ سردیوں کی راتوں میں سرد ہواؤں سے محفوظ رہنے کے لیے بھی برآمدے کے پردوں کا استعمال کیا جاتا تھا۔ نیز کمروں میں موجود آتش دانوں میں آگ جلاکر کمروں کو گرم رکھا جاتا تھا۔

سرسید اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود اپنے شرکا اور احباب سے قریبی تعلقات ہمیشہ قائم رکھتے تھے۔ وہ ہر آدمی کی خبر گیری کرتے رہتے تھے اور ان کے ذاتی مسائل تک کو سلجھانے میں ان کی '' کے لیے ہمیشہ تیار ہوجاتے تھے اور اس طرح کی مشکلات کا مداوا کرنے کے لیے وہ ہمیشہ وقت نکال لیتے تھے۔ ہر شخص کی صلاحیتوں کی مطابقت سے اس کے لیے کام تجویز کرنے یا کام لینے میں سرسید کو ملکہ حاصل تھا۔ جنوری ۱۸۷۹ء میں مولوی مشتاق حسین صاحب (وقار الملک) حیدرآباد میں نوکری سے معزول ہوکر علی گڑھ پہنچے تھے۔ سرسید نے فوراً ان کو ہوسٹل میں طلبا کی نگرانی اور ان کی دیکھ ریکھ کے ساتھ عمدہ تربیت پر نظر رکھنے کی ذمہ داری سونپی، اور مینجنگ کمیٹی کے مندرجہ ذیل ریزولیوشن کے ذریعہ بورڈنگ

ہاؤس ہی میں ان کے قیام اور طعام کا انتظام کروایا۔

> ''جناب مولوی مشتاق حسین صاحب ممبر کمیٹی خزینۃ البضاعت وممبر مینجنگ کمیٹی مدرسۃ العلوم خاص بورڈنگ ہاؤس میں سکونت اختیار کریں اور بورڈروں کے ساتھ بورڈنگ روم ہی میں کھانا کھایا کریں''۔[۸۶]

مولوی مشتاق حسین صاحب تقریباً تین سال تک (جب تک کہ وہ دوبارہ حیدرآباد میں اپنی نوکری پر بحال نہ ہوگئے) کالج کی یہ خدمت انجام دیتے رہے تھے۔ ساتھ ہی سرسید حتی الامکان کوشش کرتے رہے تھے کہ مشتاق حسین صاحب دوبارہ اپنی نوکری پر بحال ہوجائیں۔ مشتاق حسین صاحب سے پہلے بورڈروں کی نگرانی کی ذمہ داری سمیع اللہ خاں صاحب اور مولوی محمد کریم صاحب (ڈپٹی کلکٹر علی گڑھ) کے سپرد تھی ۱۸۸۲ء میں مشتاق حسین صاحب کے واپس حیدرآباد جانے سے پہلے ہی مولوی سمیع اللہ خاں صاحب دوبارہ مرادآباد سے ٹرانسفر ہوکر علی گڑھ پہنچ گئے تھے اور ۱۸۸۵ء میں علی گڑھ سے ٹرانسفر ہوکر رائے بریلی جانے تک وہ تواتر سے بورڈروں کی نگرانی کے فرائض پہلے کی طرح انجام دیتے رہے تھے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ۱۸۷۵ء سے ۱۸۸۵ء تک (یعنی تقریباً دس سال تک) مولوی محمد کریم صاحب، مولوی سمیع اللہ خاں صاحب اور مولوی مشتاق حسین صاحب (وقار الملک) نے ہوسٹلوں میں رہنے والے طلبا کے لیے معلمِ اخلاق اور ضامن دین ہونے کے فرائض انجام دیئے تھے۔ لیکن شومیٔ قسمت کہ ۱۸۸۹ء میں ٹرسٹیوں کے سلسلے کا قانون پاس ہونے کے بعد انہی حضرات نے ہی سرسید کی مخالفت کا جھنڈا بھی سب سے پہلے بلند کیا تھا۔

کرنل گریہم کی زندگی کا المیہ:

سرسید کے دوست اور پہلے سوانح نگار کرنل گریہم کی زندگی کے متعلق جب ہم نے معلومات جمع کرنی چاہی تو ہمیں بہت زیادہ کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ ہمیں سرسید کے خط (بنام وقار الملک مورخہ ۴؍اگست ۱۸۹۰ء) سے یہ اطلاع ضرور ملتی ہے کہ گریہم ۱۸۹۰ء سے کافی پہلے پنشن لے کر واپس انگلستان چلے گئے تھے۔ غالباً وقار الملک حیدآباد میں کسی عہدے پر تقرری کے لیے کرنل گریہم کا نام تجویز کرنا چاہتے تھے جس کے سلسلے میں انھوں

نے سر سید سے مشورہ کرنے کی غرض سے ایک کانفیڈینشل خط ارسال کیا تھا۔ سر سید نے اس خط کے جواب (مورخہ ۴؍ اگست ۱۸۹۰ء) میں تحریر کیا تھا کہ:

''گریہم صاحب سے بہتر کوئی شخص نہیں ہے۔ مسلمانوں کے دوست، مسلمان ریاستوں کے دوست، ہندوستانیوں سے نہایت بے تکلفی، محبت، دوستی اور یگانت سے ملنے والے، کوئی تفرقے کا خیال گویا کہ نہیں ہے۔ وہ سویز تک اپنی بیٹی کی شادی کسی افسر کے ساتھ کرنے کو آئے تھے۔ مجھے لکھا تھا کہ میں تم سے ملنے کو آؤں گا، مگر نہیں آئے۔ انھوں نے پنشن لے لی، اس لیے کہ بوڑھے ہوگئے تھے اور میرے نزدیک بڑا سبب یہ تھا کہ ان کو اپنے لڑکوں کی تربیت اور کسی کام میں لگانا مقصود تھا۔ ایک لڑکا آسٹریلیا بھیج دیا ہے کسی کارخانے میں، ایک لڑکا فوجی مدرسہ میں ہے۔ شاید پاس ہوگیا ہو۔ بہر حال جو کچھ آپ نے پوچھا ہے جب تک ان سے دریافت نہ کیا جاوے جواب دنیا مشکل ہے، بلکہ نہیں دیا جاسکتا ہے۔ ایک یہ بھی امر ہے کہ ان کو توقع تھی کہ لندن میں معلوم نہیں کہاں اور کیوں کر کوئی تعلق ہونے والا تھا۔ جس پر وہ بہت خوش تھے۔ مگر جہاں تک میں خیال کرسکتا ہوں وہ نہیں ہوا اور اگر ہوگیا ہو تو ان کا آنا محال ہے اور اگر نہ ہوا ہو تو بھی میری دانست میں آنا مشکل بظن غالب ہے۔ اس تحریر کے بعد جو آپ کی ہدایت ہوگی اس کی تعمیل کی جاوے گی آپ کا عنایت نامہ چوں کہ کانفیڈینشل ہے لہذا بجنسہ واپس ہے''۔ ۸۷

ہندوستان سے انگلستان واپس جانے کے بعد کرنل گریہم نے کس طور سے زندگی گزاری اور کب تک زندہ رہے۔ اس سلسلے میں ہمیں بہت زیادہ اطلاعات حاصل نہ ہوسکیں لیکن جو تھوڑی بہت معلومات حاصل ہوسکی وہ بہت خوش کن نہیں ہے۔

برٹش نو آبادیاتی گورنمنٹ کا وہ پولیس افسر جو اپنی سروس کے دوران ہندوستان کے اضلاع میں بے تاج کا بادشاہ ہوا کرتا تھا، جس کو صرف وردی پہنانے اور جوتے چمکانے کے لیے علیحدہ ''اردلی'' ملا کرتا تھا۔ وہ آدمی اپنی آخری عمر میں کس کسمپرسی کی حالت میں زندگی گزار رہا تھا اس کا اندازہ ہمیں کرنل گریہم کے اس خط سے ہوا جو انھوں نے محسن

الملک جناب مہدی علی خاں کو لکھا تھا۔ اس خط پر کوئی تاریخ تحریر نہیں ہے لیکن غالباً یہ ۱۹۰۵ء میں لکھا گیا تھا۔ (حالاں کہ خط میں بہت سے الفاظ وجگہوں کے نام اور کئی سطور صحیح طور پر پڑھی نہ جاسکیں لیکن پھر بھی خط کا مرکزی متن خاصا واضح ہے جو اس طرح ہے):

مائی ڈیر مہدی علی

میں تھوڑی سی مصیبت میں ہوں اور اپنے دیرینہ دوست سے اس میں رجوع کررہا ہوں اور آئندہ بھی مدد کا خواہاں رہوں گا۔ تم امیر وکبیر ہو۔ لیکن ہم اس دولت کو اپنے ساتھ دوسری دنیا میں نہیں لے جاسکتے ہیں۔ اگر مجھے مدد نہ ملی تو میں اور میرا خاندان تباہ وبرباد ہو جائے گا۔ تم میرا مطلب سمجھ گئے ہوگے۔ میں نے مسلمانوں کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ کیا اب وہ میرے لیے کچھ نہ کریں گے۔ محمود نے ۱۸۸۵ء میں علی گڑھ میں ایک ڈنر کے موقع پر اپنی تقریر میں کہا تھا کہ ''جب تک کہ ہندوستان کے مسلمان میرے والد کو یاد رکھیں گے اس وقت تک وہ کرنل گریہم کو بھی خراج عقیدت پیش کرتے رہیں گے''۔ غالباً اسی طرح کا کوئی جملہ کہا تھا۔ کیا وہ اپنے کہنے اور کرنے کو یاد کرسکتے ہیں۔ میرے عزیز دوست مجھے کچھ روپیہ کی ضرورت ہے اور اگر تم مجھے دوسو پونڈ دے سکو یا پھر سو پونڈ ابھی اس خط کے ملنے کے بعد ادھار اور ۴۰۰ پونڈ بعد میں مہیا کرواسکو تو میں تباہی سے بچ سکتا ہوں۔ ہندوستانی مسلمان کثیر التعداد ہیں اور ان پر اپنے دیرینہ دوست کی مدد کے لیے اس حقیر رقم کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ میرے سامنے میری ڈائری موجود ہے جس میں رچمونڈ بیڈفورڈ پارک اور شہر کے خوش آئند دنوں کی یادیں درج ہیں۔ کیا تم بھول چکے ہو؟...... میری چاروں لڑکیاں...... کافی عرصہ ہوا انتقال کرگئی...... میرا لڑکا جو اس وقت اسکول میں تھا جب تم یہاں آئے تھے...... اب ڈیون (Devon) میں ہے اور افریقہ کی پوری مہم کے دوران جنگ میں شریک رہا تھا...... اور...... وہ سب سے پہلے اس پہاڑی کے اوپر پہنچا تھا جہاں بورگن موجود تھیں۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی تباہ وبرباد

ہو جائے گا۔ خدا کے لیے میرے عزیز دوست مجھ سے رفاقت نبھاؤ اگر ممکن ہو تو مجھے تار سے بھیجو۔ ''گراہم پوسٹ آفس، باتھ'' ہاں تب ہی میں تباہی سے بچ سکتا ہوں۔ بے چاری مسز گراہم صدمہ سے نڈھال ہیں، یہ دنیا کیسی ہے، حقیقت کہانیوں سے کتنی مختلف ہے، میں ٦٦ سال کا ہو رہا ہوں اور گٹھیا، انفلوائنزا اور پریشانیوں سے گھرا ہوا ہوں۔ خدا حافظ میرے عزیز دوست، مجھے امید ہے تم ضروری دوستی نبھاؤ گے''۔[۸۸]

ہمیشہ تمہارا

جی ایف آئی گراہم

ہمیں نہیں معلوم کہ آئندہ کیا حالات ہوئے محسن الملک نے کرنل گراہم کی کچھ مدد کی بھی یا نہیں۔ لیکن اس خط سے ہمیں یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ کرنل گراہم کی آخری عمر خاصی کسمپرسی کی حالت میں بسر ہوئی تھی۔

سرسید ہاؤس کے چند مکین:

یوں تو سرسید ہاؤس میں سرسید کے صاحبزادگان یعنی سید محمود اور سید حامد گاہے گاہے آتے رہتے تھے (سید محمود الہ آباد سے اپنی پریکٹس ترک کرنے کے بعد کئی مہینوں تک تواتر سے سرسید ہاؤس میں مقیم رہے تھے) اس کے علاوہ سرسید کے بھتیجے سید محمد احمد خاں صاحب بھی اکثر اپنے اہل و عیال کے ساتھ آتے رہتے تھے۔ لیکن سرسید کے تین نواسے (یعنی سرسید کے بڑے بھائی سید محمد خاں کی صاحبزادی کے صاحبزادگان) یعنی سید محمد علی، سید محمود علی اور سید احمد علی مستقلاً سرسید کے ساتھ سرسید ہاؤس میں رہتے تھے۔ مختلف ضمنی حوالہ جات کی بنا پر ہمارا قیاس ہے کہ سید احمد علی (جو تینوں بھائیوں میں سب سے بڑے تھے) غالباً ۱۸٦۰ء کے آس پاس پیدا ہوئے ہوں گے۔ وہ ان چند طالب علموں میں سے ایک تھے جنھوں نے ۱۸۷۵ء میں ابتدائی مدرسہ جاری ہونے کے بعد مدرسۃ العلوم میں داخلہ لیا تھا۔ طفیل احمد صاحب کی ۱۸۹۵ء میں مرتب کی گئی ڈائریکٹری کے مطابق سید محمد علی نے ۱۸۸٦ء میں بی اے پاس کیا تھا۔ بی اے پاس کرنے کے بعد بھی وہ کافی عرصہ تک سرسید کے پرسنل سکریٹری کی حیثیت سے کام کرتے رہے تھے۔ ہمارے مفروضہ کے مطابق

۱۸۸۸ء میں ان کی شادی سر سید نے اپنی اکلوتی پوتی یعنی سید حامد کی صاحبزادی احمدی بیگم سے کر دی تھی۔ سید محمد علی نے بعد میں عدلیہ کی سروس اختیار کی تھی، ۱۸۹۵ء میں وہ ہمیر پور میں 'جنٹ مجسٹریٹ' کی حیثیت سے کام کر رہے تھے ۱۹۱۸ء میں ریٹائرمنٹ کے وقت سید محمد علی مراد آباد میں دسٹرکٹ جج کی حیثیت سے متعین تھے۔ نواب اسحاق خاں صاحب کے انتقال کے بعد سید محمد علی خاں صاحب سکریٹری ٹرسٹیان مدرسۃ العلوم کے عہدے کے لیے منتخب کیے گئے تھے (حالاں کہ نواب اسحاق خاں صاحب کی علالت کے زمانے میں بھی وہ قائم مقام سکریٹری کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے نامزد کیے گئے تھے)۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام آپ ہی کے دور سکریٹری شپ میں عمل میں آیا تھا۔ یونیورسٹی کے قیام کے بعد سید محمد علی پہلے آنریری ٹریژرار بھی مقرر ہوئے تھے۔ ۱۹۲۲ء تک آپ نے ٹریژرار کی حیثیت سے یونیورسٹی کی خدمات انجام دی تھیں۔ غالباً ۱۹۲۴ء میں آپ کا انتقال ہوا تھا۔ سید محمد علی کے منجھلے بھائی کا نام سید محمود علی تھا۔ یہ بھی اپنے بھائی کے ساتھ سر سید ہاؤس میں رہتے تھے۔ سید محمود علی سید محمد علی سے چار پانچ سال چھوٹے تھے انھوں نے ایم اے او کالج سے بی اے کا امتحان ۱۸۹۲ء میں پاس کیا تھا۔ اسی سے ہم نے اندازہ لگایا کہ وہ اپنے بڑے بھائی سید محمد علی سے چار پانچ سال چھوٹے ہوں گے کیوں کہ سید محمد علی نے ۱۸۸۶ء میں گریجویشن مکمل کر لیا تھا۔ سید محمود علی ۱۸۹۲ء کے پہلے ہی سے تپ دق کے مہلک مرض میں مبتلا ہو گئے تھے اور اسی کی وجہ سے کچھ عرصہ بعد ان کا دہلی میں انتقال ہو گیا تھا۔ ۱۸۷۰ء کے بعد سر سید کے خاندان میں یہ پہلی موت تھی۔ ۱۸۷۰ء میں سر سید کی صغیر سن صاحبزادی آمنہ بیگم کا انتقال ہوا تھا اس وقت سر سید مع اپنے دونوں صاحبزادگان کے انگلستان میں تھے۔

سید احمد علی تینوں بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ سید احمد علی نے ۱۸۹۴ء میں بی اے اور ۱۸۹۶ء میں ایم اے کا امتحان پاس کیا تھا۔ ہمارے مفروضہ کے مطابق سید احمد علی اپنے منجھلے بھائی سید محمود علی سے تقریباً دو یا تین سال چھوٹے تھے۔ سید احمد علی نے پوسٹ گریجویشن کرنے کے بعد گورنمنٹ کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ ۱۸۹۷ء میں ان کا ڈپٹی کلکٹر کے بطور تقرر ہو گیا تھا۔ وہ اپنی سروس کے دوران میرٹھ اور علی گڑھ میں بھی بطور ڈپٹی کلکٹر متعین رہے تھے۔ سید احمد علی صاحب نے علی گڑھ میں (موجودہ پرانی چنگی کے قریب) ایک بڑا بنگلہ اپنی رہائش کے لیے تعمیر کروایا تھا۔ اس بنگلہ کو انھوں نے ۱۹۲۰ء میں کالج کے ہاتھوں ساڑھے چھ ہزار روپے میں فروخت کر دیا تھا۔ سید راس مسعود کے ایک خط

سے اطلاع ملتی ہے کہ سید احمد علی صاحب کے صاحبزادے سید عابد احمد علی ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ عربی میں لکچرر کے بطور مقرر تھے اور پی ایچ ڈی کرنے کی غرض سے آکسفورڈ جانے کے لیے کوشاں تھے۔ سید احمد علی نے ۱۸۹۶ء میں ایم اے پاس کرنے کے بعد کچھ عرصہ تک سرسید کے پرسنل سکریٹری خواجہ وجیہ الدین صاحب کی غیر موجودگی میں عارضی طور پر سرسید کے پرسنل اسسٹنٹ کے بطور بھی کام کیا تھا۔ جس کی شہادت سرسید کے خط بنام ایجنٹ بینک آف بنگال، آگرہ مورخہ ۱۳ر اپریل ۱۸۹۷ء سے ملتی ہے۔ جس میں انھوں نے تحریر کیا تھا کہ:

''میں یہاں یہ اطلاع بھی دینا چاہتا ہوں کہ چوں کہ خواجہ وجیہ الدین کو ایک کام کے سلسلے میں میں نے باہر بھیجا ہے اور وہ یہاں موجود نہیں ہیں اس لیے ان کی غیر موجودگی میں میرے نواسہ سید احمد علی، ایم اے۔ میرے عارضی ایکٹنگ پرسنل اسسٹنٹ کے بطور کام کریں گے''۔ ۸۹

(نوٹ: اس زمانے میں خواجہ وجیہ الدین سرسید کے پرسنل اسسٹنٹ کے بطور کام کر رہے تھے یہ سید محمود کی بیگم صاحبہ کے سگے بھائی تھے)

سرسید کے پرسنل اسسٹنٹ کے بطور مختلف لوگوں نے مختلف ادوار میں کام کیا تھا۔ ۱۸۷۹ء میں جب وہ وائسرائے کی لیجسلیٹیو کونسل کے ممبر نامزد ہوئے تھے اس وقت مولوی ابوالحسن صاحب ان کے پرسنل اسسٹنٹ کے بطور کام کر رہے تھے اس کی شہادت سرسید کی مندرجہ ذیل 'سند خوشنودی' مورخہ ۱۴ر جنوری ۱۸۸۱ء سے ملتی ہے جو انھوں نے مولوی ابوالحسن صاحب کو دی تھی:

''دو برس تک یعنی جب تک کہ میں گورنمنٹ آف انڈیا لیجسلیٹیو کونسل میں ممبر رہا مولوی ابوالحسن میرے پاس بطور پرسنل اسسٹنٹ کے رہے۔ اس عہدے کے لیے مجھے ایسے شخص کی مدد درکار تھی جو انگریزی میں لائق ہو۔ سب سے زیادہ یہ کہ ایماندار اور معتمد و رازدار ہو۔ یہ سب صفتیں مولوی ابوالحسن میں موجود تھیں۔ اور میں تصدیق کرتا ہوں کہ انھوں نے مجھ کو اس مشکل کام میں ہر طرح کی مدد دی اور نہایت ایمانداری اور معتمدی اور رازداری سے کام کیا اور ان کی

انگریزی کی قابلیت اور لیاقت نے مجھ کو بڑی مدد دی۔ وہ برابر کلکتہ
وشملہ میں میرے ساتھ رہے۔ پس میں احسان مندی کے ساتھ یہ
سرٹیفکیٹ ان کو دیتا ہوں۔[۹۰]

مقام علی گڑھ سید احمد

۱۴ر جنوری ۱۸۸۱ء

مسلم ایجوکیشنل کانگریس کا قیام:

مسلم ایجوکیشنل کانگریس کا قیام ۱۸۸۶ء میں عمل میں آیا اور اس کا پہلا اجلاس ۲۷ر دسمبر ۱۸۸۶ء کو علی گڑھ میں منعقد ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایم اے او کالج کی بنیادیں خاصی مستحکم ہو چکی تھیں۔ نوجوان انگریز پروفیسروں کی ایک عمدہ ٹیم کالج میں موجود تھی۔ مذہبی معاملات میں روایتی نہج پر چلنے والے وہ بزرگ جو سرسید کی ایما پر کالج میں طلبا کے لیے معلم اخلاق اور ضامن دین کے بطور موجود رہتے تھے۔ (تاکہ قوم کو ضمانت دی جاسکے کہ ان کی موجودگی میں سرسید کے 'پراگندہ' خیالات طلبا کی اخلاقی ودینی تربیت کے دوران منفی اثرات مرتب نہ کرسکیں گے) اب ایک ایک کرکے کالج سے رخصت ہو چکے تھے۔ (اس سلسلے میں مولوی محمد کریم، مولوی سمیع اللہ خاں، مولوی مشتاق حسین (وقار الملک) کے نام خصوصیت سے لیے جاسکتے ہیں) اسی کے ساتھ ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ حالاں کہ سرسید نے کانگریس کے اولین اجلاس کو نظرانداز کردیا تھا۔ لیکن جب کانگریس کا دوسرا اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا تو سرسید نے کانگریس کی کارروائیوں کو تمام ہندوستانیوں کے لیے عموماً اور مسلمانوں کے لیے خصوصاً مضرت رساں قرار دیا۔ سرسید کا یہ ردِ عمل دراصل ان کی اس نفسیات کی غمازی کرتا ہے جس کی جڑیں ۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت کے بعد روا رکھے گئے انگریزوں کے ظلم وستم وسفاکی اور بربریت کے رویہ میں پنہاں نظر آتی ہیں۔ جس کے نتیجہ میں ہمارے ایک مفروضہ کے مطابق سارا شمالی ہندوستان انگریزوں کے عدل وانصاف، عمدہ ایڈمنسٹریشن اور اعلیٰ تہذیب وتمدن کے گن گاتے ہوئے ایک طرح کے 'اسٹاک ہوم سنڈرم' میں مبتلا ہو گیا تھا[۹۱] جس میں سرسید بھی شامل تھے۔ لیکن سرسید کبھی اس نفسیاتی سنڈروم سے باہر نہ نکل سکے۔ ان کا یقین تھا کہ انگریزی حکومت سے کسی طرح کا 'تصادم' ملک کو تباہی وبربادی کے غار میں ڈھکیل سکتا ہے، وہ انگریزی حکومت کی طاقت

سے واقف تھے اور ہر صورت میں ہندوستان کے مفلس ونادار نہتے عوام کو انگریزوں سے ٹکراؤ کے بجائے مصالحت اور دوستی کی تلقین کرتے تھے جس میں ان کے یقین کے مطابق ہندوستانی عوام کی فلاح و بہبود کا راز پوشیدہ تھا۔ مجھے گاندھی جی کے اہنسا، عدم تعاون اور ستیا گرہ کی تلقین میں بھی انگریزی حکومت سے ''سیدھے ٹکراؤ'' سے تہی دامنی کا یہ عنصر پنہاں نظر آتا ہے۔ (ہوسکتا ہے کہ اس میں ساؤتھ افریقہ میں ہوئے واقعات کی نفسیات شامل ہو) لیکن گاندھی جی اور سرسید کے رویوں میں نمایاں فرق یہی نظر آتا ہے کہ گاندھی جی کے یہاں انگریزوں سے سیدھے ٹکراؤ سے تہی دامنی کسی 'نفسیاتی سنڈرم' کا نتیجہ ہونے کے بجائے ایک سوچی سمجھی حکمتِ عملی کے بطور نظر آتی ہے۔ جس نے ہندوستان کے مفلس ونادار نہتے عوام کو انگریزوں کے خلاف لڑنے کے لیے ایک کارگر ہتھیار مہیا کروادیا تھا۔ لیکن اس سب کے باوجود سرسید کی ''کانگریس مخالفت'' کے سلسلے میں ہم ان کی نیک نیتی پر شک نہیں کرسکتے ہیں۔ بلکہ ان کے اس عمل کو اس زمانے کے حالات کے تناظر میں ہندوستانی عوام کی فلاح و بہبود کے سلسلے میں نہایت خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ کی گئی کوششوں پر محمول کیا جانا چاہیے۔ اس سلسلے میں پنڈت جواہر لال نہرو کا مندرجہ ذیل اقتباس سرسید کے رویہ کو سمجھنے میں خاصا معاون ثابت ہوسکتا ہے۔

> ''مگر سب سے زیادہ شغف انہیں (یعنی سرسید کو) جدید تعلیم کو رواج دینے سے تھا۔ قومی تحریک کے شروع ہونے سے وہ بہت کھٹکے تھے کیوں کہ ان کو یہ اندیشہ تھا کہ اگر برطانوی حکام کی ذرا سی بھی مخالفت کی گئی تو وہ اپنے تعلیمی پروگرام میں ان کی مدد سے محروم ہوجائیں گے۔ وہ اس مدد کو بہت ضروری سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے مسلمانوں میں برطانیہ کی مخالفت کو دھیما کرنے کی کوشش کی اور ان کو نیشنل کانگریس سے جو اس وقت تشکیل پارہی تھی دور رکھا''۔۹۲

سرسید نے اس وقت تک عام مسلمانوں تک پہنچنے کے لیے کوئی باقاعدہ کوشش نہیں کی تھی۔ ان کی انگریزی اور جدید تعلیم کی تحریک ایم اے او کالج کے سلسلے کی چند کمیٹیوں کے ذریعہ ریاستوں کے سربراہوں، شمالی ہندوستان کے زمینداروں اور کچہری کلچر سے متعلق شرفا تک ہی محدود تھی۔ لیکن کانگریس کے قیام کے بعد مسلمانوں کو سیاست سے دور رکھنے اور جدید تعلیم کے میدان میں اپنے آپ کو مستحکم کرنے کا پیغام عام کرنے کے لیے

۱۸۸۶ء میں 'مسلم ایجوکیشنل کانگریس' کا قیام عمل میں آیا تھا۔ حالاں کہ بعد میں کانگریس کی مخالفت کو زیادہ وسیع اور فعال بنانے کے ارادے سے سرسید نے مختلف ادوار میں دو تنظیمیں اور بنائی تھیں یعنی ۱۸۸۷ء میں انڈین پٹیریاٹک ایسوسی ایشن (جس کے پہلے صدر راجہ صاحب آف بنارس تھے) اور ۱۸۹۳ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفینس ایسوسی ایشن آف انڈیا۔ مسلم ایجوکیشنل کانگریس ایک طرح سے پہلی تنظیم تھی جس کے ذریعہ سرسید اپنا تعلیمی مشن عام لوگوں تک لے جانے کے متمنی تھے۔ ۱۸۹۰ء میں اس کا نام تبدیل کر کے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کر دیا گیا تھا۔ جو اس تنظیم کے اس وقت کے مقاصد کا پوری طرح احاطہ کرتا تھا کیوں کہ پچھلے تین چار برسوں میں اس تنظیم کے مقاصد میں کانگریس کی مخالفت کا عنصر بتدریج کم ہو گیا تھا اور مسلمانوں میں جدید تعلیم کو عام کرنے کا مقصد غالب آ گیا تھا۔ (غالباً یہی وجہ تھی کہ کانگریس کی سیاسی مخالفت کے لیے سرسید کو ۱۸۹۳ء میں ایک نئی تنظیم تشکیل دینی پڑی تھی) اس تنظیم نے (یعنی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے) سرسید کے اُن تمام رفقا اور شرکا کو ایک اہم پلیٹ فارم مہیا کروا دیا تھا جو ایم اے او کالج کے قیام اور استحکام کے بعد سے اپنے لیے ایک ایسے لائحہ عمل کی تلاش میں تھے جو اُن کو قومی خدمت کے اشتراک اور عمل کے سلسلے میں ایک پرخلوص اور بامعنی نصب العین فراہم کرا سکے۔

پرنسپل مسٹر بیک اور سمیع اللہ خاں:

مولوی محمد اکبر صاحب جو عربی کے پروفیسر ہونے کے ساتھ ساتھ بورڈنگ ہاؤس کے منیجر کی حیثیت سے بورڈنگ ہاؤس کے انتظامات اور طلبا کی نگہداشت کے ذمہ دار بھی تھے ان کا جولائی ۱۸۸۶ء میں انتقال ہو گیا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد مولوی سلیمان صاحب کو بورڈنگ ہاؤس کے منیجر کے بطور مقرر کیا گیا تھا۔ مولوی سلیمان صاحب کو اس طرح کے کام کا بہت زیادہ تجربہ نہیں تھا۔ طلبا ان کے انتظام سے مطمئن نہیں تھے۔ اسی وجہ سے روز روز ڈائننگ ہال کے کھانے اور بورڈنگ ہاؤس کے انتظام کے سلسلے کی شکایتیں سرسید کے پاس پہنچنے لگی تھیں۔ جس کے نتیجے کے بطور بورڈنگ ہاؤس میں رہنے والے طلبا کو خود اپنی ایک کمیٹی بنا کر کھانے اور کمروں وغیرہ کی صفائی کے انتظامات کی دیکھ ریکھ کرنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ اس کمیٹی کے قیام کے بعد بورڈنگ ہاؤس اور ڈائننگ ہال کے انتظامات کے سلسلے میں مولوی محمد سلیمان صاحب سے طلبا کے اختلافات بڑھتے چلے گئے

تھے، نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک روز ایک طالب علم نے مولوی صاحب کو مارنے کی دھمکی دے ڈالی، سرسید اس زمانے میں پبلک سروس کمیشن کے ممبر ہونے کی حیثیت سے الہ آباد گئے ہوئے تھے۔ پرنسپل تھیوڈور بیک کے پاس جب یہ شکایت پہنچی تو انھوں نے اپنے طور پر انکوائری کرنے کے بعد اس طالب علم کو جس نے مولوی صاحب کو مارنے کی دھمکی دی تھی، کالج سے نکال دیا۔ لیکن دو تین مہینوں کے بعد جب سمیع اللہ خاں صاحب رائے بریلی سے علی گڑھ تشریف لائے تو انھوں نے اس لڑکے کو پرنسپل کی مرضی کے خلاف دوبارہ کالج میں داخلہ دلوادیا۔[۹۳] دراصل سمیع اللہ خاں صاحب کا یہ عمل اس رویہ کی طرف اشارہ کرتا ہے جو آج تک علی گڑھ میں رائج ہے۔ جس کی رو سے چند بااثر لوگ ڈسپلن شکنی کے مرتکب طلبا کو معافی دلوا کر قوم کی خدمت کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں حالاں کہ ان کے اس عمل سے خود قوم کو آئندہ کتنا نقصان پہنچتا ہے اور ادارے میں ڈسپلن قائم رکھنے میں کتنی دقتیں پیش آتی ہیں اس پر کوئی دھیان نہیں دیتا ہے۔ غرض اس طالب علم کے داخلے کے بعد سے نئے پرنسپل نے کالج کمیٹی سے اس بات پر اصرار شروع کردیا کہ کالج اور بورڈنگ ہاؤس کے ڈسپلن کے معاملات میں پرنسپل کو پورے اختیارات ہونا چاہیں اور یہیں سے انگریز پرنسپل اور روایتی قومی ہمدردی کے حامل ممبران کالج کمیٹی کے درمیان ایک سرد جنگ کا آغاز ہوا تھا جس کی پیشوائی ہمیشہ سمیع اللہ خاں صاحب کرتے رہے تھے۔

کالج میں پہلی اسٹرائیک:

مندرجہ بالا واقعہ کے بعد بورڈنگ ہاؤس کے منیجر مولوی سلیمان صاحب کی مشکلات کچھ اور بڑھ گئی تھیں وہ اکثر سرسید کے پاس طلبا کی بورڈنگ ہاؤس کے معاملات میں بیجامداخلت کی شکایات لے کر پہنچنے لگے تھے۔ ان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ طلبا کام کے سلسلے میں نوکروں کے ساتھ بیجاسختی اور مار پیٹ کرتے تھے جس کی وجہ سے نوکر بھاگ جاتے تھے اور ان کو روز روز نئے نوکر تلاش کرنے میں بہت دشواری ہوتی تھی۔ مولوی صاحب کی اس شکایت میں کافی سچائی تھی۔ اسی وجہ سے سرسید نے نوٹس نکلوا کر طلبا کو آگاہ کیا کہ ''اگر آئندہ کوئی طالب علم نوکروں کے ساتھ مار پیٹ کرے گا تو اسے کالج سے خارج کردیا جائے گا''۔[۹۴] اس نوٹس کا طلبا پر منفی ردعمل ہوا۔ انھوں نے کہنا شروع کردیا کہ سید صاحب ہمارے مقابلے میں نوکروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ یعنی 'شریفوں' کے مقابلے میں

'رذیلوں' کو ترجیح دی جاتی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر نوکروں کی شکایتوں پر طلبا کا کالج سے اخراج ہونے لگا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ ہمارے نوکر نہ ہو کر ہمارے حاکم ہو گئے۔ غرض جتنے منھ اتنی باتیں ہونے لگیں۔ لیکن جلد ہی اس سلسلے میں ایک بڑا مسئلہ اس وقت کھڑا ہو گیا جب ایک طالب علم سید حسین نے رات میں ڈائننگ ہال سے کھانا لا کر ان کے کمرے میں رکھنے کی ہدایت کے باوجود کمرے میں کھانا نہ پا کر (جسے غالباً بلی کھا گئی تھی) نوکر کو مارا جس کی شکایت سید صاحب تک پہنچی۔ سرسید نے فوراً ایک نوٹس نکال کر ہدایت کی کہ سید حسین شام تک بورڈنگ ہاؤس چھوڑ دیں۔ کیوں کہ ان کو کالج سے خارج کیا جاتا ہے۔ اس نوٹس کے ردعمل کے بطور کچھ لڑکے پکی بارک کے کمرا نمبر ایک کے سامنے جمع ہوئے جس میں عزیز مرزا (صدر سٹڈنس یونین کلب) رہتے تھے اور باہم مشورے کے بعد ایک اپیل سید صاحب کی خدمت میں بھیجی گئی جس میں لکھا گیا تھا کہ اگر نوکر کو مارنے کے جرم میں کسی طالب علم کو بورڈنگ ہاؤس سے خارج کیا جائے گا تو اس کے نتیجہ میں نوکر بہت خودسر ہو جائیں گے جس کی وجہ سے طلبا نہ صرف بے عزت ہوں گے بلکہ ان کو کافی تکلیف بھی اٹھانا پڑے گی اس لیے آپ سے درخواست ہے کہ آپ سید حسین کو بورڈنگ ہاؤس سے خارج کرنے کا حکم واپس لے لیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد سرسید کا اس اپیل کے سلسلے کا جواب طلبا کے پاس پہنچ گیا۔ جس میں تحریر تھا کہ:

> ''تمہاری خودسری حد سے بڑھ گئی ہے۔ تم ہر شخص کو بے ایمان سمجھتے ہو اور اپنے آپ کو ایماندار۔ منیجر بورڈنگ ہاؤس پر الزامات لگاتے ہو۔ میرا حکم نہیں بدل سکتا۔ سید حسین کو خلاف قاعدہ نوکر کو مارنے پر بورڈنگ ہاؤس چھوڑنا پڑے گا۔'' ۹۵

اس جواب کے بعد لڑکے پکی بارک میں اس جگہ پر جمع ہونا شروع ہو گئے جہاں اب یونیورسٹی کی مسجد ہے۔ اتنے میں سرسید مسجد کے دروازے سے اپنی بگھی میں تشریف لائے۔ سرسید کو اطلاع ملی تھی کہ طلبا بورڈنگ ہاؤس چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ بگھی سے اتر کر وہ اُس طرف بڑھے جہاں طلبا جمع تھے۔ ایک طالب علم احمد معظم نے ان کو آتے دیکھ کر سلام کیا۔ ''السلام علیکم'' سرسید غصہ میں تھے انھوں نے اپنا بید اوپر اٹھایا اور یہ کہتے ہوئے اس کی طرف لپکے ''دھت تیرے سلام علیک کی'' طلبا سہم کر پیچھے ہٹے۔ سرسید نے زور زور سے ڈانٹنا شروع کیا۔ ''نکل جاؤ یہاں سے''۔ ''فوراً چلے جاؤ''۔ سرسید اس قدر طیش میں تھے کہ

وہاں موجود لوگوں کو (یعنی فریدالدین احمد خاں صاحب وغیرہ کو) سرسید کو روکنا پڑا اور بہت منت وسماجت کر کے انہیں بگھی میں سوار کروا کر واپس گھر جانے کے لیے راضی کرنا پڑا۔ وہ بگھی میں بیٹھتے وقت بھی بار بار یہی کہے جارہے تھے ''نکالو ان کو یہاں سے''۔ فوراً ''انہیں یہاں سے نکالو'' فریدالدین صاحب نے ان سے وعدہ کیا کہ آپ گھر تشریف لے چلیے ہم لوگ ان کو ابھی یہاں سے نکال دیں گے۔ اس کے بعد طلبا نے اپنا سامان باندھنا شروع کر دیا اور سارا سامان لا کر کرکٹ میدان میں جمع کر دیا۔ پرنسپل اور دوسرے اساتذہ بھی موقع پر پہنچ گئے۔ مسٹر بیک اور مسٹر ریلے نے طلبا کو روکنے کی بہت کوشش کی بلکہ یہ اعلان بھی کیا کہ جو طالب علم اس وقت بورڈنگ ہاؤس چھوڑ کر جائے گا اس کو پھر بورڈنگ ہاؤس میں واپس نہیں آنے دیا جائے گا اور وہ یونیورسٹی کے امتحان میں بھی شرکت نہیں کر سکے گا۔ لیکن ان سب دھمکیوں کے باوجود بورڈنگ ہاؤس کے تقریباً دو تہائی طالب علم بورڈنگ ہاؤس چھوڑ کر چلے گئے۔ میر ولایت حسین کے مطابق یہ طلبا رسل گنج میں واقع ایک خام سرائے میں منتقل ہو گئے تھے۔

لیکن محمد امین صاحب اپنے مضمون ''۱۸۷۸ء کا علی گڑھ کالج'' میں طلبا کے شہر میں منتقل ہونے کے سلسلے میں تحریر کرتے ہیں کہ:

> ''جب پہلی اسٹرائیک (کالج میں) ہوئی تو طلبا ظہور گیٹ پر جمع ہو گئے۔ جہاں قصبہ جلالی کے میر صاحب بھی مجمع میں موجود تھے۔ انھوں نے بورڈروں سے کہا میرا گھر حاضر ہے وہاں تشریف لے چلو۔ فوراً یکے اور گاڑیاں موجود ہو گئیں اور شورش کرنے والے طلبا میر صاحب کی بڑی حویلی میں جو وسط شہر میں ہے پہنچ گئے۔ پلاؤ زردے کی دیگیں چڑھ گئیں اور عبداللہ تھیٹریکل کمپنی کے منیجر فری پاس لے کر حاضر ہو گئے کہ جب تک آپ لوگوں کا قیام میر صاحب کی حویلی میں ہے مفت تھیٹر دیکھیے۔ پھر کیا تھا۔ دن عید اور رات شب برات''۔[۹۶]

غرض یہ طے ہے کہ اسٹرائیک کرنے والے طلبا کو شہر کے روسا نے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا اور خوب خوب خاطر ومدارات کی گئی تھیں۔ یہ ایک طرح سے انگریز پروفیسروں اور سرسید کے ذریعہ کالج میں دی جارہی انگریزی تعلیم اور تربیت کے خلاف عام روسا کے جذبات کا اظہار تھا۔ بچے تو پھر بچے ہوتے ہیں۔ اس خاطر ومدارات کے نتیجہ میں ان کا دماغ عرش

معلی پر پہنچ گیا۔ اسی وجہ سے جب دوسرے دن پرنسپل مسٹر بیک کی ایما پر میر ولایت حسین طلبا کو سمجھا بجھا کر واپس چلنے پر آمادہ کرنے کے لیے تشریف لائے تو سر برآوردہ طلبا نے اول جلول شرائط ان کے سامنے رکھنا شروع کر دیں۔ میر امام علی نے طلبا کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا کہ ہم واپس آنے کے لیے تیار ہیں بشرطہ کہ پرنسپل مسٹر بیک، مینیجر بورڈنگ ہاؤس مولوی سلیمان صاحب اور منشی محمد سعید خاں (گڑھ کپتان) کو کالج سے نکال دیا جائے۔ میر ولایت حسین صاحب لکھتے ہیں کہ انھوں نے جب استفسار کیا کہ پرنسپل مسٹر بیک اور مینیجر بورڈنگ ہاؤس کا تو تم سے تعلق ہے اس لیے ان کے استعفیٰ کے مطالبہ کا مقصد تو سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن منشی محمد سعید خاں سے تمہارا کیا لینا دینا (منشی صاحب تعمیرات کی دیکھ ریکھ پر مامور تھے) انہیں کیوں اس مسئلے میں گھسیٹ رہے ہو۔ اس پر امام علی نے جواب دیا کہ:

''سانپوں کی موسی (خالہ) تو گڑھ کپتان ہی ہیں۔ یہ بورڈنگ ہاؤس کے قریب رہتے ہیں اور بورڈنگ ہاؤس کی جھوٹی سچی خبریں لے جاتے ہیں اور سید صاحب کو سنا کر ہماری طرف سے برہم کرتے ہیں۔ اس لیے ان کا نکالا جانا بہت ضروری ہے''۔[۹۷]

بہر حال اس مصالحتی مشن سے میر ولایت حسین ناکام واپس ہوئے۔ دوسرے دن پرنسپل تھیوڈور بیک خود طلبا کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ تم کچھ چھوٹے لڑکوں کو جن کے والدین نے ان کو ہمارے سپرد کیا ہے ورغلا کر بورڈنگ ہاؤس سے لے آئے ہو۔ ان کو ہمارے سپرد کر دو، ورنہ پولیس کی معرفت ان کو تم سے واپس لیں گے۔ چنانچہ بعض کمسن طلبا (مثلاً زین الدین وغیرہ) کو اپنے ہمراہ واپس لے آئے۔ لیکن ابھی طلبا کے حوصلے پست نہیں ہوئے تھے۔ انھوں نے مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کو تار دے کر رائے بریلی سے علی گڑھ بلوایا۔ مولوی سمیع اللہ خاں صاحب نے طلبا اور پرنسپل مسٹر بیک کے درمیان مصالحت کروانے کی کوششیں شروع کیں۔ سمیع اللہ خاں صاحب کے کہنے سے طلبا بورڈنگ ہاؤس میں واپس آنے کے لیے تیار ہو گئے لیکن مسٹر بیک نے شرط لگائی کہ بغیر معافی مانگے انہیں بورڈنگ ہاؤس میں واپس نہیں لیا جائے گا۔ مسٹر بیک نے معافی نامہ کے بطور ایک فارم تیار کیا تھا جس پر دستخط کر کے ہر طالب علم کو انفرادی طور پر پرنسپل سے معافی مانگنی تھی اور جب پرنسپل اس فارم پر دستخط کر کے اس طالب علم کا قصور معاف کر دے تو اس طالب علم کو اسی فارم کے ساتھ سرسید کے پاس جانا تھا جب وہ بھی اس فارم پر دستخط کر کے اس طالب علم

کا قصور معاف کر دیں اس کے بعد ہی وہ طالب علم بورڈنگ ہاؤس میں داخل ہو سکتا تھا۔ طلبا معافی مانگنے کے لیے قطعی تیار نہ ہوئے۔ سمیع اللہ خاں صاحب نے بہت کوشش کی کہ طلبا کو بغیر معافی مانگے بورڈنگ ہاؤس میں واپس آنے کی اجازت دے دی جائے لیکن مسٹر بیک کسی صورت معافی مانگے بغیر طلبا کو واپس لینے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ آخر زچ ہو کر سمیع اللہ خاں نے طلبا سے کہا کہ میں مسٹر بیک کو راضی کرنے میں ناکام ہو گیا ہوں اس لیے اب دو ہی صورتیں بچی ہیں یعنی یا تو تم لوگ معافی مانگ کر واپس بورڈنگ ہاؤس میں چلے جاؤ یا پھر دوسری صورت میں اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے جاؤ۔ اور گھر جانے کے لیے جس طالب علم کے پاس کرایہ نہ ہو اس کو کرایہ میں اپنے پاس سے دینے کے لیے تیار ہوں۔ غرض اس کے بعد مولوی سمیع اللہ خاں صاحب دل برداشتہ واپس رائے بریلی چلے گئے۔ اس سلسلے میں میر ولایت حسین لکھتے ہیں کہ:

> ''جب طلبا کو مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کا بھی سہارا نہ رہا تو پھر مجبور ہو کر روز بروز معافی نامہ پر دستخط کر کے اول بیک صاحب کے پاس لاتے تھے اور پھر سید صاحب کے پاس لے جاتے تھے اور بورڈنگ ہاؤس واپس آجاتے تھے۔ رفتہ رفتہ بجز ان چند طلبا کے (مثلاً مظہر الحق، عزیز مرزا، عبدالمجید، شوکت علی) جن کو مسٹر بیک نے سرغنہ قرار دے کر واپس لینے سے انکار کر دیا تھا۔ باقی تقریباً سب واپس آگئے۔ اب طلبا کو معلوم ہو گیا کہ مسٹر بیک جو چاہتے ہیں وہی ہوتا ہے۔ اس لیے بیک کے خلاف ہونے میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اب بیک صاحب کا اثر کالج میں ہو گیا بیک صاحب نے کسی طالب علم کو یونیورسٹی کے امتحان سے خارج نہیں کرایا، کچھ عرصہ بعد عزیز مرزا اور مظہر الحق بھی کالج میں واپس آگئے''۔ ۹۸

اس اسٹرائیک کے ناکام ہونے کے بعد طلبا کو اندازہ ہو گیا تھا کہ کالج اور اس کے بورڈنگ ہاؤس میں رہنے کے لیے انہیں اپنے اساتذہ کے بنائے ہوئے قواعد و قوانین کی پابندی کرنی ہوگی اور قانون شکنی کی صورت میں سزا بھی بھگتنی ہوگی۔ اس حقیقت کے ذہن نشین ہونے کے بعد کالج اور بورڈنگ ہاؤس کے اندر طلبا کے ڈسپلن کا معیار بہت بہتر ہو گیا تھا۔ لیکن دوسری طرف اس اسٹرائیک کے خاتمے کے بعد سے سمیع اللہ خاں صاحب اور

ان کے چند ساتھیوں نے عام طور پر انگریز پروفیسروں اور خاص طور پر مسٹر بیک اور ان کی حمایت کرنے کے الزام میں خود سر سید کے خلاف درپردہ بہتان تراشی کا مورچہ کھول دیا تھا۔

روایتی اقدار اور نئے افکار کا ٹکراؤ:

پرنسپل مسٹر تھیوڈور بیک اور سمیع اللہ خاں کے اختلافات کی ابتدا اس وقت ہوئی تھی جب مسٹر بیک کے ذریعہ خارج کیے گئے ایک طالب علم کو سمیع اللہ خاں صاحب نے پرنسپل کی مرضی کے خلاف دوبارہ کالج میں داخلہ دلوادیا تھا۔لیکن اس حالیہ اسٹرائیک کے دوران رونما ہونے والے واقعات نے ان اختلافات میں نہ صرف شدت پیدا کردی تھی بلکہ یہ ایک سیدھے تصادم کی شکل میں سامنے آگئے تھے۔اس تصادم میں سید صاحب پوری طرح مسٹر بیک اور دوسرے انگریز پروفسروں کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے نظر آتے ہیں (بلکہ اکثر ان کی حفاظت کے لیے ایک ڈھال کا کام کرتے ہیں) اس کے برخلاف علی گڑھ بلند شہر اور مرادآباد کے بیشتر زمین دار اور دوسرے صاحبِ حیثیت لوگ (ظاہرہ یا درپردہ) سمیع اللہ خاں کی حمایت کررہے تھے۔غرض یہ کالج کی انتظامیہ کے اندر ایک طرح سے روایتی اقدار کے حامل بزرگوں اور نئے خیالات وافکار کے حامل لوگوں کے درمیان اقتدار حاصل کرنے کی (غالباً پہلی) ایک کوشش تھی۔جس میں نئے خیالات وافکار کے حامل لوگوں کو سخت کشمکش کے بعد سبقت حاصل ہوگئی تھی۔لیکن اس سبقت کے باوجود سر سید اور ان کے ساتھ انگریز پروفیسر کالج کے مستقبل کے بارے میں فکر مند ہوگئے تھے۔

قانون ٹرسٹیان کی ضرورت کا احساس:

انگریز پروفیسروں کو خدشہ تھا کہ اگر سر سید کے بعد سمیع اللہ خاں صاحب یا پھر انہیں کی طرزِ فکر کا حامل کوئی شخص کالج کمیٹی کا سکریٹری مقرر کردیا گیا تو یہ عمل کالج کے مستقبل کے لیے نہایت مضر رساں ہوگا۔سر سید ان کے خدشات وخیالات سے پوری طرح متفق تھے اور اس سلسلے میں جلد از جلد کوئی ایسی سبیل نکالنا چاہتے تھے جس سے ان خدشات کا ازالہ کیا جاسکے اور کالج کا مستقبل محفوظ رہ سکے۔

مسٹر بیک کا خیال تھا کہ سر سید کے بعد جو بھی ان کا جانشین مقرر کیا جاوے وہ ایک ایسا شخص ہونا چاہیے جو تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ انگریزی اور جدید تعلیم کی اہمیت اور تقاضوں کے علاوہ اس طرح کی جدید تعلیم کو عام کرنے کے لیے جس طرح کا ماحول

اور لوازمات درکار ہوتے ہیں ان سے بھی واقفیت رکھتا ہو۔ مسٹر بیک کا خیال تھا کہ سید محمود ہی تنہا ایک ایسے شخص ہیں جن میں یہ تمام خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اس لیے ان کا خیال تھا کہ سرسید کو اپنی زندگی ہی میں سید محمود کو اپنا قانونی جانشین مقرر کر دینا چاہیے۔

پرنسپل بیک یہ بھی چاہتے تھے کہ انگریز پروفیسروں کی ملازمت کے سلسلے کے قاعدے قانون باقاعدہ وضع کیے جائیں، جن میں پروفیسروں کی لیاقت، انتخاب، چھٹیاں، تنخواہ، ترقی اور ریٹائرمنٹ کی عمر وغیرہ کے سلسلے کی تفصیلات کی باقاعدہ وضاحت کر دی جائے اسی کے ساتھ کالج کے طلبا کی تعلیم اور ڈسپلن سے متعلق کل اختیارات کالج کے پرنسپل کے سپرد ہونے چاہئیں۔

ابھی تک کالج کے سلسلے کے مختلف کاموں کو انجام دینے کے لیے کوئی جامع اور مستقل قانون موجود نہیں تھا۔ بلکہ کالج فنڈ کمیٹی کی ذیلی کمیٹیاں (جن کی تعداد پانچ تھی) مختلف کاموں کو انجام دینے کے لیے وقتاً فوقتاً مختلف قواعد و قوانین وضع کرتی رہتی تھیں۔ اسی لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ کالج کے مختلف نوعیت کے کاموں کو چلانے کے لیے ایک جامع قانون وضع کیا جائے جو کالج سے متعلق کل ضروریات کا احاطہ کر سکے۔ اس سلسلے میں کالج فنڈ کمیٹی کے اجلاس منعقدہ ۱۱ر مارچ ۱۸۸۸ء میں سرسید نے نئے قانون کی ضرورت اور اہمیت کے پیش نظر کمیٹی سے اس نئے قانون کو وضع کرنے کی اجازت حاصل کر لی اور اس بل کا مسودہ تیار کرنے کے لیے کمیٹی نے مسٹر آرتھر اسٹریچی کو نامزد کیا اور ساتھ ہی مسٹر اسٹریچی کی مدد اور مشاورت کے لیے سید محمود اور مسٹر تھیوڈور بیک کو مقرر کیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد جب اس بل کا مسودہ تیار ہو گیا تو اس کی کاپیاں ٹرسٹیوں کے درمیان مشتہر کی گئیں۔ مسودے کے مشتہر ہوتے ہی سرسید کی مخالفت میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔

قانون ٹرسٹیان کی مخالفت:

''قانون ٹرسٹیان'' کے مسودے میں انگریز پروفیسروں کی ملازمت کے سلسلے کی جملہ شرائط وضع کرنے کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی واضح کر دیا گیا تھا کہ کالج کے پرنسپل اور اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے علاوہ کم از کم دو پروفیسر انگریز ہوں گے۔ کالج اور بورڈنگ ہاؤس میں ڈسپلن قائم کرنے کے سلسلے کی کل ذمہ داری کالج کے پرنسپل کی ہوگی۔ نیز سید محمود سرسید کے ساتھ لائف جوائنٹ سکریٹری ہوں گے جو موجودہ سکریٹری (یعنی سرسید) کے

بعد خود بخود ٹرسٹیوں کے لائف سکریٹری مقرر ہو جاویں گے۔ غرض اس قانون کے مسودے کے مشتہر ہوتے ہی سرسید کی مخالفت میں ایک طوفان بپا ہو گیا۔ جس کی پیشوائی سمیع اللہ خاں صاحب کر رہے تھے۔ سمیع اللہ خاں صاحب اور ان کے ہم خیالوں کو سب سے بڑا اعتراض اس بات پر تھا کہ مجوزہ قانون میں کالج کے انگریز اسٹاف اور خاص طور پر کالج کے انگریز پرنسپل کو بہت زیادہ اختیارات اور مراعات دی گئی ہیں۔ ساتھ ہی ان کے خیال میں سید محمود کو جوائنٹ لائف سکریٹری نامزد کر کے سرسید نے ''کنبہ پروری'' کی مثال قائم کی ہے۔ اس ''بل'' کی سب سے پرزور مخالفت انہیں لوگوں نے کی تھی جو کہیں نہ کہیں اپنے ذہن میں اس بات کی آس لگائے بیٹھے تھے کہ سرسید کے بعد کالج کے انتظام کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں آجائے گی۔ اس میں مولوی سمیع اللہ خاں صاحب پیش پیش تھے جن کے ہراول دستہ میں خواجہ محمد یوسف صاحب، مولوی محمد کریم صاحب اور مولوی مشتاق حسین صاحب (وقار الملک) سب سے زیادہ نمایاں تھے۔ بقول میر ولایت حسین، مولوی مشتاق حسین صاحب نے سرسید سے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ''آپ امیر معاویہ کی پیروی کرتے ہیں جس نے یزید کو اپنی زندگی میں اپنا جانشین بنایا تھا اسی طرح آپ سید محمود کو اپنا جانشین بنا رہے ہیں جو نامناسب ہے''۔ ۹۹ بیشتر روٴسا علی گڑھ، بلند شہر و مراد آباد مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کے طرفدار تھے اور اسی لیے اس بل کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے تھے۔ مارچ ۱۸۸۸ء سے دسمبر ۱۸۸۹ء تک یعنی ٹرسٹیوں کے واسطے بنائے جانے والے قانون کی اجازت حاصل کرنے سے لے کر کمیٹی میں اسے پاس کروانے تک سرسید کو کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا، کس کس طرح کے الزامات ان کے اوپر لگائے گئے تھے اور کیسے کیسے بہتان ان کے خلاف تراشے گئے تھے اس سب کا اندازہ اس زمانے میں سرسید کے ذریعہ مختلف لوگوں سے کی گئی خط و کتابت سے بخوبی ہوتا ہے۔ (جو زیادہ تر شائع ہو کر منظر عام پر آچکی ہے) اسی طرح اس زمانے کے حالات کا اندازہ سرسید کے تحریر کردہ مضمون بعنوان ''مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے تاریخی حالات'' ۱۰۰ سے بھی کیا جا سکتا ہے جس میں سرسید نے نہایت دیانتداری، سچائی اور صدق دل سے یہ واضح کیا ہے کہ وہ کون سی ضروریات تھیں اور وہ کون سے حالات تھے جن کی وجہ سے ''قانون ٹرسٹیان'' بنانے کی ضرورت پڑی تھی اور وہ کون سی مجبوریاں تھیں جن کے تحت سید محمود کو قانونی طور پر آئندہ کے لیے لائف سکریٹری مقرر کیا گیا تھا۔ سرسید کی اس وقت کتنی مخالفت ہوئی تھی اس کا اندازہ سرسید کے مندرجہ ذیل

اقتباس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

''مگر افسوس کہ مخالفت ہوئی اور ایسی بری طرح پر جس نے نہ صرف اشخاص کو بلکہ قوم کو بدنام کیا۔ مخالفت رائے سے نہ رہی بلکہ عداوت ذاتیات تک نوبت پہنچ گئی۔ رسالے چھپے اخباروں میں آرٹیکل چھپے۔ انگریزی میں پمفلٹ چھاپ چھاپ کر ہندوستان میں تقسیم ہوئے اور کوئی درجہ مخالفت کا باقی نہ چھوڑا اور بقول پایونیر کے ثابت ہوگیا کہ مسلمانوں میں یہ قابلیت نہیں ہے کہ کوئی بڑا کام اتفاق سے کر سکیں''۔ [۱۰۱]

قانون ٹرسٹیان اور سرسید کے مخالفین کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لیے قارئین خواجہ محمد یوسف صاحب کی کتاب بعنوان ''ازالۃ الاوہم'' [۱۰۲] (جو محمڈن پریس علی گڑھ میں طبع ہوئی تھی، سنہ اشاعت نہ معلوم) سے مستفید ہو سکتے ہیں جس میں ''قانونِ ٹرسٹیان'' کے ذریعہ سید محمود کو اپنا جانشین بنانے کے خلاف سمیع اللہ خاں صاحب کے احتجاج اور مخالفت کو جائز ٹھہراتے ہوئے سرسید اور مسٹر بیک کے دور میں مدرسۃ العلوم کے بورڈنگوں کے انتظام کا سمیع اللہ خاں صاحب کے زمانہ میں بورڈنگوں کے انتظام سے موازنہ کرتے ہوئے سمیع اللہ خاں صاحب کو ایک عمدہ منتظم اور قوم کا سچا ہمدرد ثابت کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ سرسید کے بجائے سمیع اللہ خاں صاحب ہی اصل بانی مدرسۃ العلوم ہیں۔

اس زمانے میں ذاتیات پر جس طرح کے رکیک حملے کیے گئے ان میں ایک معاملہ کالج کی عمارتوں کی تعمیر کا بھی تھا اس مد میں جس طرح کے الزامات عائد کرنے کی کوشش کی گئی تھی اس سلسلے میں سرسید تحریر کرتے ہیں کہ:

''ہمارے دوستوں نے اس پمفلٹ میں جو خاص علی گڑھ میں چھاپ کر مشتہر کر دیا ہے کہ تعمیر کا کام سکریٹری اس لیے اپنے اختیار میں رکھتے ہیں کہ ان کو بھی نفع کثیر ہوا کرے''۔ [۱۰۳]

سرسید کو اس تمام عرصہ میں کس قدر تلخ تجربات ہوئے تھے اس کا اندازہ اس کہانی سے لگایا جا سکتا ہے جو میر ولایت حسین کے مطابق سرسید نے اپنے مخالفین کے سلسلے میں لکھی

تھی ۔ جسے ہم قارئین کی دلچسپی کے لیے ذیل میں نقل کر رہے ہیں ۔ اس کہانی میں سرسید نے اپنے موافقوں کو شیر اور مخالفین کو گیدڑ سے تشبیہہ دی ہے۔

''ایک شخص اپنے وطن سے جلاوطن ہو کر ادھر ادھر پھرتا تھا اور اپنے بنی نوع کے مصائب کا رنج وغم اس کا رفیق تھا۔ اتفاقاً اس کا گزر ایک جگہ ہوا۔ اس نے وہیں جھونپڑا ڈال کر رہنا شروع کر دیا اور غم غلط کرنا چاہا۔ وہاں کی آب وہوا راس آئی اور وہ شخص موٹا تازہ فربہ چکنا چپڑا ہو گیا۔ وہ خطہ دلکش تھا۔ وہاں گیدڑ اور شیر رہتے تھے اور ادھر ادھر سے آ کر بھی جمع ہو جاتے تھے۔ ایک دفعہ شیروں نے اسے آ کر دیکھا کہ یہ صیاد تو نہیں ہے۔ ٹکٹکی لگائی غور سے گھورا اور سمجھے کی صیاد نہیں ہے بلکہ اس جنگل کے تمام جانوروں کی خدمات کرتا ہے۔ سب کے ساتھ محبت کرتا ہے ہم کو بھی اس کے ساتھ محبت کرنی چاہیے۔ گیدڑ بھی اس کی چھپریا کے گرد حلقہ باندھے رہتے تھے ٹکٹکی لگائے گھورا کرتے تھے اور مونچھیں پھڑ کایا کرتے تھے اور سوچتے تھے کہ اب یہ خوب موٹا وفربہ ہو گیا ہے یہ مرے تو اس کی لاش کو خوب مزے سے کھاویں ۔ کوئی سوچتا تھا کہ سینہ کا گوشت اچھا ہوگا اور کوئی سوچتا تھا کہ سر کا بھیجا مزیدار ہوگا۔ اس جنگل کا پرانا رہنے والا گیدڑ جو اوروں سے کمزور تھا اسی سوچ اور رنج میں تھا کہ باہر والے سب حصہ بٹا لیتے ہیں ہائے مجھے کیا ملے گا۔ یہ بدنیت مردہ خور مردہ لاش کے کھانے کی امید میں اس طرح بیٹھے تکا کرتے تھے کہ شیروں کو ان کے منصوبہ کی خبر لگی ۔ وہ آئے اور ان سے پوچھا کہ تم یہاں کیوں جمع ہو اور اس شخص کے گرد جس نے تمہاری بہت کچھ خدمت کی ہے، کیوں ٹکٹکی لگائے ہوئے ہو، دل میں تو تھا کچھ اور کہنے لگے کچھ اور۔ شیروں نے کہا جب تک اصلی دل کی بات نہ کہو گے چھٹکارا نہیں۔ اب ایک دوسرے کو دیکھتا ہے کہ پہلے وہ کچھ کہے تو میں کہوں۔ ہمارا سردار اشارہ کرے تو میں کہوں اتنے میں غیب سے آواز آئی کہ کہہ کیوں نہیں دیتے کہ ہم مردہ خور ہیں مدت سے منتظر بیٹھے ہیں کہ یہ شخص

مرے تو اس کی لاش کو کھائیں اس آواز کو سن کر شیر چوکنا ہوئے اور تلاش کرنے لگے کہ یہ کون تھا''۔۱۰۴

اس کہانی کے ساتھ ہی میر ولایت حسین نے سرسید کا بیان کردہ مندرجہ ذیل واقعہ بھی اپنی آپ بیتی میں درج کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید اس وقت روایت پرستی اور پرانے خیالات کے پروردہ لوگوں کے خلاف صف آرا تھے اور اس کا ان کو پورا احساس تھا۔ اس احساس ہی نے ان کو اس مخالفت کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی ہمت اور طاقت عطا کی تھی۔

''ہم نے سنا ہے کہ ہمارے چند دوست ایک جگہ جمع تھے اور قومی ہمدردی کے سبب اس بات پر غور کرتے تھے کہ سید احمد خاں کے بعد مدرسۃ العلوم کا کیا حال ہوگا۔ ایک دوست نے کہا کچھ اندیشہ کی بات نہیں ہے۔ تعلیم کی ضرورت پر اب ہر ایک شخص کو یقین ہوگیا ہے اور مدرسۃ العلوم اب تیار ہوگیا ہے۔ بنی بنائی چیز کا ہاتھ میں لینا ہر ایک شخص پسند کرے گا۔ آمدنی بھی اس قدر ہے کہ موجودہ حالت قائم رہ سکتی ہے۔ اور سید احمد خاں کے مرنے سے اس میں کچھ نقصان نہیں ہوسکتا کیوں کہ بہ ظاہر وہ آمدنی مستقل ہے۔ دوسرے دوست نے فرمایا کہ ہاں سچ ہے کچھ شک نہیں کہ سید احمد خاں کے بعد ان کے مر جانے پر بورڈنگ ہاؤس میں اس قدر اخراجات نہیں ہونے کے اور طالب علم زیادہ آویں گے کالج و اسکول میں بھی۔ سید احمد خاں نے خرچ بہت بڑھا رکھا ہے۔ کم تنخواہ کے لوگ مقرر ہوکر بہت تخفیف سے کام چل سکے گا اور ان کے مرجانے پر جو اور روکاوٹیں ہیں وہ بھی جاتی رہیں گی۔ میں اپنے دوستوں کا نہایت شکر گزار ہوں کہ ان کو مدرسۃ العلوم کی اس قدر فکر ہے اور اس کے لیے دور اندیشیاں جو میری عین تمنا ہے فرماتے ہیں۔ اگر مجھ کو یقین ہوجاوے کہ میری زندگی مدرسۃ العلوم کے لیے ایک رکاوٹ ہے تو میں خودکشی کے لیے تیار ہوں تاکہ ہمارے دوستوں کو مدرسۃ العلوم کی ترقی کے لیے کچھ انتظار نہ کھینچنا پڑے۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارے دوستوں کے اب تک وہ ٹکیل پرانے خیالات میں وہ بورڈنگ ہاؤس کو ایسے ہی لوگوں سے

بھرنا چاہتے ہیں جو مسجدوں میں مردوں کی فاتحہ کی روٹیاں کھانے پر بسر اوقات کرتے ہیں۔ افسوس ہے کہ ان کو تعلیم کی بھی ابھی قدر نہیں ہوئی۔ تھوڑی تنخواہ کے ٹیچر اور پروفیسر کیا تعلیم دے سکتے ہیں۔ انھوں نے کبھی چار روپیہ سے زیادہ تنخواہ کا میانجی دیکھا ہی نہیں بلاشبہ ایک میانجی کو پانچ سو روپیہ ملنا تو ان کو متعجب کرتا ہوگا''۔ ۱۰۵

غرض ''قانونِ ٹرسٹیان'' کو لے کر سرسید کی اس قدر مخالفت ہوئی تھی کہ بیان کرنا مشکل ہے۔ بس اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سرسید کے قریبی دوست اور احباب بھی ان سے شاکی ہوگئے تھے۔ سمیع اللہ خاں صاحب سے تو نااتفاقی اس قدر بڑھی تھی کہ آخیر دم تک دوبارہ تعلقات استوار نہ ہو سکے تھے۔ شدید مخالفت اور موافقت کے دوران اسی مسودے کو کالج فنڈ کمیٹی کے اجلاس منعقدہ ۲۱ر دسمبر ۱۸۸۹ء میں منظوری کے لیے پیش کیا گیا جہاں یہ قانون ۲۷ ووٹوں کی اکثریت سے پاس ہوگیا تھا۔ اس کی مخالفت میں ۲۳ ووٹ اور موافقت میں ۵۰ ووٹ پڑے تھے۔ مخالفت کے طوفان کے دوران ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس قانون کو کمیٹی سے پاس کروانا سرسید کے لیے ناممکن ہو جائے گا۔ لیکن جب قانون پر ٹرسٹیوں کی بڑی اکثریت نے اپنی رضامندی کی مہر لگادی تو ایسا محسوس ہوا جیسے سرسید کے موقف کو تمام تر جذباتی تگ ودو کے باوجود ٹرسٹیوں نے ہمدردی سے سمجھنے کی کوشش کی تھی اور اس پر اپنی منظوری کی مہر لگا کر ایک بار پھر کالج کے سلسلے میں سرسید کی حکمت عملی کو استحکام پہنچایا تھا۔ اس واقعہ کے بعد ہی سمیع اللہ خاں اور ان کے چند ساتھی مدرسۃ العلوم سے کنارہ کش ہوگئے تھے۔ مشتاق احمد صاحب (وقار الملک) نے اسی میٹنگ میں اکثریت کے فیصلے کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہوئے ادارے سے وابستہ رہنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اگر اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ آخیر اس زمانے میں سرسید کی اتنے بڑے پیمانے پر مخالفت کیوں ہوئی تھی تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کی متعدد وجوہات تھیں جن میں ایک وجہ سرسید کی اپنے فکر و عمل کے سلسلے میں بڑھتی ہوئی خود اعتمادی بھی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ مختلف مذہبی، سماجی اور ثقافتی معاملات میں اب زیادہ کھلے انداز میں اپنے ''لبرل'' رویوں کا اظہار کرنے لگے تھے۔ (جن کی مثالیں ہم آئندہ پیش کریں گے) جس کی وجہ سے عام لوگ تو کجا خود ان کے اپنے احباب بھی ان سے پوری طرح مطمئن نظر نہیں آتے تھے اور بتدریج مشکوک ہوتے چلے جارہے تھے۔

سر سید کو، کے سی ایس آئی کا خطاب:

یہ وہ زمانہ تھا جب کئی چیزیں ایک کے بعد ایک رونما ہو رہی تھیں جنھوں نے سر سید کی سماجی اور سیاسی حیثیت کو مزید تقویت پہنچائی تھی ان سب میں سب سے اہم چیز تھی سر سید کو ''سر'' کے خطاب سے نوازا جانا۔

یکم جنوری ۱۸۸۸ء کو سر سید کو ''نائٹ کمانڈر آف دی اسٹار آف انڈیا'' کا خطاب دیئے جانے کا اعلان ہوا تھا۔ (سند اور تمغہ ۱۴ر مئی ۱۸۸۸ء کو ایک مخصوص جلسے میں دیا گیا تھا)[۱۰۶] عام طور پر ''سر'' کا خطاب ہندوستان میں کسی شخص کے لیے سب سے بڑا اعزاز ملنے کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت شاید ہی کوئی ایسا ذی حیثیت شخص ہوگا جس کو اس اعزاز کو حاصل کرنے کی خواہش نہ رہی ہوگی۔ خود سر سید اس طرح کے اعزازات کا کس قدر پاس اور احترام کیا کرتے تھے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ تقریباً ۱۵ سال پہلے (یعنی ۱۸۷۵ء میں) جب محمد فیض علی خاں بہادر نے کالج کے احاطہ میں ایک دروازہ تعمیر کروانے کے لیے چندہ دیا تھا تو سر سید نے اس بات کا تذکرہ کالج فنڈ کمیٹی کے اجلاس منعقدہ ۱۲ر نومبر ۱۸۷۵ء کی روداد میں ان الفاظ میں کیا تھا:

> ''نواب ممتاز الدولہ محمد فیض علی خاں بہادر نے اپنی حبیب خاص سے واسطہ تعمیر ایک دروازہ احاطہ مدرسۃ العلوم کے روپیہ مرحمت فرمایا ہے۔ پس وہ دروازہ جو جانب گوشہ مشرقی تعمیر ہونا قرار پایا ہے۔ وہ ''فیض علی خاں دروازہ'' کے نام سے موسوم ہوا اور کتبہ ان کے نام نامی کا جس پر تمغائے ''اسٹار آف انڈیا'' بھی منقش ہو اس پر لگایا جائے''۔[۱۰۷]

قارئین کی دلچسپی کے لیے عرض ہے کہ فیض گیٹ کے ستون پر دھات میں ڈھلا ''ستارہ ہند'' کا یہ نشان آج بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ راقم نے چار سال پہلے جب برسوں کی جمی پلاستر اور پینٹ کی پرتوں کو اس تمغہ کے اوپر سے صاف کروایا تھا۔ تو اسٹار آف انڈیا کے نشان کے اوپر نقش یہ عبارت بھی پڑھنے میں آئی تھی:

"Heaven's light our Guide"

(دیکھیے راقم کی کتاب ''سر سید اور فن تعمیر، ۲۰۰۱ء، تصویر نمبر ۹)

ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس خطاب کے ملنے سے سر سید کی ایک دیرینہ خواہش کی تکمیل

ہوئی تھی۔ اس خطاب کے ملنے کے پہلے دن سے ''سر'' کا لقب سید احمد خاں کے نام کا ایک اٹوٹ حصہ بن گیا تھا۔ جیسے یہ لقب صرف سرسید کے نام ہی کا لاینفک جز بننے کے لیے ہی تجویز ہوا تھا۔ عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ کانگریس کی مخالفت کرنے اور خاص طور پر دسمبر ۱۸۸۷ء میں لکھنؤ میں منعقد ہونے والے ایجوکیشنل کانگریس کے اجلاس کے دوران قیصر باغ کی بارہ دری میں مسلمانوں کے ایک بڑے جلسے عام میں تقریر کرتے ہوئے سرسید نے اپنے جن سیاسی خیالات کا اظہار کیا تھا اسی کے صلہ کے بطور سرسید کو یہ خطاب عطا کیا گیا تھا۔ سرسید کو اس خطاب سے نوازے جانے کے پس پردہ برٹش گورنمنٹ کی اپنی نیت چاہے جو بھی رہی ہو لیکن اس سلسلے میں یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ سرسید نے کانگریس کی مخالفت گورنمنٹ سے کوئی اعزاز حاصل کرنے کے لیے ہرگز نہیں کی تھی۔ اس کے برخلاف سرسید نے اپنی پوری نیک نیتی اور صدق دل کے ساتھ کانگریس کے قیام کو عموماً پورے ملک کے لیے اور خصوصاً مسلمانوں کے لیے مضر رساں قرار دیا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ برٹش راج کو سرسید کی مسلمانوں کو سیاست سے دور رہنے کی تلقین میں اپنی ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کی پالیسی کے لیے کافی روشن امکانات نظر آئے ہوں گے۔ اس لیے اس بات کا قوی امکان ہے کہ انگریزوں نے سرسید کی مسلمانوں کو سیاست سے علیحدہ رہنے کی تلقین کو سراہتے ہوئے انہیں اس اعزاز سے نوازا ہو۔ سرسید کو ''سر'' کے خطاب سے نوازے جانے سے جہاں ایک طرف ان کے ہم عصر روسا میں کسی حد تک رقابت کے جذبے کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر تھا اسی کے ساتھ دوسری طرف خود سرسید کے اندر اپنے طرزِ فکر و عمل کے سلسلے میں ایک طرح کی خود اعتمادی بھی پیدا ہوئی تھی۔ جس کے نتیجہ میں وہ مختلف تعلیمی، سماجی، سیاسی اور ثقافتی معاملات میں زیادہ بے باکی سے اپنے ''لبرل'' رویوں کا اظہار اور اطلاق کرنے لگے تھے (جس کو عمر کے ساتھ ان کی بڑھتی ہوئی ضد پر محمول کیا گیا تھا) اگر اس سلسلے میں ہم ان کے مختلف رویوں کا شروع سے جائزہ لیں تو ہم دیکھیں گے کہ ان کے وہ ''لبرل'' رویئے جن کو وہ شروع سے برتتے چلے آئے تھے ۱۸۸۸ء تک ان میں زیادہ تنوع پیدا ہو گیا تھا۔ ہم یہ بات سرسید کے فنون لطیفہ اور خاص طور پر ''پرفارمنگ آرٹس'' کے سلسلے میں ان کے نظریات میں واقع ہونے والی بتدریج تبدیلی میں واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں۔

سر سید کا لبرل ازم اور پرفارمینگ آرٹس:

سر سید نے اپنے بچپن اور جوانی میں جس ماحول میں پرورش پائی تھی۔ اس میں شعر و شاعری اور رقص و موسیقی کا دور دورہ تھا۔ سر سید کے ماموں دبیر الدولہ خواجہ زین العابدین خاں رقص و موسیقی کے شیدائی تھے۔ ان کو موسیقی سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ انھوں نے بین بجانے میں مخصوص مہارت حاصل کر لی تھی۔ سر سید سیرت فریدیہ میں لکھتے ہیں کہ:

''ایک زمانہ ایسا آتا تھا کہ ان کو بجز ان چیزوں کے شغل کے اور طرف توجہ نہیں ہوتی تھی بڑے بڑے نامی گویئے دھرپت و خیال گانے والے نوکر تھے۔ بینیں تیار ہو رہی ہیں میر ناصر احمد جو مشہور بین بجانے والے ہمت خاں اور راگ رس خاں کے نواسوں میں تھے وہ آتے تھے اور بین بجانے کے فن کے کمال کو دکھایا جاتا تھا''۔ ۱۰۸

اسی کے ساتھ سر سید تفصّل سے ان مجلسوں کا ذکر کرتے ہیں جن میں بی جنا، دھرپت و خیال گایا کرتی تھیں۔ جہاں بڑے بڑے گویئے جمع ہوتے تھے۔ خاص طور پر بہادر خاں جو ستار بجانے میں یکتا تھے اور میر ناصر احمد جو بین بجانے میں اپنی مثال نہیں رکھتے تھے۔ غرض سر سید کے کان رقص و موسیقی کے سُر اور تال سے آشنا تھے۔ اسی کے ساتھ جب وہ ۱۸۶۹ء میں یورپ گئے تو انھوں نے وہاں کے میوزیم اور آرٹ گیلریاں دیکھیں، پیرس کی مشہور ''لوور گیلری'' اور لندن میں موجود ''میڈم ٹیسوڈ میوزیم'' کا انھوں نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہاں انھوں نے اوپرا اور تھیٹر بھی دیکھے تھے۔ وہ پرفارمینگ آرٹس کی جمالیاتی کیفیات کے شعور و آگہی کے ساتھ ساتھ ان کی سماجی اہمیت اور افادیت سے بھی آشنا تھے۔ سر سید روایت پرستی کے مخالف تھے۔ وہ مسلمانوں کے مذہبی خیالات کی اصلاح اور ان کو ترقی کی طرف مائل کرنے کے لیے علومِ جدیدہ کی تعلیم کو عام کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ یعنی وہ عوام (خصوصاً مسلمان) جو انگریزوں کو اپنے مذہب اور اپنی معاشرت کا بدترین دشمن مانتے تھے۔ جن کے خیال میں انگریزوں کے سایہ تک سے بھی ان کے دین اور ایمان کو خطرہ لاحق تھا۔ انہی کے بچوں کو سر سید انگریزی پڑھانا، انگریزی لباس پہنانا اور انگریزی طرز سے رہنا اور چھری کانٹے سے کھانا کھلانے کا اہتمام کر رہے تھے۔ اسی وجہ سے عوام میں

ان کے خلاف ردعمل نہایت شدید تھا۔ اتنا شدید کہ اگر کوئی معمولی ارادے اور عقیدے کا آدمی ہوتا تو کبھی کا ان اصلاحی کاموں سے اپنا دامن جھاڑ کر الگ ہوگیا ہوتا۔ لیکن سرسید آہنی قوت ارادی کے مالک تھے۔ وہ اپنے خیالات اور عقیدے میں اتنے راسخ تھے کہ شدید مخالفت کے باوجود وہ اپنے چنیدہ راستے پر گامزن رہے۔ وہ جس چیز کو صحیح سمجھتے تھے اسے بابانگ دہل کہتے بھی تھے اور کرتے بھی تھے۔ وہ شدید مخالفت کے باوجود بینک میں روپیہ رکھتے تھے پرومیسری نوٹ خریدتے تھے اور ان سے جو سود یا منافع ملتا تھا اس کو کالج کے تعمیری کاموں میں خرچ کرتے تھے۔ انھوں نے کالج کے چندہ کے لیے لاٹری بھی ڈالی تھی۔ جس کو ان کا جوا کھیلنا قرار دیا گیا تھا۔ سرسید کے شریک کار اسماعیل خاں صاحب نے اپنے ایک انگریز جاننے والے کے ذریعہ علی گڑھ نمائش میں فوٹوگرافی کے سلسلے کا ایک اسٹال لگوایا تھا جس پر لوگوں نے کافی لعن طعن کی تھی۔ سرسید پر عوام وخواص کڑی نظر رکھتے تھے۔ ایک بار سرسید سے ان کے اپنے بایوگرافر منشی سراج الدین صاحب نے لکھ کر دریافت کیا تھا کہ:

''گھر میں تصویر رکھنے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''۔ اس سوال کے جواب میں سرسید نے انہیں لکھا تھا کہ:

> ''ان چیزوں کو موجودہ حالات میں بحث میں لانا مسلمانوں کی ترقی میں حرج ڈالنا اور ان کو متوحش اور زیادہ متنفر کرنا ہے۔ یہ امور نہایت جزییات کے ہیں جن کی بحث سے ترقی تعلیم اور ترقی تہذیب میں حرج پڑے گا۔ پس اس کو ہرگز بحث میں نہیں لانا چاہیے پہلے امورِ معظم اور اصول کو رائج کرنا چاہیے۔ تصاویر وتماثیل کے جائز وناجائز ہونے کے دلائل موجود نہیں، اس کی نسبت فیصلہ کرنا اور ناجواز کی وجواز کی وجہ بتانا نہایت دقیق اصول پر مبنی ہے۔ تصاویر کا رواج خود بخود ہوتا جاتا ہے۔ پس جو بیل چل رہا ہے اس کو آمارنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے''۔[۱۰۹]

وہ ان تمام بحثوں سے درگزر کرتے تھے جس سے قوم کی تعلیم اور ترقی میں حرج پڑنے کا کسی قسم کا کوئی امکان ہوسکتا تھا۔ لیکن عملاً ان مسائل پر اپنا رویہ واضح کرتے رہتے تھے۔ کرنل گریہم کے مطابق سرسید کے ڈرائنگ روم میں سرجان اسٹریچی، سرسالار جنگ، لارڈ لٹن اور نظام حیدرآباد کے قدِ آدم پورٹریٹ آویزاں تھے۔ بلکہ خود ان کی اپنی ایک تصویر

کالج کے لیے چندہ جمع کرنے کے واسطے قیمتاً فروخت کی جاتی تھی۔ سرجان اسٹریچی کی اہلیہ (جو ایک اچھی آرٹسٹ تھیں) نے سرسید کا ایک روغنی پورٹریٹ بھی بنایا تھا۔ مسٹر تھیوڈور بیک کے ۱۸۸۶ء میں لکھے ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید اکثر الہ آباد جاکر سرجان اسٹریچی کے گھر پر اس پورٹریٹ کی تکمیل کی خاطر آرٹسٹ کے سامنے بیٹھتے تھے۔ خیال اغلب ہے کہ اسٹریچی ہال کے تیار ہوجانے کے بعد سرسید کی جو تصویر سرجان اسٹریچی کی تصویر کے ساتھ اس ہال میں آویزاں کی گئی تھی وہ یہی تصویر تھی۔

سرسید کی آرکیالوجی میں دلچسپی کی ابتدا تو اس وقت سے نظر آتی ہے جب انھوں نے آثار الصنادید لکھی تھی۔ لیکن اس کا باقاعدہ اظہار اس وقت ہوتا ہے جب انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی میں مجسموں کا ایک نادر ذخیرہ جمع کرلیا تھا جن کی باقاعدگی کے ساتھ سوسائٹی کی عمارت کے احاطے کی دیوار کے سہارے پیڈسٹل بنا کر آرائش کی گئی تھی بعد میں یہ کلیکشن سرشاہ سلیمان کے دورِ وائس چانسلری میں سائنٹفک سوسائٹی کے احاطہ سے معین آرٹ گیلری کی عمارت میں منتقل کردیا گیا تھا اور اب یہ شعبۂ ہسٹری کے آرکیالوجیکل سیکشن میں سرسید کلیکشن کے نام سے موجود ہے۔

سرسید کو ایم اے او کالج میں سرولیم میور کی یادگار کے بطور ان کا ایک مجسمہ نصب کرنے میں بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ کالج فنڈ کمیٹی کی میٹنگ منعقدہ ۶؍جولائی ۱۸۷۵ء میں اس تجویز پر باقاعدہ غور کیا گیا تھا۔ لیکن بعد میں عام مسلمانوں کے منفی ردِّعمل کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس تجویز پر عمل نہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ ۱۱۰

پینی ریڈنگ تھیٹر:

ایم اے او کالج میں پینی ریڈنگ کلب بھی سرسید ہی کے ایما پر قائم کیا گیا تھا۔ جس میں طلبا اپنی پسند کی کوئی تحریر خاص طور پر کسی ڈرامہ سے کوئی اقتباس منتخب کرکے، کافی تیاری کے بعد، عمدہ تلفظ، لہجے اور آواز کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ کلب کے جلسوں میں پڑھتے تھے۔ اسی پینی ریڈنگ کلب کی طرف سے ۱۸۸۹ء میں سرسید نے ایک بڑا سالانہ جلسہ پینی ریڈنگ تھیٹر کے نام سے علی گڑھ نمائش کے موقع پر کرنے کا فیصلہ کیا۔ سرسید اور ان کے قریبی دوستوں کے ساتھ ساتھ طلبا اور اساتذہ کو بھی تھیٹر میں حصہ لینے کے لیے آمادہ کیا گیا اور بڑے پیمانے پر تیاریاں شروع کردی گئیں۔ ''مطالعات سرسید'' کے ماہرین نے سرسید کے اس اسٹیج شو کا تذکرہ ہمیشہ دبے لفظوں میں کیا ہے اور ہمیشہ یہ کہہ کر اس سے درگزر

کیا گیا ہے کہ سرسید کالج کے لیے چندہ جمع کرنے کے سلسلے میں کسی بھی حد تک جانے کو تیار رہتے تھے۔ یہاں تک کہ اسٹیج پر رقص کرنے میں بھی انہیں کوئی عار نہ تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ یہ اسٹیج شو کالج کے لیے چندہ جمع کرنے کے واسطے ہی کیا گیا تھا حالاں کہ جس وقت یہ شو کیا گیا تھا اس وقت کالج کی مالی حالت بہت مستحکم تھی اور ایسی کوئی فوری ضرورت نظر نہیں آتی تھی جس کے لیے چندہ جمع کرنے کے روایتی طریقوں سے ہٹ کر تھیٹر جیسا متنازعہ طریقہ اختیار کیا جاتا۔ اسی وجہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سرسید نے یہ اسٹیج شو سوچے سمجھے طریقہ پر یہ پیغام دینے کے لیے منظم کیا تھا کہ تھیٹر جس کو دیکھنا عموماً معیوب سمجھا جاتا ہے اس کے ذریعہ بھی سماج میں عمدہ تعمیری کام کیے جاسکتے ہیں۔

سرسید کے لیے اس اسٹیج شو کے کرنے کا فیصلہ بہت ہمت کا کام تھا۔ کیوں کہ غالباً ایک سال پہلے ہی جب حالی چند مہینوں کے لیے آکر ہوسٹل کے ایک چھوٹے بنگلے میں مقیم ہوئے تھے۔ اس وقت انھوں نے سرسید سے شکایت کی تھی کہ طلبا رات میں گانے کی محفلیں منعقد کرتے ہیں۔ اس واقعے کے بارے میں میر ولایت حسین اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں کہ:

> ''گرمیوں کے موسم میں چاندنی رات میں طلبا پرنسپل سے تفریح کے لیے کچھ گانے کی اجازت لے لیتے تھے اور پرنسپل صاحب چوں کہ ہمارے رسم ورواج سے واقف نہ تھے اور ان کے ہاں گانا ناچنا تفریح کی چیزیں ہیں وہ اجازت دے دیتے تھے اور مجھ کو چار و ناچار پرنسپل کے حکم کی پابندی کرنا پڑتی تھی۔ لڑکے پندرہ بیس کی ٹولیوں میں کچی بارک کے صحن میں جمع ہوکر اور اپنے ساتھ گھڑے اور مٹکے لے جاکر بجاتے تھے .... اتفاق سے ایک روز مولانا حالی بورڈنگ میں مقیم ہوئے اور انھوں نے اس گانے کا شور سنا۔ دوسرے دن انھوں نے سید صاحب سے شکایت کی کہ آپ کا بورڈنگ ہاؤس اس قابل نہیں ہے کہ کوئی بھلا آدمی اس میں آکر قیام کرے اگر طلبا کے والدین آکر اس ہوحق کو دیکھیں تو کالج سے بدظن ہوجاویں گے۔ اس لحاظ سے اس قسم کے جلسے بورڈنگ ہاؤس میں نہیں ہونے چاہئیں''۔[111]

حالی کی اس شکایت کی بنا پر سرسید نے پرنسپل کو نوٹس بھیج کر بورڈنگ ہاؤس کے

احاطے میں گانے ناچنے پر پابندی عائد کردی تھی۔ گانے ناچنے ہی پر کیا منحصر ہے۔ ایک مرتبہ چاندنی رات میں کبڈی کھیلنے پر بھی سرسید سے شکایت کی گئی تھی۔ کالج کے دو نوجوان انگریز پروفیسر، مسٹر کاکس اور مسٹر ریلے ایک رات شور وغل کی آوازیں سن کر ٹہلتے ہوئے اپنے بنگلے سے بورڈنگ ہاؤس یعنی کچی بارک میں پہنچ گئے۔ طلبا اپنے استادوں کو اپنے درمیان دیکھ کر نہال ہوگئے۔ خوب آؤ بھگت کی گئی۔ خاطر مدارات کے درمیان طلبا نے کبڈی کھیلنے کی دعوت دی۔ وہ دونوں نوجوان پروفیسر کھیل میں شامل ہوگئے۔ مسٹر کوکس اور مسٹر ریلے کی ٹیموں کے درمیان مقابلہ شروع ہوا۔ پھر کیا تھا۔ طلبا کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ ہر ایک اپنی ٹیم کی ہمت افزائی کرنے میں دوسرے سے نمبر لے جانا چاہتا تھا۔ ساری فضا قہقہوں اور تالیوں کے شور سے گونج رہی تھی کہ اسی وقت بورڈنگ ہاؤس کے منیجر پروفیسر محمد اکبر صاحب وہاں پہنچ گئے۔ ان کو دیکھ کر سناٹا چھا گیا۔ انھوں نے طلبا کو با آواز بلند ڈانٹنا شروع کردیا۔ اتنے میں مسٹر کاکس اور مسٹر ریلے آگے بڑھے۔ انگریز پروفیسروں کو طلبا کے درمیان اس حالت میں دیکھ کر مولوی محمد اکبر صاحب دم بخود رہ گئے۔ دونوں پروفیسروں نے شور وغل کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے معافی مانگی۔ محمد اکبر صاحب ''کوئی بات نہیں ہے، آپ لوگ مصروف رہیں'' کہتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔[۱۱۲] انگریز پروفیسروں کے اس طرح طلبا کے ساتھ رات گئے کبڈی کھیلنے پر خاصی چہ میگوئیاں ہوئی تھیں۔ سید صاحب کو بھی اس واقعہ کی اطلاع پہنچی تھی۔ حالاں کہ سید صاحب نے اس واقعہ کو درگزر کردیا تھا لیکن دوسرے لوگوں کے اعتراضات کی بنا پر پرنسپل کو آئندہ احتیاط برتنے کی تلقین کی گئی تھی۔

ظاہر ہے کہ ان حالات میں جب کہ قوم کی معترضانہ نظروں کے خوف سے کالج کے احاطے میں بقول شاعر ''چاندنی کو بھی حرام'' قرار دیا جاتا تھا۔ اس وقت سرسید کا نمائش میں تھیٹر کا شو پیش کرنے کا فیصلہ ایک انقلابی قدم تھا۔ اس اسٹیج شو کی خبر ملک میں جنگل کی آگ کی مانند دور دور تک پہنچ گئی تھی۔ اس سلسلے میں احمد علی شوق، مدیر اخبار ''آزاد'' کا لکھنؤ سے سرسید کے نام مندرجہ ذیل خط مورخہ ۲۳ر جنوری ۱۸۸۹ء بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے:

''میں کل سیلم پور سے لکھنؤ آیا۔ مجھے ڈاک میں تین خطوط اس بات سے متعلق ملے کہ علی گڑھ میں کوئی تھیٹر ہونے والا ہے۔ ایک خط بہت بڑے معزز دوست کا تھا کہ جناب سید صاحب خود بھی اس تھیٹر میں ایکٹ کرنے والے ہیں اور ان معزز دوست نے بڑی واویلا

مچائی تھی کہ دیکھیے اس سے مسلمانوں کی قسمت میں کتنی بدنامی لکھی ہے۔ جو مدتوں مٹائے نہ مٹے گی ۔ انھوں نے بڑی دل سوزی اور محبت کے غصہ اور گھبراہٹ میں یہ خط لکھا تھا۔ میں نے ان کو ابھی اتنا ہی جواب لکھ دیا ہے کہ آج ہی باہر سے آیا ہوں۔ لیکن عقل سے اتنا سمجھ سکتا ہوں کہ جناب سید صاحب کا فعل جو ہوگا، کسی مصلحت سے ہوگا، فضول نہ ہوگا۔ میں حضور سے اس کی کل کیفیت کا خواہاں ہوں۔ اگر کوئی قومی اور ملکی کام ہے اور مخالف ہواؤں کے جھونکوں سے اس کی حفاظت کری گئی ہے تو میں خود پارٹ لینے کو حاضر ہوں اور قطع نظر اس کے کہ مخالفت کو ڈروں یا نہ ڈروں میں حضور کے کام کا ہر طرح پابند ہوسکتا ہوں۔ مگر یہ گھبراہٹ جو معزز دوستوں میں ہے کیوں ہے اور اصلی معاملہ کیا ہے''۔[۱۱۳]

میر ولایت حسین اپنی آپ بیتی میں اس اسٹیج شو کے سلسلے میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''اس تھیٹر کے واسطے سرسید نے نمائش کے میدان میں ایک عالیشان پنڈال بنوایا تھا جب یہ بن رہا تھا تو لوگ تعجب کرتے تھے کہ سرسید کو بڑھاپے میں یہ کیا سوجھی ہے''۔[۱۱۴]

ساتھ ہی وہ آگے تحریر کرتے ہیں کہ:

''مجھ کو یاد نہیں کہ اس تھیٹر میں سب سے اعلیٰ ٹکٹ کس قیمت کا تھا۔ مگر میں نے متوسط درجہ کا ٹکٹ پانچ روپیہ میں خریدا تھا۔ اور ادنیٰ ٹکٹ ایک روپیہ کا تھا جو طلبا کے واسطے نصف قیمت پر ملتا تھا''۔[۱۱۵]

یہ اسٹیج شو ۶ رفروری ۱۸۸۹ء کو پیش کیا گیا تھا۔ شو شروع ہونے سے پہلے موسیقی کا انتظام تھا۔ مشہور فنکار بابو فدا حسین ہارمونیم پر کوئی دھن بجا رہے تھے۔ لوگ جوق در جوق آ آ کر اپنی کرسیوں پر بیٹھ رہے تھے۔ مقررہ وقت پر موسیقی ختم ہوئی۔ اور شو شروع ہوا۔

حاجی محمد اسماعیل خاں صاحب رئیس دتاولی کپتان بنے ہوئے تھے۔ وہ نہایت عمدہ ترکی لباس پہنے کمر میں تلوار لگائے اسٹیج پر ٹہل رہے تھے۔ ان کے بعد بارہ سپاہی جھنڈی بردار، وردی زیب تن کیے ایک ایک کر کے اسٹیج پر آئے۔ کپتان ان سے مختلف زبانوں میں (یعنی اردو، انگریزی، فارسی، عربی، ترکی وغیرہ میں) مکالمہ کے ذریعہ ان کا ''پے رول''

(Parole) یعنی شناختی لفظ ، دریافت کرتا اور ان کے جواب دینے کے بعد انہیں مختلف جگہوں پر تعینات کرتا تھا۔ جب سب سپاہی اپنی اپنی جگہوں پر متعین ہو گئے تو سید احمد خاں، سرخ وسفید دھاریوں کا ریشمی عربی چغہ پہنے ہوئے اسٹیج پر داخل ہوئے۔ کپتان نے ان سے سوال کیا:

کپتان: ''ہو آر یو''

(سید احمد خاں خاموش کھڑے رہتے ہیں)

کپتان: (ذرا ترش لہجہ میں) ''ہو آر یو؟''

سید احمد: ''میں انگریزی نہیں جانتا''

کپتان: ''من انت؟''

سید احمد: ''میں عربی نہیں جانتا''

کپتان: ''سن کیم سن؟''

سید احمد: میں ترکی نہیں جانتا''

کپتان: (جھنجھلا کر) ''تم کون ہو جی؟''

سید احمد: ''میں؟ میں ہوں''

کپتان: ''میں کون؟''

سید احمد: ''وہی جو میں ہوں''

(کپتان آگے بڑھ کر کالج کے تمغہ کو جو سر سید کے سینہ پر لگا ہوا تھا، غور سے دیکھتا ہے اور کہتا ہے)

کپتان: ''سید احمد؟''

سید احمد: ''ہاں''

کپتان: ('سر' پر زور دیتے ہوئے) ''سر سید احمد؟''

سید احمد: ہاں، ہاں، ہاں

اس کے بعد سر سید نے لوگوں کو مخاطب کر کے گفتگو شروع کی اور ایک مختصر تقریر کے بعد حافظ کی غزل نہایت بلند آواز میں پڑھی۔ اس کے بعد ضلع کے انگریز کلکٹر مسٹر کینیڈی کے ساتھ ڈاکٹر موریارٹی، مسٹر اسمتھ اور مسٹر انتھونی اسٹیج پر آئے اور چاروں نے مل کر ایک انگریزی کورس پیش کیا۔ پھر آغا کمال الدین سنجر (ایرانی شاعر) نے ایک قصیدہ پڑھا۔ اس

کے بعد آغا محمد حسین (جوایک مشہور سیاح تھے) سوڈانی، بدوئی لباس زیب تن کیے کھجور کی زنبیل لیے برچھی لگائے، رسی میں ایک دنبہ باندھے، اسٹیج پر آئے اور عربی بدوی زبان میں دلچسپ گفتگو کی اور بدوی لہجے میں عربی گیت گائے اور بدوی جوش دکھلاتے ہوئے اپنے دنبہ کی تعریف کرتے رہے (گویا یہ ایک مزاحیہ سین تھا) اس کے بعد مولوی خواجہ محمد یوسف صاحب نے مختصر مگر نہایت دلچسپ گفتگو کے بعد، اپنی ایک مثنوی پڑھی۔ اس کے بعد مولانا محمد شبلی صاحب نے اپنا تصنیف کردہ مسدس، جو اسی موقع کے لیے تصنیف کیا تھا پڑھا۔ (اس کے بعد پھر ایک مزاحیہ سین پیش کیا گیا۔) جس میں محمد سعید خاں صاحب درویشی لباس میں، گلے میں مالائیں پہنے سر پر گیروا پینٹا لپیٹے، ہاتھ میں ایک تو بنی لیے، اسٹیج پر آئے اور ہندی دوہے نہایت خوبی سے پڑھے۔ پھر آغا محمد حسین اور یاقوت خاں نے افغانی لباس پہن کر ایک عمدہ مکالمہ پشتو زبان میں پیش کیا۔ اس کے بعد دونوں نے مل کر افغانی لہجے میں پشتو گیت گایا۔ (اس مزاحیہ مکالمے کے بعد دس منٹ کا انٹرول ہوا)

جب دوبارہ شو شروع ہوا تو مسٹر کینیڈی ڈاکٹر موریارٹی، مسٹر اسمتھ اور مسٹر انتھونی نے مل کر ایسا عمدہ انگریزی گیت گایا کہ تمام لوگ عش عش کر گئے۔ اس کے بعد قطب الدین اسٹیج پر آئے اور نہایت خوبی سے بیٹل آف واٹرلو (Battle of water loe) انگریزی میں پڑھ کر سنائی۔ اس کے بعد احمد حسین نے مولانا حالی کی مثنوی تعصب وانصاف کے اشعار نہایت خوبی سے پڑھے۔ اس کے بعد یاقوت خاں نے مولوی محمد شبلی کا قصیدہ پڑھا۔ اس کے بعد محمد مصطفیٰ خاں نے اسٹیج پر آ کر انگریزی میں ایک مختصر تقریر کی۔ اس کے بعد خواجہ عبدالعلی نے کوئن وکٹوریہ کی سلامتی کے لیے دعا پڑھی۔ اس کے بعد مسٹر کینیڈی، ڈاکٹر موریارٹی، مسٹر اسمتھ اور مسٹر انتھونی نے مل کر ''گاڈ سیو دی کوئن'' پیش کیا۔ اس کے بعد سید احمد خاں، حاجی محمد اسماعیل خاں، مولوی خواجہ محمد یوسف اور کالج کے دوسرے ممبروں نے مل کر مسٹر جی کینیڈی، ڈاکٹر موریائی، مسٹر اسمتھ، مسٹر انتھونی اور مسٹر آرنلڈ کے آنر میں بدوی الحان میں عربی شعر پڑھے (گویا یہ کرٹن کال تھی) پھر ہارمونیم کے بجنے کے ساتھ جلسہ ختم ہوا۔

(اس اسٹیج شو کا مندرجہ بالا بیان، عینی شاہد، سید افتخار عالم مارہروی کا قلم بند کیا ہوا ہے)[۱۱۶]

اس اسٹیج شو کی (ایک چشم دید شاہد کی زبان سے) پوری روداد سننے کے بعد قارئین خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ سرسید نے کتنے انہماک اور لگن سے اس شو کی تیاری کی ہوگی

اور خود اسٹیج پر آکر پرفارمینگ آرٹس خصوصاً تھیٹر کے سلسلے میں وہ کس طرح کا پیغام قوم کو دینا چاہتے تھے۔ خاص طور پر ایسے دور میں جب ''قانون ٹرسٹیان'' کے سلسلے میں ان کی مخالفت اپنے عروج پر تھی۔ انہیں وجوہ کی بنا پر ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہوئے کہ اب سرسید میں اپنے ''فکر وعمل'' کے تئیں خود اعتمادی بدرجہ اتم بڑھ گئی تھی۔ (جسے عام طور پر ان کی عمر کے ساتھ بڑھتی ہوئی ضد سے تعبیر کیا جاتا تھا۔) اور اسی خود اعتمادی کے نتیجے میں وہ اپنے لبرل رویوں میں زیادہ فعال نظر آنے لگے تھے۔ جس کی وجہ سے روایتی اقدار کے حامی ان کے احباب تک ان سے شاکی نظر ہوگئے تھے۔ غالباً زندگی کی طرف سے ان کا کھلے دل و دماغ کے ساتھ فیصلے لینے کا یہ طور اور طریقہ ہی ان کی بڑھتی ہوئی مخالفت کی ایک اہم وجہ تھا۔ یہ ایک طرح سے روایتی اقدار کے حامیوں اور جدید فکر وعمل کے حامی لوگوں کے درمیان کی کشمکش تھی۔ جو شروع سے موجود تھی، لیکن اب کھل کر بڑے پیمانے پر سامنے آرہی تھی۔

پبلک سروس کمیشن کی ممبری:

اس سلسلے میں حالی تحریر کرتے ہیں کہ ''۱۸۸۷ء میں سرسید کو لارڈ ڈفرن نے سول سروس کمیشن کی ممبری کے لیے انتخاب کیا تھا''۔ حالی اسی کمیشن کے نام کے سلسلے میں ایک جگہ ''پبلک سروس کمیشن'' اور دوسری جگہ ''سول سروس کمیشن'' تحریر کرتے ہیں لیکن سرسید اپنے خط مورخہ ۲۲ رنومبر ۱۸۹۵ء بنام مولانا حالی اس کمیشن کو ''پبلک سروس کمیشن'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ خیال اغلب ہے کہ سرسید پبلک سروس کمیشن کے ممبر نامزد ہوئے تھے جسے غالباً سول سروس کمیشن کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا تھا۔ اس کمیشن میں سرسید کی کارگزاری کے سلسلے میں حالی نے ۱۸۹۵ء میں خط لکھ کر سرسید سے استفسار کیا تھا۔ لیکن ان کو سرسید کے جواب سے اس سلسلے میں کچھ زیادہ معلومات فراہم نہ ہوسکی تھیں۔ سرسید نے اپنے جواب میں چند عام امور کے متعلق چند لائنیں لکھنے کے بعد تحریر کیا تھا کہ ''زیادہ تفصیل اس کی بغیر آپ کی ملاقات کے بیان نہیں ہوسکتی''۔ [۱۷۱] لیکن پھر حالی کو (اگلے دو تین سال میں) سرسید سے کئی بار ملنے کے باوجود اس سلسلے میں استفسار کا موقع نہ مل سکا تھا۔

۱۸۸۸ء میں سرسید ہاؤس میں خصوصی مہمان:

۱۸۸۸ء میں سرسید ہاؤس میں آنے والے مہمانوں کی فہرست میں تین نام بہت اہم نظر آتے ہیں۔ ۲۰ رنومبر ۱۸۸۸ء کو وائسرائے ہند و گورنر جنرل ہز ایکسیلینسی مارکویس

آف ڈفرن کالج میں تشریف لائے تھے اور سر سید ہاؤس میں سر سید کے ذاتی مہمان کے بطور فروکش ہوئے تھے۔ غالباً یہ تیسرے وائسرائے ہند تھے جنھوں نے سر سید ہاؤس میں قدم رنجنہ فرمایا تھا۔ ان کے علاوہ اسی سال کے دوران سر آکلینڈ کالون لفٹنٹ گورنر صوبہ متحدہ بھی کالج میں تشریف لائے تھے اور سر سید ہاؤس میں سر سید کی مہمان نوازی سے بہرہ یاب ہوئے تھے۔

۲۴؍جولائی ۱۸۸۸ء کو ہزایکسیلینسی نواب محمد مظہر الدین خاں بہادر، رفعت جنگ بشیر الدولہ وعتمدۃ الملک، اعظم الامرا، امیر کبیر، سر آسمان جاہ (مدارالمہام ریاست حیدرآباد) کالج میں تشریف لائے تھے اور سر سید کے ذاتی مہمان کے بطور سر سید ہاؤس میں فروکش ہوئے تھے اور ریاست کی امداد سابق میں ڈھائی سو روپے ماہوار کے اضافہ کے ساتھ مسجد کی تعمیر کے واسطے اپنی جیب خاص سے دس ہزار روپے فراہم کروائے تھے۔ نظام میوزیم سے ملحق ''آسمان منزل'' انہیں کے نام نامی سے موسوم ہے۔

سید محمود کی شادی:

۱۸۸۸ء میں جو اور واقعات رونما ہوئے تھے ان میں سے ایک اہم واقعہ سید محمود کی شادی کا تھا۔ جو ۲۸؍فروری ۱۸۸۸ء کو دہلی میں سر سید کے ماموں زاد بھائی خواجہ شرف الدین خاں صاحب کی صاحبزادی مشرف جہاں بیگم صاحبہ سے ہوئی تھی۔ بعض لوگوں نے شادی کی تاریخ ۱۳؍مارچ ۱۸۸۸ء تحریر کی ہے۔ لیکن بعض مستند حوالہ جات کی بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ شادی ۲۸؍فروری ۱۸۸۸ء کو ہوئی تھی۔

شادی کے سلسلے میں ایک حکایت:

یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ سمیع اللہ خاں صاحب سے سر سید کے ذاتی تعلقات خراب ہونے کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ سید محمود سے شادی ہونے سے پہلے مشرف جہاں بیگم کی نسبت سمیع اللہ خاں صاحب کے صاحبزادے حمید اللہ خاں صاحب سے طے ہوگئی تھی۔ لیکن جب سید محمود کی شادی کے لیے پیغام پہنچا تو مشرف جہاں بیگم کے والد خواجہ شرف الدین نے یہ نسبت توڑ کر اپنی بیٹی کی شادی سید محمود سے کرنے کو ترجیح دی تھی۔ مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کو یہ بات بہت ناگوار گزری تھی جس کی وجہ سے ان کے اور سر سید کے تعلقات جو ویسے بھی کافی کشیدہ تھے منقطع ہوگئے تھے۔ معلوم نہیں اس بات میں کتنی

صداقت ہے لیکن ہمارے خیال سے یہ ایک حکایات زیادہ اور حقیقت کم ہے۔جس کی وجوہ درج ذیل ہیں:

۱۔ دہلی میں موجود سرسید کے خاندان کے سب ہی لوگ مع خواجہ شرف الدین خاں صاحب سرسید کو اپنے خاندان کا بزرگ تسلیم کرتے تھے اور خاندان کے سلسلے کا کوئی فیصلہ ان کی ایما کے بغیر نہیں ہوتا تھا۔ ایسی صورت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ شرف الدین خاں صاحب اپنی صاحبزادی کی نسبت کہیں طے کر دیتے اور سرسید کو علم تک نہ ہوتا۔ ہمارے مشاہدے کے مطابق اگر مشرف جہاں بیگم کی نسبت کہیں طے کی جاتی تو اس میں پہلی ایما سرسید ہی کی شامل ہوتی۔ یہاں پر یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ مشرف جہاں بیگم صاحبہ کے سگے بھائی خواجہ وجیہہ الدین کافی عرصہ سے سید محمود کے سکریٹری کے بطور کام کر رہے تھے اور ان کے ساتھ ہی الہ آباد میں رہتے تھے۔

۲۔ اس زمانے میں عام طور پر لڑکوں کی شادیاں ان کی عمر سے دس پانچ سال چھوٹی عمر کی لڑکیوں کے ساتھ طے کی جاتی تھی۔ مشرف جہاں بیگم عمر میں سید محمود سے تقریباً دس گیارہ سال چھوٹی تھیں۔ لیکن وہ حمیداللہ خاں صاحب سے عمر میں بڑی نہیں تو تقریباً ہم عمر تھیں (غالباً وہ حمیداللہ خاں سے کچھ بڑی ہی تھیں) ایسی صورت میں حمیداللہ خاں صاحب سے ان کی نسبت طے کیے جانے کے امکانات کم ہی نظر آتے ہیں۔

۳۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ ایسے کسی ناخوشگوار واقعہ کے ہو جانے کے بعد عام طور پر لڑکے یا لڑکی کے والدین دوسرے فریق کو نیچا دیکھلانے کے لیے جلد از جلد اپنے بیٹے یا بیٹی کی کسی دوسری (لیکن عمدہ) جگہ شادی کر کے یہ جتلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ نسبت کے ٹوٹنے سے ان کے بیٹے یا بیٹی کی خدا کو بہتری منظور تھی جس کی وجہ سے ان کی شادی کہیں بہتر اور آسودہ خاندان میں ممکن ہو سکی۔ اس کے برخلاف حمیداللہ خاں صاحب کی شادی (بغیر کسی عجلت کے) سید محمود کی شادی کے چھ سال بعد ۱۸۹۴ء میں ہوئی تھی۔

۴۔ آخیر میں ہم مودبانہ عرض کرنا چاہیں گے کہ اس زمانے میں اگر اس طرح کا کوئی ناخوشگوار واقعہ کہیں ہو جاتا تھا تو دونوں خاندانوں میں رنجش پشتہا پشت تک چلتی تھی۔ لیکن اس کے برخلاف ہم دیکھتے ہیں کہ سمیع اللہ خاں صاحب کے چھوٹے صاحبزادے مجیداللہ خاں صاحب کی ۱۹۰۶ء میں شادی شرف الدین خاں صاحب کی پوتی یعنی مشرف جہاں بیگم صاحبہ کے سگے بھائی کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ (جو حکیم بدرالدین خاں کی نواسی

تھیں)۱۱۸؎ جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے کہ اگر حمید اللہ خاں صاحب سے مشرف جہاں بیگم کے ساتھ نسبت طے کر کے توڑنے کی کہانی صحیح ہوتی تو ان کے چھوٹے بھائی مجید اللہ خاں صاحب کی شادی شرف الدین خاں صاحب کی پوتی سے ہرگز نہ کی جاتی۔ بہر حال مندرجہ بالا وجوہات کی بنا پر ہمارا قیاس یہی ہے کہ سرسید اور سمیع اللہ خاں صاحب کے تعلقات کے کشیدہ ہونے میں شرف الدین خاں صاحب کی صاحبزادی کی حمید اللہ خاں سے نسبت ٹوٹنے کے واقعے سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا ہے بلکہ یہ صرف ایک قیاس آرائی معلوم ہوتی ہے اس طرح کی حکایات عام طور پر ان لوگوں کی تشفی کے لیے رائج ہو جاتی ہیں جو مختلف واقعات کے سلسلے میں در پردہ رازوں کو منکشف کر کے ایسے جواز مہیا کرانے کی کوشش کرتے ہیں جن کو ''دور کی کوڑی'' لانے کے مترادف قرار دے کر لوگ واہ واہ کرتے ہیں۔

شادی کی سادہ تقریب:

سید محمود کی شادی دہلی میں بغیر کسی دھوم دھام کے بہت خاموشی کے ساتھ ہوئی تھی۔ دراصل یہ وہ زمانہ تھا جب ''قانونِ ٹرسٹیان'' کے سلسلے میں سرسید کی مخالفت اپنے عروج پر تھی۔ اس تمام مخالفت میں سید محمود کا لائف جوائنٹ سکریٹری مقرر کیا جانا ہی تنازعہ کی اصل جڑ تھی جس کی وجہ سے سمیع اللہ خاں کی قیادت میں سرسید کے قریبی دوست و احباب بھی بین بین نظر آ رہے تھے۔ یہ کہنا کہ کون اس تقریب میں شریک ہوگا اور کون شرکت سے تہی دامنی اختیار کرے گا ایک مشکل کام تھا۔ ایسے میں سرسید کے لیے یہ فیصلہ کرنا کہ کس کو اس تقریب میں شرکت کرنے کے لیے مدعو کریں اور کس کو چھوڑیں ایک نہایت دشوار مرحلہ تھا۔ غالباً انہیں مجبوریوں کی وجہ سے سرسید نے فیصلہ کیا کہ خاموشی سے قریبی عزیزوں اور رشتہ داروں کی موجودگی میں اس تقریب کو انجام دیا جائے۔

اس سلسلے میں محسن الملک کے حیدر آباد سے لکھے خط کے جواب مورخہ ۹؍فروری ۱۸۸۸ء سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت سرسید کس قدر پس و پیش میں مبتلا تھے وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''کیا آپ سید محمود کی شادی میں تشریف لاویں گے جو تاریخ کے تقرر کی اطلاع نہ کرنے کا الزام دیتے ہیں؟ اگر آپ یاد کریں تو اس قدر امر کہ ان کی (یعنی سید محمود کی) شادی ہونے کو ہے۔ میں آپ کو اطلاع دے چکا ہوں''۔۱۱۹؎

محسن الملک کے خط کا یہ جواب کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اس خط کے پہلے جملے

میں پوشیدہ سوال سے (یعنی کیا آپ سید محمود کی شادی میں تشریف لاویں گے") یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تک سرسید محسن الملک تک کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ اگر مدعو کیے جاتے تو وہ شادی کی تقریب میں شرکت کرتے یہی وجہ تھی کہ محسن الملک کے استفسار کے باوجود انھوں نے اپنے جواب میں نہ انہیں مدعو کیا نہ کسی چیز سے انکار کیا بس اپنا مدعا چند الفاظ میں کچھ اس طرح ظاہر کر دیا کہ خود فیصلہ کیجیے۔ شادی کی تقریب میں شرکت کرنا چاہیں تو سر آنکھوں پر، لیکن اگر شرکت کرنی منظور نہ ہو تو کوئی شکوہ بھی نہ ہوگا کیوں کہ کسی کو بھی شرکت کی دعوت نہیں دی گئی تھی۔

شادی کی تقریب کی تیاریاں:

ہمارا خیال ہے کہ اس موقع پر ایک کے بجائے دو شادیوں کی رسمیں انجام دی گئی تھیں۔ پہلی شادی سید محمود کی شرف الدین خاں صاحب کی صاحبزادی مشرف بیگم صاحبہ کے ساتھ انجام دی گئی تھی اور دوسری شادی سرسید کے بڑے بھائی (مرحوم سید محمد خاں صاحب) کے نواسے یعنی سید محمد علی صاحب سے سرسید کی اکلوتی پوتی (یعنی سید حامد کی صاحبزادی) احمدی بیگم کی ہوئی تھی۔ ہمارے اس مفروضہ کے سلسلے کے اشارے جگہ بہ جگہ دستیاب ہوتے ہیں۔

شادی کے سلسلے میں کی گئی تیاریوں کی تفصیلات بہت زیادہ نہیں ملتی ہیں پھر بھی احمد الدین خاں صاحب کے نام تحریر کردہ سرسید کے خط مورخہ ۱۵ر فروری ۱۸۸۸ء سے شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں کچھ اندازہ ضرور لگایا جا سکتا ہے۔ وہ تحریر کرتے ہیں کہ:

> "میں اس خط میں ایک چیک تعدادی چار سو روپیہ کی ملفوف کرتا ہوں۔ اس کا روپیہ بنک سے وصول کر کے حسب تفصیل مندرجہ ذیل دے دو۔
>
> مبلغ سو روپیہ خواجہ شرف الدین خاں صاحب کو دے دو کہ بابت اخراجات بری کے ہیں۔ سو روپیہ میں خود دے آیا ہوں۔ سو روپیہ یہ ہیں دو سو روپیہ ہوئے، بعد اس کے حساب سے اگر ہوں گے تو وہ بھی دے دوں گا۔ سو روپیہ کو چہ والی کو (یعنی بڑی بہن عجیبۃ النساء بیگم کو) دے دو کہ یہ واسطے اخراجات مہمانداری کے ہے۔ باقی روپیہ جو خرچ ہوگا وہ بھی دیا جاوے گا۔ دو سو روپیہ کوچہ والی کو دے دو کہ احمدی بیگم

کے لیے جو تم نے مانگا تھا وہ بھیجے ہیں جو کچھ وہ چاہیں اس کو بنوادیں۔
پچاس روپیہ تم لے لو مدد کے صرف کے لیے''۔[۱۲۰]

سید محمود اپنی شادی کے لیے (خود ان کے اپنے بیان کے مطابق) ۲۱ دن کی ''اتفاقیہ'' چھٹی لے کر دہلی گئے تھے انہیں یہ چھٹی لفٹنٹ گورنر سرآکلینڈ کالون کی سفارش پر چیف جسٹس مسٹر ایج نے منظور کی تھی۔ سید محمود ۲۵/فروری سے ۱۶/مارچ ۱۸۸۸ء تک ۲۱ دن کی اتفاقیہ چھٹی پر رہے تھے۔[۱۲۱] اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ سید محمود شادی کی تاریخ سے ایک یا دو روز پہلے ہی دہلی پہنچے تھے۔ شادی ۲۸/فروری ۱۸۸۸ء کو ہوئی تھی اور غالباً دو یا تین مارچ تک وہ اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ واپس الہ آباد پہنچ گئے تھے۔ یہ مفروضہ ہم نے اس لیے بنایا کیوں کہ ۵/مارچ ۱۸۸۸ء کو سرسید نے کالج کے ڈائنگ ہال میں کالج کے طلبا اور اساتذہ کے لیے دعوتِ ولیمہ کا اہتمام کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ۵/تاریخ کو دعوتِ ولیمہ کے اہتمام کے لیے سرسید دو یا تین روز پہلے یعنی ۲ یا ۳/مارچ ۱۸۸۸ء تک واپس علی گڑھ پہنچ گئے ہوں گے اور ان کے دہلی سے روانگی کے ساتھ ہی سید محمود اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ الہ آباد روانہ ہو گئے ہوں گے۔ اس سلسلے میں میر ولایت حسین رقم طراز ہیں کہ:

> ''اس تقریب کی خوشی میں مسٹر محمود نے پانسو روپیہ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کو نذر کیے اور ۵/مارچ ۱۸۸۸ء کو سرسید نے دعوتِ ولیمہ کالج کے ڈائنگ ہال سالار منزل میں کی، جس میں کالج کے کل طلبا و اساتذہ اور سید صاحب کے احباب مدعو تھے''۔[۱۲۲]

اس دعوت کو دعوتِ ولیمہ کہنا مبالغہ ہوگا۔ کیوں کہ دولہا اور دلہن کی غیر موجودگی میں یہ دعوت ایک طرح سے خانہ پوری کرنے کے واسطے کالج کے طلبا اور اساتذہ کو دی گئی ہوگی۔

ولادت سید راس مسعود:

۱۵/فروری ۱۸۸۹ء کو سید محمود کے صاحبزادے سید راس مسعود کی ولادت ہوئی تھی ہمیں یہ نہیں معلوم کہ سید راس مسعود کی ولادت کہاں ہوئی تھی۔ شادی کے بعد سے سید محمود اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ الہ آباد میں رہ رہے تھے۔ اس لیے راس مسعود کی ولادت بھی الہ آباد ہی میں ہونی چاہیے تھی لیکن اس وقت کا رواج تھا کہ لڑکی پہلے بچہ کی ولادت سے پہلے اپنے میکے چلی جاتی تھی تا کہ پہلے بچے کی ولادت میکے میں ہو اس لیے خیال اغلب یہی ہے

کہ سر راس مسعود کی ولادت دہلی میں سر سید کے ننہال کے آبائی مکان میں ہوئی ہوگی۔

سید محمد علی کی شادی:

ہمارے مفروضہ کے مطابق سید محمد علی کی شادی سر سید کی پوتی (یعنی سید حامد کی صاحبزادی) محمدی بیگم سے اسی دوران ہوئی تھی جب سید محمود کی شادی مشرف بیگم صاحبہ سے ہوئی تھی۔ اس مفروضہ کے سلسلے میں جو مختلف اشارے جگہ بہ جگہ ملتے ہیں ان میں یہ بات بھی شامل کی جاسکتی ہے کہ سید محمد علی کی صاحبزادی فاطمہ محمدی بیگم کی ولادت بھی ۱۸۸۹ء میں ہوئی تھی جس سے اس بات کو تقویت ملتی ہے کہ غالباً ان کی شادی بھی ۱۸۸۸ء میں ہوئی تھی۔

سر سید اور لیجسلیٹیو کونسل کی ممبری:

حیاتِ جاوید میں سر سید کی لیجسلیٹیو کونسل کی ممبری کے سلسلے کی اطلاعات واضح نہیں ہیں۔ لیکن اب ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ سر سید جولائی ۱۸۷۸ء میں وائسرائے کی کونسل کے ممبر نامزد ہوئے تھے اور ۱۸۸۰ء میں انھوں نے اپنا ٹرم پورا ہونے سے (چھ دن) پہلے ممبری سے استعفیٰ دے دیا تھا (یہ ٹرم دو سال کا تھا) بعد میں جب اضلاع شمال مغرب میں کونسل قائم ہوئی تو ۱۸۸۷ء میں وہ دوبارہ صوبہ کی لیجسلیٹیو کونسل کے ممبر منتخب کیے گئے اور تواتر سے دو ٹرم تک یعنی ۱۸۸۷ء سے ۱۸۹۳ء تک لیجسلیٹیو کونسل کے ممبر رہے تھے۔ (یہاں ایک ٹرم تین سال کا ہوتا تھا) جس کی تفصیلات علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے مختلف شماروں میں موجود ہیں (انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ان طلاعات کی موجودگی کے سلسلے کی معلومات ہمیں شافع قدوائی صاحب کے توسل سے حاصل ہوئی ہیں۔)

۱۸۸۷ء سے ۱۸۹۳ء تک کونسل کے اجلاسوں کے دوران سر سید اکثر لمبے لمبے عرصہ تک الہ آباد اور نینی تال میں مقیم رہتے تھے۔ الہ آباد میں ان کا تواتر سے آنا جانا ۱۸۸۶ء سے شروع ہو گیا تھا جب وہ پبلک سروس کمیشن کے ممبر نامزد کیے گئے تھے۔

یوں کہنا چاہیے کہ یہ سر سید کے عروج کا زمانہ تھا۔

سر سید کی زندگی کا یہ ''دورِ طرحداری'' اب آہستہ آہستہ اپنے اختتام کو پہنچ رہا تھا اور اسی کے ساتھ بتدریج ایک دوسرا اور آخری دور شروع ہو رہا تھا جس کو ہم سر سید کی زندگی کا دورِ تردود کہہ سکتے ہیں۔ جس کی تفصیلات آئندہ باب میں وضاحت کے ساتھ بیان کی جائیں گی۔

حواشی

۱۔ سرسیداورسین ٹیفک سوسائٹی (ایک بازیافت)، مصنف: افتخار عالم خاں، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۲۰۰۰، صفحہ: ۶۰
۲۔ فونڈیشن مدرسۃ العلوم، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، مورخہ ۳/ مارچ ۱۸۷۶ء، صفحہ: ۱۲۹
۳۔ ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۱۲۹
۴۔ سرسید کا خط مورخہ ۴/فروری ۱۸۷۶ء، بنام جی ڈبلو رینس، آرکایوز، سرسید اکیڈمی، اے ایم یو، علی گڑھ
۵۔ سرسید کا خط بنام پرائیویٹ سکریٹری وائسرائے الہند، مورخہ ۷/اکتوبر ۱۸۷۶ء، بحوالہ 'سرسید کی خط وکتابت' مرتبہ: شان محمد، (۱۹۹۵ء)، صفحہ: ۴۳
۶۔ سرسید کا خط بنام کھیلز اینڈ کو الہ آباد مورخہ ۲۵/اکتوبر ۱۸۷۶ء، بحوالہ: سرسید کی خط وکتابت مرتبہ: شان محمد (۱۹۹۵ء) صفحہ: ۵۳
۷۔ روزنامچہ جمع وخرچ (یکم فروری ۱۸۷۶ء لغایت یکم مئی ۱۸۷۷ء آرکایوز، سرسید اکیڈمی اے ایم یو، علی گڑھ
۸۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً
۹۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً
۱۰۔ اخبار سین ٹیفک سوسائٹی، مورخہ ۱۲/جنوری ۱۸۷۷ء مولانا آزاد لائبریری، اے ایم یو، علی گڑھ، صفحہ: ۲۱
۱۱۔ دی لائف اینڈ ورک آف سید احمد، مصنف: پی ایف آئی گراہم (۱۸۸۵ء) صفحہ: ۲۶۱
۱۲۔ اخبار سین ٹیفک سوسائٹی، مورخہ ۱۲/جنوری ۱۸۷۷ء مولانا آزاد لائبریری، اے ایم یو، علی گڑھ، صفحہ: ۲۲
۱۳۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً، صفحہ: ۲۱
۱۴۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً، صفحہ: ۲۳
۱۵۔ ضمیمہ اخبار سین ٹیفک سوسائٹی (نمبر ۲) مورخہ ۱۲/جنوری ۱۸۷۷ء مولانا آزاد لائبریری، اے ایم یو، علی گڑھ، ص: ۴
۱۶۔ روزنامچہ جمع وخرچ (یکم فروری ۱۸۷۶ء لغایت یکم مئی ۱۸۷۷ء آرکایوز، سرسید اکیڈمی اے ایم یو، علی گڑھ
۱۷۔ سرسید کا خط بنام محسن الملک مورخہ ۱۶/مارچ ۱۸۷۰ء، مکتوبات سرسید، مرتبہ: اسماعیل پانی پتی، صفحہ: ۹۷
۱۸۔ اخبار سین ٹیفک سوسائٹی، مورخہ ۴/مئی ۱۸۷۷ء، مولانا آزاد لائبریری، اے ایم یو، علی گڑھ، صفحہ: ۲۷۴
۱۹۔ اخبار سین ٹیفک سوسائٹی، مورخہ ۲۸/جولائی ۱۸۷۷ء، روئیداد اجلاس نمبر ۲۹، یونیورسٹی لائبریری، : مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ صفحہ: ۵۴۸
۲۰۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، (ضمیمہ) مورخہ ۱۲/جون ۱۸۷۷ء، نمبر ۲۵، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ صفحہ: ۲۷۶
۲۱۔ حیاتِ جاوید، مصنفہ: مولانا الطاف حسین حالی، (تیسرا ایڈیشن) ترقی اردو بیورو، دہلی (۱۹۹۰ء) صفحہ: ۲۲۴
۲۲۔ حیاتِ جاوید، مصنفہ: مولانا الطاف حسین حالی، (تیسرا ایڈیشن) ترقی اردو بیورو، دہلی (۱۹۹۰ء) صفحہ: ۲۳۱
۲۳۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، مورخہ ۲۰/جولائی ۱۸۷۸ء، نمبر ۲۵، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ صفحہ: ۲۷۶
۲۴۔ دی لائف اینڈ ورک آف سید احمد، مصنفہ: جی ایف آئی گراہم (۱۸۸۵ء)، صفحہ: ۳۷۶

۲۵۔ حیاتِ جاوید، مصنفہ: مولانا الطاف حسین حالی، (تیسرا ایڈیشن) ترقی اردو بیورو، دہلی (۱۹۹۰ء) صفحہ: ۲۳۰

۲۶۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں موجود چند حوالہ جات سے یہ وضاحت ابھی حال میں ہوئی جس کی معلومات ہمیں شافع قدوائی صاحب کے توسل سے حاصل ہوئی۔

۲۷۔ سرسید کا خط بنام مولوی ممتاز علی، مورخہ ۱۵ر ستمبر ۱۸۷۹ء، مکاتیب سرسید، مرتب مشتاق حسین، (۱۹۶۰ء) صفحہ: ۱۴۴

۲۸۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، مورخہ ۹ر جنوری ۱۸۷۹ء، نمبر ۲۵، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ صفحہ: ۲۷۶

۲۹۔ کارنامہ سروری، مرتبہ: نواب ذوالقدر جنگ مطبع: مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (۱۹۳۳ء) صفحہ: ۲۲۸

۳۰۔ ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۲۲۹

۳۱۔ خطوط سرسید، مرتبہ: نسرین ممتاز بصیر، لیتھوکلر پرنٹرس، علی گڑھ (۱۹۹۵ء) صفحہ: ۷۵

۳۲۔ خطوط سرسید بنام حکیم احمد الدین مخطوطہ نمبر ۱۰۰، شعبہ مخطوطات، مولانا آزاد لائبریری، اے ایم یو علی گڑھ

۳۳۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً

۳۴۔ سرسید کا خط بنام زین العابدین مورخہ ۷ر مئی ۱۸۸۹ء، مکتوبات سرسید، مرتبہ: اسماعیل پانی پتی، صفحہ: ۴۹۷

۳۵۔ انتخاب مکاتیب (سرسید، شبلی اور اقبال) مرتبہ: شیخ عطاء اللہ، ایم اے (۱۹۵۸ء) قومی کتب خانہ لاہور، صفحہ: ۱۶۷

۳۶۔ خطوط سرسید، مرتبہ: راس مسعود (۱۹۲۲ء) صفحہ: ۱۲۶

۳۷۔ مکاتیب سرسید، مرتبہ: مشتاق حسین، صفحہ: ۱۵۱

۳۸۔ ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۱۴۹

۳۹۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، مورخہ ۷ار نومبر ۱۸۷۷ء، نمبر ۲۵، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ صفحہ: ۹۷۳

۴۰۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، مورخہ ۴ر اگست ۱۸۷۷ء، رویداد مجلس خزینۃ البضاعۃ التاسیس منعقدہ: ۲۹ر جولائی ۱۸۷۷ء، صفحہ: ۵۷۷

۴۱۔ علی گڑھ کا آثار الصنادید، مصنفہ: اصغر عباس، ماہنامہ آجکل، اکتوبر ۱۹۹۶ء، صفحہ: ۱۸

۴۲۔ دی ارلی لائف آف فرسٹ اسٹوڈینٹ آف ایم اے او کالج، مرتبہ: خواجہ عبدالمجید، الہ آباد پریس (۱۹۱۶ء) صفحہ: ۵۱

۴۳۔ دی ارلی لائف آف فرسٹ اسٹوڈینٹ آف ایم اے او کالج، مرتبہ: خواجہ عبدالمجید، الہ آباد پریس (۱۹۱۶ء) صفحہ: ۵۳

۴۴۔ دی ارلی لائف آف فرسٹ اسٹوڈینٹ آف ایم اے او کالج، مرتبہ: خواجہ عبدالمجید، الہ آباد پریس (۱۹۱۶ء) صفحہ: ۵۴

۴۵۔ دی ارلی لائف آف فرسٹ اسٹوڈینٹ آف ایم اے او کالج، مرتبہ: خواجہ عبدالمجید، الہ آباد

پریس (۱۹۱۶ء)، صفحہ: ۵۵

۴۶۔ دی ارلی لائف آف فرسٹ اسٹوڈینٹ آف ایم اے او کالج، مرتبہ: خواجہ عبدالمجید، الہ آباد پریس (۱۹۱۶ء)، صفحہ: ۵۶

۴۷۔ کارنامہ سروری، مرتبہ: نواب ذوالقدر جنگ بہادر، مطبع، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (۱۹۳۳ء)

۴۸۔ خطوطِ سرسید مرتبہ: نسرین ممتاز بصیر (۱۹۹۵ء) لیتھوکلر پرنٹرس، علی گڑھ۔ صفحہ: ۴۲

۴۹۔ خطوطِ سرسید مرتبہ: نسرین ممتاز بصیر (۱۹۹۵ء) لیتھوکلر پرنٹرس، علی گڑھ۔ صفحہ: ۴۳

۵۰۔ خطوطِ سرسید مرتبہ: نسرین ممتاز بصیر (۱۹۹۵ء) لیتھوکلر پرنٹرس، علی گڑھ۔ صفحہ: ۴۶

۵۱۔ خطوطِ سرسید مرتبہ: نسرین ممتاز بصیر (۱۹۹۵ء) لیتھوکلر پرنٹرس، علی گڑھ۔ صفحہ: ۴۷

۵۲۔ خطوطِ سرسید مرتبہ: نسرین ممتاز بصیر (۱۹۹۵ء) لیتھوکلر پرنٹرس، علی گڑھ۔ صفحہ: ۴۷

۵۳۔ سرسید کا خط بنام سید محمود مورخہ ۲۸ر مئی ۱۸۸۳ء، بحوالہ سرسید کی کرسپانڈنس، مرتبہ: عتیق احمد صدیقی، سرسید اکیڈمی، صفحہ: ۴۷

۵۴۔ سرسید کا خط بنام مولوی امتیاز علی مورخہ ۲۱ر نومبر ۱۸۸۳ء، مکاتیب سرسید، مرتبہ: مشتاق حسین، صفحہ: ۲۶۲۔۲۶۲

۵۵۔ سلیکٹڈ ڈاکومینٹ، مرتبہ: یوسف حسین، ایشیا پبلشنگ ہاؤس، (۱۹۶۴ء) صفحہ: ۱۲۸

۵۶۔ حیاتِ جاوید، مصنفہ: مولانا الطاف حسین حالی، اردو ترقی بیورو، (۱۹۹۰ء) صفحہ: ۱۷۶

۵۷۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، مورخہ ۲۴ر مارچ ۱۸۸۵ء، نمبر ۲۵، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

۵۸۔ سید محمود کا خط بنام چیف سکریٹری (گورنمنٹ آف انڈیا) مورخہ ۸ر ستمبر ۱۸۹۳ء، سرسید اکیڈمی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ص: ۵۹ (نوٹ یہ خط ہاتھ کے لکھے ۱۰۵ فل اسکیپ صفحات پر مشتمل ہے)

۵۹۔ روز نامچہ جمع و خرچ (بابت ۱۸۸۲ء) آرکایوز، سرسید اکیڈمی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۶۰۔ ہسٹری آف ایم اے او کالج، مصنفہ: تھیوڈور ماریسن، مرتبہ: صفی احمد، مرکز ادب اردو، لکھنؤ، ص: ۸۲

۶۱۔ سرسید اور فن تعمیر، مصنفہ: افتخار عالم خاں، سرسید اکیڈمی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، (۲۰۰۱) صفحہ: ۴۶

۶۲۔ خطوطِ سرسید، مرتبہ: نسرین ممتاز بصیر، (۱۹۹۵ء) لیتھوکلر پرنٹرس، علی گڑھ۔ صفحہ: ۴۵

۶۳۔ خطوطِ سرسید، مرتبہ: نسرین ممتاز بصیر، (۱۹۹۵ء) لیتھوکلر پرنٹرس، علی گڑھ۔ صفحہ: ۵۶

۶۴۔ خطوطِ سرسید، مرتبہ: نسرین ممتاز بصیر، (۱۹۹۵ء) لیتھوکلر پرنٹرس، علی گڑھ۔ صفحہ: ۵۷

۶۵۔ خطوطِ سرسید بنام حکیم احمد الدین، مخطوطہ نمبر ۱۰۰ شعبہ مخطوطات، مولانا آزاد لائبریری، اے ایم یو علی گڑھ

۶۶۔ خطوطِ سرسید، مرتبہ: نسرین ممتاز بصیر، (۱۹۹۵ء) لیتھوکلر پرنٹرس، علی گڑھ۔ صفحہ: ۵۸

۶۷۔ خطوطِ سرسید بنام حکیم احمد الدین، مخطوطہ نمبر ۱۰۰ شعبہ مخطوطات، مولانا آزاد لائبریری، اے ایم یو علی گڑھ

۶۸۔ خطوطِ سرسید، مرتبہ: نسرین ممتاز بصیر، (۱۹۹۵ء) لیتھوکلر پرنٹرس، علی گڑھ۔ صفحہ: ۶۸

۶۹۔ ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۶۸

۷۰۔ ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۶۹

۷۱۔ ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۷۵

۷۲ خطوطِ سرسید، مرتبہ: نسرین ممتاز بصیر، (۱۹۹۵ء) لیتھوکلر پرنٹرس، علی گڑھ۔ صفحہ: ۵۲
۷۳ علی گڑھ فرسٹ جنریشن، مصنفہ: ڈیویڈلیلیویلڈ، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، (۱۹۹۶ء) صفحہ: ۱۹۶
۷۴ ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۱۹۷
۷۵ سرسید کا خط بنام مسٹر ایف آلیس بلاک، مجسٹریٹ، علی گڑھ مورخہ ۵/نومبر ۱۸۸۴ء بحوالہ سرسید اور فنِ تعمیر مصنفہ: افتخار عالم خاں، (۲۰۰۱)، سرسید اکیڈمی، صفحہ: ۱۹۰، ۱۸۷
۷۶ دی لائف اینڈ ورک آف سید احمد، مصنفہ: جی الیف آئی گراہم (۱۸۸۵ء) صفحہ: ۳۷۵
۷۷ ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۳۷۶
۷۸ ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۳۸۰
۷۹ سرسید احمد خاں، مصنفہ: عنایت اللہ دہلوی، سہ ماہی جامعہ، جلد: ۹۵، جولائی دسمبر ۱۹۹۸ء، صفحہ: ۶۶
۸۰ ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۶۷
۸۱ ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۶۶
۸۲ ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۶۷
۸۳ مطالعہ سرسید احمد خاں، مرتبہ: عبدالحق، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ (۱۸۸۴ء)، صفحہ: ۴۶
۸۴ ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۵۳
۸۵ ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۵۳
۸۶ وقارِ حیات، مرتبہ: محمد مقتدیٰ خاں شیروانی، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۳۴۴، علی گڑھ، صفحہ: ۳۸۷
۸۷ سرسید کا خط بنام وقار الملک مورخہ ۴/اگست ۱۸۹۰ء، خطوطِ سرسید، مرتبہ: راس مسعود، (۱۹۲۲ء) صفحہ: ۱۰۲
۸۸ کرنل گریم کا خط بنام محسن الملک (مورخہ؟) آرکایوز، سرسید اکیڈمی، اے ایم یو، علی گڑھ
۸۹ سرسید کا خط بنام ایجنٹ بینک آف بنگال، آگرہ، مورخہ ۱۳/اپریل ۱۸۹۷ء، آرکایوز، سرسید اکیڈمی، علی گڑھ
۹۰ سرسید کی 'سند خوشنودی' جو مولوی ابوالحسن کو مورخہ ۱۴/جنوری ۱۸۸۸ء کو دی تھی بحوالہ خطوطِ سرسید، مرتبہ: سید راس مسعود، نظامی پریس، بدایوں، (۱۹۳۱)
۹۱ سرسید اور سائنٹفک سوسائٹی (ایک بازیافت) مصنفہ: افتخار عالم خاں، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۲۰۰۰، صفحہ: ۱۲
۹۲ سرسید اسلام اور مسلمان، مصنفہ: جواہر لال نہرو، مترجم: سید عابد حسین، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جلد: ۹۵، جولائی دسمبر ۱۹۹۵ء، صفحہ: ۱۱۰
۹۳ ازالۃ الاوہام، مصنفہ: خواجہ محمد یوسف (۱۸۹۷ء)، بحوالہ علی گڑھ فرسٹ جنریشن، مصنفہ: ڈیویڈلیلیویلڈ، صفحہ: ۲۶۵
۹۴ آپ بیتی، مصنفہ: میر ولایت حسین، مرتبہ: سید محمد ٹونکی، علی گڑھ (۱۹۷۰ء)، صفحہ: ۶۳۔۵۸
۹۵ ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۵۹
۹۶ ۱۸۷۸ء کا علی گڑھ مصنفہ: میاں محمد امین، سرسید ہال ریویو (اولڈ بوائز نمبر ۱۹۷۵ء)
۹۷ آپ بیتی، مصنفہ: میر ولایت حسین، مرتبہ: سید محمد ٹونکی (۱۹۷۰ء)، علی گڑھ، صفحہ: ۶۱

۹۸ آپ بیتی، مصنفہ: میر ولایت حسین، مرتبہ: سید محمد ٹونکی (۱۹۷۰ء)، علی گڑھ، صفحہ: ۶۳

۹۹ ایضاً ایضاً ایضاً

۱۰۰ مقالاتِ سرسید، مرتبہ: مولانا اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی اردو لاہور، (۱۹۶۵ء)، حصہ: ۱۲، صفحہ: ۱۸۵ تا ۲۴۵

۱۰۱ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے تاریخی حالات، مصنفہ: سرسید احمد خاں، مقالات سرسید، مرتبہ: اسماعیل پانی پتی، حصہ: ۱۲، صفحہ: ۲۲۳

۱۰۲ ازالۃ الاوہام، مصنفہ: خواجہ محمد یوسف، محمڈن پریس، علی گڑھ۔ (۱۸۹۳ء)

۱۰۳ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے تاریخی حالات، مصنفہ: سرسید احمد خاں، مقالات سرسید، مرتبہ: اسماعیل پانی پتی، حصہ: ۱۲، صفحہ: ۲۰۵

۱۰۴ آپ بیتی، میر ولایت حسین، مرتبہ: محمد ٹونکی (۱۹۷۰ء)، صفحہ: ۸۳

۱۰۵ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۸۴

۱۰۶ حیاتِ جاوید، مصنفہ: مولانا الطاف حسین حالی، ترقی اردو، بیورو، نئی دہلی (۱۹۹۰ء)، صفحہ: ۲۶۶

۱۰۷ سرسید اور فنِ تعمیر، مصنفہ: افتخار عالم خاں، سرسید اکیڈمی، اے ایم یو، علی گڑھ (۲۰۰۱ء)، صفحہ: ۶۵

۱۰۸ سیرتِ فریدیہ، مصنفہ: سرسید احمد خاں، مرتبہ: محمود احمد برکاتی، پاکستان اکیڈمی، کراچی، (۱۹۶۴ء)، صفحہ: ۱۳۰

۱۰۹ حیاتِ جاوید، مصنفہ: مولانا الطاف حسین حالی، ترقی اردو، بیورو، نئی دہلی (۱۹۹۰ء)، صفحہ: ۴۷۷

۱۱۰ سرسید کا خط بنام سر ولیم میور، مورخہ ۶ رمئی ۱۸۷۵ء، آرکائیوز، سرسید اکیڈمی، اے ایم یو، علی گڑھ

۱۱۱ آپ بیتی، میر ولایت حسین، مرتبہ: سید محمد ٹونکی (۱۹۷۰ء)، علی گڑھ، صفحہ: ۷۶

۱۱۲ علی گڑھ فرسٹ جنریشن، مصنفہ: ڈیوڈ لیلیو یلڈ، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، بمبئی ۱۹۹۶ء، صفحہ: ۲۵۳

۱۱۳ احمد علی شوقی، مدیر اخبار 'آزاد' کا خط سرسید کے نام مورخہ ۲۳ رجنوری ۱۸۸۹ء

۱۱۴ آپ بیتی، میر ولایت حسین، مرتبہ: سید محمد ٹونکی (۱۹۷۰ء)، علی گڑھ، صفحہ: ۷۷

۱۱۵ آپ بیتی، میر ولایت حسین، مرتبہ: سید محمد ٹونکی (۱۹۷۰ء)، علی گڑھ، صفحہ: ۷۷

۱۱۶ محمڈن کالج ہسٹری، مصنفہ: سید افتخار عالم خاں، (۱۹۰۱ء)، صفحہ: ۵۰ تا ۸۴

۱۱۷ حیاتِ جاوید، مصنفہ: مولانا الطاف حسین حالی، ترقی اردو، بیورو، نئی دہلی (۱۹۹۰ء)، صفحہ: ۲۵۳

۱۱۸ بحوالہ سوانح عمری حاجی محمد سمیع اللہ خاں بہادر، مصنفہ: خانبہادر مولوی ذکاء اللہ، اتر پردیش، اردو اکیڈمی، لکھنؤ ۱۹۹۷ء

۱۱۹ مکتوبات سرسید، مرتبہ: اسماعیل پانی پتی، صفحہ: ۱۲۷

۱۲۰ خطوط سرسید، مرتبہ: ڈاکٹر نسرین ممتاز بصیر، علی گڑھ (۱۹۹۵ء)، صفحہ: ۴۹

۱۲۱ جسٹس محمود ریکگنیشن، مرتبہ: ایس خالد رشید، علی گڑھ لا جنرل (V ۱۹۷۳ء) محمود نمبر، صفحہ: ۲۹۷

۱۲۲ آپ بیتی، مصنفہ: میر ولایت حسین، مرتبہ: سید محمد ٹونکی (۱۹۷۰ء)، علی گڑھ، صفحہ: ۶۸

☆☆☆

باب پنجم

سرسید کا دورِ تردد
(۱۸۹۰ء تا ۱۸۹۸ء)

۱۸۸۹ء میں قانونِ ٹرسٹیان کے پاس ہو جانے کے بعد وہ لوگ جو سمیع اللہ خاں صاحب کی قیادت میں سرسید کی جارحانہ مخالفت پر اتر آئے تھے یا تو کالج سے کنارہ کش ہو گئے تھے یا پھر اکثریت کے فیصلے کے آگے سرِ تسلیم خم کر کے کالج کے سلسلے میں سرسید کے موقف اور طرزِ عمل کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ جن لوگوں نے ''قانونِ ٹرسٹیان'' کے پاس ہونے کے بعد سمیع اللہ خاں صاحب کے ساتھ کالج سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی ان میں سے چند اہم لوگوں کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

حمید اللہ خاں صاحب، نواب محمد لطف علی خاں، کنور محمد عبدالغفار خاں صاحب (دھرم پور)، محمد مصطفیٰ خاں صاحب (بڑا گاؤں) اور خواجہ محمد یوسف صاحب (۱۸۹۵ء میں نواب سر وقار لامرا کی مصالحت کی کوشش کے زیر اثر سرسید نے سب کچھ بھلا کر ان لوگوں کو کالج کی ٹرسٹی شپ آفر کی تھی۔ اس وقت بھی ان حضرات نے سمیع اللہ خاں صاحب کی قیادت میں اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا) لیکن مولوی مشتاق حسین صاحب (وقار الملک، جو مخالفت کے علمبرداروں میں سے ایک تھے) نے اکثریت کے فیصلے کے آگے سر جھکاتے ہوئے۔ نئے قوانین کو قبول کر کے کالج کا ٹرسٹی بننا تسلیم کر لیا تھا (حالاں کہ سرسید سے ان کے پہلے جیسے تعلقات پھر کبھی استوار نہ ہو سکے تھے)۔

۱۸۸۹ء میں 'قانونِ ٹرسٹیان' کے پاس ہونے کے بعد سے سرسید نے بہت حد تک ان بزرگوں کی تنقیدی گرفت سے نجات حاصل کر لی تھی جو سرسید کے جدید علوم کے سلسلے کے تعلیمی مشن سے تو اتفاق رکھتے تھے لیکن سرسید کی جدید فکر اور لبرل رویوں سے برگشتہ اور بدظن رہتے تھے۔ سرسید کے لیے عام مسلمانوں کو تنگ نظری، روایت پرستی و تقلید اور توہم پرستی کے جال سے نکالنے کے کام سے زیادہ مشکل کام یہ ہو گیا تھا کہ وہ کس طرح

اپنے ان رفقائے کار کو جو ان کے ہم خیال تھے اپنے تعلیمی مشن کے اطلاق کے معاملات کی تفصیلات میں بے جا مداخلت سے باز رکھ سکیں۔ دراصل جتنے منھ تھے اتنی ہی باتیں تھیں۔ سرسید کو روز روز نئی نئی تجویزیں اور نئے نئے مشورے موصول ہوتے رہتے تھے۔ جن میں خاص طور پر انگریز پروفیسروں کی مخالفت اور بورڈنگ ہاؤس میں موجود طلبا کی دینی اور اخلاقی تربیت کی طرف سے خدشات کا اظہار کیا جاتا تھا۔ زیادہ تر لوگ انگریز پروفیسروں کی کالج میں موجودگی کی اس لیے مخالفت کرتے تھے کہ ان کو بڑی بڑی تنخواہیں دینے کی وجہ سے کالج پر مالی بوجھ بڑھ گیا ہے جب کہ ان کے خیال کے مطابق یہی کام بہت کم تنخواہوں پر ہندوستانی اساتذہ انجام دے سکتے ہیں۔ دوسری طرف انگریز پروفیسروں کو ٹرسٹیوں کے ان جذبات کا اندازہ تھا جس کی وجہ سے وہ (یعنی انگریز پروفیسران) کالج میں اپنے غیر یقینی مستقبل کی طرف سے ہمیشہ فکر مند رہتے تھے اور اسے زیادہ بہتر اور یقینی بنانے کے لیے مختلف تدابیر کرنے کے ساتھ ساتھ سرسید سے اصرار بھی کرتے رہتے تھے۔ اسی طرح وہ لوگ جو بورڈروں کی تربیت کے سلسلے میں اپنے خدشات کا اظہار کرتے رہتے تھے ان کا خیال تھا کہ اگر بورڈنگ ہاؤس کے نظم ونسق کی ذمہ داری انگریز پروفیسروں کے ہاتھوں میں چلی گئی تو انگریز پروفیسران طلبا کو اپنے مذہب سے متنفر کر کے عیسائیت کی طرف راغب کرنے کی کوشش کریں گے۔ دوسری طرف انگریز پروفیسروں کا خیال تھا کہ کالج میں بہتر نظم ونسق قائم رکھنے کے لیے اس سلسلے کی تمام ذمہ داری کالج کے پرنسپل کی ہونا چاہیے جس کے بغیر پرنسپل کے لیے کالج میں نظم ونسق قائم رکھنا بہت مشکل کام ہوگا۔ سرسید اپنے رفقاء کے ان خدشات سے قطعی اتفاق نہیں کرتے تھے ان کا خیال تھا کہ جو لوگ اس طرح کے خدشات کا اظہار کرتے ہیں وہ دراصل کالج کو روایتی فارسی مدرسوں کی نہج پر چلانا چاہتے ہیں اسی وجہ سے انھوں نے ''قانون ٹرسٹیان'' کی چند مدوں میں اپنے اس اختلاف کو ظاہر کرتے ہوئے واضح الفاظ میں درج کروا دیا تھا کہ:

ایم اے او کالج میں کالج کا پرنسپل اور اسکول کا ہیڈ ماسٹر ہمیشہ انگریز ہی ہوا کرے گا۔ اس کے علاوہ دو پروفیسر بھی ہمیشہ انگریز ہی ہوا کریں گے۔

اسی کے ساتھ انگریز پروفیسروں کے تقرر کی شرائط، ان کی تنخواہ کا گریڈ، سالانہ ترقی کی شرح، مختلف اقسام کی چھٹیاں، کام کے اوقات، انگلستان آنے جانے کا کرایہ، مکان کی سہولیات وغیرہ کے سلسلے کی قانونی ضمانت ''قانون ٹرسٹیان'' میں تفصیل کے ساتھ

شامل کر لی گئی تھیں۔

جہاں تک کالج میں نظم و نسق قائم کرنے کا تعلق تھا۔ ''قانونِ ٹرسٹیان'' کی رو سے کالج اور بورڈنگ ہاؤس کے نظم و نسق کی کل ذمہ داری کالج کے پرنسپل کے ذمہ سونپ دی گئی تھی۔

(سرسید کا کہنا تھا کہ انگریز پروفیسر زیادہ انہماک اور شدومد کے ساتھ نماز کے اوقات میں طلبا کو نماز پڑھنے کی تلقین کرتے تھے بلکہ نماز کے اوقات میں مسجد میں طلبا کی حاضری کا چلن انہیں کی ایما پر شروع ہوا تھا)

سستے بورڈنگ ہاؤس:

معاشی طور پر کمزور طلبا کے لیے کالج میں سستے بورڈنگ ہاؤس بنانے کا مسئلہ بھی کافی عرصہ تک زیر بحث رہا تھا۔ ہم یہاں اس بات کی وضاحت کرنا چاہیں گے کہ سرسید پر ایک الزام یہ بھی عائد کیا جاتا ہے کہ انھوں نے کالج کے طلبا میں معاشی بنیادوں پر تفریق روا رکھتے ہوئے فرسٹ کلاس، سیکنڈ کلاس اور تھرڈ کلاس بورڈنگ ہاؤس قائم کیے تھے۔ حالاں کہ اس کے لیے بھی سرسید کے رفقا میں موجودہ بزرگ ذمہ دار تھے جنھوں نے قومی ہمدردی کے جذبہ کے تحت غریب طلبا کے لیے کالج کے احاطہ میں موجود پرانی بارکوں، اصطبلوں اور نوکر پیشے کی بوسیدہ عمارتوں میں تھرڈ کلاس بورڈنگ ہاؤس کا لیبل لگا کر، رہائش کا مفت انتظام کر دیا تھا۔ سرسید شروع سے ہی اس تفریق کے خلاف تھے ان کا کہنا تھا کہ غریب طلبا کو بدحالی میں رکھ کر تعلیم دینے اور ان کی رہائش کے لیے بوسیدہ عمارتوں میں سستے بورڈنگ ہاؤس بنانے سے بہتر ہوگا کہ ہم ایسے طلبا کے لیے زیادہ سے زیادہ وظائف کا انتظام کریں، تاکہ وہ بھی بلا کسی امتیاز کے دوسرے طالب علموں کے ساتھ عمدگی اور آسودگی سے رہ کر تعلیم حاصل کر سکیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے کافی وظائف کا انتظام کر بھی رکھا تھا اور مزید وظائف حاصل کرنے کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ اس بات کو کہ سرسید طلبا میں معاشی بنیادوں پر کسی طرح کی تفریق کو روا نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ میر ولایت حسین کے ۱۸۸۲ء کے آس پاس کے اس بیان سے تقویت ملتی ہے کہ:

> ''سید صاحب نے تھرڈ کلاس بورڈنگ ہاؤس توڑ دیا تھا اور ہم لوگ جو تھرڈ کلاس بورڈنگ ہاؤس میں رہتے تھے سیکنڈ کلاس بورڈنگ

ہاؤس میں منتقل ہو گئے اور تھرڈ کلاس بورڈنگ ہاؤس کی بارکیں منہدم
کر دی گئیں''۔[۱]

اسی طرح کچھ عرصہ کے بعد ہی سرسید نے سیکنڈ کلاس اور فرسٹ کلاس بورڈروں کے ڈائنگ ہالوں کو ختم کر کے سب طلبا کے لیے ایک ہی طرح کے کھانے کا انتظام کر کے سیکنڈ کلاس اور فرسٹ کلاس بورڈروں کی تفریق کو بھی بڑی حد تک ختم کر دیا تھا۔ دراصل فرسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس بورڈنگ ہاؤسوں کی تفریق کالج میں بورڈنگ ہاؤسوں کے لیے موجود عمارتوں کی کمی اور ان کے تقابلی تعمیری نوعیت کی بنا پر خود بخود پیدا ہو گئی تھی لیکن جیسے جیسے کالج کی عمارت کے پختہ بورڈنگ ہاؤس کے کمروں کی تعمیر کا کام آگے بڑھتا گیا یہ تفریق بتدریج ختم ہوتی گئی حتی کہ آخیر میں اس کا وجود 'پکی بارک' اور 'کچی بارک' جیسے ناموں تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ اس سلسلے میں میر ولایت حسین لکھتے ہیں کہ:

''سرسید نے تھرڈ کلاس بورڈنگ ہاؤس ۱۸۸۳ء میں توڑ کر سیکنڈ کلاس
میں ملا دیا تھا۔ مگر ۱۸۸۸ء میں سیکنڈ کلاس اور فرسٹ کلاس کے کھانے
کی تفریق بھی مٹا دی''۔[۲]

سرسید کا خیال تھا کہ غریب طلبا کی رہائش کے لیے سستے ہوسٹل بنانے کی بات دراصل وہ لوگ کرتے ہیں جو روایتی طرزِ تعلیم کی طرف واپس جانا چاہتے ہیں جہاں طلبا موٹے جھوٹے کپڑے پہن کر خیرات کی روٹیوں سے اپنا پیٹ بھر کر چٹائی پر سوتے تھے اور رات میں چراغ کی روشنی میں اپنا درس یاد کرتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ ایک جگہ کہتے ہیں:

''مگر افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارے دوستوں کے اب تک وہی
ٹکیل پرانے خیالات ہیں وہ بورڈنگ ہاؤس کو ایسے ہی لوگوں سے
بھرنا چاہتے ہیں جو مسجدوں میں مردوں کی فاتحہ کی روٹیاں کھا کر بسر
اوقات کرتے ہیں''۔[۳]

سرسید کا خیال تھا کہ غریب طلبا کو کسمپرسی اور بدحالی میں رکھ کر جدید تعلیم دینے یا تعلیم کو ان کی بساط کے مطابق ارزاں کر کے ان تک پہنچانے کے بجائے سب سے اچھا طریقہ یہی ہے کہ ان کے لیے زیادہ سے زیادہ وظائف کا انتظام کیا جائے تا کہ وہ بھی عمدہ اور شائستہ بود و باش کے ساتھ جدید تعلیم حاصل کرنے کا فخر حاصل کر سکیں۔ غرض سرسید تھرڈ کلاس بورڈنگ ہاؤس جاری کیے جانے کے سخت خلاف تھے۔ بلکہ جب لوگ سرسید کی

مخالفت کرنا چاہتے تھے یا جب ان کو کسی طرح کی تکلیف پہنچانا مقصود ہوتا تھا تو وہ سستے بورڈنگ ہاؤس قائم کیے جانے کا بکھیڑا شروع کر دیتے تھے۔ یہ مسئلہ ایک طرح سے سرسید کی ''چڑ'' بنالیا گیا تھا۔ جس کی تصدیق میر ولایت حسین کے بیان کردہ خواجہ محمد یوسف صاحب کے مندرجہ ذیل بیان سے ہوتی ہے:

> ''خواجہ صاحب میری گاڑی میں آئے اور فرمایا کہ میں آئندہ اجلاس مسلم ایجوکیشنل کانگریس میں بمقام لکھنؤ یہ ریزولیوشن پیش کرنا چاہتا ہوں کہ شریف مگر غریب مسلمانوں کی تعلیم میں آسانی پیدا کرنے کے واسطے مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں تھرڈ کلاس بورڈنگ ہاؤس پھر قائم کیا جائے، تمہاری کیا رائے ہے۔ میں نے کہا یہ بہت مفید ریزولیوشن ہے۔ میں اس کے موافق ہوں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ سید احمد خاں صاحب اس کی مخالفت کریں گے۔ اس وقت بھی اس رائے پر قائم رہو گے۔ میں نے کہا میری اصلی رائے تو یہی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ سید صاحب کے مقابلے میں کہاں تک اپنی رائے پر قائم رہوں گا'' ۔[۴]

خواجہ محمد یوسف صاحب کا مندرجہ بالا ریزولیوشن ۱۸۸۶ء کے ایجوکیشنل کانگریس لکھنؤ کے اجلاس میں پیش تو کیا گیا تھا لیکن چند وجوہات کی بنا پر (جس میں یہ وجہ اہم تھی کہ لوگوں کا خیال تھا کہ اس تجویز سے سرسید کو تکلیف پہنچے گی) بعد میں واپس لے لیا گیا تھا لیکن بقول میر ولایت حسین خواجہ محمد یوسف صاحب بعد میں اکثر کہا کرتے تھے کہ:

> ''میں اپنی کوٹھی متصل علی گڑھ کالج میں جب سستا بورڈنگ ہاؤس کھول دوں گا جس میں طلبا رہیں گے اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں تعلیم پائیں گے، اس وقت سید صاحب کیا کریں گے'' ۔[۵]

ان اقتباسات سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ سرسید طلبا میں کسی طرح کی تفریق روا رکھنے کے خلاف تھے لیکن غریب طلبا کے لیے تھرڈ کلاس ہوسٹل (یعنی سستے ہوسٹل) قائم کرنے جیسے مسائل حبِ علی کے بجائے بغض ماویہ میں اٹھائے جاتے تھے جن سے مراد صرف یہ ہوتی تھی کہ عام مسلمانوں میں اس بات کو مشتہر کیا جائے کہ سرسید کا جدید تعلیم کا مشن صرف اہلِ ثروت لوگوں تک ہی محدود ہے۔ غالباً اسی وجہ سے سمیع اللہ خاں صاحب

نے کالج سے علیحدہ ہونے کے بعد ۱۸۹۲ء میں الہ آباد میں میور کالج میں تعلیم پانے والے (غریب) مسلم طلبا کے لیے ایک مسلم ہوسٹل کی عمارت تعمیر کروائی تھی جس کا سنگِ بنیاد سرسید ہی کی طرز پر لفٹنٹ گورنر کے ہاتھوں رکھوایا گیا تھا۔

قانون ٹرسٹیان، سمیع اللہ خاں اور حالی:

قانون ٹرسٹیان کے سلسلے میں سمیع اللہ خاں صاحب نے جس طرح کی مخالفت کی تھی اس کے بارے میں خواجہ الطاف حسین حالی نے اپنے خیالات کا تفصیلی اظہار اپنے مضمون بعنوان ''خیالات دربارہ مسودہ قانونِ ٹرسٹیان مدرسۃ العلوم، علی گڑھ'' میں کیا تھا جو ۱۸۸۹ء میں سرمور گزٹ ناہین میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں حالی نے اپنے بے لاگ رائے ظاہر کی تھی حالاں کہ حیاتِ جاوید میں اس سلسلے میں وہ خاصے محتاط نظر آتے ہیں، کیوں کہ اس وقت تک حالات کافی بدل چکے تھے۔ حالی اپنے اس مضمون میں تحریر کرتے ہیں کہ:

> ''جو اختلاف یا مخالفت مسودہ قانون مذکور کے ساتھ کی گئی ہے، یہ ایک اندرونی مخالفت ہے جو خود مدرسے کے بانی اور اس کے بعض اعوان وانصار میں پیدا ہوئی ہے اور اس لیے وہ مدرسہ کے حق میں نہایت خطرناک ہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ جناب مولوی سمیع اللہ خاں صاحب اور ان تمام ممبران کالج فنڈ کمیٹی کو بلاشبہ یہ استحقاق حاصل تھا اور حاصل ہے کہ مسودہ مذکور کی کل یا بعض دفعات سے اختلاف یا ان پر اعتراض کریں اور اس مسودے کو من حیث المجموع منظور کریں یا نہ کریں۔ لیکن جس طریقے سے مولوی صاحب نے اس پر نکتہ چینی کی ہے، اگر میری رائے غلط نہیں تو ایسی نکتہ چینی کا استحقاق ان کو یا کسی اور ممبر کو ہرگز حاصل نہیں ہوسکتا۔ انھوں نے اختلاف نہیں کیا ہے، بلکہ مخالفت کی ہے اور بیان کا ایسا عنوان اختیار کیا ہے کہ جس سے ذاتی رنجش کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ اکثر دفعات کو سید صاحب کی خود غرضی پر محمول کرتے ہیں۔ انھوں نے سید صاحب اور سید محمود کے مذہب پر بھی تعریض کی ہے جو کسی طرح ان کو زیبا نہ تھی...... مولوی صاحب ممدوح نے مسودہ قانون ٹرسٹیان پر اعتراضات وشبہات لکھنے اور ان

کے شائع کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مشہور یہ ہے کہ ایڈوکیٹ اور ہندوستانی اخبار میں جو کچھ سید صاحب کے برخلاف لکھا جاتا ہے، وہ خود مولوی صاحب کا یا ان کے ایما سے ان کے بعض دوست لکھتے ہیں...... جناب مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب نے جو مسودہ قانون مذکور پر اپنی رائے تحریر فرمائی ہے اس میں انھوں نے اپنے بہت سے حقوق مدرسے پر جتائے ہیں اور گویا یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ اور سید صاحب مدرسہ کے قائم کرنے اور اس کو قائم رکھنے میں مساوی الاقدام ہیں۔ بلاشبہ مولوی صاحب ممدوح کے بہت سے حقوق تسلیم کرنے کے قابل تھے لیکن افسوس ہے کہ "قومی خدمات" جتلانے اور اظہار کرنے سے گو وہ جتلانا اور اظہار کرنا کسی پیرائے میں ہو، بالکل بے قدر سمجھی جاتی ہیں بلکہ "کان لم یکن" ہو جاتی ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہی حقوق مولوی صاحب ممدوح اپنی زبان سے ظاہر نہ کرتے بلکہ کوئی دوسرا شخص ان کو ظاہر کرتا۔ کوئی منصف مزاج آدمی جو مدرسۃ العلوم کے اول سے آخر تک تمام حالات سے واقف ہے، وہ اس کے قیام اور اس کی ترقیات کو سرسید احمد خاں کی ذات کے سوا کسی دوسرے شخص کی طرف منسوب کر سکے...... پس اگر چہ اس بات کا انکار نہیں ہو سکتا کہ سرسید احمد خاں نے جو کام شروع کیا تھا، اس میں اکثر بزرگانِ قوم سے ان کو بے انتہا مدد پہنچی، اور قوم کا فرض ہے کہ ان کی دل سے شکر گزار ہو، لیکن کسی شخص کو یہ استحقاق نہیں ہے کہ مدرسہ کے کسی کام میں سرسید کی مساوات کا دعویٰ کر سکے"۔[۶]

حالی کے اس بیان سے سمیع اللہ خاں صاحب کے سلسلے کی بہت سی باتیں صاف ہو جاتی ہیں۔ جن کے نتیجے کے بطور، ہم تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ اس مخالفت میں ہمیں اختلاف کم اور دعوے داری کا عنصر زیادہ نظر آتا ہے۔

سرسید کے کاموں کے اصل معاونین:

عموماً دیکھا گیا ہے کہ سرسید ذہین اور باصلاحیت نوجوانوں کو پہچاننے میں مہارت

رکھتے تھے۔ وہ ایسے نوجوانوں کی تعلیم اور ترقی کے سلسلے میں خصوصی دلچسپی لیتے تھے اور ان کی ہر امکانی مدد کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ اس فہرست میں مندرجہ ذیل نام شامل کیے جا سکتے ہیں جو سرسید کے کاموں میں نہایت کارآمد معاونین ثابت ہوئے تھے اور بیشتر نے مختلف ادوار میں سرسید کے پرسنل اسسٹنٹ کے فرائض بھی مستعدی سے انجام دیئے تھے۔

سرسید کے اول پرسنل سکریٹری جناب ابوالحسن صاحب، سمیع اللہ خاں صاحب کے صاحبزادے، حمید اللہ خاں صاحب، سرسید کے بھانجے سید محمد علی اور ان کے چھوٹے بھائی سید احمد علی، سرسید کے ماموں زاد بھائی خواجہ شرف الدین خاں صاحب کے صاحبزادے خواجہ وجیہہ الدین، امتیاز علی صاحب کے صاحبزادے ممتاز علی صاحب، ذکاءاللہ خاں صاحب کے صاحبزادے عنایت اللہ خاں صاحب اور ایجوکیشنل کانفرنس کے آفس میں موجود منشی نجم الدین صاحب۔

سب سے پہلے یعنی جب سرسید ۱۸۷۹ء میں وائسرائے کی لیجسلیٹیو کونسل کے ممبر نامزد ہوئے تھے اس وقت مولوی ابوالحسن صاحب نے ان کے پرسنل اسسٹنٹ یا پرائیوٹ سکریٹری کے فرائض انجام دیئے تھے۔ وہ ان کے ساتھ کلکتہ اور شملہ جایا کرتے تھے۔ سرسید ان کے کام سے بہت مطمئن تھے۔ ان کے کام کی تعریف کرتے ہوئے جو ''سند خوشنودی'' (یعنی ٹیسٹی مونیل) سرسید نے مورخہ ۱۴رجنوری ۱۸۸۱ء میں انہیں دیا تھا اس میں انھوں نے لکھا تھا کہ دو برس تک یعنی جب تک کہ وہ گورنمنٹ آف انڈیا کی لیجسلیٹیو کونسل میں ممبر رہے تھے مولوی ابوالحسن ان کے پاس بطور پرسنل اسسٹنٹ کام کرتے رہے تھے۔ ۷ے

''وہ انگریزی میں لائق ہیں اور ایمان دار اور معتمد و راز دار ہیں۔ وہ برابر کلکتہ و شملہ میں میرے ساتھ رہے تھے۔'' وغیرہ وغیرہ۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جہاں تک وائسرائے کی لیجسلیٹیو کونسل میں سرسید کی انگریزی تقریروں وغیرہ کا تعلق ہے ان میں مولوی ابوالحسن صاحب کے تعاون کا بڑا حصہ رہا ہوگا۔

جب سرسید ۱۸۸۷ء میں پبلک سروس کمیشن کے ممبر نامزد ہوئے تھے اس وقت جناب حمید اللہ خاں صاحب انگلینڈ سے اپنی تعلیم مکمل کر کے ہندوستان واپس آ چکے تھے اور الہ آباد ہائی کورٹ میں پریکٹس کر رہے تھے۔ اس وقت تک سرسید کے بھانجے سید احمد علی صاحب بھی ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد رسمی طور پر سرسید کے پرسنل اسسٹنٹ کے فرائض

انجام دینے لگے تھے اور سرسید کے ساتھ الہ آباد آتے جاتے رہتے تھے۔ سرسید جب کمیشن کے اجلاس کے سلسلے میں الہ آباد جاتے تھے تو حمید اللہ خاں صاحب ان کے کاموں کو انجام دینے کے لیے بہت وقت ان کے اور سید احمد علی صاحب کے ساتھ گزارتے تھے۔ ۱۸۸۷ء میں جب سرسید گورنر کی کونسل کے ممبر بھی نامزد کردیئے گئے تھے اس وقت تک سید محمد علی کا عدلیہ کی سروس میں انتخاب ہوگیا تھا۔ اس لیے اب الہ آباد میں سرسید کی انگریزی مراسلت وغیرہ سے متعلق زیادہ تر کام حمید اللہ خاں صاحب ہی انجام دیتے تھے۔ لیکن ۱۸۸۹ء میں قانون ٹرسٹیان کے پاس ہونے کی وجہ سے سمیع اللہ خاں صاحب سے جو اختلافات پیدا ہو گئے تھے اس کی وجہ سے حمید اللہ خاں صاحب نے بھی آہستہ آہستہ سرسید سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ اس زمانے میں سرسید کے ماموں زاد بھائی (خواجہ شرف الدین) کے صاحبزادے خواجہ وجیہہ الدین (جو کافی عرصے سے سید محمود کے پرسنل اسسٹنٹ کے بطور کام کررہے تھے) نے سرسید کے پرائیوٹ سکریٹری کے فرائض بھی انجام دینا شروع کردیئے تھے۔ خواجہ وجیہہ الدین نے ایک لمبے عرصہ تک سرسید اور سید محمود کے پرسنل اسسٹنٹ کے بطور اپنے فرائض انجام دیئے تھے۔ سید محمود کے ۱۸۹۳ء میں ہائی کورٹ کی ججی کے عہدے سے مستعفی ہوکر علی گڑھ منتقل ہوجانے کے بعد خواجہ وجیہہ الدین بھی ان کے ساتھ علی گڑھ منتقل ہوگئے تھے۔

علی گڑھ میں سید احمد علی کے ساتھ وہ (یعنی وجیہ الدین صاحب) سرسید کے آفس کی انگریزی مراسلت کی نگہداشت کرتے تھے۔ حالاں کہ ۱۸۹۷ء میں سید احمد علی ڈپٹی کلکٹر مقرر ہونے کے بعد سرسید ہاؤس سے چلے گئے تھے۔ لیکن ۱۸۹۷ء کے ایک مستند حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک خواجہ وجیہہ الدین کل وقتی طور پر سرسید کے پرسنل اسسٹنٹ کے بطور کام کررہے تھے اور ۱۸۹۸ء میں سرسید کا انتقال ہونے تک وہ ان کے ساتھ اسی حیثیت سے کام کرتے رہے تھے۔ سرسید کے انتقال کے بعد جب ۱۸۹۸ء میں سید محمود کالج کے لائف آنریری سکریٹری مقرر ہوگئے تھے۔ اس وقت بھی خواجہ وجیہہ الدین ان کے پرسنل اسسٹنٹ کے بطور کام کررہے تھے۔ بلکہ اب ان کی یہ حیثیت زیادہ مستحکم ہوگئی تھی۔ کیوں کہ سید محمود کے خط بنام تھیوڈور بیک مورخہ ۱۵ر ستمبر ۱۸۹۸ء سے اطلاع ملتی ہے کہ اس وقت تک خواجہ وجیہہ الدین سکریٹری کالج کمیٹی کے پرسنل اسسٹنٹ کے بطور سو روپے ماہوار پر کالج کے اسٹاف میں شامل کرلیے گئے تھے۔[۸]

لیکن جب سید محمود کالج کے سکریٹری کے عہدے سے برطرف کردیئے گئے تھے اس وقت خواجہ وجیہہ الدین کہاں رہے تھے اس کے بارے میں ہمیں پوری اطلاع نہیں ہے۔ لیکن ہمیں یہ ضرور معلوم ہے کہ جب سید محمود ۱۹۰۱ء میں اپنے چچازاد بھائی سید محمد احمد خاں صاحب کے ساتھ رہائش اختیار کرنے کی غرض سے سیتاپور منتقل ہو گئے تھے اس وقت خواجہ وجیہہ الدین ان کے ساتھ سیتاپور منتقل نہیں ہوئے تھے بلکہ وہ اپنی بہن (بیگم محمود) اور بھانجے راس مسعود کے ساتھ سرسید ہاؤس ہی میں مقیم رہے تھے۔ ۱۸۹۰ء کے بعد مولوی ذکاالله صاحب کے صاحبزادے مولوی عنایت الله صاحب اکثر کافی لمبے لمبے عرصے کے لیے علی گڑھ آکر سرسید ہاؤس میں مقیم رہتے تھے اور سرسید کی انگریزی مراسلت اور آفس کے دوسرے تمام کاموں کو نہایت مستعدی سے انجام دیتے تھے۔ سرسید ان کی لیاقت اور کام کرنے کے طریقہ سے بہت مطمئن رہتے تھے۔ عنایت الله صاحب کی صحت اچھی نہیں رہتی تھی جس کی وجہ سے سرسید فکرمند رہتے تھے اور اکثر ان کی رہائش کا انتظام کر کے انہیں پہاڑ پر جانے کی صلاح دیتے تھے جس کی شہادت سرسید کے خطوط کے مندرجہ ذیل اقتباسات سے دستیاب ہوتی ہے۔

۱۔ سرسید کا خط بنام عنایت الله مورخہ ۱۷ مئی ۱۸۹۰ء

''تمہارا خط پہنچا۔ میں نے راجہ صاحب کو خط لکھا ہے۔ جواب آنے پر تم کو اطلاع دوں گا۔ مگر چند باتیں سمجھ لینی چاہئیں۔ اول یہ کہ پہاڑ پر اگر پھرنا نہ ہوا اور ایک جگہ بیٹھے رہو تو محض بے فائدہ ہے''۔[9]

۲۔ سرسید کا خط بنام راجہ جے کشن داس مورخہ ۱۷ مئی ۱۸۹۰ء۔

''اگر آپ کو تکلیف نہ ہو اور کسی کمرے میں پندرہ بیس روز عنایت الله کو رہنے کی اجازت دے دیں۔ عنایت الله نہایت سعادت مند لڑکا ہے اور بہت سلیقہ کا اور نہایت آدمیت اور صفائی سے رہنے والا''۔[10]

۳۔ سرسید کا خط بنام عنایت الله مورخہ ۱۹ مئی ۱۸۹۰ء

''راجہ صاحب کی تجویز مرسل ہے۔ وہ کمرا دینے کو موجود ہیں۔ جب تمہارا دل چاہے چلے جاؤ۔ راجہ صاحب بھی جانے والے ہیں ان کے سبب سے بہت باتوں میں آرام رہے گا اور شاید چند روز کو میں بھی جاؤں''۔[11]

طبیعت کی خرابی کے باوجود عنایت اللہ صاحب سر سید کے تجویز کردہ ترجمے کے کام مستعدی سے کرتے رہتے تھے۔ سر سید ترجمہ کے کام کے کاغذات ڈاک سے عنایت اللہ صاحب کے پاس بھیجتے رہتے تھے یا پھر وہ علی گڑھ آکر اپنا کام مکمل کرتے تھے جس کی شہادت سر سید کے متعدد خطوط سے ملتی ہے۔ اس سلسلے میں سر سید کے ایک خط کا مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو۔

سر سید کا خط بنام عنایت اللہ صاحب مورخہ ۸/ مارچ ۱۸۹۳ء۔

''مسٹر ماریسن کی اسپیچ قریب ۱۶ صفحہ قلمی ہے۔ اس اسپیچ کا ترجمہ میں چاہتا ہوں تم مہربانی سے کردو۔ اگر تمہاری طبیعت خدا کے فضل سے اچھی ہو اور دل خوش ہو تو ان کی اسپیچ تمہارے پاس بھیج دوں''۔۱۲؎

سر سید کی ایما پر ہی عنایت اللہ صاحب کا ۱۸۹۳ء میں بطور لائبریرین کالج میں تقرر ہو گیا تھا۔ سر سید اپنے خط مورخہ ۱۱/ مارچ ۱۸۹۳ء کے ذریعہ عنایت اللہ صاحب کو اطلاع دیتے ہیں کہ:

''مسٹر بیک پرنسپل کالج نے تم کو چھٹی لکھی ہے اور انھوں نے مجھ سے کہا کہ شاید تم نے ان کی تحریر و تجویز کو پسند کیا ہے۔ میں بھی بھاولپور جانے سے تمہارا یہاں رہنا پسند کرتا ہوں۔ لائبریرین کو بہت کم کام ہے مگر چونکہ وہ کلرک آف کالج بھی تصور ہوتا ہے اس لیے پرنسپل کو کچھ چھٹیاں وغیرہ لکھوانی ہوتی ہیں وہ بھی لکھنی پڑتی ہیں...... غرض کے کام تمہاری طبیعت و حالت کے مناسب ہے...... مناسب ہے کہ تم یہاں چلے آؤ...... میرے یہاں رہو جب تک تم اپنا مناسب بندوبست کرو''۔۱۳؎

اس طرح انھوں نے مارچ ۱۸۹۳ میں علی گڑھ آکر بورڈنگ ہاؤس میں سکونت اختیار کر لی تھی جس کی شہادت سر سید کے مندرجہ ذیل خط سے فراہم ہوتی ہے۔

سر سید کا خط بنام عنایت اللہ مورخہ ۲۲/ مارچ ۱۸۹۳ء۔

''۲۴ مارچ بروز جمعہ بوجہ اجلاس کونسل بریلی جاؤں گا اور وہاں سے الہ آباد اور سید محمود کو علی گڑھ لانے کی کوشش کروں گا۔ اگر وہ آئے تو اپریل کے شروع میں آویں گے۔ کمرا خالی ہے تم بروز شنبہ یہاں آکر

فروکش ہو اور بورڈنگ ہاؤس میں اپنے رہنے کا بہ طمانیت بندوبست کرلو۔ اگر تم بورڈنگ ہاؤس میں اپنا کھانا علیحدہ پکوا کر کھانا چاہو تو ایک مکان دروازہ بورڈنگ ہاؤس کے سامنے باغ میں ہے (یعنی وکٹوریہ گیٹ کے سامنے) اس میں بخوبی کھانا پک سکے گا''۔۱۴؎

لیکن شاید عنایت اللہ صاحب نے دو ایک سال ہی کالج میں نوکری کی تھی کیوں کہ ۱۸۹۶ء میں وہ دوبارہ دہلی میں موجود تھے اور سرسید اپنے خط مورخہ ۱۸؍جولائی ۱۸۹۶ء کے ذریعہ انہیں اپنے آفس کے کام کے سلسلے میں دو دو ہفتہ کے لیے علی گڑھ آنے کی ہدایت دے رہے تھے۔

''چنانچہ چھٹیات موجودہ کو بہ ترتیب درست کرلیا ہے۔ اب صرف ان کا نئے رجسٹروں میں چڑھانا ہے۔ اس کام میں تمہاری ہی مدد چاہتا ہوں بشرطیکہ تمہاری طبیعت بہ صحت کامل ہو اور بحالت صحت تمہارا یہاں آنے کا ارادہ ہو تو دو ہفتہ کے قریب تم کو کام کرنا ہوگا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ تمہاری صحت بالکل صحیح اور تندرست ہو''۔۱۵؎

عنایت اللہ صاحب نے آخیر وقت تک سرسید کا ساتھ نبھایا تھا۔ انتقال سے ڈیڑھ مہینہ پہلے یعنی ۱۵؍فروری ۱۸۹۸ء کے خط میں وہ عنایت اللہ صاحب کو تحریر کرتے ہیں کہ:

''جو نسخہ آپ کے پاس وجیہہ الدین صاحب نے بھیجا ہے وہ نسخہ نہیں ہے بلکہ چار دواؤں کے نام ہیں۔ ان کو علیحدہ چار شیشیوں میں ہونا چاہیے پس آپ ان چاروں دواؤں کو چار شیشیوں میں خرید لیں اور میرے پاس بذریعہ ڈاک بھیج دیں اور ان کی قیمت سے مجھے اطلاع دیں''۔۱۶؎

اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ عنایت اللہ صاحب سرسید کے آخری وقت تک کسی نہ کسی صورت میں ان کے مختلف کام انجام دیتے رہے تھے اور ان کے ساتھ خواجہ وجیہہ الدین صاحب بھی سرسید کی خدمت میں مستعدی سے مصروف تھے۔

ایک اور صاحب جو سرسید کے تصنیف و تالیف اور آفس کی مراسلت کے سلسلے میں بہت مددگار ثابت ہوئے تھے وہ منشی نجم الدین تھے۔ منشی نجم الدین صاحب کا تقرر غالباً محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے آفس میں بطور کلرک کے ہوا تھا۔ لیکن سرسید نے ان کی

خدمات اپنے آفس کے کام کے لیے کانفرنس سے مستعار لی تھیں۔ نجم الدین صاحب ''املا'' لکھنے کے ماہر تھے اور سرسید کے آفس میں ہندوستانی و فارسی کلرک کے بطور کام کرتے تھے۔ ۱۸۹۳ء کے بعد جب سید محمود ہائی کورٹ سے مستعفی ہو کر علی گڑھ منتقل ہو گئے تھے اس وقت بتدریج منشی نجم الدین صاحب کا کام بڑھنا شروع ہو گیا تھا۔ ۱۸۹۶ء تک سید محمود کے ذہنی انتشار میں اضافہ کے ساتھ نجم الدین صاحب کی دشواریاں کافی بڑھ گئی تھیں۔ میر ولایت حسین تحریر کرتے ہیں کہ منشی نجم الدین صاحب نے خود انہیں بتلایا تھا کہ:

''سید صاحب اور مرزا عابد علی بیگ صاحب اور سید محمد احمد صاحب (ممبران) کی موجودگی میں (سرسید ہاؤس میں) جلسے روزانہ صبح سے رات کے ایک دو بجے تک جاری رہتے اور وہ (یعنی منشی نجم الدین) روئیدادیں، جن کو سید محمود ٹہل ٹہل کر لکھوایا کرتے، لکھا کرتے اور سید صاحب اپنی چوکی پر مجبوراً بیٹھے رہتے۔ اس طرح روئیدادوں کی تعداد لا متناہی ہو گئی''۔[۷۱]

کام کے سلسلے کی تمام تر اذیتوں کے باوجود منشی نجم الدین، آخری وقت تک سرسید کے ساتھ موجود رہے تھے۔ سرسید کے انتقال کے بعد جب سید محمود کالج کمیٹی کے سکریٹری ہوئے تو انھوں نے نجم الدین صاحب کو اپنے آفس میں ٹرانسفر کروالیا تھا۔ لیکن اس وقت تک سید محمود کا دیر رات تک جاگتے رہ کر طویل خطوط اور روئیدادیں لکھوانے کا سلسلہ بہت آگے بڑھ چکا تھا۔ غالباً اسی وجہ سے کچھ عرصے ان کے آفس میں رہنے کے بعد منشی نجم الدین نے اپنی خرابی صحت کی بنیاد پر دیر رات تک آفس میں کام کرنے سے معذرت چاہی ہوگی جس کی وجہ سے سید محمود ان سے خاصے بدظن ہو گئے تھے جس کا اظہار ان کے خط بنام مسٹر بیک، پرنسپل، ایم۔ اے۔ او۔ کالج، مورخہ ۱۵ر ستمبر ۱۸۹۸ء سے بخوبی ہوتا ہے۔ وہ تحریر کرتے ہیں کہ:

''مسٹر نجم الدین سکریٹری کے آفس میں کسی پوسٹ پر متعین نہیں تھے بلکہ یہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں کلرک تھے۔ چونکہ ایجوکیشنل کانفرنس کالج ہی کے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے بنائی گئی تھی اس لیے وہ عموماً کالج میں ہندوستانی کلرک کے فرائض انجام دیتے تھے۔ سرسید احمد خاں کے انتقال کے بعد سے یہ نواب محسن الملک کے

ساتھ کام کرتے تھے جو کالج کے ٹرسٹی ہونے کے ساتھ ساتھ فائنس کمیٹی اور سرسید میموریل کمیٹی کے صدر ہیں اور ایجوکیشنل کانفرنس کے کاموں میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ میں نے نواب محسن الملک سے ان کی خدمات مستعار لی تھیں اور انہیں ان کی سابقہ تنخواہ یعنی ۲۵ روپے مہینہ پر ہندوستانی و فارسی کلرک کی حیثیت سے اپنے آفس میں مقرر کر دیا تھا۔ لیکن چونکہ پچھلے کچھ عرصہ سے ان کی صحت خراب رہ رہی تھی اسی لیے کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد انھوں نے اپنے کام کے سلسلے میں جو فرائض ان کے سپرد کیے گئے تھے ان کے انجام دینے سے اپنی معذوری کا اظہار کیا۔ جس کی وجہ سے میرے آرڈر مورخہ ۸ر ستمبر ۱۸۹۸ء کے ذریعہ اس آفس سے ان کا تقرر منسوخ کر دیا گیا''۔[۱۸]

اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۸ر ستمبر ۱۸۹۸ء کے بعد نجم الدین صاحب دوبارہ ایجوکیشنل کانفرنس میں اپنی پرانی پوسٹ پر واپس چلے گئے ہوں گے۔ منشی نجم الدین ان چند لوگوں میں سے ایک تھے جو سرسید کے آفس میں ان کے آس پاس ہمیشہ موجود رہتے تھے۔ تا کہ جس وقت سرسید کو ضرورت ہو تو وہ ''ڈکٹیشن'' دے سکیں۔ سرسید کے آفس کے کاموں، خاص طور پر ان کی مراسلت اور دوسری تحریروں کے سلسلے میں منشی نجم الدین نہایت کارآمد معاون ثابت ہوئے تھے۔ منشی نجم الدین صاحب نے لمبی عمر پائی تھی۔ ان سے متعلق ایک عمدہ مضمون بعنوان ''سرسید کے رفیق منشی نجم الدین'' پروفیسر مختارالدین آرزو صاحب نے ۱۹۵۴ء میں لکھا تھا جو پہلی بار ''نئی تحریریں'' لاہور میں ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کی اہمیت اس لیے زیادہ ہے کہ آرزو صاحب ذاتی طور پر منشی نجم الدین صاحب سے واقف تھے۔

اسی کے ساتھ نوے کی دہائی میں دوسرے وہ لوگ جو سرسید کے کاموں میں خاص طور پر ان کی انگریزی مراسلت اور ان کی مختلف تحریروں کے ترجموں کے کام میں وقتاً فوقتاً ان کی مدد کرتے رہتے تھے ان میں سے چند لوگوں کے نام اس طرح ہیں۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، میر ولایت حسین، شیخ محمد عبداللہ وغیرہ۔ ان لوگوں کے علاوہ انگلش اسٹاف کے لوگ خاص طور پر مسٹر تھیوڈور بیک اور مسٹر ماریسن بھی سرسید کے لیے اکثر

انگریزی ڈرافٹ تیار کرتے تھے۔ خود سید محمود جو ۱۸۹۳ء میں الہ آباد سے علی گڑھ منتقل ہو چکے تھے اس سلسلے میں سرسید کے معاون ہوتے تھے۔

سرسید کے بے تکلف دوست:

ہم یہاں یہ بات کہنے کی اجازت چاہیں گے کہ سرسید کے رفقا و احباب کی جو لمبی فہرست لوگوں نے مرتب کر رکھی ہے وہ سب سرسید کے ہم عصر، ان کے مشیر، شرکائے کار، ہم خیال، شناسا، ہمدرد اور معتقدین تو ہو سکتے ہیں لیکن ان میں سرسید کے بے تکلف دوست خال خال ہی تھے۔ علی گڑھ میں موجود لوگوں میں اس زمرے کے ناموں میں شاید زین العابدین صاحب کا نام سرِ فہرست ہوگا۔ ان کے علاوہ، اگر کسی اور کا نام اس فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے تو وہ شاید (تھوڑے سے تامل کے ساتھ) اسماعیل خاں صاحب کا نام ہوگا۔

زین العابدین صاحب عدلیہ کی سروس میں تھے اور ۱۸۸۹ء میں (ڑیٹائرمنٹ سے پہلے) مراد آباد میں سب جج کی حیثیت سے متعین تھے، اُسی زمانے میں وہ وہاں بیمار ہو گئے تھے جس کی وجہ سے انھوں نے مئی ۱۸۸۹ء میں چھ مہینے کی چھٹی لے لی تھی اور اسی کے ساتھ چھٹی کے بعد پنشن لے کر ریٹائر ہونے کا ارادہ بھی ظاہر کیا تھا۔ سرسید ان کی بیماری کی خبر سن کر کس قدر پریشان ہوئے تھے اس کا اندازہ ان کے خطوط کے مندرجہ ذیل اقتباسات سے لگایا جا سکتا ہے۔

سرسید کا خط بنام زین العابدین مورخہ ۷ رمئی ۱۸۸۹ء۔

> ''تمہارا خط پہنچا۔ میرا نینی تال جانا چند کاموں کے انجام پر موقوف ہے جو ٹھیک معلوم نہیں کہ کب انجام ہوں گے۔ مگر تم اپنا وقت کیوں ضائع کرتے ہو راجہ صاحب کا مکان موجود ہے جو کمرے میرے متعلق ہیں ان میں تو راجہ صاحب کو بھی مداخلت کا اختیار نہیں ہے پس تم فی الفور مع زین الدین چلے جاؤ۔ تمہاری بیماری سے میں سخت پریشان و متردد ہوں''۔[19]

(☆ ایک مجموعہ خطوط میں لفظ ''بیماری'' کے بجائے غلطی سے ''بیوی'' چھپ گیا تھا جس کی وجہ سے یہ غلطی کئی اور مجموعوں میں بھی پہنچ گئی ہے)۔

سرسید کا خط بنام زین العابدین مورخہ ۸؍مئی ۱۸۸۹ء۔

''جن تر ددات کا مجھے ہمیشہ خیال رہتا تھا آخر وہ دن آن موجود ہوئے۔ لیکن چھ مہینے کی رخصت منظور ہو یا پنشن ہو تم کو اپنی باقی ماندہ زندگی بسر کرنے کا اس وقت پورا بندوبست کرنا چاہیے۔ تمہارا خیال کیا ہے؟ میں تو اس وقت تمہارا خط پڑھ کر اس قدر پریشان ہوا ہوں کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا''۔[۲۰]

سرسید کا خط بنام زین العابدین مورخہ ۹؍مئی ۱۸۸۹ء۔

''میں ۲۰؍مئی کو یقیناً نینی تال جاؤں گا۔ اگر چہ تم میں طاقت نہیں ہے مگر جس طرح ہو سکے تم میرے پاس آ جاؤ۔ تمہارا دل بھی بہلے گا۔ تم سے تمہارے آئندہ حالات کی نسبت بات چیت کرنے سے میری پریشانی بھی رفع ہوگی۔ مع ھذا جب چھ مہینے کی رخصت لی ہے تو وہاں پڑے رہنے سے کیا فائدہ؟ علی گڑھ میں رہو یہاں آ جاؤ تو اس کا بندوبست بھی کیا جاوے''۔[۲۱]

سرسید کا خط بنام زین العابدین مورخہ ۱۳؍مئی ۱۸۸۹ء۔

''میری بھی نہایت تمنا ہے کہ جب تک زندہ ہوں تم علی گڑھ میں رہو۔ میری کوٹھی سے متصل جو بنگلہ ہے جس میں ڈاکٹر رہتا تھا خالی ہو گیا ہے۔ جب تک تمہارے رہنے کا معاملہ طے نہ ہو کسی کو کرایہ پر نہیں دینے کا۔ جس قدر جلد ممکن ہو اور تم میں طاقت ہو ایک دن یا دو دن کے لیے میرے پاس ہو جاؤ۔ جب تک تم مل نہ جاؤ گے اور تم سے زبانی بات چیت نہ ہو جائے گی تر ددات جو لاحق ہیں رفع نہ ہوں گے''۔[۲۲]

اسی فکر و تر دد کا نتیجہ تھا کہ کچھ عرصہ بعد جب زین العابدین صاحب عدلیہ کی سروس سے ریٹائر ہو کر علی گڑھ آئے تو سرسید نے سرسید ہاؤس کی مغربی باؤنڈری سے ملحق بنگلہ (موسومہ بنگلہ خورد) جس کو ڈاکٹر ایلس نے حال ہی میں خالی کیا تھا، زین العابدین صاحب کو کرایہ پر ان کی رہائش کے لیے دلوا دیا تھا۔ زین العابدین صاحب کے لیے سرسید ہاؤس کے دروازے ہمیشہ وا رہتے تھے۔ صبح کی سیر ہو یا ناشتہ، دوپہر کا کھانا ہو یا شام کی

چائے ، زین العابدین صاحب ضرور پکڑے جاتے تھے۔ سرسید کے لیے کام کی تھکن اور کثافت دور کرنے کے لیے بھی زین العابدین صاحب کی موجودگی ضروری ہوتی تھی۔ اسی لیے جب وہ کام کرتے کرتے تھک جاتے تو چپراسی بھیج کر زین العابدین صاحب کو کھانا کھانے یا چائے پینے کے لیے طلب کرلیا جاتا تھا۔ لیکن یہ رفاقت زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکی کیوں کہ اسی عرصہ میں زین العابدین صاحب کو رام پور میں ایک ملازمت مل گئی اور وہ اپنے اہل وعیال کو علی گڑھ میں چھوڑ کر رام پور چلے گئے اور جب تک انھوں نے رام پور میں ملازمت کی ان کو اپنے اہل وعیال کی طرف سے قطعی اطمینان اور بے فکری رہی تھی۔ خاص طور پر اپنے صاحبزادگان کی تعلیم کی طرف سے وہ قطعی بے فکر اور مطمئن تھے کیوں کہ ان کے کالج میں تعلیم کے سلسلے کے انتظامات کی سرسید خود نگہداشت کرتے تھے۔ رام پور میں تقریباً پانچ سال ملازمت کرنے کے بعد سرسید ہی کی ایما پر، وہ دوبارہ علی گڑھ واپس آ گئے تھے۔ سرسید نے اس سلسلے میں اپنے خط مورخہ ۲۸/ اکتوبر ۱۸۹۵ء میں انہیں لکھا تھا کہ:

> ''جو کچھ تم کو ملتا ہے تمہاری زندگی بسر کرنے کے لیے نہایت کافی ہے۔ خدا کا شکر کرو اور اپنے گھر میں آ کر بیٹھو اور جو خدا نے دال روٹی دی ہے اس کو کھاؤ اور شکر کرو۔ السٹر جو تم نے بنوایا ہے میں یہ جانتا تھا کہ میرے لیے بنوایا ہے اور عظیم نے جو لکھا تھا وہ سچ لکھا تھا میں نے اس سے یوں ہی کہا تھا''۔ [۲۳]

اس زمانے میں زین العابدین صاحب اپنی مستقل سکونت کے بارے میں متفکر تھے اور علی گڑھ ہی میں اپنی رہائش کے لیے ایک مکان بنانے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ غالباً اس سلسلے میں انھوں نے سرسید کو خط لکھا ہوگا جس میں کچھ شکوے اس طرح کے بھی ہوں گے کہ جب سون پال کی کوٹھی فروخت ہو رہی تھی تو اسے انھوں نے ان کے بجائے اسماعیل خاں صاحب کو خرید وا دیا تھا (یہ کوٹھی ابھی حال تک نشاط کوٹھی کے نام سے مشہور تھی۔ اب اس میں علی گڑھ پبلک اسکول قائم ہے)۔ اس کے علاوہ ایک زمین جو سرسید ہاؤس کے شمال میں واقع تھی (جس پر اب ''محمودہ بیگم'' کوارٹرز کی عمارت تعمیر ہو چکی ہے) اُس پر بھی زین العابدین صاحب مکان تعمیر کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔ لیکن وہ زمین سرسید کی ایما پر اُن کے بھتیجے سید محمد احمد صاحب نے اپنا مکان تعمیر کرنے کے لیے خرید لی تھی۔ غالباً اس خط میں زین العابدین صاحب نے اس امکان پر بھی غور کرنے کے لیے لکھا تھا کہ جس مکان

میں اس وقت وہ رہ رہے ہیں۔ کالج اُس مکان کو قیمتاً اُن کے نام منتقل کر سکتا ہے یا نہیں۔ اس خط کے جواب میں سرسید نے جو خط لکھا تھا اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جہاں تک کالج کے مفادات کا تعلق تھا وہ اپنے عزیز دوستوں تک سے نہایت صفائی سے معاملات طے کیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ اپنے خط مورخہ ۱۱؍ مارچ ۱۸۹۶ء میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''میں اب بھی تم کو صلاح دیتا ہوں کہ اپنی اولاد سے جو فضل الٰہی سے سمجھ دار ہیں صلاح کرو کہ وہ کہاں توطن اختیار کرنا پسند کرتے ہیں۔ علی گڑھ میں یا دوسری جگہ۔ اگر وہ مرادآباد میں پسند کریں جس کو میں بھی اپنی اور تمہاری زندگی کے بعد اُن کا وطن ہونا پسند کرتا ہوں تو تم کو مرادآباد میں کوئی مکان لے لینا، جو سستا بھی ملے گا، نہایت مناسب ہے۔ اور اگر وہ علی گڑھ میں رہنا پسند کریں تو علی گڑھ میں کوئی بندوبست کیا جائے۔ اسماعیل خاں والی کوٹھی اُن کے لیے خرید دینے کی شکایت بے جا ہے۔ کبھی مجھ کو خیال بھی نہ تھا کہ درحقیقت اس زمین کے خریدنے کا اور اس میں مکان بنانے کا جو میری کوٹھی کے پاس ہے اور جو محمد احمد کے لیے خریدی گئی ہے تمہارا ارادہ ہے اور نہ کبھی اُس کا ارادہ تم نے ظاہر کیا۔ اب اس خط میں اُس کا ذکر کرتے ہو۔ جس بنگلہ میں تم علی گڑھ میں رہتے ہو اگر میری ملکیت ہوتا تو شاید خدا جانتا ہوگا کہ میں اسی وقت بلا معاوضہ تم کو دے دیتا۔ مگر آپ کو معلوم ہے کہ وہ ملکیت مدرسہ ہے۔ نہ اس کو میں منتقل کر سکتا ہوں نہ اس کا منتقل کرنا مناسب ہے اور نہ کرایہ میں تخفیف کر سکتا ہوں...... یہ تو آپ یقین کر لیں کہ جس بنگلے میں آپ رہتے ہیں وہ کسی طرح منتقل نہیں ہو سکتا۔ مگر آپ اس بات کا قطعی تصفیہ کریں کہ بعد میری اور آپ کی زندگی کے آپ کی اولاد کو کہاں توطن اختیار کرنا مناسب ہوگا۔ علی گڑھ میں یا کسی اور جگہ۔ اگر علی گڑھ ہی میں توطن قرار پاوے تو اس وقت کوئی تدبیر مکان کی نسبت کی جاوے اور صلاح سے کوئی زمین لی جاوے جس میں مکان تعمیر ہو''۔[۲۴]

سرسید کی زندگی میں زین العابدین صاحب ''بنگلہ خورد'' ہی میں رہائش پذیر

رہے۔ بلکہ ان کے انتقال کے بعد بھی اُسی مکان میں رہتے رہے۔۱۹۰۳ء میں انھوں نے تاروالے بنگلہ کے احاطہ کی مشرقی دیوار سے ملحق زمین پر اپنا ایک ذاتی مکان تعمیر کروایا تھا۔ جس کے لیے آراضی غالباً کالج نے انہیں ''پٹہ'' پر دی تھی۔ زین العابدین صاحب کے ۱۹۰۵ء میں انتقال کے بعد بھی اُن کے صاحبزادگان، سید زین الدین اور سید عین الدین اس مکان میں رہائش پذیر رہے تھے۔ لیکن اجلاس ٹرسٹیان منعقدہ ۱۵/اپریل ۱۹۱۰ء کی روئیداد سے معلوم ہوتا ہے کہ زین الدین صاحب اور عین الدین صاحب نے یہ مکان مبلغ سات سو ایک روپے چار آنہ اور چھ پائی کے عیوض واپس کالج کی تحویل میں دے دیا تھا۔ اب یہ مکان یونیورسٹی کی ملکیت میں ہے۔[۲۵]

راس مسعود کی دودھ چھوٹنے کی شادی:

آج کل ''صحت نسواں'' کے ماہروں کا اس خیال پر مکمل اتفاق ہے کہ ماؤں کا اپنے بچوں کو دودھ پلانا بچے اور ماں دونوں کی صحت کے لیے اشد ضروری ہے۔ انیسویں صدی میں ماؤں کا اپنے بچوں کو کافی عرصہ تک دودھ پلانے کا رواج عام تھا۔ سید راس مسعود تقریباً پونے دو سال کی عمر تک اپنی والدہ کا دودھ پیتے رہے تھے۔ ماں کا دودھ چھٹانا بھی ایک مرحلہ ہوتا تھا۔ جس کو بہت سی رسومات کے ساتھ ایک تقریب کے بطور انجام دیا جاتا تھا۔ سید راس مسعود کے دودھ چھوٹنے کی شادی (یا جشن) کا اہتمام نومبر ۱۸۹۰ء میں کیا جا رہا تھا۔ جس کی شہادت سرسید کے خط بنام حکیم احمد الدین مورخہ ۱۴/ستمبر ۱۸۹۰ء سے دستیاب ہوتی ہے۔

> ''بوا سے کہہ دینا کہ ماہ نومبر میں ہم سب لوگ دہلی آویں گے اور محمود بیگم کا ارادہ ہے کہ مسعود کے دودھ چھوٹنے کی شادی کریں گی۔ بس اس مکان میں جس میں تم رہتے ہو تمہارے ساتھ سب رہیں گے۔ محمود بیگم نے کہا کہ میں تو جس قدر روپیہ کہیں گی اُن کو یعنی عجبۃ النسا بیگم کو دے دوں گی۔ ان کو اختیار ہوگا جس طرح چاہیں وہ کریں وہی بڑی ہیں اور وہی سب کچھ کریں گی۔ مکان کی سفیدی و ضروری مرمت کرنی اور چلمن پردے اور چاندنیاں بنوانی ضروری ہیں۔ تم ان سب کا تخمینہ کر کے بصلاح ان کے میرے پاس بھیج دو۔ میں بھی

دس پندرہ دن بعد پھر وہاں آؤں گا اور سب امور سمجھا دوں گا''۔ ۲۶

ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں سید محمود کی ازدواجی زندگی (شادی کے دو سال گزر جانے کے باوجود) خاصی آسودہ اور پرسکون تھی۔ سرسید بھی اب پوری طرح اپنے پوتے کی محبت اور دیکھ ریکھ میں مگن اور مصروف نظر آتے ہیں۔ حالاں کہ اس وقت وہ علی گڑھ میں اسٹریچی ہال کی عمارت کو جلد از جلد مکمل کرنے کے لیے تن من دھن سے لگے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود اب وہ تواتر سے الہ آباد آنے جانے لگے تھے نیز الہ آباد میں بتدریج ان کے قیام کی مدت میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اس زمانے میں اُن کی دلچسپیاں خانگی معاملات میں کافی بڑھ گئی تھیں۔ سید محمود نے کچھ عرصے پہلے دہلی میں اپنے آبائی مکان کے قرب میں واقع خالی زمین پر اپنی پسند کے مطابق ایک جدید طرز کا مکان اپنے خاص استعمال اور آرام کی خاطر تعمیر کروانے کی خواہش کا اظہار اپنی پھوپھی عجبۃ النسا بیگم سے کیا تھا۔ لیکن جب اس سلسلے میں تاخیر ہوئی تو عجبۃ النسا بیگم نے استفسار کرنا شروع کیا۔ مجبوراً سرسید کو اپنی بہن کی خاطر وہ کیفیت بیان کرنا پڑی جس کی وجہ سے سید محمود مکان تعمیر کروانے کے سلسلے میں تاخیر کر رہے تھے۔ وہ اس سلسلے میں اپنے خط بنام حکیم احمد الدین مورخہ ۱۱ر ستمبر ۱۸۹۰ء میں تحریر کرتے ہیں کہ:

> ''بوا سے یہ بھی کہہ دو کہ سید محمود کا مستقل ارادہ ہے کہ جو زمین حویلی کے پاس اور دکانیں پڑی ہیں وہاں ایک کمرا وغیرہ مکانات اپنے آرام کے موافق بنوالیں تاکہ جب چاہیں وہاں آویں رہیں لیکن انھوں نے صاف طور پر کہا کہ اگرچہ یہ مکان دراصل آپ کا نہیں ہے لیکن اس مکان کا قبالہ خرید آپ کی والدہ اور بیوی کے نام کا ہے یعنی موسومہ عزیز النسا بیگم و پارسا بیگم اور اس سبب سے ایک جھگڑے کی چیز ہے اور میں نے اسی سبب سے کہ ایک جھگڑے کی چیز میں پڑنا بے فائدہ ہے اب تک کچھ نہیں کیا۔ میں نے کہا کہ ہاں یہ سچ ہے مگر کوئی جھگڑا کرنے والا نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ گو اس وقت کوئی نہیں ہے مگر آئندہ کوئی کرے تو کیا علاج ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر تم کو ایسا خیال ہے تو میں تمھارے نام اس مکان کی دستاویز جس طرح پختگی سے تم چاہو لکھ دوں پھر کچھ اندیشہ نزاع باقی نہیں

رہے گا۔ ابھی وہ اس بات کو سوچتے ہیں اگر ان کی رائے میں آگیا اور
منظور کیا تو میں دستاویز لکھ دوں گا اور وہ مکان بنالیں گے۔ غرض کہ
بوا کو جو تردد تھا کہ سید محمود نے باوجود مصمم ارادہ کے کیوں اب تک
مکان بنانے کا ارادہ نہیں کیا۔ اس تحریر سے ان کو معلوم ہو جاوے گا
کہ اس کا سبب یہ تھا۔ دو ایک روز بعد وہ سمجھ کر اس کا جواب دیں
گے۔ کسی ہوشیار معمار سے تم اس زمین کو جو حویلی کے آگے واقع ہے
مع ان دکانیں و مکان کے جو امام بخش سے خریدے ہیں نقشہ بنوا کر
بھیج دو مگر نقشہ صحیح و ہر ضلع کی ٹھیک پیمائش فٹوں کے حساب سے
ہو۔ منشی اکرام الدین والوں کی جو زمین وہاں واقع ہے اُس کو بھی سید
محمود خرید کر شامل کر لینا چاہتے ہیں۔ اول تو یہ بات کہ وہ مل سکے گی یا
نہیں دوسرے یہ کہ خواجہ شرف الدین خاں صاحب سے صلاح
کر کے بطور تخمینہ کے لکھو کہ درحقیقت وہ زمین کس مالیت کی ہے اور
بہ سبب اس کے کہ اس کا لینا منظور ہے کس قدر قیمت تک لے لینا
مناسب ہے۔ یہ خط خواجہ شرف الدین خاں صاحب کو دکھا دینا تا کہ
سب باتیں اس کی سمجھ میں بخوبی آجاویں اور وہ رائے دے سکیں''۔[۲۷]

اس خط میں سید محمود کا اپنے خاندان کے دوسرے لوگوں کے سلسلے میں جائداد کو لے کر خدشات کا اظہار کرنا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ غالباً وہ اپنے بڑے بھائی (یعنی سید حامد) کی طرف سے ایک محتاط رویہ روا رکھتے تھے۔

سرسید کی علی گڑھ میں مصروفیات:

سرسید اس زمانے میں علی گڑھ میں کالج کی عمارتیں تعمیر کروانے میں مصروف تھے۔ ''کالج کی عمارتوں'' سے مراد وہ عمارتیں تھیں جو آج مشرق میں مہدی منزل سے شروع ہو کر مغرب میں مشتاق منزل تک ایک لائن میں واقع ہیں اور جن کے وسط میں اسٹریچی ہال کی عمارت موجود ہے۔ اس زمانے میں سرسید خاص طور پر اسٹریچی ہال اور اس کے دونوں اطراف موجود بڑے دروازوں کی تعمیر کو مکمل کروانے میں تندہی سے مصروف تھے۔ ۱۸۹۱ء میں کالج کی عمارتوں میں سے کون کون سی عمارتیں تعمیر ہو چکی تھیں، کون سی

عمارتیں زیر تعمیر تھیں اور کون سی عمارتوں کی تعمیر کی ابھی ابتدا ہونا باقی تھی۔ ان معاملات کے سلسلے میں سرسید نے اجلاس ٹرسٹیان منعقدہ ۲۸ر دسمبر ۱۸۹۱ء میں مندرجہ ذیل رپورٹ پیش کی تھی جس سے ان امور کا مفصل حال معلوم ہوتا ہے۔ سرسید کے اس بیان میں جگہ بہ جگہ قارئین کی سہولت کے لیے منصف نے قوسین میں چند اندراجات فراہم کر دیئے ہیں۔

''عمارت مدرسۃ العلوم کا حال اگرچہ آپ سب صاحبان کو معلوم ہے مگر میں بطور یاددہانی کے عرض کرتا ہوں کہ اس عمارت کے بیچ میں سینٹرل ہال ہے اور اسٹریچی ہال کے نام سے معزز ہے۔ اس ہال کی جانب مشرق جو ایک دروازہ ہے وہ لارنس گیٹ کے نام سے نامزد ہے جو کلکٹر و مجسٹریٹ علی گڑھ کے تھے اور جنھوں نے مدرسۃ العلوم کی تعمیر کے لیے ایک قطع زمین ملنے کی ابتدائی گورنمنٹ میں رپورٹ کی تھی اور ان کے نام کا کتبہ جو تیار ہے نصب ہوگا (گویا ۱۸۹۱ء تک لارنس گیٹ تیار ہو گیا تھا۔) اس کے متصل ایک کمرا یعنی لیکچر روم ہے جو محمد حمید اللہ خاں صاحب اسکوائر کے ولایت سے تعلیم پا کر آنے کی یادگار میں تعمیر ہونا تجویز کیا گیا ہے اور بہت کچھ تعمیر بھی ہو گیا ہے (حالاں کہ اس وقت تک سمیع اللہ خاں صاحب سرسید اور کالج سے اپنے تعلقات مکمل طور پر منقطع کر چکے تھے۔ لیکن اس کے باوجود اس کا اثر اس فیصلے پر نہیں پڑا تھا جو اس لیکچر روم کے نام کے سلسلے میں سرسید پہلے کر چکے تھے اور نہ ہی اس کی تعمیر کے سلسلے میں کوئی تاخیر ہوئی تھی) اس کے متصل جوبلی روم ہے (جو ۱۸۹۹ء میں تھیوڈور بیک کے انتقال کے بعد ان کی یادگار کے بطور بیک منزل کے نام سے موسوم ہوا) جو بیادگارِ جشن جوبلی حضور ملکہ معظمہ ہے وہ بھی تعمیر ہونا شروع ہوا ہے۔ اس کے متصل ایک اور کمرا یعنی لیکچر روم ہے جس کی لاگت نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی خاں بہادر نے اپنے پاس سے دینے کا اقرار کیا ہے اور نصف کے قریب عنایت بھی کر چکے ہیں (اس لیکچر روم کی تعمیر ابھی شروع نہیں ہوئی تھی) اس کے متصل لائبریری ہے جو لارڈ لٹن کے نام سے معزز ہے اور لٹن

لائبریری کہلاوے گی وہ بھی کرسی تک بن گئی ہے۔ (۱۸۸۷ء میں جب کالج کی عمارتوں کی تعمیر کی ابتدا کی گئی تھی اس وقت اس لائن میں تعمیر کی جانے والی سب عمارتوں کی بنیادیں بھروا کر کرسی تک چنائی کروا کر 'بھراؤ' ڈال دیا گیا تھا) اس سے متصل جو خوبصورت عمارت ہے وہ نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی خاں کے احسانات کی یادگار میں بنائی گئی ہے اور تیار ہے اور مہدی منزل کے نام سے موسوم ہے۔ (مہدی منزل اسکول کے انگلش کلاسوں کی عمارتوں کے ساتھ ۱۸۸۲ء ہی میں تعمیر ہوگئی تھی) جس طرح کی عمارات اور جس صورت اور شکل کی سینٹرل ہال کی جانب مشرق ہیں ایسی ہی اس کے جانب غرب ہیں۔ سینٹرل ہال سے پیوسطہ جانب غرب کا دروازہ بیادگار احسانات جناب وزیرالدولہ مدیرالملک خلیفہ سید محمد حسن بہادر سی آئی ای حسن گیٹ کے نام سے موسوم ہے اور اس پر ان کے نام کا کتبہ جو تیار ہے نصب ہوگا (یعنی اس وقت تک حسن گیٹ کی تعمیر بھی مکمل ہوچکی تھی) اس کے متصل آسمان منزل بیادگار احسانات ہز ایکسیلینسی سر آسمان جاہ کے ہیں اور یہ عمارت مثل عمارت جوبلی روم (یعنی بیک منزل) کے ہوگی اس سے متصل ایک اور کمرا لیکچر روم ہے اور اس کے متصل نظام میوزیم جو حضور اعلیٰ ہز ہائی نس کے نام نامی سے معزز ہے اور اس کی عمارت مثل لٹن لائبریری کے ہوگی۔ اس کے متصل وہ عمارت ہے جو مثل عمارت مہدی منزل کے ہوگی۔ پس میں تحریک کرتا ہوں کہ بیادگار احسانات مولوی محمد مشتاق حسین یہ عمارت ان کے نام سے موسوم ہو اور مشتاق منزل کہلائی جائے (حالاں کہ قانونِ ٹرسٹیان کے سلسلے میں جو تلخی مشتاق حسین صاحب سے پیدا ہوئی تھی اس کے اثرات ابھی تک باقی تھے، لیکن اس کے باوجود مشتاق حسین صاحب کے نام پر کالج میں یادگار قائم کرنا سرسید کی کشادہ دلی کی وکالت کرتا ہے"۔) ۲۸

سرسید کے اس بیان سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ۱۸۹۱ء تک اسٹریچی ہال

کے مغرب میں واقع عمارتوں میں سے ابھی تک کوئی بھی عمارت تعمیر ہونا شروع نہیں ہوئی تھی۔ حالاں کہ ان سب عمارتوں کی بنیادیں بھی ۱۸۷۹ء ہی میں بھروادی گئی تھیں اور کرسی تک چنائی بھی کروادی گئی تھی۔ ان عمارتوں میں نظام میوزیم کی عمارت کی تعمیر کا کام سب سے پہلے شروع کیا گیا تھا۔ کالج کی مندرجہ بالا عمارتوں کی تعمیر کے ساتھ ساتھ سرسید کورٹ میں واقع بورڈنگ ہاؤس کے پختہ کمروں کی تعمیر کا کام بھی تواتر سے چل رہا تھا۔ ۱۸۸۷ء تک ۴۴ رہائشی کمرے، سالار منزل (ڈائننگ ہال) اور صدر دروازے (یعنی وکٹوریہ گیٹ) کی تعمیر مکمل ہو چکی تھی۔ اب وکٹوریہ گیٹ کے مغرب میں واقع بورڈنگ ہاؤس کے کمروں کی تعمیر کا کام جاری تھا۔

مسجد کی تعمیر کا کام بھی ۱۸۸۷ء میں شروع ہو چکا تھا اور ۱۸۹۱ء میں تواتر سے چل رہا تھا مسجد کے صحن میں مشرق کی جانب ''محمود منزل''، تعمیر کرنے کا فیصلہ بھی ۱۸۹۱ء ہی میں کیا گیا تھا۔[۲۹] اسی کے ساتھ مسجد میں ایک کنواں تعمیر کروانے کے واسطے محمد حسن صاحب نے ۹۵۲ روپے اور نور جہاں مہدی علی صاحبہ نے ۱۰۰ روپے کا عطیہ دیا تھا۔[۳۰] (محسن الملک کی بیگم صاحبہ کا نام نور جہاں بیگم تھا آپ کشمیری نژاد ایک اینگلو انڈین خاتون تھیں یہ محسن الملک کا عقد ثانی تھا)

جنوری ۱۸۹۳ء تک ظہور وارڈ کی تعمیر کا کام بھی باقاعدہ طور پر شروع ہو گیا تھا۔

سید محمود کی علالت:

غالباً اگست ۱۸۹۲ء میں سید محمود الہ آباد میں علیل ہو گئے تھے۔ سرسید ان کو آرام کرنے کی غرض سے علی گڑھ لانا چاہتے تھے اسی وجہ سے انھوں نے اپنے خط مورخہ ۱۶/ اگست ۱۸۹۲ء بنام منشی شیام بہاری لال میں تحریر کیا تھا کہ:

''غالباً میں لکھنؤ سے پھر الہ آباد جاؤں گا اور یہاں سے سب لوگوں کو
لے کر علی گڑھ پہنچوں گا سید محمود بھی علی گڑھ آویں گے''۔[۳۱]

لیکن نومبر ۱۸۹۲ء تک سید محمود علی گڑھ نہیں آئے تھے۔ خیال اغلب ہے کہ جب سید محمود کی ۲۵/ دسمبر ۱۸۹۲ء سے ایک سال کی چھٹی (فرلو) منظور ہو گئی تو سرسید نے سب لوگوں کا علی گڑھ آنے کا دوبارہ پروگرام مرتب کیا جس کی شہادت سرسید کے خط بنام منشی شیام بہاری لال مورخہ ۲۸/ نومبر ۱۸۹۲ء سے ملتی ہے۔ جس میں وہ تحریر کرتے ہیں کہ:

''میں ابھی کوئی تاریخ اپنی روانگی کی مقرر نہیں کرسکتا۔آج سر آکلینڈ کالون الہ آباد سے روانہ ہوں گے اس کے بعد کوئی تاریخ مقرر کروں گا۔امور مفصلہ ذیل پر آپ کو توجہ کرنی چاہیے۔اول یہ کہ لالہ نندکمار کو تاکید کیجیے کہ کانفرنس کا حساب ہر طرح پر مرتب کر رکھیں اس میں کسی طرح کی غلطی نہ رہے...... ششم یہ کہ جس کمرے میں ہم کھانا کھاتے ہیں اس کمرے میں جو میز اور سالبوٹ رکھے ہیں ان کو وہاں سے نکلوا کر بڑے کمرے میں جو کتب خانہ کا ہے بالفعل اس میں رکھوا دیجیے اور زنان خانہ کے جس قدر کمرے ہیں معہ احمد علی کے کمرے اور غسل خانہ وغیرہ کے سب کو صاف اور درست کروا دیجیے اور حافظ عبدالرحمٰن والا مکان ہے وہ بھی صاف اور درست ہو جاوے تاکہ جب زنانی سواریاں وہاں پہنچیں تو کچھ دقت نہ رہے''۔[۳۲]

اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید اس وقت الہ آباد سے سید محمود کے (معہ فیملی) علی گڑھ منتقل ہونے کے سلسلے میں گھر کی صفائی وغیرہ کے ساتھ دوسرے انتظامات مکمل کرنے کی تلقین کر رہے تھے۔ یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ سرسید ہاؤس میں ایک بڑا ہال 'ڈائننگ روم کے بطور استعمال ہوتا تھا جس میں وائسرائے ہند اور صوبہ کے لفٹنٹ گورنر وغیرہ جیسے سربرآوردہ مہمانوں کی آمد پر تیس چالیس مہمانوں کے طعام کے اہتمام کے لیے نہایت عمدہ فرنیچر (میز کرسی) اور کراکری کا انتظام موجود تھا۔موجودہ خط میں کھانے کے جس کمرے کا ذکر کیا گیا ہے غالباً وہ مندرجہ بالا ڈائننگ ہال کے علاوہ کوئی چھوٹا کمرا ہے جس میں روزانہ کے معمول کا کھانا کھانے کے لیے انتظام موجود ہوگا۔غالباً یہ کمرا زنان خانے کے کمروں میں سے ایک ہوگا اسی وجہ سے اسے خالی کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی اور اسی لیے سرسید نے شیام بہاری لال صاحب کو ہدایت دی تھی کہ اس کمرے میں موجود کھانا کھانے کی میز اور ''سالبوٹ'' ان کے رہائشی ہال یعنی اس بڑے ہال میں منتقل کر دیئے جائیں جہاں وہ اپنے پڑھنے لکھنے اور آفس کا کام کرتے ہیں (اسے ہی وہ کتب خانہ کا بڑا کمرا کہتے تھے) یہاں ہم قارئین کو یاد دلانا چاہیں گے کہ پچھلے صفات میں ہم نے مولوی عبدالحق صاحب کا بیان کردہ ایک واقعہ نقل کیا ہے جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ جب وہ سرسید سے ملنے کے لیے گئے تھے تو سرسید کام کر رہے تھے۔اسی وقت نوکر نے کھانا

لاکر اسی کمرے میں رکھی ایک میز پر لگا دیا تھا۔ اسی وقت سید محمود بھی وہاں آگئے تھے۔ سرسید اور سید محمود کے ساتھ انھوں نے کھانے کی میز کے اطراف بیٹھ کر ہی سرسید سے بات کی تھی۔ اس واقعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سید محمود کے ۱۸۹۳ء میں علی گڑھ منتقل ہونے کے بعد روزانہ معمول کے کھانے کے سلسلے میں گھر کے مردوں کے لیے کھانا کھانے کا اہتمام سرسید کی ''اسٹڈی'' یا اس بڑے رہائشی ہال ہی میں ہوتا تھا جہاں وہ اپنا لکھنے پڑھنے کا اور آفس کا کام کرتے تھے (جہاں پہلے سے ایک ڈائننگ ٹیبل اور سائڈ بورڈ پہنچا دیے گئے تھے) میں اس خط میں موجود لفظ ''سالبوٹ'' کا مطلب سمجھنے سے قاصر رہا تھا لیکن میرے ایک دوست ڈاکٹر محبوب عالم (مدیر ''نوائے اخلاق'' راولپنڈی) نے برسر تذکرہ خیال ظاہر کیا تھا کہ یہ لفظ ''سائڈ بورڈ'' ہوسکتا ہے جس کو غلطی سے ''سالبوٹ'' پڑھ یا لکھ دیا گیا ہے۔ میں ان کی رائے سے قطعی متفق ہوں اور شکر گزار ہوں کہ ان کی وجہ سے یہ گتھی کسی حد تک سلجھ گئی۔

سید محمود کا استعفیٰ:

۱۸۹۲ء تک الہ آباد میں سید محمود اپنے کام کے سلسلے میں خاصے پریشان رہنے لگے تھے۔ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کا خیال تھا کہ سید محمود اپنی عادتوں کی بے اعتدالی کے باعث اپنے منصبی فرائض کو انجام دینے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس کے برخلاف جسٹس محمود کا کہنا تھا کہ وہ ہندوستانی (اور خاص طور پر مسلمان) ہونے کی وجہ سے انگریز چیف جسٹس کی نسلی امتیاز کی ذہنیت کا شکار ہو رہے ہیں وہ اگست ۱۸۹۲ء سے ۲۵ر نومبر ۱۸۹۳ء تک تقریباً سوا سال تک چھٹی پر رہے تھے۔ جیسا کہ انھوں نے بعد میں صوبائی گورنمنٹ کے چیف سکریٹری کو لکھے اپنے خط میں واضح کیا ہے کہ اس لمبی چھٹی کی وجہ یہ تھی کہ اگست ۱۸۹۲ء میں ایک کیڑے کے ان کے پیر کے تلوے میں کاٹ لینے کی وجہ سے ایک بڑا زخم ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے اور جس پر دو مرتبہ جراحی کا عمل بھی کروانا پڑا تھا، اسی لیے اگست ۱۸۹۲ء سے ۲۵ر نومبر ۱۸۹۲ء تک وہ ''میڈیکل گراؤنڈس'' پر چھٹی پر رہے تھے۔ (ہمیں سید محمود کے اپنی اس بیماری کے بیان سے یہ شبہ ضرور ہوا تھا کہ کہیں وہ ذیابیطس (شکر) کے مرض میں تو مبتلا نہیں ہو چکے تھے) تین مہینے کی مندرجہ بالا بیماری کے دوران (سید محمود کے لکھنے کے بموجب) وہ اس قدر لاغر اور کمزور ہو گئے تھے کہ انہیں اپنی صحت کو دوبارہ بحال کرنے کے لیے ۲۵ر نومبر ۱۸۹۲ء سے ایک سال کی لمبی چھٹی (فرلو) لینا

پڑی تھی۔ اس چھٹی کے دوران سید محمود اپریل ۱۸۹۳ء میں علی گڑھ آگئے تھے۔ علی گڑھ پہنچنے کے بعد ہی ان کو گورنمنٹ آف نارتھ ویسٹرن پراونس و آودھ کے چیف سکریٹری جناب آئی ڈی لاٹوش کا خط ملا تھا جو چیف جسٹس سر جان ایج کی سید محمود کے خلاف گورنمنٹ میں شکایت دائر کرنے کی وجہ سے سید محمود کو اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے لکھا گیا تھا۔ چیف جسٹس سر جان ایج نے گورنمنٹ کو اپنے خط مورخہ ۷رجولائی ۱۸۹۳ء میں تحریر کیا تھا کہ سید محمود کے اپنے منصبی کاموں کو اطمینان بخش طریقہ پر انجام نہ دے سکنے کی وجہ، ان کے خیال میں سید محمود کی غیر محتاط شراب نوشی کی عادت ہے۔ وہ سگریٹ پینے کی زیادتی اور دیر رات تک جاگنے کی عادت کی وجہ سے اکثر کئی دن تک عدلیہ سے متعلق اپنے فرائض کو انجام دینے کے قابل نہیں ہوتے ہیں۔ کورٹ میں یا انگلش میٹنگوں کے دوران ان سے گفتگو کرنا خاصا ناخوشگوار اور مشکل عمل ہوتا ہے۔ ایک موقع پر جب کہ پوری بینچ ایک فیصلہ صادر کرنے کے لیے موجود تھی، جسٹس محمود جو اس وقت بھی نشے میں تھے، اپنا پورا فیصلہ (جو پہلے سے تیار تھا) پڑھنے تک سے قاصر رہے تھے۔ (اور یہ فیصلہ بغیر پڑھے ہی پڑھا ہوا تسلیم کر لیا گیا تھا) اس موقع پر کورٹ میں جتنے لوگ موجود تھے ان پر سید محمود کی حالت عیاں ہوگئی تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔[۳۳]

چیف سکریٹری کے خط کا جو جواب مورخہ ۸ر ستمبر ۱۸۹۳ء کو سید محمود نے تحریر کیا تھا وہ ہاتھ کے لکھے ۱۰۵ صفحات پر مبنی ہے۔[۳۴] انھوں نے اپنے اس جواب میں نہایت عمدگی سے اپنے اوپر لگائے گئے الزامات کی نہ صرف تردید کی ہے بلکہ نہایت جارحانہ مگر مدلل انداز میں اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے مد مقابل (یعنی چیف جسٹس سر جان ایج کو) کٹہرے میں کھڑا کر دیا ہے۔ سید محمود کے مدلل دعوے کا لب لباب یہ ہے کہ وہ ایک ہندوستانی (اور مسلمان) ہونے کی وجہ سے سر جان ایج کی فرقہ وارانہ ذہنیت اور نسلی امتیاز کی پالیسی کا شکار ہوئے ہیں۔ سید محمود نے اپنے اس دعوے کو متعدد معتبر اسناد اور باوثوق واقعات کے حوالوں سے نہایت پر اثر انداز میں ثابت کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے، جو ان کی پیشہ وارانہ مہارت اور قابلیت کی غمازی کرتی ہے۔ اس خط کو پڑھنے کے بعد بڑی آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ اب تک سید محمود کی ذہنی صلاحیتیں شراب نوشی کے مضر اثرات سے بہت زیادہ متاثر نہیں ہوئی تھیں حالاں کہ خط کی غیر معمولی طوالت اشارہ کرتی ہے کہ اگر یہ بے راہ روی اسی طرح قائم رہی تو آئندہ اس کے اثرات مضر ہو سکتے ہیں۔

بہر حال اس خط سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ گو سید محمود اپنے عہدہ پر کام کرتے رہنے کے خواہش مند تھے (انھوں نے الہ آباد سے کسی دوسرے ہائی کورٹ میں ٹرانسفر کیے جانے کی خواہش کا بھی اظہار کیا تھا) لیکن چیف جسٹس سر جان ایج کے ان کی ذاتی زندگی کے طور طریقوں پر اعتراضات کرنے کی وجہ سے وہ کسی بھی باعزت شخص کی طرح یہ سمجھ گئے تھے کہ آئندہ ان کے لیے سر جان ایج کے ساتھ کام کرنا ایک نہایت ہی مشکل امر ہوگا اس لیے اس خط کے فوراً بعد (یا اس خط کے ساتھ ہی) انھوں نے اپنے عہدے سے سبکدوش کیے جانے کی درخواست بھی گورنمنٹ میں داخل کر دی تھی جس کی بنیاد پر وہ اپنی پوری پنشن (یعنی ۶۰۰ روپے ماہوار) کے ساتھ ۲۵ر نومبر ۱۸۹۳ء کو چھٹی ختم ہونے کے بعد اپنے عہدے سے ریٹائر کر دیئے گئے تھے۔

سید محمود کا استعفیٰ اور سر سید:

سید محمود اور چیف جسٹس کے درمیان تنازعہ کی خبر جنگل کی آگ کی طرح ملک میں پھیل گئی تھی۔ سید محمود کے ریٹائر کیے جانے کی خبر عام ہونے کے بعد لوگ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرنے لگے تھے۔ عام خیال تھا کہ اس واقعہ کے بعد سر سید کے انگریز حاکموں سے تعلقات کشیدہ ہو جائیں گے سر سید اس ردعمل کی پہلے سے توقع کر رہے تھے اسی لیے وہ شروع سے سید محمود کو اعتدال کا رویہ اپنانے کی صلح دے رہے تھے۔ لیکن دوسری طرف وہ سید محمود کے مزاج سے بھی واقف تھے اور انہیں قوی امید تھی کہ چیف جسٹس سے جاری اختلافات کی وجہ سے سید محمود اب زیادہ عرصے تک یہ ملازمت نہیں کر سکیں گے۔ اس سلسلے میں وہ اپنے خط بنام ذکاء اللہ صاحب مورخہ ۲۶ر ستمبر ۱۸۹۳ء میں تحریر کرتے ہیں کہ:

> ''سید محمود کو جیسا کہ ان کا مزاج ہے ہائی کورٹ کی ججی کی کچھ بھی پرواہ نہیں ہے۔ وہ استعفیٰ دینے کو جوتی اتارنے کے برابر سمجھتے ہیں جو تحریرات بابت تنازعہ چیف جسٹس انھوں نے لکھی ہیں وہ نہایت سخت ہیں اور چیف جسٹس کی نسبت الزام لکھنے اور اس کی خصلتوں کے بیان کرنے میں کچھ فروگزاشت نہیں کی۔ ابھی ان تمام تحریرات کی نسبت گورنمنٹ سے کچھ فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ انھوں نے استعفیٰ بھیج دیا ہے۔ بعد اس قدر ناچاقی اور تحریرات مخالف، کے پھر یک جائی اور

بشرکت کام ہونا ناممکن تھا۔ لہذا ان کے دل میں سما گیا ہے کہ مجھے
نوکری کرنی ہی منظور نہیں ہے۔ اس کا کیا علاج ہے۔ بہر حال خدا کو
جو منظور ہوگا وہ ہوگا''۔ ۳۵ؔ

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سید محمود کی تمام تر ذاتی کمزوریوں سے واقف ہونے کے باوجود سرسید کو کہیں نہ کہیں اس بات کا یقین تھا کہ سید محمود کے خلاف اس تنازعہ میں چیف جسٹس نسلی امتیاز برتنے کے مرتکب ہوئے ہیں۔ وہ اس سلسلے میں ایک جگہ تحریر کرتے ہیں کہ:

''مگر افسوس ہے کہ ہزایکسیلینسی لارڈلٹن کی جو دلی عنایت میرے
حال پر اور سید محمود کے حال پر تھی اس نے مجبور کیا اور مجھ کو اس بات پر
راضی ہونا پڑا کہ سید محمود اودھ میں ڈسٹرکٹ جج ہونا منظور کریں اس
کے بعد وہ ہائی کورٹ الہ آباد کے جج مقرر ہوئے۔ مگر یہ کہ وہ کیوں
کر ہوئے اس کا بیان کچھ ضروری نہیں ہے مگر میں نے نہ ان کا ہونا
پسند کیا اور نہ کچھ مجھ کو خوشی ہوئی۔ میری رائے میں ابھی وہ وقت نہیں
آیا ہے اور نہ شاید آوے کہ ہمارے یورپین دوست جو ایک ملک کے
فاتح ہیں اور جو نیچرل تفوق ان کو فتح مندی کا ہے اور ہندوستانی
جو مفتوح ہیں اور مفتوح ہونے کی نیچرل حقارت ان کو ہے وہ دونوں
ایک بینچ پر بیٹھ کر مساوی اعزاز اور افتخار کے ساتھ جو اس عہدہ کے
شایان ہے، کام کر سکیں''۔ ۳۶ؔ

سرسید اسی تحریر میں سید محمود کے مزاج کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے ہائی کورٹ سے مستعفی ہونے پر اطمینان اور خوشی کا اظہار مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتے ہیں:

''سید محمود کا مزاج اس قسم کا نہیں ہے اور اپنے اسلاف کے خون کا اثر
ان میں موجود ہے۔ وہ ہائی کورٹ کی ججی کی کچھ پرواہ نہیں کرتے
تھے۔ اگر ہمارے دوستوں کو اصلی حالات معلوم ہوں کہ اول تقرر
کے وقت کیا پیش آیا اور زمانہ قائم مقامی میں انھوں نے کیوں
یادداشت کی کہ وہ مستقل نہ کیے جاویں تو ان کے استعفیٰ دینے پر
ہمارے دوستوں کو کچھ تعجب نہ ہوگا روپیہ کی ان کو کچھ پرواہ نہیں ہے۔
نہ اس سبب سے کہ وہ دولت مند ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ ان کے دل

میں استغنا ہے جس شخص کا مزاج ایسا ہو کہ اگر ہزاروں روپے ماہواری کی آمدنی ہے تو بھی ایک نہ بچاوے اور اگر تھوڑی آمدنی ہو تو بھی اس میں خوش رہے تو وہ روپے کی کیا پرواہ کر سکتا ہے۔ حکومت کا ان کو کچھ مزہ نہیں بلکہ اس کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ کسی عہدہ کے سبب افتخار کرنے کو پاجی پن جانتے ہیں۔ پھر ہائی کورٹ کی ججی کی کیا پرواہ کر سکتے ہیں۔ وہ اکثر رباعیوں کو میرے سامنے پڑھا کرتے ہیں اور یہی ان کا خیال ہے جس سے میں بھی خوش ہوں اور پسند کرتا ہوں ...... اگر سید محمود جس طرح بھی ہوسکتا، طوعاً وکرہاً اور اپنے کانشس کی اور سلف رسپیکٹ کی پرواہ نہ کرکے اور چیف صاحب کی بھی اطاعت اور اتفاق رائے کرکے پوری پنشن کی توقع میں ہائی کورٹ کی ججی کا کام کیے جاتے تو موافق حال کے قاعدہ کے ان کو سات برس اور کام کرنا ضروری تھا اور یہ مدت اس قدر دراز تھی کہ گوارا نہیں ہوسکتی تھی اس لیے انھوں نے خوب کیا جو استعفیٰ دے دیا۔ اب وہ اپنے وقت کے خود بادشاہ ہو گئے جو چاہیں سو کریں''۔ ۳۷

اخباروں میں سید محمود اور چیف جسٹس کے درمیان تنازعہ کی خبر سے طرح طرح کی قیاس آرائیاں شروع ہو گئی تھیں اور سرسید کے حوالے سے طرح طرح کے بیانات شائع ہونے لگے تھے۔ اس سلسلے میں ''دکن بجٹ'' مورخہ ۱۵ ستمبر ۱۸۹۳ء کے شمارے میں اخبار ''ہندو'' کے حوالے سے ایک خبر شائع ہوئی تھی جس میں بیان کیا گیا تھا کہ:

> ''اخبار ہندو اس بیان کے لیے ذمہ دار ہے کہ سرسید احمد خاں نے اپنی پالیسی بدل دی ہے اور اب شامل ٹینس امتحانات کے (یعنی ہندوستان میں بھی سول سروس کا امتحان ہو) حامی ہو گئے ہیں اور جو وجہ بیان کی گئی ہے وہ اور بھی خلافِ شان علی گڑھ کے نائٹ کے ہے کہ ان کے بیٹے جسٹس محمود سے اور چیف جسٹس اور الہ آباد ہائی کورٹ کے دیگر ججوں سے تکرار سی ہو گئی ہے اور اپنی دو برس کی رخصت کے اختتام پر بہ مجبوری ریٹائر کیے جائیں گے۔ اس لیے سرسید اب کل طبقہ حکام اور ان کے کاموں کے دشمن ہو گئے ہیں''۔ ۳۸

سرسید نے اپنے خط بنام ایڈیٹر ''پایونیر'' مورخہ ۲۲ رستمبر ۱۸۹۳ء میں ''ہندو'' اخبار کے مندرجہ بالا حوالے سے تحریر کیا تھا کہ:

''میں نے ہندو اخبار جس کی طرف ''دکن بجٹ'' نے اشارہ کیا ہے نہیں دیکھا اور دکن بجٹ کے پاس کوئی ذریعہ بھی نہیں تھا کہ اس بے بنیاد افواہ مو کد تکذیب کرتا۔ میرے بعض دوستوں نے مجھ سے کہا کہ میں موکد اور علانیہ انکار ایسی افواہوں کا کروں ...... انھوں نے مجھے صلاح دی ہے کہ میں آپ کے باوقعت اخبار کے کالم میں ان بے بنیاد افواہوں کی تردید کروں اور نیز اپنی آرا مختصر طور پر بیان کروں...... میں ان آدمیوں میں سے نہیں ہوں جو کہ ہندوستان کے طریقہ حکومت میں جو یہ تبدیلی واقع ہوئی ہے اس کو یونہی برائے نام خیال کرتے ہیں ۔ کیوں کہ جو کوئی ہندوستان کی اس زمانہ کی تاریخ سے واقف ہے جانتا ہے کہ سوداگروں کی جماعت کے ہاتھ سے خواہ وہ کتنے ہی خلائق دوست اور اشراف اور کارکن کیوں نہ ہوں مالکِ تخت وتاج کے ہاتھ میں حکومت چلے جانے سے ایک حقیقی اور عظیم تبدیلی واقع ہوئی ہے اور اسی وجہ سے میں نے یہ خیال نہیں کیا کہ ملکہ معظمہ کا ''قیصر ہند'' کا خطاب یکم جنوری ۱۸۷۷ء کو اختیار کرنا ایک بے معنی رسم یا بچوں کا کھیل تھا...... ان افواہوں نے میرے ان پبلک خیالات کو جو برٹش رول کے ساتھ تمام زندگی کی وفاداری اور محبت کی وجہ سے اور اپنے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کی بہبودی کی وجہ سے ہیں۔ ایک ایسے واقعہ کے ساتھ ملا دیئے ہیں جیسے کہ وہ نا اتفاقی ہے جو سر جان ایج، چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ اور میرے بیٹے سید محمود پیونی جج میں ہوگئی ہے۔ پبلک اس سے بالکل ناآگاہ ہے کہ اس قابل افسوس غلط فہمی کے واقعات اور پیچیدگیاں اصل میں کیا ہیں۔ اور میری رائے میں نہ ان کو کوئی حق ہے کہ اس بات کی توقع رکھیں کہ سید محمود یا میں پبلک کے اشتیاق کو رفع کرنے کے لیے کوئی عام اظہار بذریعہ اسپیچ یا مضمون کے کروں گا۔ میرا بیٹا سید محمود میرے خاندان میں اپنے جدی سلسلہ

میں پہلا شخص ہے جس کو انگریزی زبان اور ادب ۱۸۵۷ء کے بعد سکھایا گیا۔ اس کی تعلیم کسی گورنمنٹ سروس کے لیے نہیں ہوئی اور اگرچہ بہ اعتبار عمر اور تعلیمی صفات کے اس کو لندن کے مقابلہ کے امتحان میں کامیابی کا ایک سے زیادہ موقع مل سکتا تھا۔ لیکن اس نے اپنے قدرتی میلان اور خوشی سے بار کو گورنمنٹ سروس پر ترجیح دی۔ جب تک کہ وہ ۱۸۷۹ء میں اودھ میں ڈسٹرکٹ جج مقرر کیا گیا اور پھر آخر کار الہ آباد ہائی کورٹ کا پیونی جج۔ اب بوجہ اس قابل افسوس غلط فہمی کے جو اس میں اور سر جان ایج میں واقع ہوگئی ہے جو کچھ حالات ان کے عہدہ کے زمانہ اور اس پر جاری رہنے کے ہوں مگر اس قابل افسوس امر سے برٹش کے ساتھ میری وفاداری کے خیالات پر جو تمام عمر میرے دل میں موجود رہے ہیں، ذرا سا بھی کسی قسم کا اثر نہیں پڑ سکتا۔ اور میں اس رول کو ہمیشہ سے یہ سمجھتا ہوں کہ وہ میرے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کے امن اور بہبودی کے لیے ایک بڑی برکت ہے......

......میں آپ کا بہت ممنوں ہوں گا اگر آپ براہ مہربانی اس خط کو اپنے کالم میں جگہ دیں گے۔ کیوں کہ پھر کثیر خطوں کے جواب دینے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اور نہ کسی دوسرے اخبار میں اس امر پر لکھنے کی ضرورت باقی رہے گی۔ جیسا کہ پہلے آپ کے اخبار میں ان امور کے صاف بیان کرنے سے جن کی وجہ سے میں نے لیجسلیٹیو کونسل سے استعفیٰ دیا تھا جھوٹی افواہ اور غلط فہمیاں پھیلنے سے رک گئی تھیں جو اس وقت غالباً میرے استعفیٰ دینے سے پھیل جاتیں''۔[۳۹]

سید محمود کے اس تنازعہ کی وجہ سے جہاں ایک طرف حکومت اور انگریزوں سے تعلقات کو لے کر سر سید کی ذاتی پوزیشن خاصی زیر بار ہوئی تھی وہیں ہمارے خیال میں حکومت بھی سر سید کی پوزیشن کی ان مشکلات کو سمجھ کر اس پیچیدگی کو رفع کرنے کی خواہش مند تھی۔ سید محمود ہمیشہ سے ''اینٹی اسٹیبلشمنٹ'' رجحانات کے حامل تھے (جسے عام زبان میں ہم ان کی باغیانہ روش کہہ سکتے ہیں) ہمارے خیال میں سید محمود کی شخصیت کی اس خصوصیت نیز ان کی ''انا'' سے سر سید کو تو ڈر تھا ہی لیکن گورنمنٹ بھی اس امکان سے انکار نہیں کر سکتی تھی

کہ وہ کسی وقت بھی کھل کر (گورنمنٹ کی مخالفت میں) سیاست کے میدان میں کود پڑ سکتے تھے۔ غالباً اسی خدشہ کا ازالہ کرنے کی خاطر ۱۸۹۶ء میں سید محمود کو لیجسلیٹیو کونسل کے ممبر کی حیثیت سے نامزد کیا گیا تھا۔ حالاں کہ سید محمود نے کونسل کی ممبر کے حیثیت سے کونسل کے کاموں میں کبھی بھی کسی قسم کی کوئی دلچسپی نہیں لی تھی (ہوسکتا ہے یہ بھی ممبر نامزد کیے جانے کی غیر تحریری شرائط میں سے ایک ہو) بہر حال ہمارے خیال میں سید محمود کو گورنمنٹ کا وفادار بنائے رکھنے کے لیے ہی انہیں کونسل کے ممبر کی حیثیت سے نامزد کیا گیا تھا۔ حالاں کہ ہم اپنے اس مفروضہ کے سلسلے میں کوئی مستند شہادت تلاش کرنے سے قاصر رہے۔

محسن الملک اور وقار الملک کا حیدرآباد سے اخراج:

قارئین کی دلچسپی کے لیے تحریر کیا جاتا ہے کہ ۱۸۹۲ء میں مولوی مشتاق احمد صاحب (وقار الملک) اور ۱۸۹۳ء میں مولوی سید مہدی علی خاں صاحب (محسن الملک) یکے بعد دیگرے حیدرآباد میں اپنی اپنی ملازمت سے برطرف کردیئے گئے تھے۔ مولوی مشتاق احمد صاحب (وقار الملک) مستقل رہائش کے ارادے سے اپنے آبائی وطن امروہہ منتقل ہوگئے تھے۔ ہمارے خیال میں ۱۸۷۹ء میں ''قانونِ ٹرسٹیان'' کے سلسلے میں جو کڑواہٹ ان کے اور سرسید کے مابین پیدا ہوگئی تھی اسی کی وجہ سے انھوں نے مستقل سکونت کے لیے علی گڑھ کے بجائے اپنے آبائی وطن امروہہ کو اپنی مستقل سکونت کے لیے ترجیح دی تھی۔ اس کے برخلاف سید مہدی علی خاں صاحب (محسن الملک) نے اپنی آئندہ زندگی گزارنے کے لیے اپنے آبائی وطن اٹاوہ کے بجائے علی گڑھ کو ترجیح دی تھی انھوں نے حیدرآباد سے آکر سرسید ہاؤس کے جنوب میں واقع ایک بڑے بنگلے میں رہائش اختیار کی تھی۔ یہ بہت بڑے احاطہ سے گھرا بنگلہ سابق میں افیون والی کوٹھی کے نام سے موسوم تھا جس کو نواب مزمل اللہ خاں صاحب نے خرید لیا تھا اور ''بھیکم پور ہاؤس'' کے نام سے موسوم کیا تھا۔ مولوی مہدی علی خاں صاحب نواب مزمل اللہ خاں صاحب کے اسی بنگلے یعنی بھیکم پور ہاؤس میں سکونت پذیر ہوئے تھے (بعد میں بھیکم پور ہاؤس کے احاطہ ہی میں ۱۹۲۵ء میں ''مزمل پیلس'' کی موجودہ خوبصورت عمارت تعمیر کی گئی تھی) حالاں کہ مولوی مہدی علی خاں صاحب اور سرسید کے درمیان اب وہ پہلی سی رفاقت موجود نہیں تھی جس کی شہادت ''حیات محسن'' میں امین زبیری صاحب کے مندرجہ ذیل بیان سے ملتی ہے کہ:

''سرسید کو ان کی طرف سے (یعنی محسن الملک کی طرف سے) ایک قسم کی بدگمانی پیدا کردی گئی (تھی) اور بعض تو یہاں تک کہتے ہیں کہ سرسید اس بات کے بھی روادار نہ رہے تھے کہ محسن الملک علی گڑھ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر بھی قدم رکھیں، ممکن ہے کہ اس روایت میں مبالغہ ہو لیکن یہ یقینی ہے اور اس زمانہ کے کاغذات دیکھنے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نواب صاحب کو سرسید کے طریق کارروائی پر بہت اعتراض تھا اور ان کی کچھ پیش نہ جاتی تھی۔ اس حالت کے متعلق نواب وقار الملک کو انھوں نے متعدد خطوط لکھے ہیں جن سے کالج کی انتظامی خرابیوں اور اصلاح سے مایوسیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ باوجود ان خرابیوں اور مایوسیوں کے نواب محسن الملک کا جذبہ قومی برابر کام کرتا رہا اور زیادہ تر صوبہ بمبئی کو جہاں سال کا زیادہ حصہ بسر کرتے تھے اپنا محور قرار دے لیا''۔[۴۰]

بہرحال حقیقت یہی ہے کہ محسن الملک نے حیدر آباد سے آنے کے بعد گو علی گڑھ میں سکونت تو ضرور اختیار کی تھی لیکن ان کا زیادہ تر وقت علی گڑھ کے باہر ہی گزرتا تھا جس میں کسی حد تک اس کی صحت کی خرابی کا بھی دخل تھا۔ وہ ذیابیطس (شکر) کے مرض میں مبتلا تھے اور علاج کے سلسلے میں زیادہ تر بمبئی میں رہتے تھے۔ گرمیاں شملے میں گزارتے تھے۔

سرسید ہاؤس کے احاطہ کی توسیع:

نقشہ دیکھنے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سرسید ہاؤس کے احاطہ کی مغربی باؤنڈری اور تار والے بنگلے و بنگلہ خورد اور نہر والی کوٹھی کی (مشترکہ) مشرقی باؤنڈری کے درمیان نزول کی زمین کی ایک پتلی پٹی بطور کچے راستے کے موجود تھی۔ یہ راستہ کسی کے استعمال میں نہیں تھا۔ اسی لیے سرسید نے میونسپل بورڈ کو مورخہ ۳۰ر مارچ ۱۸۹۱ء کو ایک درخواست دے کر اس زمین کو خریدنے کی خواہش ظاہر کی تھی تا کہ اس زمین کو وہ اپنے بنگلے کے احاطے میں شامل کر کے اس کی توسیع کر سکیں۔[۴۱] بعد میں چند وجوہ کی بنا پر انھوں نے اپنی رائے بدلتے ہوئے اپنے خط مورخہ ۲۳ر جنوری ۱۸۹۲ء کے ذریعہ اس زمین کو کالج کے لیے خریدنے کے

خیال کا اظہار کیا تھا تا کہ اسے تار والے بنگلے اور بنگلہ خورد کے احاطوں میں ملایا جا سکے۔[۴۲] بہر حال یہ زمین کی پٹی (جس کا کل رقبہ ۴۶۸۹ مربع گز تھا) ایک سو ستر روپے پندرہ آنے چھ پائی میں سر سید نے خرید لی تھی۔[۴۳] سر سید کے انتقال کے بعد اس زمین کے ریکارڈ میں (غلطی سے) سر سید کے وارثین کے نام درج ہو گئے تھے۔ اس طرح ۱۹۲۲ء میں کھتونی اور دوسرے ریکارڈوں میں اس زمین کی ملکیت کے سلسلے میں بیگم محمود کا نام درج پایا گیا تھا۔ بیگم صاحبہ نے اس پر اپنی ملکیت کے لیے اصرار کیا تھا۔ یونیورسٹی نے اعتراض کرتے ہوئے انکوائری کروائی تھی جس کی کارروائی مکمل ہونے کے بعد یہی طے ہوا کہ ہو سکتا ہے کہ سر سید نے یہ زمین کالج کے لیے ہی خریدی ہو لیکن زمین کے ریکارڈ اور کھتونی کے اندراجات کی رو سے بیگم محمود کی ملکیت ثابت ہوتی ہے۔[۴۴] اس زمین کی ملکیت کے تنازعہ کی اہمیت اس لیے زیادہ ہو گئی تھی کہ تار والے بنگلے کے احاطہ کی مشرقی باؤنڈری سے ملحق جو مکانات تعمیر ہوئے تھے جیسے ضیاء الدین احمد صاحب کی رہائش کے لیے ایک بڑی کوٹھی (جواب انگلش ہاؤس کے نام سے جانی جاتی ہے) یا اس سے ملحق زین العابدین صاحب کی کوٹھی وغیرہ، ان کی تعمیر میں اس متنازعہ زمین کا کچھ حصہ شامل ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے ضروری ہو گیا تھا کہ یونیورسٹی یا تو بیگم صاحبہ کو اس زمین کا معاوضہ ادا کرے یا پھر اس کے عوض اتنی ہی آراضی کسی دوسری جگہ پر انہیں مہیا کروائے۔ غرض ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سر سید ہاؤس کے احاطہ میں جو ردوبدل اب نظر آتی ہے اس میں اس متنازعہ زمین سے متعلق جو بھی تصفیہ یونیورسٹی سے ہوا تھا (جس کا ہمیں علم نہ ہو سکا) اس کا کچھ نہ کچھ ہاتھ ضرور ہے۔ بہر حال یہ ایک ضمنی امر تھا جس کو ضمناً ہم نے یہاں درج کر دیا تا کہ ضرورت محسوس ہو تو آئندہ حوالوں میں اس کی تشریح نہ کرنا پڑے۔ اسی متنازعہ زمین کے کاغذات سے اس امر کا انکشاف بھی ہوا کہ موجود نہر والی کوٹھی ابتداً ''حوض والی کوٹھی'' کے نام سے موسوم تھی اور خواجہ یوسف صاحب کی ملکیت تھی۔[۴۵] نیز یہ اطلاع بھی ملتی ہے کہ ۱۸۹۰ء میں سید زین العابدین صاحب تار والے بنگلے میں رہائش پذیر تھے۔[۴۶]

فتح گڑھ میں سر سید کے رشتہ دار:

جب ۱۸۹۳ء میں سید محمود الہ آباد سے آکر علی گڑھ میں مقیم ہوئے تھے اس وقت دہلی میں سر سید کے آبائی مکان میں کیا ہو رہا تھا۔ آیئے اس پر بھی ایک اجمالی نظر ڈال لیں۔

سر سید اپنے خط مورخہ ۱۳را کتوبر ۱۸۹۳ء بنام حکیم احمد الدین تحریر کرتے ہیں کہ:

''آج تمہاری بہن (یعنی سید حامد کی بیگم صاحبہ) روانہ فتح گڑھ ہوتی ہیں احمد علی ان کو پہنچانے جاتا ہے''۔ ۴۷

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت سید حامد کی بیگم صاحبہ علی گڑھ آئی ہوئی تھیں اور علی گڑھ سے فتح گڑھ تشریف لے گئیں تھیں۔ سید احمد علی ان کو پہنچانے کے لیے فتح گڑھ گئے تھے۔ اس جملے کا مطلب یہی ہوا کہ سید احمد علی انہیں فتح گڑھ پہنچانے کے بعد واپس آ گئے ہوں گے۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ فتح گڑھ میں کوئی ایسی جگہ موجود تھی جہاں بیگم حامد جا کر رہ سکتی تھیں۔ جس کا یہی مطلب نکالا جا سکتا ہے کہ فتح گڑھ میں بیگم حامد یا سر سید کے کوئی اتنے قریبی عزیز موجود تھے جہان جا کر بیگم حامد رہ سکتی تھیں، بلکہ رہی تھیں۔ حالاں کہ باوجود کوشش کے ہم کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس زمانے میں فتح گڑھ میں سر سید یا بیگم حامد کے کون سے رشتہ دار موجود تھے۔ حالاں کہ اس خط سے تقریباً دو مہینے بعد یعنی ۱۳ر دسمبر کو سید حامد بھی فتح گڑھ تشریف لے گئے تھے جس کی شہادت سر سید کے خط بنام حکیم احمد الدین مورخہ ۱۳ر دسمبر ۱۸۹۳ء کے اس جملے سے ملتی ہے جس میں وہ تحریر کرتے ہیں کہ:

''ٹکٹ پہنچے۔ حامد فتح گڑھ کیوں گئے ہیں۔ دیگیں جلد بھیجو ضرورت ہے کمروں کی روشنی کے لیے دیوار گیر لیمپ خریدنے ہوں گے''۔ ۴۸

ہمارا خیال ہے کہ اس وقت تک (دو مہینہ گزر چکے تھے) سید حامد کی بیگم صاحبہ فتح گڑھ سے واپس آ چکی ہوں گی۔ سر سید کا یہ جملہ (جو برسرِ تذکرہ لکھا گیا تھا) کہ ''حامد فتح گڑھ کیوں گئے ہیں''؟ تجسس کا اظہار کرتا ہے گویا وہ سید حامد کے فتح گڑھ جانے کا سبب جاننا چاہتے ہیں دراصل اس تجسس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ ۱۳ر دسمبر ۱۸۹۳ء تک (جب کہ وہ فتح گڑھ گئے تھے) ان کی طبیعت خاصی خراب ہو چکی تھی کیوں کہ وہاں سے واپس آنے کے تقریباً ایک مہینہ بعد ہی ان کا دہلی میں انتقال ہو گیا تھا۔ بہر حال ہم باوجود کوشش کے فتح گڑھ میں موجود سر سید یا بیگم حامد کے کسی عزیز یا رشتہ دار کا کوئی حوالہ تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے (حالاں کہ ہمیں یہ ضرور معلوم ہوا کہ اپنی نوکری کے زمانے میں سید حامد کچھ عرصہ فتح گڑھ میں بھی تعینات رہے تھے۔)

سید حامد کا انتقال:

جنوری ۱۸۹۴ء کے تیسرے ہفتے میں سنیچر کے دن، دہلی میں، سید حامد کا انتقال ہو گیا تھا۔ حالی کے مطابق اس روز سرسید دہلی ہی میں موجود تھے۔ وہ تحریر کرتے ہیں کہ:

''سید حامد مرحوم کے انتقال کا صدمہ ان پر نہایت سخت ہوا تھا۔ دو وقت انھوں نے بالکل کھانا نہیں کھایا اور پندرہ بیس روز تک ان کی حالت نہایت نازک رہی، مگر جس وقت بیٹے کا دم نکلا اور گھر میں کہرام مچا وہ شمس العلما مولوی ذکاء اللہ کے مکان پر چلے گئے اور جب تک لوگ ان کو دفن کر کے نہ آئے وہیں چپ چاپ بیٹھے رہے اور پھر جو اس روز سے علی گڑھ گئے ایک ادھ بار سے زیادہ پھر کبھی جا کر گھر کی صورت نہیں دیکھی۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے دلی کا غم بھلانے کے لیے دلی کی بود و باش ہی ہمیشہ کے لیے ترک کر دی''۔[۴۹]

سید حامد کے انتقال کے دو تین دن بعد ہی سرسید علی گڑھ چلے آئے تھے۔ وہ علی گڑھ سے اپنے خط مورخہ ۲۸ رجنوری ۱۸۹۴ء بنام حکیم احمد الدین تحریر کرتے ہیں کہ:

''میں بتاکید تم کو لکھتا ہوں کہ پھولوں کی جو رسم ہے وہ سید حامد مرحوم کی نسبت ہرگز مت کرنا اور گھر میں کہہ دو کہ جو عورت آوے وہ تھوڑی دیر ٹھہر کر واپس چلی جائے کوئی رسم پھولوں کی نہ ہو''۔[۵۰]

سید حامد کے انتقال کے بعد مولوی ذکاء اللہ صاحب کی ایک تعزیتی تحریر، علی گڑھ گزٹ مورخہ ۲ رفروری ۱۸۹۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ (یہ تحریر مجھے شافع قدوائی صاحب کے توسل سے حاصل ہوئی) اس تحریر میں سید حامد مرحوم کی وجاہت، نیک سیرت، شرافت، بشاشت، سخاوت اور دوستوں کے ساتھ لطف و کرم کا روایتی انداز میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس تحریر سے ہی ہمیں معلوم ہوا کہ سید حامد کا انتقال سنیچر کے روز ہوا تھا۔ نیز یہ بھی کہ انھوں نے پولیس میں ملازمت کرنے سے پہلے بنارس میں (کچہری میں) سب رجسٹرار کے بطور بھی کچھ عرصہ ملازمت کی تھی۔[۵۱]

سید حامد پر قرضہ:

سید حامد کے انتقال سے سرسید ٹوٹ سے گئے تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ اب ان کو

دوسری پریشانیاں لاحق ہوگئی تھیں۔ سید حامد کی بیگم کی کفالت کے ساتھ ہی سرسید کو اس قرضے کی فکر بھی ستانے لگی تھی جو سید حامد اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ اس سلسلے میں وہ اپنے خط مورخہ ۸؍مارچ ۱۸۹۴ء بنام حکیم احمد الدین تحریر کرتے ہیں کہ:

''سید حامد کے انتقال پر جو الم ہے اس کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ ان کے قرض کی کچھ انتہا نہیں ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کیوں کر ادا ہوسکتا ہے۔ تم نے جو تعداد قرضہ لکھی ہے، تفصیل وار اس کی فہرست لکھو کہ کس کس کا ہے اور نیز ٹھیک اندازہ لکھو کہ ان کی بیوی کے اخراجات کے لیے ماہواری کتنا روپیہ چاہیے۔ نہایت کفایت اور ضرورت سے کام ہونا چاہیے''۔ ۵۲

سید حامد کے انتقال کے بعد سے سرسید نے اپنی بہو کی کفالت کے لیے پچاس روپیہ مہینہ انہیں بھیجنا شروع کر دیا تھا ساتھ ہی سید حامد کے قرضے کے واجبات کو بھی ادا کرنے کے سلسلے میں تدابیر کرنی شروع کر دی تھی۔ اس سلسلے میں وہ اپنے خط مورخہ ۳؍اگست ۱۸۹۴ء بنام حکیم احمد الدین تحریر کرتے ہیں کہ:

''پچاس روپیہ کا منی آرڈر مرسل ہے اپنی بہن کو دے دو اس کا خط نسبت قرضہ کے آیا تھا۔ کسی اتوار کو تم یہاں آؤ تو مشورہ کیا جاوے کہ کیا سبیل اس کے ادا کی ہو''۔ ۵۳

حالاں کہ اس قرضہ کے سلسلے میں لوگوں نے نالش کرنے کی دھمکیاں بھی دی تھیں اس سلسلے میں سرسید اپنے خط مورخہ ۱۰؍اپریل ۱۸۹۵ء بنام حکیم احمد الدین تحریر کرتے ہیں کہ:

''تم ان لالہ صاحب کو سمجھا دو کہ نالش کی دھمکی سے کچھ فائدہ نہیں سید حامد مرحوم نے کچھ جائداد نہیں چھوڑی۔ نہ ان کی کوئی جائداد ہمارے قبضہ میں ہے پس نالش کا کیا نتیجہ ہے۔ مرحوم کی جائداد پر ڈگری ہو تو ڈگری کو لے جا کر چاٹا کرو ہمارا خرچ جواب دہی میں جو پڑے گا وہ ہم لالہ صاحب سے لے لیں گے''۔ ۵۴

بہر حال یہ قصہ کافی عرصہ تک چلتا رہا۔ لیکن قیاس یہی ہے کہ آہستہ آہستہ سرسید نے سید حامد کے قرضوں کے کل واجبات ادا کر دیئے تھے۔ یہی نہیں وہ سید حامد کی بیگم

اور بیٹی کے مستقبل کے لیے بھی انتظامات کرنے کی فکر میں لگے تھے۔ وہ اپنے خط مورخہ ۱۳ر ستمبر ۱۸۹۴ء بنام حکیم احمد الدین تحریر کرتے ہیں کہ:

''کیا یہ سچ ہے کہ میاں ابراہیم نے جو حویلی اور دیوان خانہ ہم سے خریدا تھا اس کو وہ فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ اگر یہ بات سچ ہو تو میں اس کو احمدی بیگم (دختر سید حامد) کے لیے خرید کرنا چاہتا ہوں''۔ ۵۵

ہمشیرہ کا انتقال:

۱۸۹۳ء کے بعد سے سرسید مختلف انواع کی پریشانیوں میں گھرتے چلے گئے تھے۔ پہلے سید محمود کا استعفیٰ پھر سید حامد کا انتقال اور اس کے چند مہینوں بعد ہی ان کی نہایت شفیق اور محبت کرنے والی، بڑی بہن عجبۃ النسا بیگم کا انتقال ہو گیا تھا۔ عجبۃ النسا بیگم کی عمر تقریباً ۹۰ سال کی ہو رہی تھی۔ ادھر کچھ عرصہ سے وہ کافی بیمار تھیں جس کا اندازہ سرسید کے خط مورخہ ۱۶ر نومبر ۱۸۹۴ء سے ہوتا ہے۔ جس میں وہ حکیم احمد الدین صاحب کو تحریر کرتے ہیں کہ:

''تمہارا خط پہنچا۔ ہمشیرہ عجبۃ النسا بیگم کی علالت طبع جو حد سے زیادہ ہوگئی ہے اس کا مجھ کو نہایت رنج ہے۔ میں ہر چند دل کو دہلی آنے پر مضبوط کرتا ہوں مگر وہاں کے مکانات اور سید حامد مرحوم کا رنج اس قدر دل پر اثر کرتا ہے کہ قدم نہیں اٹھتا۔ اب تک سید حامد مرحوم کا غم میرے دل سے کم نہیں ہوا ہے۔ یہاں اور کاموں کے خیال میں دن گزر جاتا ہے مگر دہلی آنے اور ہمشیرہ صاحبہ کو دیکھنے کا مصمم ارادہ رکھتا ہوں کہاں تک دہلی جانے سے پرہیز کروں گا۔ بہر حال اگر قسمت میں ملنا ہے تو میں آ کر ملوں گا۔ تم ان کا حال برابر لکھتے رہو۔ اگر ممکن ہو تو یہ خط ہمشیرہ صاحبہ کو سنا دینا''۔ ۵۶

بہر حال اگلے مہینہ ہی یعنی دسمبر ۱۸۹۴ء میں عجبۃ النسا بیگم صاحب کا دہلی میں انتقال ہو گیا تھا۔ غالباً سرسید اس وقت دہلی پہنچ گئے تھے۔

سرسید کی علالت اور مرض کی تشخیص:

یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ سرسید کے گلے میں (دائیں طرف) ایک رسولی تھی۔ وہ ''ہائپو تھائی رو ائڈ ازم'' کے مرض میں کافی عرصہ سے مبتلا تھے۔ ۱۸۶۹ء میں جب وہ انگلینڈ

گئے تھے اس وقت سے اس مرض کے اثرات ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے۔ حالی نے خود لکھا ہے کہ:

''انگلینڈ میں ان کے پانوں میں ایک مرض پیدا ہو گیا تھا جو اخیر دم تک زائل نہیں ہوا، ان کے پانوں اور پنڈلیاں سوج جاتی تھیں اور تلوؤں میں درد ہو جاتا تھا، مہینے مہینے، دو دو مہینے برابر یہ تکلیف رہتی تھی۔ چند روز کو افاقہ ہو جاتا تھا پھر وہی شکایت پیدا ہو جاتی تھی''۔ ۵۷ے

چوں کہ سرسید تمباکو کا استعمال بکثرت کرتے تھے (یعنی حقہ پیتے تھے، انگلینڈ میں سگریٹ اور بعد میں سگار کثرت سے پینے لگے تھے اور ساتھ ہی پان میں تمباکو کھانے کے بھی عادی تھے) اسی وجہ سے ہم نے حالی کے مندرجہ بالا بیان کو ان کی تمباکو نوشی کی عادت پر محمول کیا تھا۔ لیکن بعد میں جب ''ہائپوتھائی روائڈازم'' کی دوسری علامتیں بھی ظاہر ہونے لگیں جیسے وزن کا بڑھنا، سستی رہنا، دل کی دھڑکن کا سست ہو جانا، پیروں پر سوجن آ جانا و ذہنی تھکاوٹ کا احساس ہونا وغیرہ۔ اس وقت ہمیں احساس ہوا کہ غالباً وہ ''ہائپوتھائی روائڈازم'' میں مبتلا تھے۔ اپنی بیماری کے تذکرے میں وہ خود اس مرض کی علامتوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ۱۸۹۴ء میں یکے بعد دیگرے مختلف ذہنی پریشانیوں میں گھرے رہنے کی وجہ سے سرسید کی صحت متاثر ہوئی تھی اور وہ بیمار پڑ گئے تھے۔ بیماری کی نوعیت کیا تھی؟ اس سلسلے میں وہ خود اپنے خط یکم مارچ ۱۸۹۴ء بنام نیاز محمد خاں صاحب تحریر کرتے ہیں کہ:

''ان دنوں میری طبیعت کسی قدر علیل ہو گئی تھی۔ قلب کی حرکت نہایت سست ہو گئی تھی اور اس سبب سے خون کی گردش میں نہایت سستی آ گئی تھی اور دفعتاً پانوں اور پنڈلیوں پر ورم ہو گیا تھا۔ مگر اس کا سبب بجز قلب کے سست ہو جانے کے اور کچھ نہیں تھا۔ لیکن اب بالکل اچھا ہوں۔ آپ کچھ تردد نہ کیجیے گا۔ پانوں کا ورم جاتا رہا ہے۔ خفیف سا کچھ شبہ ورم کا پنڈلیوں پر باقی ہے۔ کھانا بھی اپنے معمول کے طور پر کھانے لگا ہوں اور رات کو نیند بھی اچھی طرح سے آنے لگی ہے۔ غرض کہ اب اچھا ہوں''۔ ۵۸ے

ہمیں یقین ہے کہ اپنی اس علالت کے سلسلے میں سرسید علی گڑھ کے انگریز سول سرجن کے زیر علاج رہے ہوں گے لیکن وہ بیماری کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اسی

وجہ سے طبیعت کے ٹھیک ہوتے ہی پنجاب کے سفر پر روانہ ہوگئے تھے۔ ظاہر ہے کہ سفر کی تھکان نے پھر انہیں مضمحل کر دیا ہوگا۔ اسی وجہ سے واپس علی گڑھ پہنچنے کے بعد دوبارہ علیل ہوگئے تھے۔ اس سلسلے میں وہ اپنے خط مورخہ ۲۲/اپریل ۱۸۹۴ء میں بنام نیاز محمد خاں صاحب تحریر کرتے ہیں کہ:

''میں بخیر وعافیت علی گڑھ پہنچ گیا۔ جالندھر میں پانوں پر ورم زیادہ ہو گیا تھا اور تھکان کے سبب کسی قدر بخار کی سی حرارت تھی مگر آج فضل الٰہی سے بالکل اچھا ہوں۔ پانوں پر ورم بہت ہی کم ہے''۔ ۵۹

پریشانیوں کا مداوا:

سرسید کے بارے میں ہمارا ایک جزوی مشاہدہ یہ بھی ہے کہ جب بھی وہ زیادہ پریشانیوں میں گھر جاتے تھے تو ان کے مداوا کے بطور وہ یکلخت اپنے آپ کو مختلف نوعیت کے فلاحی کاموں میں اس طرح مصروف کر لیتے تھے کہ ان کی مصروفیات ہی ان کی پریشانیوں کا مداوا بن جاتی تھیں۔ سید حامد کے انتقال کے بعد بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ علی گڑھ آنے کے بعد انھوں نے اپنے آپ کو کالج کی عمارتوں کی تعمیر کے کام میں مکمل طور پر مصروف کر لیا۔ ایک طرف ظہور وارڈ کی تعمیر تیزی سے جاری تھی تو دوسری طرف وہ جلد از جلد اسٹریچی ہال کی عمارت کو مکمل کرنا چاہتے تھے۔ کالج میں بورڈنگ ہاؤسوں کی کمی کا احساس کافی عرصہ سے ہو رہا تھا۔ اسی لیے سرسید نے اجلاس ٹرسٹیان منعقدہ ۲۹/جولائی ۱۸۹۴ء میں ڈینچر بورڈنگ ہاؤس کی تعمیر کی مکمل اسکیم منظور کرواکر، ڈینچر فروخت کرنا اور ڈینچر بورڈنگ ہاؤس (موجودہ موریسن کورٹ) کی تعمیر کا کام بڑے پیمانے پر شروع کروا دیا تھا۔

اسٹریچی ہال کا افتتاح:

۱۸۹۴ء کے وسط تک اسٹریچی ہال کی عمارت تقریباً تیار ہو چکی تھی۔ ۱۲/نومبر ۱۸۹۴ء کو شمالی مغربی صوبہ کے لفٹنٹ گورنر سر چارلس کروستھ ویٹ کے ذریعہ اسٹریچی ہال کے افتتاح کی رسم ادا کروائی گئی تھی۔ پچھلے تین چار مہینوں سے سرسید اس جلسے کو عمدہ طریقہ پر منظم کرنے کے سلسلے میں دن رات مصروف رہے تھے جس کا اظہار ضلع کے انگریز حکام سے کی گئی ان کی مراسلت سے بخوبی ہوتا ہے۔ سرسید نے اپنے خط، بنام ضلع کلکٹر علی گڑھ، مورخہ ۲۶/اکتوبر ۱۸۹۴ء کے ذریعہ لفٹنٹ گورنر کی آمد کے پروگرام کے سلسلے میں ضلع کلکٹر

سے تبادلۂ خیال کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا تاکہ پروگرام کو حتمی شکل دی جا سکے۔ اسی کے ساتھ مورخہ ۲؍نومبر ۱۸۹۴ء کے خط کے ذریعہ اس موقع پر سپاہیوں وغیرہ کو تعینات کیے جانے اور دوسرے انتظامات کرنے کے سلسلے میں سرسید نے ضلع کلکٹر کو تحریر کیا تھا کہ:

"حالاں کہ پولیس کے سپاہی گورنر صاحب کی علی گڑھ میں آمد کے دوران کافی مصروف ہوں گے لیکن مجھے امید ہے کہ آپ ۱۲ تاریخ کو چھ سپاہی ۱۲ بجے دوپہر سے ہزا یکسیلینسی کے جانے تک ڈیوٹی پر تعینات کر دیں گے اور انہیں ہدایت فرمادیں گے کہ وہ اپنی ڈیوٹی اور ڈیوٹی کی جگہ کے سلسلے میں مجھ سے احکامات لیں گے۔ مجھے آپ سے ایک اور درخواست بھی کرنی ہے۔ امید ہے کہ آپ اس کے لیے اپنی رضامندی عنایت فرماویں گے۔ مجھے جہاں تک یاد ہے کہ ایک چوڑی اور لمبی کپڑے کی پٹی مقامی نمائش کے دوران دربار ہال جانے کے راستہ پر بچھائی جاتی ہے اور میرے خیال میں ۱۰ تاریخ کو ٹاون ہال کے سنگِ بنیاد رکھنے کی تقریب میں بھی اس کی ضرورت ہوگی۔ اگر آپ تحصیل دار کو ہدایت کر دیں کہ ۱۲ تاریخ کو دو گھنٹے کے لیے اس کپڑے کی پٹی کو ہمیں مستعار دے دیں تو میں آپ کا بے حد مشکور ہوں گا۔ تکلیف دہی کے لیے معافی کا خواستگار ہوں"۔[۶۰]

اس طرح ۱۲؍نومبر ۱۸۹۴ء کو شمالی مغربی صوبہ کے لفٹنٹ گورنر چارلس کروستھ ویٹ نے اسٹریچی ہال کے افتتاح کی رسم ادا کی تھی۔ اس موقع پر سرجان اسٹریچی کے صاحبزادے (جوالہ آباد میں بارایٹ لا تھے) اور ان کی والدہ بیگم سرجان اسٹریچی مہمانِ خصوصی کے بطور موجود تھیں۔

کالج میں غبن:

شیام بہاری لال سرسید کے آفس میں ۱۸۸۳ء سے کام کر رہے تھے۔ سرسید ان پر مکمل اعتماد اور بھروسا کرتے تھے۔ جہاں تک کام کا سوال ہے وہ سرسید کے مزاج سے بخوبی واقف تھے اور کام کے سلسلے میں حتی الامکان سرسید کو شکایت کا موقع نہیں دیتے تھے۔ انھوں نے اسی خوبی کی وجہ سے سرسید کا یقین اور اعتماد حاصل کرلیا تھا۔ جولائی ۱۸۹۵ء میں اچانک

شیام بہاری لال فالج کے عارضہ میں مبتلا ہو گئے تھے جس کی وجہ سے ان کو آفس سے چھٹی لینی پڑی تھی۔ ان کی غیر موجودگی میں بینک کا ایک نوٹس آیا جس کی رو سے اتفاقیہ یہ امر سامنے آیا کہ غالباً بینک کے اکاؤنٹ کے سلسلے میں کوئی جعل سازی کی گئی ہے۔ بعد میں جب سر سید نے تفتیش کروائی تو معلوم ہوا کہ شیام بہاری لال نے ایک جعلی میٹنگ کی روئیداد پر سات ٹرسٹیوں کے جعلی دستخط بنا کر اپنے نام ''پاور آف اٹارنی'' (مختاری کے اختیارات) حاصل کر کے کالج کے مختلف کھاتوں سے تقریباً تریسٹھ ہزار اور ساڑھے بیالیس ہزار روپے مختلف مراحل میں نکالے تھے۔ مرزا عابد علی بیگ (ٹرسٹی مدرسۃ العلوم) اور میر ولایت حسین کو اس سلسلے میں سارے اکاؤنٹ چیک کر کے رپورٹ پیش کرنے کی ذمہ داری دی گئی تھی۔ ان کی رپورٹ کے مطابق غبن شدہ رقم ۱۹۸۰۷۱ روپے تھی۔ پہلا جعلی چیک ۶۰۰ روپے کا ۵رفروری ۱۸۹۰ء کو کیش کیا گیا تھا اور ۲۱رمئی ۱۸۹۵ء تک اس طرح کے تقریباً ۴۲ چیک کیش کیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ ۱۸۸۵ء سے ۱۸۸۹ء تک دوسرے طریقوں سے بھی بڑی بڑی رقمیں خورد برد کی گئی تھیں۔ جن کا کل میزان تقریباً ۴۱۴۶۷ روپے ہوتا تھا (مرزا عابد علی بیگ نے جنوری ۱۹۰۱ء میں اپنی رپورٹ بعنوان ''خلاصہ رپورٹ'' کے شائع کردی تھی، جس میں غبن کے سلسلے کی کافی تفصیلات موجود ہیں۔ لیکن ''عربی رقوم'' سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ہم اس رپورٹ سے پوری طرح استفادہ نہ کرسکے)۔[61]

سر سید کے لیے یہ ایک بہت بڑا سانحہ تھا۔ مخالفین نے بغلیں بجانا شروع کردیں، نئے نئے شکوک پیدا کیے جانے لگے۔ موافقین کے سر جھک گئے۔ ہر طرح کے دشنام برداشت کرنے پڑے۔ سید محمود نے مقدمہ کی مثل تیار کرنا شروع کی۔ سید کرامت حسین جیسے قانون دانوں سے مشورے کیے گئے۔ شومیٔ قسمت سے شیام بہاری لال (جو رپورٹ درج کروانے کے بعد گرفتار کرلیے گئے تھے) کا پولیس حراست ہی میں انتقال ہوگیا تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ انھوں نے ندامت سے جیل میں خودکشی کرلی تھی۔ سید محمود اور کرامت حسین صاحب کا خیال تھا کہ شیام بہاری لال کے انتقال کے باوجود مقدمہ چلایا جاسکتا ہے اور ان کی کل جائداد ضبط کروائی جاسکتی ہے حالاں کہ شیام بہاری لال کی کل جائداد ضبط بھی کروالی جاتی تو اس کی کل مالیت دس ہزار روپے سے زیادہ کی نہ تھی جس کے لیے برسوں مقدمہ کی پیروی درکار تھی۔ غالباً اسی وجہ سے شیام بہاری لال کے انتقال کے بعد سارا معاملہ التوا میں پڑ گیا۔

غبن کا یہ حادثہ سرسید کی صحت پر اس طرح اثر انداز ہوا کہ وہ پھر کبھی پوری طرح اس سے ابھر نہ سکے اور غالباً اسی کی وجہ سے (بڑھتی عمر کے ساتھ) بتدریج خراب ہوتی صحت مارچ ۱۸۹۸ء میں جان لیوا ثابت ہوئی۔ غبن کا یہ حادثہ کالج کے تمام کاموں پر اثر انداز ہوا تھا۔ خاص طور پر کالج کی عمارتوں کا کام بُری طرح متاثر ہوا تھا۔ ڈبینچر بورڈنگ ہاؤس (موجودہ موریسن کورٹ) کی تعمیر کے علاوہ دوسری تمام عمارتوں کی تعمیر التوا میں پڑ گئی تھی۔ بقول سرسید، چند قریبی دوستوں کے قلیل ماہواری چندے سے (جو تقریباً ڈھائی سو روپے مہینہ تھا) صرف مسجد کی تعمیر کا کام جیسے تیسے کچھ نہ کچھ جاری رکھا جا سکا تھا۔

دفتر سکریٹری ٹرسٹیان میں احتیاطی تدابیر:

اس غبن کی وجہ سے سرسید کی ایما پر جو احتیاطی تدابیر کی گئی تھیں ان میں انگریزی میں بینک سے مراسلت اور چیک پر سکریٹری کے ساتھ جوائنٹ سکریٹری کے دستخطوں کی ذمہ داری سید محمود کے سپرد کی گئی تھی۔ جس کا باقاعدہ اعلان علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۳/جنوری ۱۸۹۶ء میں اس طرح کیا گیا تھا:

> ''انتظام سررشتہ انگریزی دفتر سکریٹری
>
> ہم کو معلوم ہوا ہے کہ سررشتہ انگریزی دفتر سکریٹری مدرستہ العلوم میں یہ انتظام ہوا ہے کہ جو چٹھی یا ڈاک یا چیک دفتر سکریٹری سے بنام بنک آف بنگال یا اور کسی بنک پر جاری ہوں ان پر علاوہ دستخط سکریٹری کے سید محمود لیف آنریری جنٹ سکریٹری کے بھی دستخط ہوا کریں گے اور جس چٹھی یا ڈاک یا چیک مذکورہ بالا پر سید محمود لیف آنریری جنٹ سکریٹری کے دستخط نہ ہوں وہ معتبر و جائز نہیں سمجھی جاوے گی''۔[۶۲]

سید محمود کو اختیارات کی منتقلی:

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۷/جنوری ۱۸۹۶ء کے مطابق اجلاس ٹرسٹیان منعقدہ یکم جنوری ۱۸۹۶ء میں ''اہتمام و نگرانی دفتر سکریٹری (شعبۂ انگریزی) نیز نگرانی امورات دفتر بورڈ آف مینجمنٹ (جو حال میں مقرر ہوا ہے) سید محمود لیف آنریری جنٹ سکریٹری کے سپرد کر دیا گیا تھا''۔ اس اجلاس میں جب مندرجہ بالا امور سید محمود کے سپرد

کرنے کی تجویز رکھی گئی تھی تو سید محمود نے اس سلسلے میں اپنی مشروط رضا مندی مندرجہ ذیل الفاظ میں ظاہر کی تھی:

''سید محمود نے کہا کہ جناب صدر، جو اطلاع کہ لیف آنریری سکریٹری نے نسبت سپردگی اہتمام ونگرانی دفتر سکریٹری واہتمام ونگرانی دفتر بورڈ آف مینجمنٹ اس جلسے میں دی ہے اس کی بابت چند امور عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ میں لائف آنریری جنٹ سکریٹری ٹرسٹیان کا ہوں اور اس حیثیت سے میرے متعلق چند خاص خدمات مخصوص رہی ہیں کہ جن کو میں برابر انجام دیتا رہا ہوں...... ان کے سلسلے میں کبھی کسی کو کوئی شکایت نہ ہوئی۔ میری طبیعت یہ ہے کہ جب تک کوئی کام باضابطہ میرے سپرد نہ ہو اور اس کے انتظام کرنے کا پورا اختیار مجھ کو نہ ہو میں اس کی ذمہ داری لینا پسند نہیں کرتا ہوں اور نہ مجھ کو خواہ مخواہ ذمہ داریاں اور اختیارات لینے کی نہ کبھی تمنا تھی اور نہ اب ہے۔ بلکہ جو کام کہ کسی اور کے سپرد ہو اس میں دست اندازی کرنے کو بے جا سمجھتا ہوں کہ اس سے ہمیشہ احتمال ابتری پیدا ہوتا ہے۔ اب چوں کہ لیف آنریری سکریٹری ان کاموں کو میرے ذمے سپرد کرتے ہیں، ان کو میں اپنے ذمہ لینا منظور کرتا ہوں۔ مگر اس کے ساتھ شرائط یہ ہیں کہ:

اولاً: جملہ رجسٹر ہائے حسابات درست کر کے سکریٹری حسب ان نقشا جات کے جو میں تیار کروں گا وہ تیار کرا دیں تا کہ مجھ کو صاف معلوم ہو جاوے کہ اب، بعد اس غبن کے جو کہ شیام بہاری لال، معزول ہیڈ کلرک، دفتر سکریٹری نے کیا ہے، فینشل یعنی مالی حالت مدرسۃ العلوم کی کیا ہے اور کس کس فنڈ میں کس کس قدر روپیہ اب باقی ہے۔

ثانیاً: علاوہ رجسٹر ہائے حسابات کے میری یہ خواہش ہے کہ لیف آنریری سکریٹری جملہ کاغذات انگریزی کارسپانڈنس کو جواب موجود ہے۔ (بعد تلف ہو جانے ان کاغذات کے جو شیام بہاری لال نے تلف کیے ہیں) ان کو بالکل مرتب کر کے رجسٹروں کی خانہ

پری کرادیں تا کہ صاف ظاہر رہے کہ مجھ کو یہ دفتر انگریزی کس حالت میں سپرد ہوا ہے اور کون کون سے کاغذات اس میں اب موجود ہیں۔

ثالثاً: یہ کہ لیف آنریری سکریٹری مجھ کو پورا اختیار دیں کہ آج کی تاریخ کے بعد کے حسابات اور رجسٹروں وغیرہ کے فارم جس طرح کہ میں مناسب سمجھوں تیار کیے جاویں اور کل کارروائی ان رجسٹروں کے موافق ہو۔

رابعاً: یہ کہ انگریزی دفتر سکریٹری کے اہل کاروں کے لیے میں ایک دستور العمل بنادوں گا کہ جس کے موافق ان کو اپنے فرائض منصبی پورے کرنے چاہئیں اور نیز اس دستور العمل میں ان اہل کاروں کے لیے جو انگریزی نہیں جانتے مگر ان کی مدد انگریزی مقاصد کے لیے لینی ضرور ہوتی ہے قواعد شامل کردوں گا۔

خامساً: یہ کہ انگریزی دفتر کے اہل کاروں پر جرمانہ کرنے یا ان کو معطل کرنے یا ان کی موقوفی کی رپورٹ کرنے یا ان کی ترقی کی سفارش کرنے کا مجھ کو اختیار دیا جاوے اور اسی قسم کا اختیار دربارہ ان اہل کاران دفتر سکریٹری کے دیا جاوے جو انگریزی نہیں جانتے مگر ان کی مدد انگریزی دفتر کے مقاصد کے لیے لینی ضرور ہوتی ہے۔

سادساً: یہ کہ مدرسۃ العلوم کی پختہ عمارت کے تین کمرے واسطے انگریزی دفتر سکریٹری کے دیئے جاویں اور کسی قدر مختصر خرچ ان کی میز اور الماری درست کرنے کا عطا فرمایا جاوے کہ بغیر اس کے میرے نزدیک دفتر درست نہیں رہ سکتا اور اس مکان میں جو کہ خاص سکونت کا مقام ہے نہ عمدہ طور پر دفتر کے رہنے کی گنجائش ہے اور نہ دفتر کو یہاں رہنا چاہیے۔ اگر یہ شرائط منظور ہوں تو میں اس کام پر بالاستعجاب آج ہی سے متوجہ ہوتا ہوں اور جہاں تک میری حد قدرت میں ہے اس کام کو درستی سے انجام دینے میں مصروف ہوں گا''۔[۶۳]

سید محمود کے خیال سے سرسید کا گھریلو قسم کا ذاتی تعلقات پر مبنی نیاز مندانہ وخاکسارانہ کام کرنے کا انداز ایک طرح سے بوسیدہ اور فرسودہ تھا۔ سرسید اپنے گھر کے

بڑے رہائشی کمرے ہی میں اپنے آفس کا کام بھی کرتے تھے۔ لوگوں سے ملاقات بھی کرتے تھے اور اپنے تصنیف و تالیف کے کام کو بھی وہیں انجام دیتے تھے۔ سید محمود کے خیال میں کام کرنے کے لیے ایک واجبی عملہ اور اس کے لیے ایک باقاعدہ آفس ہونا عمدہ ایڈمنسٹریشن کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ جہاں اس طرح کا ماحول پیدا کیا جاسکتا ہے جس میں وضع کیے ہوئے دستور العمل کو نافذ کر کے ہر آدمی کو اپنے فرائض کے لیے جواب دہ بنایا جاسکتا ہے اور فرائض کی ادائیگی کے لیے جزا اور عدم ادائیگی کے لیے سزا کا مستحق قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسی لیے عملہ کے اہل کاروں کی ملازمت کے سلسلے کے کل حقوق بھی وہ اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے۔ حقیقتاً یہ ایک عمدہ خیال تھا۔ سرسید اس سے متفق تھے لیکن مسئلہ وہی وسائل کا تھا۔ ابھی کالج میں اتنی استعداد بھی نہیں ہوئی تھی کہ طلبا اور اساتذہ کے لیے عمارتوں میں کلاسوں اور بورڈنگ ہاؤسوں کا مناسب بندوبست کر سکے ایسی حالت میں سکریٹری کے ایک ذیلی آفس کے لیے عمارت کے تین پختہ کمروں کو وقف کرنا خاصا مشکل کام تھا۔ ساتھ ہی ان کمروں کو عمدہ فرنیچر سے آراستہ کروانا نیز آفس کے لیے مجوزہ اسٹاف مہیا کروانا، یہ سب نہایت مشکل مراحل تھے۔ ظاہر ہے کہ سرسید باوجود خواہش کے (سید محمود کے مزاج کی مطابقت سے) ان شرائط کو فوری طور پر پورا کرنے میں ناکام رہے ہوں گے۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے حتی الامکان کوشش کی تھی کہ سید محمود کی شرائط کو جس حد تک بھی ممکن ہو سکے پورا کیا جائے۔ سید محمود نے یہ شرط بھی رکھی تھی کہ سکریٹری کے آفس کی مراسلت کے سابقہ ریکارڈ کو ترتیب دے کر رجسٹروں میں باترتیب خانہ پُری کرنے کے بعد ان کے حوالے کیا جائے۔ یہ بھی ایک مشکل کام تھا جس کے لیے کافی وقت اور محنت درکار تھی۔ لیکن اس کے باوجود ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سرسید اس کام کو مکمل کروانے میں مصروف ہو گئے تھے اور اگلے سات آٹھ مہینوں تک ان ریکارڈوں کو مرتب کرواتے رہے تھے جس کی شہادت ان کے خط مورخہ ۱۸؍جولائی ۱۸۹۶ء بنام عنایت اللہ خاں صاحب سے ملتی ہے جس میں وہ تحریر کرتے ہیں کہ:

> ''چنانچہ چٹھیات موجودہ کو بہ ترتیب درست کر لیا ہے۔ اب صرف ان کا نئے رجسٹروں میں چڑھانا باقی ہے اس کام میں تمہاری مدد چاہتا ہوں بشرطیکہ کہ تمہاری طبیعت بہ صحتِ کامل ہو''۔[۶۴]

یوں کہنا چاہیے کہ اس زمانے میں سید محمود نے معہ سرسید ان کے آفس کے پورے

عملے کو ایک طرح سے ''ہوم ورک'' کرنے میں مصروف کر دیا تھا۔

سید محمود کا لکھنؤ میں پریکٹس کرنا:

سید محمود نے جن شرائط کے ساتھ سکریٹری کے شعبۂ انگریزی اور دفتر بورڈ آف مینجمنٹ کے کاموں کی نگرانی کرنے کی ذمہ داری قبول کرنے کی مشروط رضا مندی ظاہر کی تھی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چوں کہ سید محمود جو الہ آباد ہائی کورٹ کے جسٹس رہ چکے تھے وہ انگریز حکومت کی نوکر شاہی کی طرز کی افسرانہ شان کے بغیر کام کرنے کے عادی نہ رہے تھے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ سید محمود نے اختیارات ملنے کے باوجود (جن کو وہ اکثر استعمال بھی کرتے رہتے تھے) سکریٹری کے آفس کے اس ذیلی کام میں کچھ زیادہ دلچسپی نہ دکھلائی بلکہ وہ اپنے علیحدہ آفس قائم کیے جانے کے مطالبہ ہی کو وقتاً فوقتاً دہراتے رہتے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے دوبارہ وکالت کی طرف رجوع کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے لکھنؤ کے چیف جوڈیشیل کورٹ میں اپنا نام بھی رجسٹرڈ کروالیا تھا جس کی شہادت ہمیں سرسید کے خط بنام نیاز احمد مورخہ ۱۹ رمئی ۱۸۹۶ء سے فراہم ہوتی ہے۔ جس میں وہ تحریر کرتے ہیں کہ:

> ''یہ بات صحیح ہے کہ سید محمود نے اپنا نام صیغہ بیرسٹری، چیف جوڈیشیل کورٹ، لکھنؤ میں لکھا لیا ہے اور چند مقدمات شاید کثیر المالیت انھوں نے لیے ہیں جن کی وہ پیروی کرتے ہیں اور ابھی تک واپس نہیں آئے ہیں''۔ ؁۶۵

غرض وہ اگست، ستمبر ۱۸۹۶ء تک ایک طرح سے لکھنؤ منتقل ہو گئے تھے۔ جہاں انھوں نے اپنی رہائش کے لیے ایک بنگلے کا انتظام بھی کر لیا تھا۔

سید محمود کی خرابیِ صحت

ہمارے ایک مفروضہ کے مطابق ہمیں شک تھا کہ سید محمود ذیابیطس کی بیماری (یعنی شکر کے مرض) میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اسی کے ساتھ ان کی بے ترتیب زندگی اور کثرت مے نوشی نے ان کی صحت پر مضر اثرات مرتب کرنا شروع کر دیئے تھے۔ وہ سگریٹ بھی بکثرت پیتے تھے۔ اسی لیے اگر وہ بلڈ پریشر اور جگر کی خرابی کے شکار ہو گئے ہوں تو کوئی تعجب نہیں ہے۔ جسمانی کسرت کی کمی کی وجہ سے وزن بہت بڑھ گیا تھا۔ جسم شل ہو گیا تھا۔

خون کی کمی کے آثار چہرے کی زردی سے عیاں تھے۔ حالاں کہ الہ آباد سے علی گڑھ منتقل ہونے کے بعد سے ان کے اندر نمایاں تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ خاص طور پر شراب نوشی کے سلسلے میں کچھ اعتدال واقع ہوا تھا جس کا اثر ان کے چہرے مہرے کی بشاشت میں کسی قدر نظر آنے لگا تھا۔ لیکن یہ سب ایک وقتی تبدیلی ثابت ہوئی۔ کیوں کہ لکھنؤ منتقل ہونے کے بعد ان کی پرانی مہ نوشی دوبارہ عود کر آئی تھی۔ اس سلسلے میں شیخ عبداللہ ''مشاہدات و تاثرات'' میں تحریر کرتے ہیں کہ:

> ''انہی دنوں ایک انگریز سید محمود کا دوست بطور سیاح کے سفر کرتا ہوا علی گڑھ ان سے ملنے کے لیے آ گیا۔ وہ کچھ دنوں تک سید محمود کے پاس علی گڑھ میں رہا اور اس کے بعد دونوں مختلف مقامات پر قدیم عمارتیں اور یادگاریں دیکھنے کے لیے نکلے۔ دہلی، آگرہ، لکھنؤ، بنارس اور دیگر مقامات پر قریب ایک ماہ سے زیادہ گشت لگاتے رہے۔ یہ ان کے دوست کا ان کے پاس آنا ان کے حق میں سم قاتل ہو گیا۔ پرانی مہ نوشی کی عادت پھر عود کر آئی''۔[۶۶]

غرض لکھنؤ کے دورانِ قیام سید محمود نے شراب پینے کی معتدل نہج کو یکسر خیر باد کہہ دیا تھا اسی لیے جلد ہی ذہنی انتشار کا شکار ہو کر وہ واپس علی گڑھ آ گئے تھے۔

سر سید کی مصروفیات:

سید محمود جس زمانے میں وکالت کے سلسلے میں لکھنؤ چلے گئے تھے سر سید اس تمام عرصے میں اپنے مختلف کاموں کو (جو ابھی تک ادھورے تھے) مکمل کرنے میں مصروف ہو گئے تھے۔ جیسے ڈیپنچر ہاؤس کی تعمیر کا کام، مسجد کی جزوی تعمیرات کا سلسلہ۔ ساتھ ہی سید محمود کی ایما اور خواہش کے مطابق وہ سکریٹری کے آفس کے سابقہ (بیس برس کے) ریکارڈ کو مرتب کروانے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔ لیکن ان سب کے ساتھ انہیں اپنی دلچسپی کے لیے ایک نایاب وسیلہ بھی میسر ہو گیا تھا اور وہ تھا ان کا لاڈلہ ''پوتا'' سید راس مسعود۔ جو ان کی تمام تر شفقت، محبت اور توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ جس کی معصوم خواہشات کو پورا کر کے انہیں عجب قسم کی تسکین ملتی تھی۔ وہ اپنا زیادہ تر وقت اس کے دلار میں صرف کرتے تھے۔ ساتھ ہی اس کی تعلیم اور تربیت کا بھی خیال رکھتے تھے۔ اسی لیے جہاں گھر کے کمپاؤنڈ میں موجود

کرکٹ فیلڈ کے قریب تعمیر کردہ بڑا کمرا اور سہ دری راس مسعود کے مکتب میں تبدیل ہوگئی تھی وہیں گھر میں پہلے سے موجود دو گھوڑوں کی بڑی بگھی کے علاوہ ایک خوبصورت سی (ایک گھوڑے کی) چھوٹی بگھی کا اور اضافہ ہوگیا تھا جو صرف ''پوتے'' کے لیے مخصوص تھی اور ''راس مسعود کی بگھی'' کہلاتی تھی۔ اب کسی تقریب یا کالج کے کسی فنکشن میں سرسید تنہا نظر نہیں آتے تھے بلکہ ان کا یہ ''چھوٹا دوست'' (نوکروں کے نرغہ میں) ہمیشہ ان کے ساتھ ہوتا تھا۔

سرسید ہاؤس کی ملکیت مشرف بیگم کے نام:

شیخ عبداللہ صاحب ''مشاہدات وتاثرات'' میں تحریر کرتے ہیں کہ غالباً اسی زمانے میں لوگوں کے کہنے پر سید محمود نے اپنا وہ بنگلہ جو انھوں نے سرسید کی رہائش کے لیے ۱۸۷۶ء میں خریدا تھا (یعنی سرسید ہاؤس) اپنی بیگم صاحبہ یعنی مشرف جہاں محمود بیگم کے نام بیع کردیا تھا۔ اس سلسلے میں وہ تحریر کرتے ہیں کہ:

> ''لوگوں کے کہنے سے انھوں نے وہ کوٹھی جس میں سرسید، بیگم محمود اور وہ خود رہتے تھے۔ محمود بیگم کے نام بیع کردی''۔

اسی سلسلے میں شیخ عبداللہ صاحب آگے تحریر کرتے ہیں کہ:

> ''یہ مجھ کو بالکل یاد نہیں رہا کہ آیا یہ بیع نامہ سرسید کی حیات میں رجسٹری ہوگیا تھا یا بعد میں رجسٹری ہوا لیکن رجسٹری ضرور ہوئی اور میں نے کرائی اور سب رجسٹرار کو بلا کر سید محمود کی کوٹھی پر رجسٹری کروائی''۔ [۶۷]

بہر حال ہمارا مفروضہ یہی ہے کہ یہ کوٹھی سرسید کی زندگی ہی میں سید محمود نے مشرف جہاں بیگم صاحبہ کے نام بیع کر کے بیع نامہ کی رجسٹری کروادی تھی جس کے چند مبہم اشارے مختلف تحریروں میں بھی ملتے ہیں۔

سید محمد احمد کا علی گڑھ میں مکان:

سرسید کے بڑے بھائی کے صاحبزادے سید محمد احمد خاں ۱۸۹۶ء میں علی گڑھ میں مکان بنانے کے خواہش مند اور کوشاں تھے۔ یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ سرسید نے انہیں سرسید ہاؤس کے شمال میں ایک قطعہ زمین مکان بنوانے کے لیے خریدوا دیا تھا۔ سید محمد احمد نے اپنے خط مورخہ یکم فروری ۱۸۹۶ء میں اناؤ سے سرسید کو تحریر کیا تھا کہ:

''بعد تسلیم التماس ہے کہ والا نامہ مورخہ ۳؍جنوری سنہ حال وارد ہوا۔ میں نے جو تخمینہ کوٹھی، تیار کروایا ہے وہ ابھی تک نہیں آیا ہے۔اس لیے میں نہیں کہہ سکتا ہوں کہ کس قدر اینٹ صرف ہوگی لیکن آپ میکڈانلڈ صاحب سے اینٹوں کی بابت بندوبست فرماویں اور سرِ دست ذیل اینٹیں خرید لی جاویں:

قسم اول۔بحساب (رقم پڑھی نہ جاسکی) روپیہ۔وڈھولائی ایک روپیہ آٹھ آنہ۔ ۳۰۰۰۰

قسم دوم۔بحساب (رقم پڑھی نہ جاسکی) روپیہ۔وڈھولائی ایک روپیہ آٹھ آنہ۔ ۴۰۰۰۰

قسم سویم۔ بحساب (چھ روپیہ) وڈھولائی ایک روپیہ آٹھ آنہ۔ ۵۰۰۰۰

اگر سویم اینٹ میں بہت نقص ہو تو بہت سویم نہ خرید فرماویں بلکہ بجائے اس کے دوم خرید فرماویں۔اس لیے کہ میں نے قسم سویم نہیں دیکھی ہیں کہ کس قسم کی ہیں۔ میں پانصد (یعنی پانچ سو) روپیہ آج یا کل میں روانہ کردوں گا۔میکڈانلڈ صاحب کو دے دیا جاوے بطور پیشگی۔ اس کے بعد میں سو روپیہ یا زیادہ اس سے ماہواری روانہ کروں گا وہ ان کو دے دیا جاوے گا۔میرے خیال میں زیادہ خرچ اینٹ قسم دوم کا ہوگا۔آپ کی کیا رائے ہے۔میں ایک ساتھ بنیاد کوٹھی بھروانا چاہوں گا۔اور اس قدر اینٹیں بنیاد کو کافی ہوں گی۔علاوہ اس کے میکڈانلڈ صاحب سے بندوبست کرلیا جائے کہ جس قدر اینٹوں کی ضرورت ہوگی اس قدر دیں گے۔ بعد تخمینہ نہیں کہہ سکتے ہوسکتا ہے کہ زیادہ یا اس سے کم ہو۔میری طبیعت ابھی تک صاف نہیں ہوئی۔ جوڑیاں کواڑوں کی ۳ عدد اور کچھ لکڑی میں نے خرید لی ہے۔سید محمود کے ممبر کونسل ہونے سے نہایت خوشی ہوئی۔اس کی مبارکباد آپ کو پہنچے''۔۶۸

اس وقت کی سب عمارتوں میں ''ایف۔ایم'' چھاپے کی اینٹس لگی پائی گئی

ہیں۔ جو فرگوسن اور میکڈ انلڈ کے بھٹہ کی اینٹیں تھیں۔ کالج کی عمارتوں کے لیے بھی سر سید نے زیادہ تر اینٹیں فرگوسن اینڈ میکڈ انلڈ سے ہی خریدی تھیں۔ سر سید میکڈ انلڈ صاحب سے ذاتی طور پر واقف تھے اسی لیے سید محمد احمد خاں صاحب نے سر سید سے درخواست کی تھی کہ وہ میکڈ انلڈ صاحب سے کہہ کر مجوزہ (مختلف اقسام کی) اینٹیں (جن کی مجموعی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تھی) ان کے مکان کی بنیاد بھروانے کے لیے خرید وادیں جس کے لیے وہ ۵۰۰ روپے پیشگی میکڈ انلڈ صاحب کو ادا کرنے کے لیے روانہ کر رہے تھے اور باقی رقم ۱۰۰ روپے مہینہ کے حساب سے ادا کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت سید محمد احمد صاحب کی عمر تقریباً ۵۴ سال کی ہو رہی تھی اور غالباً اس سال کے اواخیر میں ان کا ریٹائر منٹ ہونے والا تھا غالباً وہ ریٹائر منٹ سے پہلے ہی اپنے مکان کی تعمیر مکمل کروانا چاہتے تھے۔ سید محمد احمد خاں صاحب ریٹائر منٹ کے بعد علی گڑھ تو آگئے تھے۔ لیکن جس مکان کی تعمیر کے سلسلے میں انھوں نے مندرجہ بالا خط تحریر کیا تھا وہ نہ معلوم اسباب کی بنا پر تعمیر نہ کیا جا سکا تھا۔ بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے مفروضہ کے مطابق جس زمین پر یہ مکان تعمیر کیا جانا تھا وہ زمین سید محمد احمد خاں صاحب نے غالباً فروخت کردی تھی کیوں کہ ہمیں اس طرح کے اشارے ملتے ہیں کہ غالباً یہی زمین کئی مراحل سے گزر کر یونیورسٹی کی ملکیت میں آگئی تھی۔ یہ غالباً وہی زمین ہے جس پر اس وقت ''محمود بیگم کوارٹرز'' بنے ہوئے ہیں۔ یہ زمین کس طرح مشرف جہاں محمود بیگم صاحبہ تک پہنچی اس سلسلے میں، ہم کوئی بات وثوق سے نہیں کہہ سکتے ہیں لیکن اس سلسلے میں، ہم نے اپنے مفروضات کا اظہار اس زمین کے متعلق تذکروں میں جا بجا کرنے کی کوشش کی ہے۔ علی گڑھ میں مکان نہ تعمیر کرنے کے فیصلے کے بعد ہی غالباً سید محمد احمد خاں صاحب نے سیتا پور میں اپنے اہل وعیال کی رہائش کے لیے ایک بڑی کوٹھی موسومہ ''بیگم باغ'' خرید لی تھی۔ ۱۹۰۱ء میں جب سید محمود ان کے ساتھ علی گڑھ سے سیتا پور منتقل ہوئے تھے تب وہ سید محمد احمد خاں صاحب کے ساتھ اسی کوٹھی میں رہائش پذیر ہوئے تھے۔ ہمیں سید محمد احمد خاں صاحب کے اسی خط سے یہ اطلاع بھی ملی تھی کہ سید محمود ۱۸۸۶ء میں لیجسلیٹو کونسل کے ممبر نامزد کیے گئے تھے جس کی مبارک باد سید محمد احمد صاحب نے اس خط میں سر سید کو دی تھی۔

سر سید کی صحت:

اب سر سید کی عمر تقریباً ۸۰ سال کی ہو رہی تھی۔ صحت پر ضعیفی کے آثار نمایاں ہو چکے تھے۔ پڑھنے لکھنے کے لیے عینک کا استعمال تو وہ تقریباً ۲۰ برسوں سے کر رہے تھے۔ ہو سکتا ہے دور کی نظر بھی کمزور ہو گئی ہو لیکن دور کی نظر کا چشمہ استعمال نہیں کرتے تھے۔ دانت بھی عمر کے ساتھ ''جھر جھرے'' ہو گئے تھے یعنی کہ جیسا عام طور پر ہوتا ہے کچھ گر گئے تھے اور کچھ موجود تھے۔ ''نسیان'' بڑھ گیا تھا۔ یعنی چیزیں بھولنے لگے تھے۔ بہر حال یہ سب تو بڑھاپے کی عام علامتیں تھیں لیکن ان کے علاوہ وزن بہت بڑھ گیا تھا جس کی وجہ سے اٹھنے بیٹھنے اور چلنے میں دشواری ہونے لگی تھی۔ اب کسی جلسے میں کھڑے ہو کر دو چار منٹ سے زیادہ تقریر وغیرہ نہیں کر سکتے تھے۔ اسی لیے اب ان کے واسطے عام طور پر بیٹھ کر تقریر کرنے کا انتظام کیا جاتا تھا۔ لمبے سفر سے تو ڈاکٹروں نے کئی سال پہلے سے منع کر رکھا تھا (اسی وجہ سے دو تین سال پہلے بمبئی میں منعقد ہونے والا ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس موقوف کرنا پڑا تھا کیوں کہ سر سید نے اتنا لمبا سفر کرنے سے معذوری ظاہر کی تھی۔ اسی طرح ایک سال پہلے وائسرائے کے سکریٹری کو خط لکھ کر شملہ تک کا سفر نہ کر سکنے پر ندامت ظاہر کرتے ہوئے اپنے وہاں نہ پہنچ سکنے کے سلسلے میں معافی کے خواستگار ہوئے تھے) اب سر سید کی صحت پر ''ہائپوتھائی روائڈازم'' کی علامتیں بھی پوری طرح سے نظر آنے لگی تھیں۔ یعنی وزن بڑھ گیا تھا۔ سستی رہتی تھی، پیروں پر سوجن ہو جاتی تھی وغیرہ۔ اسی لیے اس زمانے میں عام طور پر خاموش رہنے لگے تھے۔ لیکن حتی الامکان وہ اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لیے اپنے معمول کے مطابق تصنیف و تالیف کے کام کو جاری رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ساتھ ہی کالج کی عمارتوں کی تعمیر کو مکمل کرنے (جس میں صرف ڈیبنچر ہوسٹل کے کمروں اور مسجد کی جزوی تعمیر شامل تھی) میں اپنے آپ کو حتی المقدور مصروف رکھنے کی سعی کرتے تھے۔

سید محمود اور ان کا جارحانہ رویہ:

سر سید کی صحت کا جب یہ حال تھا اسی زمانے میں سید محمود نے لکھنؤ سے واپس آ کر ایک بار پھر کالج کے کاموں کو انجام دینے کے واسطے اپنی مشروط رضامندی کی یاد دہانی کرواتے ہوئے (یعنی اپنے آفس وغیرہ کے مطالبات کو دھراتے ہوئے) ان کے پورا کیے جانے پر اصرار کرنا شروع کر دیا تھا۔ اب ان کا انداز خاصا جارحانہ ہو گیا تھا خاص طور پر

جب وہ نشے میں ہوتے تھے اور ایسا کم ہی ہوتا تھا جب وہ نشے میں نہ ہوں۔ حالاں کہ اب بھی جب وہ نشے میں نہیں ہوتے تھے (یا کم نشے میں ہوتے تھے) تو ان کی قانون دانی کی پیشہ ورانہ قابلیت ان کی تحریر و تقریر میں دوبارہ نظر آنے لگتی تھی۔ اب اکثر لوگوں نے سید محمود کے جارحانہ طرزِ گفتگو کی وجہ سے سر سید ہاؤس میں آنا جانا ترک کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں اسماعیل خاں صاحب اپنے ایک خط بنام مولوی مشتاق حسین (وقار الملک) میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''یہ سچ ہے کہ سر سید خود بہت پریشان ہیں مگر جو بات سید محمود ایجاد کرتے ہیں آخر کار مقبول اور منظور ہوتی ہے۔ اور وہی کام اجرا کیا جاتا ہے۔ میں نے تو سید صاحب کے یہاں آنا جانا ترک کر دیا، کیوں کہ یا تو ان کی رائے میں شریک ہو اور کارروائی پر دستخط کرو اور نہیں تو سید محمود کی گالیاں کھاؤ اور غصہ کرو تو جوتی پیزار کرو''۔[۶۹]

مولانا شبلی نعمانی جو سر سید ہاؤس کے احاطے کے اندر ہی ایک چھوٹے سے بنگلے میں رہائش پذیر تھے سید محمود کی موجودگی کی وجہ سے شاذ و نادر ہی سر سید کے پاس آتے تھے۔ دراصل سید محمود علی گڑھ آنے کے بعد سے اکثر صبح سویرے وقت گزاری کے واسطے مولانا کے پاس چلے جاتے تھے۔ مولانا کا وہی وقت اپنا تحقیق و تصنیف کا کام کرنے کا ہوتا تھا جس میں خاصا حرج ہونے لگا تھا۔ اسی وجہ سے ایک دن انھوں نے دبے لفظوں میں اس کا اظہار سید محمود سے کر دیا تھا۔ سید محمود کو یہ بات سخت ناگوار گزری تھی۔ اسی روز سے انھوں نے مولانا سے ملنا جلنا قطعی ترک کر دیا تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ سر سید کے انتقال کے فوراً بعد مولانا سر سید ہاؤس کے احاطہ میں اپنی رہائش موقوف کر کے اسماعیل خاں صاحب کی کوٹھی میں منتقل ہو گئے تھے اور کچھ روز وہاں رہنے کے بعد آخیر کالج سے مستعفی ہو کر اپنے وطن واپس چلے گئے تھے۔ سید محمود صاحب جب کسی سے ناراض ہوتے تھے تو اپنی ناراضگی کا اظہار بانگ دہل کرتے تھے۔ وہ حریف کو زک پہنچانے اور بدلہ لینے کے متمنی رہتے تھے۔ حالاں کہ دوسری طرف وہ آسانی سے لوگوں کو معاف بھی کر دیتے تھے۔ جب کسی سے صلح صفائی ہو جاتی تھی تو فوراً سب کچھ بھلا دیتے تھے بلکہ اسی شخص کی ہر طرح کی مدد کرنے کے لیے ہر وقت تیار ہو جاتے تھے۔ اس زمانے میں جن لوگوں سے شاکی رہتے تھے ان کے خلاف گفتگو میں جارحانہ رویہ اختیار کرتے تھے۔ چوں کہ پیشہ ورانہ قانون داں تھے اس لیے اپنے

مخالفین کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنے کی دھمکیاں بھی دیتے رہتے تھے۔ عام طور پر لوگ تھانہ کچہری سے گھبراتے تھے اسی لیے سید محمود سے خائف رہتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ ان کی نظروں سے دور رہیں (غالباً یہ خوف ہی تھا جس نے عام لوگوں کے دلوں میں سید محمود سے تنفر کے جذبہ کو فروغ دینے میں مدد دی تھی) سرسید کی سب سے بڑی پریشانی یہی تھی کہ سید محمود اب بہت سے لوگوں کے خلاف انتقامی کارروائی کرنے کے درپہ ہو گئے تھے۔ وہ جن ٹرسٹیوں سے ناراض تھے ان کو برخاست کرنے کے لیے سرسید سے اصرار کرتے تھے یا جو جگہیں خالی تھیں ان پر اپنے معتمد لوگوں کو نامزد کروانے کے لیے ضد کرتے تھے۔ سرسید جب ان کے ان بے جا مطالبات کو پورا کرنے سے معذوری ظاہر کرتے تھے تو خود سید محمود کے جارحانہ اندازِ گفتگو کا ہدف بنتے تھے۔ سرسید کی مجبوری یہ تھی کہ اب سید محمود اپنے اختیارات کو استعمال کر کے سرسید کے روزمرہ کے کاموں میں مخل بھی ہو سکتے تھے۔ کیوں کہ اب بینک کا کوئی بھی چیک اس وقت تک کیش نہیں ہوسکتا تھا جب تک کہ اس پر سکریٹری کے دستخطوں کے ساتھ ساتھ سید محمود کے دستخط بھی موجود نہ ہوں۔ اسی وجہ سے اب سید محمود کے مطالبات کو آسانی سے نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس زمانے میں سید محمود کو سب سے زیادہ کدورت مشتاق حسین صاحب (وقار الملک) سے تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ سرسید اپنے ''خصوصی اختیارات'' کو استعمال کر کے وقار الملک کو ٹرسٹی شپ سے علیحدہ کردیں۔ سرسید اپنی روادارانہ طبیعت سے مجبور تھے۔ وہ یہ کہہ کر اس بات کو رفع دفع کرنا چاہتے تھے کہ یہ خصوصی اختیارات اس طرح کے معاملات میں استعمال نہیں کیے جاسکتے ہیں۔ چوں کہ یہ قانونی تشریح کا مسئلہ تھا (جو سید محمود کا پسندیدہ مشغلہ تھا) اس لیے سید محمود اس پر لمبی بحثیں کرتے رہتے تھے۔ میر ولایت حسین لکھتے ہیں کہ ایک روز سید محمود نے ان سے بھی یہ سوال کیا تھا کہ کیا دفعہ ۱۴۰ کی رو سے (جس میں سکریٹری کو خصوصی اختیارات دیئے گئے ہیں) سکریٹری کو مولوی مشتاق حسین کو ٹرسٹی شپ سے خارج کرنے کا اختیار پہنچتا ہے یا نہیں؟ اور جب میر صاحب نے دبے لفظوں میں یہ کہنے کی جرات کی تھی کہ یہ خصوصی اختیارات سکریٹری کو اس طرح کے کاموں کو انجام دینے کے لیے نہیں دیئے گئے ہیں تو سید محمود نے اپنا عندیہ ان پر اس طرح ظاہر کیا تھا:

> ''میں درگا پرشاد پر نالش کرنے والا ہوں۔ مشتاق حسین اُس کو مدد دے گا میں نے کہا کہ ٹرسٹی ہونے پر مدد دینے کا اندیشہ ہے تو ٹرسٹیوں

کی جماعت سے خارج ہونے پر اور زیادہ خطرہ ہوگا۔ انھوں نے (یعنی سید محمود نے) کہا کہ اس حالت میں ان کی مدد دشمنی پر مبنی سمجھی جاوے گی اور ٹرسٹی ہونے کی حالت میں واقعی مدد سمجھی جاوے گی"۔ ۰ےے

سرسید کے آفس کا گھر سے منتقل کیا جانا:

اب سید محمود کے مختلف نوعیت کے مطالبات سرسید کے لیے دردِ سر بنتے جا رہے تھے خاص طور پر سکریٹری کے لیے کالج کی عمارت میں ایک عمدہ آفس ترتیب دیئے جانے کا مسئلہ، سید محمود نے اپنی انا کا مسئلہ بنالیا تھا۔ وہ کسی بھی صورت سے اس بات کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کہ سکریٹری کا آفس یا ٹرسٹیوں کے اجلاس وغیرہ اب ان کے بنگلے پر منعقد ہوں۔ ان کا کہنا تھا کہ گھر رہائش کے لیے ہوتا ہے اور اس طرح کی چیزیں ان کی پرایویسی میں مخل ہونے کے مترادف ہیں۔ اسی عرصہ میں ٹرسٹیانِ کالج کے ایک ریزولیوشن کے ذریعہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ کی عمارت اور سائنٹفک سوسائٹی کی کل املاک کالج کی ملکیت میں منتقل کر دی گئی تھی۔ سید محمود نے انسٹی ٹیوٹ کی عمارت کو سکریٹری کا آفس قائم کیے جانے کے لیے وقف کرنے کی تجویز رکھی تھی۔ اس تجویز کے مطابق سید محمود اس عمارت کو اپنے خرچ پر درست اور آراستہ کروا کر اس میں سکریٹری کے لیے ایک عمدہ اور باقاعدہ آفس قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت سید محمد احمد خاں صاحب بھی ریٹائر ہو چکے تھے۔ وہ کالج کے ٹرسٹی تو پہلے سے ہی تھے اب ان کو سید محمود کی ایما پر آنریری اسسٹنٹ سکریٹری بھی مقرر کر دیا گیا تھا۔ سید محمد احمد خاں صاحب کے علی گڑھ آنے کے بعد ہی سید محمود نے ان کی نگرانی میں سکریٹری کے آفس کو انسٹی ٹیوٹ کی عمارت میں منتقل کروانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس فیصلے کے لیے حسب قاعدہ پانچ ٹرسٹیوں کی رضامندی بھی حاصل کر لی گئی تھی (جن میں سے تین یعنی سرسید، سید محمود اور سید محمد احمد تو گھر ہی میں موجود تھے نیز چوتھے اور پانچویں ٹرسٹی کے بطور مرزا عابد علی بیگ اور سید زین العابدین ہر وقت سید محمود کو دستیاب رہتے تھے) دسمبر ۱۸۹۷ء کے اواخیر سے انسٹی ٹیوٹ کی عمارت کی مرمت وغیرہ کا کام بڑی شدومد کے ساتھ شروع کر دیا گیا تھا اور جنوری ۱۸۹۸ء کے وسط تک سرسید کے آفس کے سامان کو انسٹی ٹیوٹ کی عمارت میں منتقل کرنے کا کام جاری ہو گیا تھا۔ سرسید اب صرف ایک خاموش تماشائی تھے۔ ان کی نظروں کے سامنے ان کے آفس کی فائلیں، ان کی کتابیں، ان کی الماریاں حتیٰ

کہ ان کے لکھنے پڑھنے کی میز کرسی اور دوسرا مطلوبہ سامان ایک ایک کر کے گھر سے انسٹی ٹیوٹ کی عمارت میں منتقل کیا جانے لگا۔ انسٹی ٹیوٹ کی عمارت میں کس کروفر سے سکریٹری کا آفس آراستہ کیا جارہا تھا اس کی چند تفصیلات ہمیں اجلاس ٹرسٹیان منعقدہ ۳۰/جنوری ۱۸۹۸ء کی روئیداد سے فراہم ہوتی ہیں:

''مدھیز دہم۔ اطلاع نسبت منتقل ہونے دفتر سکریٹری کے مکانِ سکونت سے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ میں۔ آپ کو معلوم ہے کہ تمام عمارتیں اور باغ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ کا بموجب دفعہ ۲۰۳ قواعد وقانون ٹرسٹیان کے ایک جزو عماراتِ مدرسۃ العلوم کا قرار پاچکا ہے۔ اور چوں کہ مدرسۃ العلوم میں اس سبب سے کہ اس کی عمارت پوری نہیں ہوئی، دفتر سکریٹری کے رکھنے کی گنجائش نہیں تھی اور اس کا مکان مسکونہ سے علیحدہ کرنا اور مرتب کر کے علیحدہ مکان میں رکھنا ضروری تھا۔ اس لیے سکریٹری اور آنریبل سید محمود، ٹرسٹی وجوائنٹ سکریٹری کی اور مرزا عابد علی بیگ صاحب اور سید محمد احمد خان بہادر، ٹرسٹیان کے مشورے سے یہ رائے قرار پائی کہ دفتر سکریٹری معہ ان مطبوعہ کتابوں کے جو لوگوں نے کالج کو اس غرض سے دی ہیں کہ ان کو فروخت کر کے ان کی قیمت کالج کے صرف میں لائی جاوے، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ میں بھیج دیا جاوے اور ٹرسٹیوں کا اجلاس جو مکانِ مسکونہ سکریٹری میں ہوتا تھا وہ بھی علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ میں ہوا کرے۔ آنریبل سید محمود، لائف آنریری جوائنٹ سکریٹری نے دفتر سکریٹری کے درست کرنے کے لیے دو ہزار روپیہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ کی عمارت میں دفتر سکریٹری کے رکھنے اور ٹرسٹیوں کا اجلاس ہونے کے لیے چند ترمیمات کی ضرورت تھی جس کو آنریبل سید محمود نے اپنے خرچ سے پورا کیا ہے اور جس کو دو ہزار روپیہ موعودہ میں سے مجرا لیں گے اور مسٹر گارڈنر کو دفتر اکاؤنٹینٹ جنرل سے ۱۵۰ روپیہ ماہواری پر واسطہ دفتر کی ترتیب کے بلایا ہے جس کی تنخواہ وہ خود دیں گے۔ پس

دفتر سکریٹری علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ ہال میں منتقل ہو جاوے گا۔ دو کمرے جو مولوی یوسف نے کلب کے نام سے گھیر رکھے تھے وہ خالی کر دیئے اور کلب کو وہاں سے اٹھالیا"۔اے

اسی میٹنگ کی روئیداد کی "آٹھویں مد" سے اطلاع ملتی ہے کہ سکریٹری کے آفس کی منتقلی کا کام کافی عرصہ سے چل رہا تھا اور اس کام کی نگرانی سید محمد احمد خاں صاحب کے سپرد کی گئی تھی اور اس کام کے لیے انہیں با قاعدہ اسسٹنٹ سکریٹری مقرر کر دیا گیا تھا۔ جس کی منظوری کی سفارش اس اجلاس میں ممبروں کے سامنے پیش کی گئی تھی۔اس مد میں تحریر تھا کہ:

"مد ہشتم۔ان دنوں جو دفتر سکریٹری کی ترتیب با قاعدہ کی جاتی ہے جو سکریٹری کے مسکونہ مکان میں بلا ترتیب پڑا ہے اور اس مکان میں سے نکال کر انسٹی ٹیوٹ ہال میں بھیجا جاتا ہے اور تمام کتابیں عربی وغیرہ کی اور تمام کتب قانونی و انگریزی جو مکان مسکونہ سکریٹری میں پڑی ہیں ان سب کو انسٹی ٹیوٹ ہال اور اسٹریچی ہال میں منتقل کیا جاتا ہے۔ سکریٹری کو ضرورت پڑی ہے کہ ایک اسسٹنٹ اپنا مقرر کرے تا کہ تمام کام اس کی نگرانی میں احتیاط سے انجام پاویں۔اس واسطہ سکریٹری نے سید محمد احمد خاں کو جو ٹرسٹی کالج بھی ہیں اور اب انھوں نے پنشن لے لی ہے اس کام پر مقرر کیا ہے اور کوئی معاوضہ یا کوئی تنخواہ ان کو نہیں دی جاوے گی۔ بلکہ وہ صرف بطور آنریری اسسٹنٹ سکریٹری کے کام کریں گے۔ پس امید ہے کہ ٹرسٹی اس امر کو منظور فرماویں گے۔ بس میں کسی قسم کا بار کالج کی مالی حالت پر عائد نہیں ہوتا"۔۲ے

اس وقت سید محمود ایک نہایت شاندار آفس سکریٹری کے واسطے ترتیب دینے میں مصروف تھے۔ وہ جس کروفر سے اس کام کو انجام دے رہے تھے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اس کام کے لیے ایک بڑی رقم یعنی تقریباً دو ہزار روپے (جو آج کے تقریباً تین لاکھ روپیہ کے مساوی ہوتے ہیں) اپنی جیب سے اس کام کے لیے دیئے تھے۔ عمارت میں ضرورت کے مطابق ردو بدل کرنے کے بعد مرمت کے ساتھ نہایت عمدہ رنگ وروغن کروایا گیا تھا۔ ہر کمرے کے لیے عمدہ فرش، قالین، پردے اور فرنیچر مہیا کروایا

گیا تھا۔ ایک انگریز مسٹر گارڈنر کو اکاؤنٹینٹ جنرل کے آفس سے ۱۵۰ روپے ماہوار تنخواہ پر اس دفتر کو ترتیب دینے کے لیے بلایا گیا تھا غرض یوں سمجھ لیجیے کہ سکریٹری کے نام پر وہ (اس زمانے کے معیار سے) اپنے لیے ایک ''فائیو اسٹار'' قسم کا آفس منظّم کرنے میں مصروف تھے۔ حالاں کہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ سرسید کی عمر اور ضعف کو دیکھتے ہوئے اس وقت اگر ان کا آفس کہیں اور بھی واقع ہوتا تو ان کی سہولت کی خاطر ان کے بنگلے پر منتقل کر دیا جاتا۔ ٹرسٹیوں کے اجلاس ان کی آسانی کے لیے ان کی رہائش گاہ ہی پر منعقد کیے جاتے۔ لیکن اس کے برخلاف ان کے انتقال سے صرف دو ڈھائی مہینے پہلے ان کا آفس ان کا عملہ، ان کی کتابیں، ان کے گھر سے ڈیڑھ میل دور انسٹی ٹیوٹ کی عمارت میں منتقل کر دی گئی تھیں۔ جہاں سکریٹری کے لیے ایک عالیشان آفس ترتیب دیا جارہا تھا جس میں آسائش اور ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ ''بجز ایک سکریٹری کے'' جو اس آفس سے ڈیڑھ میل دور اپنے بنگلے میں اپنے پوتے کی ''ناز برداریوں'' سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ یہ وہ شخص تھا جو زندگی میں کبھی مایوس نہیں ہوا تھا اور شاید آج بھی مایوس نہیں تھا۔ وہ اپنے پوتے کی ناز برداریوں میں کچھ اس طرح مصروف تھا جیسے آنے والی نئی نسل کی دیکھ ریکھ اور پرورش کر رہا ہو۔

سرسید کا گھر سے نکلنا:

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ کالج سے متعلق متعدد ایسے معاملات تھے جن کے کرنے کے لیے سید محمود سرسید کو مجبور کرتے رہتے تھے اور سرسید جب ان کی حسب مرضی فیصلے کرنے سے انکار کرتے تھے تو سید محمود کی ناگواری کے شکار ہوتے تھے۔ آخر کار انہیں اپنے مکان میں سید محمود کے ساتھ رہنے میں اس قدر ناگواری پیش آنے لگی تھی کہ ایک دن انھوں نے میر ولایت حسین صاحب کو بلا کر کالج کے بورڈنگ ہاؤس کے ایک چھوٹے سے بنگلے میں منتقل ہونے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میر ولایت حسین اس سلسلے میں تحریر کرتے ہیں کہ:

> ''آخیر کو سید صاحب کو اپنی کوٹھی میں رہنے میں اتنی ناگواری پیش آئی کہ انھوں نے مجھ کو بلا کر فرمایا کہ ''میرے واسطے بورڈنگ ہاؤس میں ایک چھوٹا بنگلہ خالی کرادو''۔ میں نے کہا بہت اچھا، جس بنگلے میں مولانا حالی آکر مقیم ہوئے تھے، وہ بنگلہ خالی ہے اس کو صاف کرادوں گا، آپ اس میں تشریف لے آئیے۔ سید صاحب ۱۸۹۸ء

میں اس بنگلے میں اپنی کوٹھی چھوڑ کر تشریف لے آئے''۔۳ے

یہ واقعہ ہمارے مفروضہ کے مطابق غالباً فروری ۱۸۹۸ء کے اوائل کا ہے۔ سرسید اس وقت جس بنگلے میں منتقل ہوئے تھے وہ بنگلہ موجودہ یونین ہال کے مشرقی لان پر واقع تھا (اب یہ منہدم ہو چکا ہے) سرسید کے اس بنگلے میں منتقل ہونے کی تصدیق شیخ عبداللہ صاحب کے مندرجہ ذیل بیان سے بھی ہوتی ہے جو اس زمانے میں یونین ہال کے قریب ہی واقع بورڈنگ ہاؤس کے ایک دوسرے بنگلے میں رہتے تھے (اس وقت موجودہ یونین ہال کے قریب بورڈروں کے رہنے کے لیے چار بنگلے موجود تھے) شیخ عبداللہ صاحب تحریر کرتے ہیں کہ:

''ایک روز جب کام ختم ہونے کے بعد میں اپنے مکان پر آیا تو ملازم سے معلوم ہوا کہ سرسید اپنا کچھ سامان لے کر اس بنگلیا میں آگئے ہیں جو یونین ہال کے قریب واقع تھی۔ میں نے باہر نکل کر دیکھا کہ سرسید بنگلیا کے برآمدے میں تشریف رکھتے ہیں اور سید راس مسعود سامنے کے میدان میں کھیل رہے ہیں۔ میں چائے پینے کے بعد سرسید کی خدمت میں حاضر ہوا اور سرسید کی کرسیاں و سامان دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی اور حیرت کی وجہ یہ بھی تھی کہ ناصر خاں جو عمارات کا کام کیا کرتے تھے وہ بنگلیا کے چاروں طرف صفائی کرا رہے تھے اور سرسید کا کچھ سامان مزدور سر پر اٹھائے لا رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ آج سرسید سے سید محمود سے کوئی ایسا جھگڑا پیش آیا ہے جو سرسید کی برداشت سے باہر ہوگا۔ اسی وجہ سے وہ اپنی مسکونہ کوٹھی چھوڑ کر یہاں آگئے ہیں۔۴ے

غرض چند روز سید صاحب کالج کے اس بنگلے میں رہے تھے کہ شیخ عبداللہ صاحب کے مطابق، سید محمد احمد خاں، نواب اسماعیل خاں صاحب، مرزا عابد علی بیگ صاحب وغیرہ کی مصالحتی کوششوں کی وجہ سے وہ اپنی کوٹھی میں واپس جانے کے لیے رضامند ہو گئے تھے۔ میر ولایت حسین کے لکھنے کے مطابق محمود بیگم صاحبہ ایک روز آئیں اور سید صاحب کو یہ کہہ کر کہ ''کوٹھی میری ملکیت ہے سید محمود کی نہیں'' سید صاحب کو کوٹھی پر واپس لے گئیں۔ غرض تین چار روز اس بنگلے میں رہنے کے بعد سرسید واپس ''سرسید ہاؤس'' میں چلے گئے تھے۔

سرسید کا دوسری بار گھر سے منتقل ہونا:

لیکن اب حالات اس قدر خراب ہو چکے تھے کہ سرسید کا سید محمود کے ساتھ رہنا تقریباً ناممکن ہو گیا تھا۔ میر ولایت حسین لکھتے ہیں کہ چند روز بعد ہی سید صاحب نے دوبارہ بلا کر کہا کہ میں پھر بورڈنگ ہاؤس کے بنگلے میں آنا چاہتا ہوں۔ لیکن دوسرے دن وہ حاجی اسماعیل خاں صاحب کے اصرار پر ان کی چھوٹی کوٹھی موسومہ ''بی بی والی کوٹھی'' (جو اب ''دارالانس'' کے نام سے جانی جاتی ہے) میں اپنے پورے ساز و سامان کے ساتھ مستقل رہائش کے ارادے سے منتقل ہو گئے تھے۔ ہمارے اس مفروضہ کی بنیاد کہ سید صاحب اس مرتبہ مستقل رہائش اختیار کرنے کے ارادے سے اپنے تمام ساز و سامان، فرنیچر و ذاتی نوکروں کے ساتھ اس نئے مکان میں منتقل ہوئے تھے میر ولایت حسین صاحب کی مندرجہ ذیل تحریر پر مبنی ہے جس میں سید صاحب کے انتقال کے بعد کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

> ''پس ماندہ لوگوں میں اس بات پر بحث ہے کہ کاغذات اور الماریوں کی کنجیاں کس کے پاس رہیں۔ حاجی اسماعیل صاحب کہتے تھے کہ یہ قوم کی ملکیت ہے یہ ہمارے پاس رہیں اور سید محمد احمد کہتے تھے کہ ہمارے پاس رہنی چاہئیں۔ آخر یہ تصفیہ ہوا کہ بیک صاحب کے سپرد کر دی جائیں۔ بیک صاحب اور پٹنگ صاحب وہاں موجود تھے اور چھوٹے صندوقچے اپنی گاڑی میں رکھوا رہے تھے اور الماریوں کو مقفل کر کے ان کی کنجیاں اپنی جیب میں رکھ لی تھیں''۔ ۵۷

میر ولایت حسین کا یہ بیان شاہد ہے کہ سید صاحب اپنی تمام الماریوں، صندوقچوں اور دوسرے ساز و سامان و نوکروں کے ساتھ اس مکان میں منتقل ہوئے تھے۔ در اصل اس زمانے میں کاغذات اور نقدی کو محفوظ رکھنے کے لیے صندوقچوں کا استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ صندوقچے لکڑی یا لوہے کے ہوتے تھے۔ سرسید کی تحویل میں کالج کے سلسلے کے متعدد اقرار نامے، مختار نامے، اوقاف اور مختلف رجسٹریوں کے کاغذات اور بیع نامے رہتے تھے نیز مختلف کاموں کو انجام دینے کے لیے نقد روپے بھی رہتے تھے۔ جہاں تک نقدی کا سوال ہے گو کہ پیپر کرنسی موجود تھی (پرومیسری نوٹوں کی صورت میں) لیکن اس قدر عام نہیں

ہوئی تھی کہ روزمرہ کے لین دین میں استعمال کی جا سکے اس لیے روزانہ کے خرچ اور تنخواہوں وغیرہ کی تقسیم اور تعمیراتی سامان کی خرید وغیرہ کے لیے کافی روپے چاندی کے سکوں کی صورت میں وقتاً فوقتاً موجود رہتے تھے جن کو تھیلیوں میں رکھ کر صندوقچوں میں مقفل کیا جاتا تھا اور یہ صندوقچے الماریوں میں مقفل رہتے تھے۔

سرسید کا نیا گھر:

سرسید اسماعیل خاں صاحب کی پرانی کوٹھی موسومہ ''بی بی والی کوٹھی'' (موسومہ حال 'دارالانس') میں منتقل ہوئے تھے۔ یہ کوٹھی محمد جان خاں صاحب، رئیس دادوں کی کوٹھی موسومہ ''بیت الاکرم'' (جو آج کل ''پان والی کوٹھی'' کے نام سے مشہور ہے) کے مغرب میں واقع میدان کے وسط میں ایک اونچی کرسی پر بنی ہوئی تھی (اب اس کوٹھی کے آس پاس ایک بڑی اور گنجان بستی بس گئی ہے اور اسے پہچاننا تک مشکل ہو گیا ہے) اسماعیل خاں صاحب کے سون پال کے بنگلے کو خریدنے سے پہلے اس مکان میں ان کا زنان خانہ تھا۔ لیکن جب انھوں نے سون پال کا کشادہ احاطے کا بڑا بنگلہ (یعنی موجودہ ''نشاط کوٹھی'') خرید لیا تھا تو وہ اپنے کل خاندان کے افراد کے ساتھ اپنے اس نئے بنگلے میں منتقل ہو گئے تھے۔ اس طرح ''بی بی والی کوٹھی'' ایک طرح سے خالی ہو گئی تھی۔ ہمارا مفروضہ ہے کہ سرسید نے اس کوٹھی میں منتقل ہونا اس لیے منظور کیا ہوگا کیوں کہ اب وہ اپنی رہائش کے لیے علیحدہ ایک مستقل اور خود مختارانہ بندوبست کرنا چاہتے تھے۔ حالاں کہ وہ اسماعیل خاں صاحب کی بڑی کوٹھی (نشاط کوٹھی) کے ایک حصہ میں بھی منتقل ہو سکتے تھے۔ اور ہمیں یقین ہے کہ اسماعیل خاں صاحب نے اصل میں ان کو یہی پیش کش کی ہوگی بلکہ اس کے لیے اصرار بھی کیا ہوگا لیکن سرسید اب کسی پر اپنا بار نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔ اب وہ اپنی ایک علیحدہ خود مختارانہ رہائش کے خواہاں تھے۔ اسی لیے انھوں نے اسماعیل خاں صاحب کی خالی کوٹھی (یعنی بی بی والی کوٹھی) کو اپنی شرائط پر اپنی رہائش کے لیے پسند کیا ہوگا جس میں غالباً یہ شرط بھی شامل ہوگی کہ وہ اس کوٹھی کو کرایے پر رہائش کے لیے لیں گے اور اسماعیل خاں صاحب نے سرسید کی خوشی کی خاطر ان کی ہر شرط کو بخوشی منظور کر لیا ہوگا۔ اپنے اس نئے مکان میں منتقل ہونے کے بعد سرسید ایک بار پھر سے اپنے مختلف نوعیت کے کاموں کو شروع کرنے کے لیے مستعد نظر آنے لگے تھے۔ ان کے آفس کے عملہ کے لوگ (جن کا یا تو تعمیرات سے تعلق تھا یا

جو سر سید سے ذاتی تعلق مانتے تھے) جیسے منشی نجم الدین ،خواجہ وجیہ الدین، منشی ناظر خاں وغیرہ نیز ان کے قریبی دوست (جیسے سید زین العابدین، محمد اسماعیل خاں وغیرہ) ونو جوان معتقدین (یعنی صاحبزادہ آفتاب احمد خاں ، میر ولایت حسین، شیخ عبداللہ وغیرہ) نیز کالج کے اسٹاف کے یوروپین و ہندوستانی اساتذہ کے ساتھ کالج کے مختلف ٹرسٹیان اور سر سید کے عزیز واقارب وغیرہ کا اس نئے گھر میں آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ اس نئے مکان میں سر سید کے آس پاس پہلے دن سے رونق رہنے لگی تھی۔ ان کے ذاتی نوکر، چپراسی، خانساماں، بھشتی، خاک روب وغیرہ ان کے آس پاس مستعد نظر آنے لگے تھے۔ ان کا گھر ایک بار پھر ''بھرا پُرا'' نظر آنے لگا تھا۔ لیکن یہ رونق زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی تھی ۔ نئے مکان میں منتقل ہوئے ابھی دس پندرہ روز ہی گزرے تھے کہ سر سید کی طبیعت خراب ہونے لگی تھی۔

سرسید کا انتقال:

اس مرتبہ ایک نئی تکلیف شروع ہوئی تھی۔ یہ بھی ایک طرح سے بڑھاپے ہی کی دین تھی۔ عمر کے بڑھنے کے ساتھ عموماً ''پروسٹیٹ گلینڈ'' بھی بڑھ جاتا ہے۔ غالباً اسی کی وجہ سے پیشاب رُک جانے کی شکایت شروع ہو گئی تھی، کچھ ہی دنوں میں یہ تکلیف اس قدر بڑھ گئی کہ ڈاکٹروں کو سلائی سے پیشاب نکالنا پڑتا تھا۔ غالباً اس عمل کے بار بار دھرانے سے پیشاب کی نالی میں زخم ہو گئے تھے جس کی وجہ سے پیشاب کے ساتھ خون بھی آنے لگا تھا۔ دو ایک دن کے اندر ہی ان زخموں میں غالباً ''سیپٹک'' ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے جاڑا لگ کر تیز بخار چڑھنے لگا تھا۔ سر سید علی گڑھ کے انگریز سیول سرجن ڈاکٹر پیسانی کے زیر علاج تھے جو دوسرے انگریز ڈاکٹروں کو بھی صلاح مشورے کے لیے بلاتے رہتے تھے۔ ڈاکٹر پیسانی بہت توجہ سے علاج کر رہے تھے۔ اکثر آدھی آدھی رات کو بھی ضرورت پڑنے پر فوراً آتے تھے۔ ۲۶ر مارچ ۱۸۹۸ء یعنی سنیچر کی رات سے طبیعت زیادہ خراب ہونا شروع ہو گئی تھی جاڑا لگ کر تیز بخار ہو گیا تھا۔ دوسرے روز دوپہر تک غشی طاری ہو گئی تھی اور اسی عالم میں رات ۹ بجے کے قریب انھوں نے داعئ اجل کو لبیک کہا اور اس طرح علی گڑھ کا ''نائٹ'' اور عالی ظرف ''اولڈ مین'' اس دنیا سے چلا گیا۔

علی گڑھ شہر میں سر سید کے انتقال کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ صبح ہونے تک باہر سے لوگ علی گڑھ پہنچنے لگے تھے۔ سید ذکاء اللہ اور ڈپٹی نذیر احمد صبح سویرے

سرسید کا مقبرہ
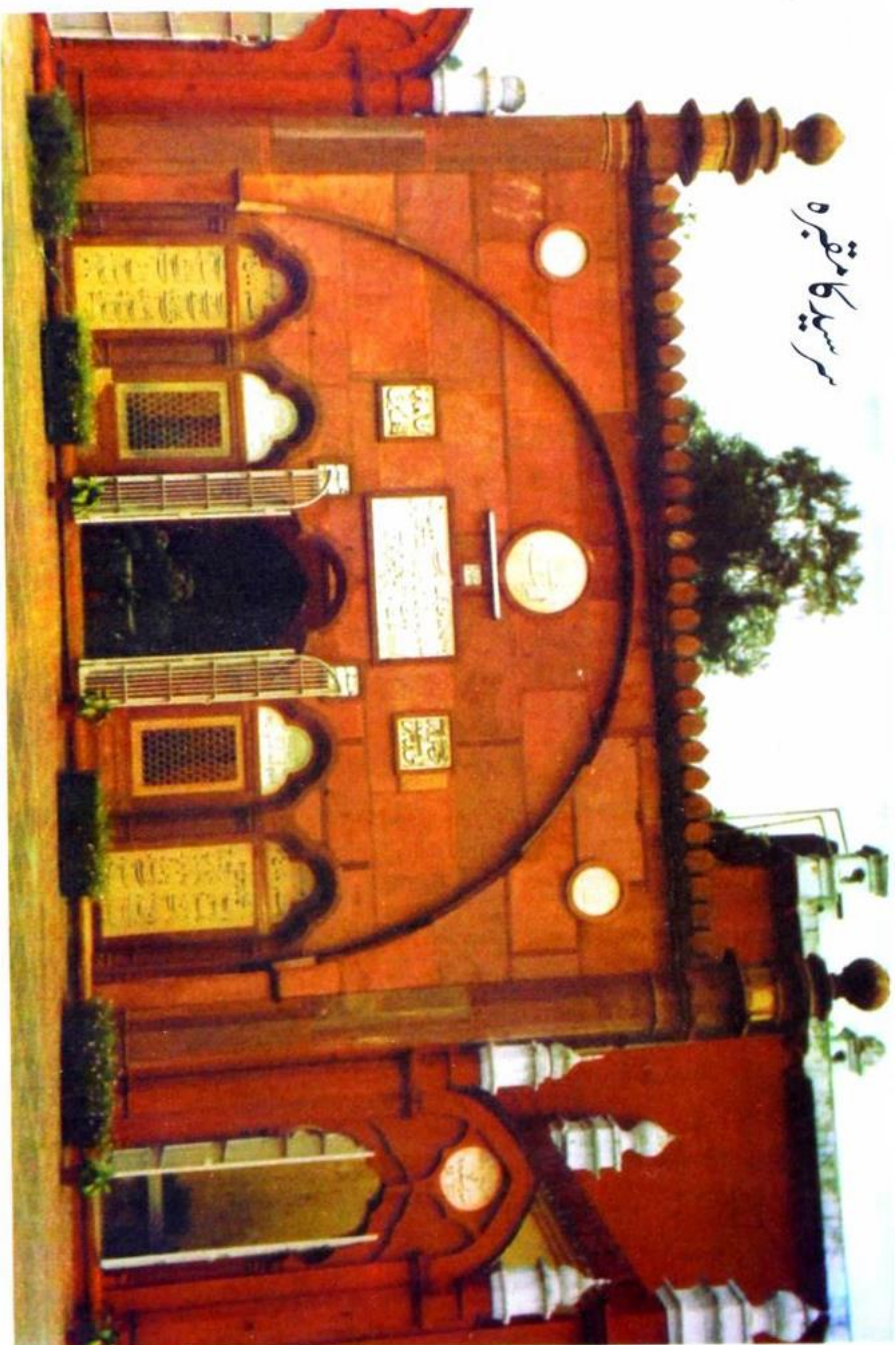
ہی علی گڑھ پہنچ گئے تھے۔ سرسید کے عزیز و اقارب میں سید محمد احمد خاں صاحب اور خواجہ وجیہ الدین تو علی گڑھ ہی میں موجود تھے لیکن ان کے علاوہ سید محمد علی، سید احمد علی، حکیم محمد احمد، اکرام اللہ خاں صاحب وشرف الدین خاں صاحب اور ان کے صاحبزادگان (یعنی خواجہ فخر الدین خاں صاحب اور خواجہ مصلح الدین خاں صاحب) وغیرہ سب علی گڑھ پہنچ گئے تھے۔ مسٹر تھیوڈور بیک نے رات ہی میں میر ولایت حسین کو اپنے ساتھ لے جا کر وکٹوریہ گیٹ کے سامنے واقع پارک میں سرسید کی تدفین کے لیے جگہ کا انتخاب کیا تھا اور ضروری انتظامات کرنے کی ہدایات دی تھیں۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ رات ہی میں سید محمود نے اپنے عزیزوں کے مشورے سے سرسید کو یونیورسٹی کی مسجد کے صحن کے شمال میں واقع قطعہ آراضی میں دفن کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور رات ہی کو قبر کھدوانے کے احکامات جاری کر دیئے تھے۔ صبح مسٹر بیک نے ضلع کے تمام حکام کے مشورے سے مطلع کیا کہ چوں کہ اسٹیشن کے کل انگریز افسران تدفین میں باضابطہ شریک ہونا چاہتے ہیں اس لیے جنازہ اٹھنے کا ٹائم سہ پہر ۴ بجے مقرر کر دیا گیا ہے۔ سرسید کے مخالفین بھی اپنے اپنے اختلافات بھلا کر اس موقع پر موجود تھے۔ بلکہ مختلف نوعیت کے انتظامات میں پیش پیش نظر آرہے تھے۔ سمیع اللہ خاں صاحب پورے وقت موجود رہے تھے (حالاں کہ اس وقت بھی انہیں سخت اعتراض اس بات پر تھا کہ مسٹر بیک جنازہ اٹھنے کے وقت کا تعین کرنے والے کون ہوتے ہیں۔ جنازہ اٹھنے کے وقت کا تعین سرسید کے عزیزوں کو کرنا چاہیے۔ بہرحال یہ اعتراض ان کے چند ساتھیوں تک ہی محدود رہا تھا)[۷۶] شیخ عبداللہ صاحب کے مطابق تقریباً گیارہ بجے میت کو غسل دیا گیا۔ میت کو غسل جناب خواجہ محمد یوسف صاحب نے دیا تھا[۷۷] چار بجے کے قریب جنازہ اٹھایا گیا۔ کالج کے طلبا و اساتذہ اور شہر کے ہندوؤں و مسلمانوں کا ایک جم غفیر اپنے اس عالی حوصلہ اور قابل احترام بزرگ کو الوداع کہنے کے لیے جنازہ کے ساتھ روانہ ہوا۔ لوگ جوق در جوق راستہ میں آکر اس ہجوم میں شامل ہوتے گئے۔ سید محمود بھی راستہ ہی میں اس جم غفیر میں شامل ہو گئے تھے۔ ضلع کے کل انگریز افسران اس جلوس میں شامل تھے۔ پولیس کا گارڈ جلوس کی پیشوائی کر رہا تھا۔ کرکٹ میدان میں نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔ مولوی عبداللہ انصاری صاحب نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ پرنسپل مسٹر بیک اور مسٹر ماریسن بھی نمازِ جنازہ کی صفوں میں ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ نمازِ جنازہ کے بعد یونیورسٹی کی مسجد کے صحن کے شمالی قطعہ میں تدفین کی گئی۔ پولیس کے گارڈ نے سلامی کے بطور گارڈ آف آنر، دیا۔

لفٹنٹ گورنر کی ہدایت کے مطابق علی گڑھ کے مجسٹریٹ مسٹر ای اے مولو نے کے ساتھ ضلع کے تمام انگریز افسران اور ان کی بیگمات نے تدفین کے بعد قبر پر گل ہائے عقیدت پیش کیے اور اس طرح سر سید کی زندگی کا آخری سفر مکمل ہوا۔

سر سید اور چندے کا کفن:

یہ بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ سر سید کی تکفین ان کے احباب کے چندے سے ہوئی تھی۔ وہ لوگ جو کسی عظیم انسان کی پہچان اس کی فقیرانہ شان میں تلاش کرنے کے متمنی رہتے ہیں اس طرح کی باتوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کر کے اپنے طور پر سر سید کی عظمت کو خراجِ تحسین پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن جہاں تک اصلیت کا تعلق ہے یہ بات صرف دو لوگوں (یعنی میر ولایت حسین اور شیخ عبداللہ صاحب) نے صرف نوکروں کے حوالے سے لکھی ہے اور ان دونوں حضرات کی اس اطلاع کے ''مخفی مخزن'' سید مہدی علی خاں صاحب (محسن الملک) ہی تھے۔

میر ولایت حسین نے سید مہدی علی خاں صاحب (محسن الملک) کے حوالے سے لکھا ہے کہ انھوں نے میر صاحب کو بتلایا تھا کہ ان کے پاس سر سید کا نوکر ''اعظیم'' آیا تھا جسے انھوں نے تکفین کا انتظام کرنے کے لیے پچاس روپے دیئے ہیں۔[۸] شیخ عبداللہ صاحب نے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کے ملازم ''ولی محمد'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس نے انہیں بتلایا کہ وہ تکفین کے لیے محسن الملک سے پچاس روپے مانگ کر لایا ہے۔[۹] (غرض یہیں پر ان دونوں ماخذ میں نمایاں اختلاف ہے) ہوسکتا ہے کہ جب سر سید کا نوکر اعظیم سر سید کے انتقال کی خبر دینے محسن الملک کے پاس گیا ہو تو انھوں نے تکفین اور تدفین وغیرہ کے سلسلے میں استفسار کیا ہو اور جب نوکر نے اپنی لاعلمی کے ساتھ اپنے پاس کوئی پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے اس سلسلے میں اپنی بے بسی کا اظہار کیا ہو تو از راہِ اخلاص مندی محسن الملک نے یہ کہہ کر اسے پچاس روپے دیئے ہوں کہ احتیاطاً وہ یہ روپے رکھ لے تا کہ وقتِ ضرورت تکفین وغیرہ کے سلسلے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ اگر واقعی ایسا ہی ہوا تھا تو ہم یہی کہیں گے کہ یہ محسن الملک کا ایک نہایت ہی مخلصانہ اور شریفانہ عمل تھا۔ ہمیں یقین ہے کہ ایسا ہی ہوا ہوگا اور اگر ایسا ہی ہوا تھا تو اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ سر سید کی تکفین احباب کے چندے سے ہوئی تھی ایک مہمل سی بات نظر آتی ہے۔ کیوں کہ اس زمانے میں (بلکہ آج

بھی) شریف لوگوں میں، بالفرضِ محال، اگر اس طرح کی رواداری کی کوئی بات ہو بھی جاتی تھی تو کوشش یہی کی جاتی تھی کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ نہ کہ تکفین کے انتظام کی کفالت قبول کرنے والا (کوئی دوست یا عزیز) خود ہی اس بات کو الم نشرہ کرے۔ شیخ عبداللہ سرسید کی تدفین کے بعد کے بیان میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''قبر میں دفن کرنے اور مٹی دینے کے بعد محسن الملک مرحوم (مسجد کے) صحن کے نیچے میدان میں ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور سرسید کے ورثا کو (ان کی غیر موجودگی میں) خوب کھری کھری سنائیں کہ جس شخص کی بدولت ان لوگوں کو دنیا میں عزت وثروت حاصل ہوئی ان میں سے کسی کی جیب سے پچاس روپے بھی نہ نکلے جس سے ان کی تجہیز اور تکفین ہوتی۔ میں سرسید کا دوست ضرور تھا لیکن وارث نہیں تھا۔ یہ وارثوں کا فرض تھا کہ وہ روپیہ صرف کرتے لیکن انھوں نے نہیں کیا''۔ ۸۰؎

محسن الملک کا یہ رویہ اس وقت کے عام اخلاقی اور شریفانہ روایات کے قطعی منافی تھا۔ اس طرح (وہ بھی تکفین کے فوراً بعد) عام لوگوں کے مجمع میں اس طرح کی بات کرنا کسی طرح سے بھی محسن الملک جیسے بزرگ کے شایانِ شان نہیں تھا۔ اگر شیخ عبداللہ صاحب کا مندرجہ بالا بیان صحیح ہے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک طرح سے سرسید کے اعزا کو بدنام کرنے کی ایک غیر مہذب کوشش تھی۔ بہر حال حقیقت جو بھی ہو، ہمیں محسن الملک جیسے بزرگ کا یہ رویہ کافی عجیب سا معلوم ہوا خاص طور پر اس لیے کہ پچھلے کئی سالوں سے وہ سرسید سے کافی دور ہو گئے تھے۔ اسی زمرے میں ہم یہاں قارئین کو مطلع کرنا چاہیں گے کہ مسٹر بیک کے خط مورخہ ۶/اپریل ۱۸۹۸ء سے اطلاع ملتی ہے کہ سرسید جس ڈاکٹر کے زیرِ علاج تھے اس کو سید محمود نے ۱۵۰ روپے کی بڑی رقم بطور فیس ازخود ارسال کی تھی۔ اس سلسلے میں مسٹر بیک تحریر کرتے ہیں کہ:

''میں نے ڈاکٹر پیسانی کو مطلع کر دیا تھا کہ آپ کے والد کے علاج کے سلسلے میں بطور فیس ان کو ۱۰۰ روپے ادا کیے جائیں گے لیکن اگر آپ اس رقم کو بڑھا کر ۱۵۰ روپے کرنا چاہتے ہیں تو یہ ایک طرح سے آپ کی جائز فیاضی قرار دی جائے گی کیوں کہ انھوں نے (یعنی

ڈاکٹر نے) نہایت مستعدی سے اپنے فرائض انجام دیئے تھے اور تقریباً دس مرتبہ ان کو (سرسید کو) دیکھنے کے لیے آئے تھے۔ اکثر آدھی رات میں انہیں آنا پڑا تھا اور ہر مرتبہ جراحی کے آلات کا استعمال بھی کرنا پڑا تھا''۔[۸۱]

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر کی فیس ہی کے بطور سید محمود نے ایک سو پچاس روپے کی بڑی رقم ادا کی تھی (جو آج کے تقریباً پندرہ ہزار روپے سے بھی زیادہ تصور کی جا سکتی ہے) ایسی حالت میں کوئی کیسے یہ یقین کر سکتا ہے کہ سرسید کے قریبی عزیزوں کی موجودگی میں (جو سب ماشاء اللہ صاحبِ حیثیت لوگ تھے اور سرسید سے محبت کے ساتھ بے پناہ عقیدت بھی رکھتے تھے جیسے سید محمد علی، خان بہادر سید محمد احمد خاں، حکیم محمد احمد، ڈپٹی کلکٹر سید احمد علی، خواجہ شرف الدین، خواجہ وجیہ الدین وغیرہ) سرسید کی تکفین سید مہدی علی خاں صاحب کے ذریعہ ایک نوکر کو دیئے گئے پچاس روپے کے ''چندے'' سے ہوئی ہوگی۔ بقول شخصِ: ''خدا کو دیکھا نہیں ہے لیکن اس کی قدرت سے اسے پہچانا ہے''۔

سرسید کے انتقال کے بعد ان کے خاندان اور خاص طور پر سید محمود کے مختصر حالات آئندہ باب بعنوان ''درونِ خانہ: پس سرسید'' کے تحت بیان کیے گئے ہیں۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ آپ بیتی، مصنفہ: میر ولایت حسین، مرتب: سید محمد ٹونکی (۱۹۷۰ء)، علی گڑھ، صفحہ: ۳۱

۲۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۴۳

۳۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۸۵

۴۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۶۳

۵۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۶۴

۶۔ خیالات در بارہ مسودہ قانون ٹرسٹیان، مصنفہ: خواجہ الطاف حسین حالی، سرمور گزٹ، مورخہ ۲۹ر نومبر بابت ۸ر اگست ۱۸۸۹ء، بحوالہ: سرسید تحریک کا ردِ عمل مصنفہ: ڈاکٹر صدیقہ ارمان (۱۹۹۹ء) سرسید یونیورسٹی، کراچی، صفحہ: ۱۱۲۔۱۱۱

۷۔ سرسید مرحوم کے خط کا عکس مورخہ ۱۴ر جنوری ۱۸۸۱ء، خطوطِ سرسید، مرتبہ راس مسعود ((۱۹۳۱ء) نظامی پریس، بدایوں

۸۔ سید محمود کا خط بنام مسٹر تھیوڈور بیک مورخہ ۱۵ر ستمبر ۱۸۹۸ء، دی تھیوڈور بیک پیپرز، مرتب: خلیق احمد نظامی، سرسید، اکیڈمی، علی گڑھ، صفحہ: ۱۷۱

۹۔ سرسید کا خط بنام عنایت اللہ مورخہ ۱۷ر مئی ۱۸۹۰ء، مکتوبات سرسید، مرتبہ: اسماعیل پانی پتی، صفحہ: ۲۱۰

۱۰۔ سرسید کا خط بنام راجہ جیکشن داس، مورخہ ۱۷ر مئی ۱۸۹۰ء، خطوطِ سرسید، مرتبہ: راس مسعود (۱۹۲۲ء)، صفحہ: ۱۳۴

۱۱۔ سرسید کا خط بنام عنایت اللہ مورخہ ۱۹ر مئی ۱۸۹۰ء، مکتوبات سرسید، مرتبہ: اسماعیل پانی پتی، صفحہ: ۱۳۴

۱۲۔ سرسید کا خط بنام عنایت اللہ مورخہ ۸ر مارچ ۱۸۹۳ء، مکتوبات سرسید، مرتبہ: اسماعیل پانی پتی، صفحہ: ۵۱۲

۱۳۔ سرسید کا خط بنام عنایت اللہ مورخہ ۱۱ر مارچ ۱۸۹۳ء، خطوطِ سرسید، مرتبہ: راس مسعود، (۱۹۲۲ء)، صفحہ: ۱۹۲

۱۴۔ سرسید کا خط بنام عنایت اللہ مورخہ ۲۲ر مارچ ۱۸۹۳ء، خطوطِ سرسید، مرتبہ: راس مسعود، (۱۹۲۲ء)، صفحہ: ۱۹۳

۱۵۔ سرسید کا خط بنام عنایت اللہ مورخہ ۱۸ر جولائی ۱۸۹۶ء، مکتوبات سرسید، مرتبہ: اسماعیل پانی پتی، صفحہ: ۱۰۹

۱۶۔ سرسید کا خط بنام عنایت اللہ مورخہ ۱۵ر فروری ۱۸۹۸ء، مکتوبات سرسید، مرتبہ: اسماعیل پانی پتی، صفحہ: ۵۵۵

۱۷۔ آپ بیتی، میر ولایت حسین، مرتب: سید محمد ٹونکی (۱۹۷۰ء)، علی گڑھ۔ صفحہ: ۱۱۷

۱۸۔ تھیوور بیک پیپرز، مرتبہ: خلیق احمد نظامی سرسید اکیڈمی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ صفحہ: ۱۷۳

۱۹۔ سرسید کا خط بنام سید زین العابدین، مورخہ ۷ر مئی ۱۸۸۹ء، مکتوبات سرسید، اسماعیل پانی پتی، صفحہ: ۴۹۷

۲۰۔ سرسید کا خط بنام سید زین العابدین، مورخہ ۸ر مئی ۱۸۸۹ء، مکتوبات سرسید، اسماعیل پانی پتی، صفحہ: ۴۹۸

۲۱۔ سرسید کا خط بنام سید زین العابدین، مورخہ ۹ر مئی ۱۸۸۹ء، مکتوبات سرسید، اسماعیل پانی پتی، صفحہ: ۴۹۹

۲۲۔ سرسید کا خط بنام سید زین العابدین، مورخہ ۱۳رمئی ۱۸۸۹ء، مکتوبات سرسید، اسماعیل پانی پتی، صفحہ: ۵۰۰
۲۳۔ سرسید کا خط بنام سید زین العابدین، مورخہ ۲۸راکتوبر ۱۸۹۵ء، مکتوبات سرسید، اسماعیل پانی پتی، صفحہ: ۱۱۷
۲۴۔ سرسید کا خط بنام سید زین العابدین، مورخہ ۱۱رمارچ ۱۸۹۶ء، مکتوبات سرسید، اسماعیل پانی پتی، صفحہ: ۱۱۹
۲۵۔ رویداد اجلاس ٹرسٹیان منعقدہ ۱۵راپریل ۱۹۱۰ء، آرکایوز، سرسید اکیڈیمی، اے ایم یو، علی گڑھ
۲۶۔ سرسید کا خط بنام حکیم احمد الدین، مورخہ ۱۴رستمبر ۱۸۹۰ء، بحوالہ خطوطِ سرسید، مرتبہ: نسرین ممتاز بصیر، (۱۹۹۵ء) علی گڑھ، صفحہ: ۶۸
۲۷۔ سرسید کا خط بنام حکیم احمد الدین، مورخہ ۱۱رستمبر ۱۸۹۰ء، بحوالہ خطوطِ سرسید، مرتبہ: نسرین ممتاز بصیر، (۱۹۹۵ء) علی گڑھ، صفحہ: ۶۸
۲۸۔ رویداد اجلاس ٹرسٹیان منعقدہ ۲۸ردسمبر ۱۸۹۱ء، آرکایوز، سرسید اکیڈیمی، اے ایم یو، علی گڑھ
۲۹۔ خلاصہ رپورٹ، مرزا عابد علی بیگ، مارچ ۱۸۹۸ء (در مطبع ریاض ہند علی گڑھ طبع شدہ)، صفحہ: ۹
۳۰۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً
۳۱۔ سرسید کا خط بنام شیام بہاری لال، بحوالہ سرسید کرسپانڈنس، مرتبہ: عتیق احمد صدیقی، (۱۹۹۰ء)، سرسید اکیڈمی، علی گڑھ، صفحہ: ۱۵۵
۳۲۔ سرسید کا خط بنام شیام بہاری لال، بحوالہ سرسید کرسپانڈنس، مرتبہ: عتیق احمد صدیقی، (۱۹۹۰ء)، سرسید اکیڈمی، علی گڑھ، صفحہ: ۱۵۵۔۱۵۷
۳۳۔ سر جان ایج کا خط مورخہ ۷رجولائی ۱۸۹۳ء، بحوالہ: سید محمود کا استعفیٰ مورخہ ۸رستمبر ۱۸۹۳ء، آرکایوز، سرسید اکیڈیمی، اے ایم یو، علی گڑھ۔ صفحہ: ۲
۳۴۔ سید محمود کا خط بنام چیف سکریٹری مورخہ ۸رستمبر (ہاتھ کے لکھے ۱۰۵ صفحات پر مشتمل) آرکایوز، سرسید اکیڈیمی، اے ایم یو، علی گڑھ، یہ خط علی گڑھ لا جرنل (جلد ۲) محمود نمبر فیکلٹی آف لا، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں سید خالد رشید نے ترتیب دے کر شائع کیا ہے۔ صفحات ۳۰۰۔۲۶۶
۳۵۔ سرسید کا خط بنام ذکاءاللہ، مورخہ ۲۶رستمبر ۱۸۹۳ء، مکتوبات سرسید، مرتبہ: اسماعیل پانی پتی، صفحہ: ۵۹۱
۳۶۔ سرسید کا خط بنام ذکاءاللہ، مورخہ ۲۶رستمبر ۱۸۹۳ء، مکتوبات سرسید، مرتبہ: اسماعیل پانی پتی، صفحہ: ۵۹۱
۳۷۔ سرسید کا خط بنام ذکاءاللہ، مورخہ ۲۶رستمبر ۱۸۹۳ء، مکتوبات سرسید، مرتبہ: اسماعیل پانی پتی، صفحہ: ۳۷۔۶۳۶
۳۸۔ سرسید کا خط بنام ایڈیٹر پایونیر مورخہ ۲۲رستمبر ۱۸۹۳ء، مکاتیب سرسید، مرتبہ: مشتاق حسین، صفحہ: ۳۷۰
۳۹۔ سرسید کا خط بنام ایڈیٹر پایونیر مورخہ ۲۲رستمبر ۱۸۹۳ء، مکاتیب سرسید، مرتبہ: مشتاق حسین، صفحہ: ۳۷۳
۴۰۔ حیاتِ محسن، مرتبہ: مولوی محمد امین، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، علی گڑھ، (۱۹۳۴ء)، صفحہ: ۷۰

۴۱۔ سرسید کا خط بنام کلکٹر (پریسیڈینٹ میونسپل بورڈ) مورخہ ۱۶؍اکتوبر ۱۸۹۱ء، آرکائیوز، سرسید اکیڈمی، علی گڑھ

۴۲۔ سرسید کا خط بنام کلکٹر (پریسیڈینٹ میونسپل بورڈ) مورخہ ۲۳؍جنوری ۱۸۹۲ء، آرکائیوز، سرسید اکیڈمی، علی گڑھ

۴۳۔ سرسید کا خط بنام صدر کول میونسپلٹی بورڈ، مورخہ ۳۰؍جون ۱۸۹۲ء، آرکائیوز، سرسید اکیڈمی، علی گڑھ

۴۴۔ شیخ عبداللہ کا خط بنام سجاد حیدر، مورخہ ۵؍جنوری ۱۹۲۵ء، آرکائیوز، سرسید اکیڈمی، علی گڑھ

۴۵۔ سرسید کا خط مورخہ ۴؍اپریل ۱۸۹۲ء، میں حوض والی کوٹھی اور اس کی ملکیت کا تذکرہ ہے۔ آرکائیوز، سرسید اکیڈمی، علی گڑھ

۴۶۔ سرسید کا خط مورخہ ۱۶؍اکتوبر ۱۸۹۱ء میں تار والے بنگلے کی نشان دہی کرتے ہوئے زین العابدین کی اس میں رہائش کا تذکرہ ہے۔ آرکائیوز، سرسید اکیڈمی، علی گڑھ

۴۷۔ سرسید کا خط بنام حکیم احمد الدین، مورخہ ۱۳؍اکتوبر ۱۸۹۳ء، خطوط سرسید، مرتبہ: نسرین ممتاز بصیر، (۱۹۹۵ء)، صفحہ: ۷۹

۴۸۔ سرسید کا خط بنام حکیم احمد الدین، مورخہ ۱۳؍اکتوبر ۱۸۹۳ء، خطوط سرسید، مرتبہ: نسرین ممتاز بصیر، (۱۹۹۵ء)، صفحہ: ۸۱

۴۹۔ حیاتِ جاوید، مصنفہ: مولانا الطاف حسین حالی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی (۱۹۹۰ء)، صفحہ: ۳۳۷

۵۰۔ سرسید کا خط بنام حکیم احمد الدین، مورخہ ۲۸؍جنوری ۱۸۹۴ء، خطوط سرسید، مرتبہ: نسرین ممتاز بصیر، (۱۹۹۵ء)، صفحہ: ۸۲

۵۱۔ سید حامد کا انتقال پر ملال، تعزیتی تحریر۔ ذکاء اللہ، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، مورخہ ۲؍فروری ۱۸۹۴ء، صفحہ: ۱۲۹

۵۲۔ سرسید کا خط بنام حکیم احمد الدین، مورخہ ۸؍مارچ ۱۸۹۵ء، خطوط سرسید، مرتبہ: نسرین ممتاز بصیر، (۱۹۹۵ء)، صفحہ: ۸۲

۵۳۔ سرسید کا خط بنام حکیم احمد الدین، مورخہ ۳؍اگست ۱۸۹۴ء، خطوط سرسید، مرتبہ: نسرین ممتاز بصیر، (۱۹۹۵ء)، صفحہ: ۸۳

۵۴۔ ایضاً ایضاً مورخہ ۱۰؍اپریل ۱۸۹۵ء ایضاً ایضاً صفحہ: ۹۲

۵۵۔ ایضاً ایضاً مورخہ ۱۳؍ستمبر ۱۸۹۴ء ایضاً ایضاً صفحہ: ۸۴

۵۶۔ ایضاً ایضاً مورخہ ۱۶؍نومبر ۱۸۹۴ء ایضاً ایضاً صفحہ: ۸۹

۵۷۔ حیاتِ جاوید، مصنفہ: مولانا الطاف حسین حالی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی (۱۹۹۰ء)، صفحہ: ۲۰۷

۵۸۔ سرسید کا خط بنام نیاز محمد، مورخہ یکم مارچ ۱۸۹۴ء، خطوط سرسید، مرتبہ: سید راس مسعود، (۱۹۲۲ء)، صفحہ: ۲۲۱

۵۹۔ ایضاً ایضاً ۲۲؍اپریل ۱۸۹۴ء ایضاً ایضاً صفحہ: ۲۲۴

۶۰۔ سرسید کا خط بنام مسٹر ہیریسن مورخہ ۲/نومبر ۱۸۹۴ء، بحوالہ سرسید اور فن تعمیر، مصنفہ: افتخار عالم خاں سرسید اکیڈمی، (۲۰۰۱ء)، صفحہ: ۲۶۱

۶۱۔ خلاصہ رپورٹ، مرتبہ: مرزا عابد علی بیگ، مطبع ریاض ہند، علی گڑھ۔ (۱۹۰۳ء)

۶۲۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، مورخہ ۳/جنوری ۱۸۹۶ء، صفحہ: ۱۱

۶۳۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، مورخہ ۳/جنوری ۱۸۹۶ء، صفحہ: ۲۲

۶۴۔ سرسید کا خط بنام عنایت اللہ، مورخہ ۱۸/جولائی ۱۸۹۶ء، مکتوبات سرسید، اسماعیل پانی پتی، صفحہ: ۵۳۶

۶۵۔ سرسید کا خط بنام منشی نیاز محمد خاں مورخہ ۱۹/مئی ۱۸۹۶ء، خطوط سرسید، مرتبہ: راس مسعود، (۱۹۲۲ء)، صفحہ: ۲۳۸

۶۶۔ مشاہدات وتاثرات مصنفہ: ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ (طبع اول ۱۹۶۹ء) علی گڑھ، صفحہ: ۱۵۴

۶۷۔ مشاہدات وتاثرات مصنفہ: ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ (طبع اول ۱۹۶۹ء) علی گڑھ، صفحہ: ۱۵۳

۶۸۔ سید محمد احمد کا خط بنام سرسید، مورخہ یکم فروری ۱۸۹۶ء، بحوالہ سرسید اور فن تعمیر، مصنفہ: افتخار عالم خاں، (۲۰۰۱) سرسید اکیڈمی، علی گڑھ۔ صفحہ: ۲۷۰

۶۹۔ حیات محسن، مرتبہ: مولوی محمد امین زبیری مارہروی، مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ۔ (۱۹۳۴ء) صفحہ: ۷۰

۷۰۔ آپ بیتی، میر ولایت حسین، مرتبہ: سید محمد ٹونکی (مسلم ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ)۔ (۱۹۷۰ء) صفحہ: ۱۱۸

۷۱۔ روئیداد نمبر ۱۲۲، اجلاس ٹرسٹیان منعقدہ ۳۰/جنوری ۱۸۹۸ء لائبریری، سرسید اکیڈمی، علی گڑھ، صفحہ: ۱۲۔۱۱

۷۲۔ روئیداد نمبر ۱۲۲، اجلاس ٹرسٹیان، منعقدہ ۳۰/جنوری ۱۸۹۸ء، بحوالہ: سرسید اور فن تعمیر، مصنفہ: افتخار عالم خاں (۲۰۰۱ء) سرسید اکیڈمی، علی گڑھ، صفحہ: ۲۷۴

۷۳۔ آپ بیتی، میر ولایت حسین، مرتبہ: سید محمد ٹونکی، مسلم ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ۔ (۱۹۷۰ء) صفحہ: ۱۲۰

۷۴۔ مشاہدات وتاثرات، مصنفہ: شیخ محمد عبداللہ، (طبع اول ۱۹۶۹ء)، فیملی ایجوکیشن ایسوسی ایشن علی گڑھ، صفحہ: ۱۷

۷۵۔ آپ بیتی، میر ولایت حسین، مرتبہ: سید محمد ٹونکی، مسلم ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ۔ (۱۹۷۰ء) صفحہ: ۱۲۲

۷۶۔ مشاہدات وتاثرات، مصنفہ: شیخ محمد عبداللہ، (طبع اول ۱۹۶۹ء)، فیملی ایجوکیشن ایسوسی ایشن علی گڑھ، صفحہ: ۱۰۴

۷۷۔ مشاہدات وتاثرات، مصنفہ: شیخ محمد عبداللہ، (طبع اول ۱۹۶۹ء)، فیملی ایجوکیشن ایسوسی ایشن علی گڑھ، صفحہ: ۱۰۴

۷۸۔ آپ بیتی، میر ولایت حسین، مرتبہ: سید محمد ٹونکی، مسلم ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ۔ (۱۹۷۰ء) صفحہ: ۱۲۴

۷۹۔ مشاہدات وتاثرات، مصنفہ: شیخ محمد عبداللہ، (طبع اول ۱۹۶۹ء)، فیملی ایجوکیشن ایسوسی ایشن علی گڑھ، صفحہ: ۱۰۳

۸۰۔ مشاہدات وتاثرات، مصنفہ: شیخ محمد عبداللہ، (طبع اول ۱۹۶۹ء)، فیملی ایجوکیشن ایسوسی ایشن علی گڑھ، صفحہ: ۱۰۵

۸۱۔ تھیوڈور بیک پیپرز، مرتبہ خلیق احمد نظامی (۱۹۹۱ء) سرسید اکیڈمی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، صفحہ: ۲۵۔۱۲۴

☆☆☆

باب ششم

دورنِ خانہ: پس سر سید:
(۱۸۹۸ءتا۱۹۰۳ء)

۲۷/مارچ ۱۸۹۸ءکو سر سید کے انتقال کے فوراً بعد (قانون کی رو سے) سید محمود کالج کے ٹرسٹیوں کے سکریٹری مقرر ہو گئے تھے۔ سید محمود کالج کے ایڈمنسٹریشن کو قاعدے قانون کی مطابقت سے اس طور پر چلانا چاہتے تھے جیسے ایک عمدہ خودکار مشین اپنا کام کرتی ہے۔ ان کے اس طریقِ کار کی ایک عمدہ جھلک پہلے دن کے واقعہ ہی میں نظر آتی ہے۔ سید صاحب کے ''سوم'' کی رسم ادا کرنے کے لیے کالج کے طلبا اور اسٹاف نے سید محمود سے اجازت حاصل کرنے کے لیے ایک درخواست ان کی خدمت میں ارسال کی تھی۔ سید محمود نے اس سلسلے میں ''فتویٰ'' دریافت کرنے کے لیے یہ درخواست مولوی عبداللہ صاحب (ڈین) کے پاس بھیج دی تھی۔ مولوی عبداللہ صاحب نے تحریر کیا ''سوم کیا جائے'' پس سید محمود نے درخواست پر اپنی رضامندی انہیں الفاظ میں تحریر کردی کہ ''سوم کیا جائے''۔ سید محمود کا کام کرنے کا یہ مشینی انداز کالج کے عملہ کے لیے بالکل نیا تھا۔ اس لیے اس طریقۂ کار کے عادی ہونے میں ان کو خاصی دقت پیش آئی تھی اور خاصی چہ میگوئیاں بھی ہوئی تھیں۔ سید محمود کی ذاتی کمزوریوں (یعنی شراب نوشی وغیرہ کی لت) کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم یہ ضرور باور کرانا چاہیں گے کہ ایڈمنسٹریشن کو قاعدے قانون کی مطابقت سے چست درست کرنے میں انھوں نے نہایت عمدگی اور دیانت داری سے شروعات کی تھی۔ اس زمرے میں مندرجہ ذیل امور کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔

مسٹر بیک کو رجسٹرار مقرر کرنا:

سید محمود نے سکریٹری ہونے کے فوراً بعد اپنے خط مورخہ ۲۹/مارچ ۱۸۹۸ء[۱] کے ذریعہ مسٹر تھیوڈور بیک کو کالج کے پرنسپل کے عہدے کے ساتھ ساتھ ایک سال کے لیے کالج کا آنریری رجسٹرار (بغیر کسی معاوضہ کے) مقرر کر دیا تھا۔ نیز اپنے خط مورخہ

۱۶/اپریل ۱۸۹۸ء کے ذریعہ رجسٹرار کے فرائض واختیارات کی تفصیلی وضاحت کردی تھی تاکہ رجسٹرار اپنے فرائض منصبی کو بآسانی ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے منصبی اختیارات کے دائرے سے تجاوز بھی نہ کرسکے۔[۲] سید محمود نے اپنے خط مورخہ ۲۹/اپریل ۱۸۹۸ء کے ذریعہ وہ انگلش ریکارڈ جو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ کی عمارت میں واقع سکریٹری کے نئے آفس میں موجود تھا نگہداشت اور حفاظت کے احکام کے ساتھ رجسٹرار کی تحویل میں دے دیا تھا۔[۳]

ڈاک کے سلسلے میں احکامات:

علی گڑھ کے پوسٹ ماسٹر نے اپنے خط بنام سید محمود مورخہ ۲۹/مارچ ۱۸۹۸ء کے ذریعہ استفسار کیا تھا کہ:

> ''میں آپ سے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ مرحوم سر سید احمد خاں صاحب کے نام سے موصول ہونے والی ڈاک کس کے حوالے کی جائے برائے مہربانی اس اہم امر کے سلسلے میں جلد جواب ارسال فرمائیں''۔[۴]

مندرجہ بالا خط کے جواب میں سید محمود نے ایک تفصیلی خط علی گڑھ کے پوسٹ ماسٹر کو ارسال کیا تھا جس کے ساتھ کالج کے قاعدے قانون کی ایک کاپی بھی نتھی کی تھی۔ اس خط کا لب لباب یہی تھا کہ کالج کے قانون کے مطابق سر سید کے انتقال کے بعد وہ قانونی طور پر ٹرسٹیوں کے سکریٹری مقرر ہوئے ہیں اور انھوں نے اپنے اختیارات کی رو سے مسٹر بیک کو کالج کا آنریری رجسٹرار مقرر کیا ہے اور رجسٹرار کو اختیار دیا ہے کہ وہ سید صاحب کے نام آنے والے کل منی آرڈروں وانشورڈ خطوط (یعنی بیمہ) کو موصول کریں اور متعلقہ رجسٹروں میں ان کا اندراج کرکے مجوزہ طریقہ سے اس کا حساب رکھیں۔ اس کے علاوہ جو بھی خطوط یا دیگر اشیا ہوں وہ مجھے ذاتی طور پر وصول کروائی جائیں (کیوں کہ میں سکریٹری ہونے کے ساتھ ہی ان کا اکلوتا بیٹا ہوں اور اسی لیے ان کا وارث بھی ہوں) اس خط میں سید محمود نے یہ درخواست بھی کی تھی کہ پہلے کی طرح ڈاک چپراسیوں وغیرہ کے حوالے نہ کی جائے جو ڈاک لینے کے لیے عموماً بھیجے جاتے تھے۔ بلکہ ڈاک ذاتی طور پر انہیں ارسال کی جائے۔[۵]

سید محمود کی مخالفت:

کالج کے عملہ کے زیادہ تر لوگ سید محمود کے افسرانہ طرزِ عمل اور قاعدے قانون کی پابندی پر اصرار اور اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف سخت تادیبی کارروائی کیے جانے کے امکانات سے خاصے شاکی اور خائف نظر آنے لگے تھے۔ کالج کے ٹرسٹی بھی سید محمود سے خائف رہنے لگے تھے۔ وہ سید محمود سے کھل کر بات کرنا تو درکنار ان کے سامنے آنے سے بھی کتراتے تھے۔ اسی ڈر و خوف کا نتیجہ تھا کہ جب سید محمود کے سلسلے میں اس طرح کی افواہیں پھیلنا شروع ہوئیں کہ انھوں نے آخری عمر میں اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ غیر سعادت مندانہ اور ناخلفی کا رویہ اختیار کیا تھا تو لوگوں نے نہ صرف ان افواہوں پر یقین کیا بلکہ ان کو بڑھا چڑھا کر پیش بھی کیا۔ کوئی کہتا وہ سر سید کے سامنے عمداً شراب پیتے تھے۔ کوئی کہتا وہ میز پر گھونسا مار کر سر سید سے اپنی بات منوانے کے لیے اصرار کرتے تھے اور کوئی تو یہاں تک کہتا کہ ہم نے سنا ہے کہ انھوں نے ایک بار سر سید کو غصہ میں دھکا دے کر کرسی پر گرا دیا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ غرض جتنے منھ اتنی باتیں تھیں حالاں کہ کوئی بات بے بنیاد نہیں تھی لیکن ہر بات کا پتنگڑ ضرور بنایا گیا تھا۔ آخر میں اس الزام نے کہ سید محمود کی ناخلفی کی وجہ سے سر سید کی تکفین چندے کے پیسے سے عمل میں آئی تھی۔ آگ پر تیل کا کام کیا تھا اور ہر شخص کے دل میں سید محمود کے خلاف تنفر کا بیج بو دیا تھا۔ سید محمود اپنی قابلیت اور قانون دانی کے زعم اور کالج کے تنظیمی معاملات کو چست درست کرنے کے عمل میں اس قدر غلطاں اور پیچاں تھے کہ انہیں احساس ہی نہیں ہوا کہ ان کے خلاف کس طرح کالا وا اندر ہی اندر پک رہا ہے۔ یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ ان کی سادہ لوحی ہی تھی جس نے ان کے مخالفین کو یہ موقع فراہم کر دیا تھا کہ سر سید کے انتقال کے دس مہینوں کے اندر ہی انہیں کالج کے معاملات سے یکسر علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ مسٹر بیک کے رجسٹرار مقرر کیے جانے کے خلاف بھی شدید ردِ عمل ہوا تھا۔ سید محمود کے اس عمل کو کالج کو مکمل طور پر انگریزوں کے سپرد کر دینے کے مترادف ٹھہرایا گیا تھا۔ متعلقہ ٹرسٹیوں کے ایک گروہ نے اس کے خلاف باقاعدہ احتجاجی مہم شروع کر دی تھی۔

مسٹر بیک کا سر پرستانہ مشورہ:

دوسری طرف مسٹر بیک جو یورپین اسٹاف کی نمائندگی کر رہے تھے گو پوری طرح سید محمود کے ساتھ تھے لیکن ابتدا میں ان کا رویہ سید محمود کی طرف سے کچھ سر پرستانہ سا نظر

آتا ہے۔ حالاں کہ یہ صورت حال کچھ عرصہ بعد تبدیل ہوگئی تھی۔ مسٹر بیک اپنے خط بنام سید محمود مورخہ ۵/اپریل ۱۸۹۸ء میں ٹرسٹیوں کے تنازعے کے سلسلے میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''میں نہ صرف پرنسپل اور رجسٹرار، ایم اے او کالج کی حیثیت سے بلکہ آپ کے والد کے ایک رفیق اور مداح اور آپ کے ایک ذاتی دوست کی حیثیت سے مندرجہ ذیل باتیں تجویز کرنا چاہتا ہوں۔ میری تجویز ہے کہ آپ اور چند ٹرسٹیوں کے مابین جو تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا ہے اس کے سلسلے میں کالج کی بھلائی کے لیے ضروری ہے کہ:

(۱) اس تنازعہ کے حوالے سے آپ متعلقہ ٹرسٹیوں کو کم از کم تین مہینوں تک کوئی خط تحریر نہ کریں۔

(۲) نہ ہی گورنمنٹ کو اس تنازعہ کے سلسلے میں تین مہینوں تک کوئی مراسلہ ارسال کریں۔

(۳) آپ اس تنازعہ کے سلسلے میں کوئی تحریر علی گڑھ گزٹ یا کسی دوسرے اخبار میں شائع نہ کروائیں نہ ہی آپ کے زیر اثر ٹرسٹی کوئی تحریر شائع کروائیں۔

(۴) اس تنازعہ کے سلسلے میں تین مہینوں تک کسی طرح کا ایکشن نہ لینا اس لیے ضروری ہے کہ آئندہ جب ان تنازعات کے سلسلے میں اگر کوئی فیصلے لیے جائیں تو اس وقت ان کے بارے میں پہلے ظاہر کی گئی رائے یا وضاحت کسی طرح سے ان فیصلوں کے لینے میں مانع نہ ہو''۔[۶]

اسی روز تحریر کیے (یعنی ۵/اپریل ۱۸۹۸ء کو) ایک دوسرے خط میں مسٹر بیک نے سید محمود کو یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ ٹرسٹیوں کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے اگر ممکن ہو سکے تو قانون کی دفعہ ۱۴۰ میں تھوڑی تبدیلی کر دی جائے (اس دفعہ کے ذریعہ ناگزیر صورتِ حال میں سکریٹری کو ٹرسٹیوں کے برخاست کرنے کے اختیارات حاصل تھے) مسٹر بیک کا کہنا تھا کہ اس عمل سے ٹرسٹیوں میں اعتماد پیدا ہوگا اور خیال اغلب ہے کہ وہ بڑی حد تک مطمئن بھی ہو جائیں گے۔ دوسرے اس طرح سے آپ (یعنی سید محمود) کا ٹرسٹیوں کے نام پہلا مراسلہ یہ خوش کن پیغام لے کر پہنچے گا کہ آپ سکریٹری ہونے کے بعد خود اپنی مرضی سے

اپنے مخصوص اختیارات میں تخفیف کیے جانے کے خواہش مند ہیں۔ اس سے نہایت عمدہ تاثر پیدا ہوگا اور عام لوگ یہ یقین کرنے کے لیے مجبور ہو جائیں گے کہ آپ کالج کے معاملات کو ذاتیات کے بجائے صرف قاعدے قانون اور چند اصولوں پر چلانا چاہتے ہیں۔ [۷]

سید محمود کی مسٹر بیک کو تلقین:

بورڈ آف مینجمنٹ کی تشکیل سرسید کی زندگی ہی میں ہوئی تھی۔ سرسید کے انتقال کے چوتھے روز یعنی ۳۱/ مارچ ۱۸۹۸ء کو بورڈ آف مینجمنٹ کی ایک میٹنگ منعقد کی گئی تھی جس میں کالج کے بدلے ہوئے حالات اور خاص طور پر مالی مشکلات کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا تھا۔ اس میٹنگ میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کی تجویز (یعنی تجویز نمبر ۸) کے مطابق کالج کے مالی بحران کی صورت حال کا تفصیلی جائزہ لینے کے لیے ایک فائنس کمیٹی کی تشکیل کی گئی تھی جس میں مندرجہ ذیل لوگوں کو نامزد کیا گیا تھا۔

۱۔ نواب محسن الملک، ۲۔ حاجی اسماعیل خاں، ۳۔ مرزا عابد علی بیگ، ۴۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، ۵۔ مسٹر چکرورتی، ۶۔ مسٹر تھیوڈور بیک۔ مسٹر بیک کے خط مورخہ ۸/ اپریل ۱۸۹۸ء سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب محسن الملک اس کمیٹی کے صدر اور مسٹر بیک اس کمیٹی کے سکریٹری مقرر کیے گئے تھے۔ [۸]

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسٹر بیک کو رجسٹرار مقرر کرنے اور بہت سے اختیارات انہیں سونپنے کے بعد سید محمود نے پہلے دن سے ہی مسٹر بیک کو قاعدے قانون کے مطابق اپنے فرائض ادا کرنے کے سلسلے میں مستعد اور چست درست رکھنے کے لیے ناقدانہ اشارے کرنا شروع کر دیئے تھے۔ جس کی وجہ سے مسٹر بیک سید محمود کی طرف سے نہ صرف ہوشیار ہو گئے تھے بلکہ ان کو احساس ہو گیا تھا کہ سید محمود ایک بے باک اور سخت گیر افسر کے بطور قاعدے قانون کی پابندی کے سلسلے میں کوئی بھی رو رعایت برتنے کے قائل نہیں ہیں اس ضمن میں مندرجہ ذیل واقعہ مثال کے بطور پیش کیا جا سکتا ہے۔

بورڈ آف مینجمنٹ کے قواعد کے مطابق صرف سکریٹری ہی بورڈ کی میٹنگ بلانے کا نوٹس جاری کرنے کا مجاز تھا۔ مسٹر بیک نے ۹/ اپریل ۱۸۹۸ء کو بورڈ آف مینجمنٹ کی میٹنگ بلانے کا نوٹس بطور رجسٹرار جاری کر دیا تھا۔ اس میٹنگ کے سلسلے میں سید محمود نے مسٹر بیک کو ایک خط میں جو تحریر کیا تھا اس کا لب لباب مندرجہ ذیل تھا:

''بورڈ آف مینجمنٹ کے اجلاس منعقدہ ۲۸/مئی ۱۸۹۶ء کے ریزولیوشن نمبر۲ کی رو سے ۹/اپریل ۱۸۹۸ء کو آپ کے ذریعہ اجلاس بلانے کے لیے جاری کردہ نوٹس غیر قانونی تھا اور ۲۸/مئی ۱۸۹۶ء کے ریزولیوشن کی نفی کرتا تھا۔ اسی وجہ سے آپ کے ذریعہ جو نوٹس جاری کیا گیا تھا اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں تھی۔ کالج میں غبن کے سلسلے میں کافی محنت اور خرچ کے بعد میرے اور مرزا عابد علی بیگ کے ذریعہ لکھنؤ میں جو رپورٹ تیار کی گئی تھی وہ بورڈ کے سامنے رکھی گئی تھی۔ لیکن اس پر کوئی رائے اس لیے نہیں لی گئی تھی کیوں کہ ایک تو یہ کافی ضخیم تھی دوسرے اس میں جن قانونی اصطلاحات کا استعمال کیا گیا تھا وہ پیشہ ور وکلا اور قانون دانوں کے علاوہ کسی اور کے لیے کسی بھی دلچسپی کا باعث نہیں ہوسکتی تھیں۔ حالاں کہ آپ کا کہنا تھا کہ اس روز کی میٹنگ دراصل ۳۱/مارچ ۱۸۹۸ء کی ملتوی کردہ میٹنگ کا متصلہ تھی اور قواعد تواتر کے مطابق مندرجہ بالا قانون کی خلاف ورزی نہیں کرتی تھی۔ حالاں کہ دوسرے ممبران کا بھی یہی خیال تھا کہ یہ ملتوی کی ہوئی میٹنگ کا متصلہ نہیں تھی بلکہ نئے سرے سے بلائی گئی ایک میٹنگ تھی اسی وجہ سے ممبروں کی اکثریت کی رائے سے یہ میٹنگ شکریہ کی تحریک کے بعد برخاست کردی گئی تھی۔ میں نے یہاں اس واقعہ کا ذکر کسی تنقیدی نیت سے نہیں کیا ہے۔ بلکہ میں نہایت خلوص کے ساتھ قاعدے قانون کی پابندی کی اہمیت اور قوانین کی رو سے وضع کیے گئے طور طریقوں کی مطابقت سے کام کرنے کی ضرورت پر روشنی ڈالنا چاہتا تھا جن کی پابندی ہمارے لیے لازمی ہے۔ قاعدے قانون کی پابندی ہماری لیے اس وجہ سے اور بھی ضروری ہے کیوں کہ مسلم عوام اور خاص طور پر ٹرسٹیانِ کالج مجھے لائف آنریری سکریٹری کے بطور قاعدے قانون کے سلسلے میں وہ مراعات دینے کے لیے تیار نہ ہوں گے جو وہ میرے والد (اور کالج کے بانی) سرسید احمد خاں صاحب کے سلسلے میں روا رکھتے تھے

اور جن کو میرے مقابلے میں کہیں زیادہ اختیاری مراعات حاصل تھیں۔ میرے اور آپ کے سلسلے میں قانونی پابندی کی ضرورت اس لیے اور زیادہ ہے کیوں کہ (جیسا کہ آپ کو بھی علم ہے کہ) کالج کے مخالفین اور کالج کی تعلیمی پالیسی اور مقاصد سے مخالفت رکھنے والے لوگوں نے یہ افواہ پھیلانا شروع کردی ہے کہ پرنسپل ہونے کے ساتھ ساتھ میرا آپ کو کالج کا رجسٹرار مقرر کرنا ایک طرح سے کالج کے اختیارات کو مسلمانوں کے ہاتھوں سے لے کر عیسائیوں کے ہاتھوں میں سونپ دینے کے مترادف ہے۔ ان بے بنیاد افواہوں کو پھیلانے سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ یہ شرپسند لوگ (جن میں سب سے ممتاز ہستیوں سے میں اور آپ دونوں بخوبی واقف ہیں) خود یہ جانتے ہیں کہ میں نہ تو کام سے ڈرتا ہوں اور نہ ہی عموماً اپنے اختیارات آسانی سے کسی کو سونپتا ہوں۔ دراصل آپ کو رجسٹرار مقرر کرنے کے سلسلے میں، میں اپنے والد کے طرزِ عمل کی پیروی کررہا تھا جن کی ہمیشہ سے یہ خواہش رہی تھی کہ کالج کے انتظامی معاملات میں یورپین اور ہندوستانی برابر کے شریک رہیں''۔[9]

یہ ایک خاصا طویل خط ہے۔ جس میں سید محمود نے مسٹر بیک کو یہ یاددہانی بھی کروائی تھی کہ ان کا رجسٹرار کی حیثیت سے آنریری تقرر صرف ایک سال کے لیے کیا گیا ہے (یعنی قطعی عارضی ہے) نیز رجسٹرار کی حیثیت سے جو اختیارات ان کو دیئے گئے تھے اور جو فرائض ان کو انجام دینا تھے ان کی بھی تفصیل سے تشریح کی گئی تھی اور اخیر میں اس امید کے ساتھ یہ خط ختم کیا گیا تھا کہ اس مکمل وضاحت کے نتیجے کے بطور امید ہے کہ آئندہ کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہوگی۔ غرض اس خط سے یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ اب تک سید محمود اور مسٹر بیک کے درمیان رسہ کشی کی ابتدا ہوچکی تھی۔

سرسید میموریل فنڈ کمیٹی کا قیام:

اسی عرصے میں دوسرے چند واقعات اس نوعیت کے ہوئے جنھوں نے مسٹر بیک کو کالج کے سکریٹری کے عہدے کے لیے دوسرے لوگوں کی دعوے داری کی طرف بھی

متوجہ کیا تھا۔ دراصل سرسید کے انتقال کے وقت کالج کی مالی حالت خاصی خستہ تھی اور ضرورت اس بات کی تھی کہ کسی طرح اس مالی بحران سے کالج کو نجات دلائی جائے۔ اس سلسلے میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کی تجویز پر ایک بڑے جلسے میں کالج کے لیے روپیہ فراہم کرنے کے ارادے سے سرسید میموریل فنڈ کمیٹی کی تشکیل کی گئی تھی، جس کے صدر سید مہدی علی خاں صاحب (محسن الملک) اور سکریٹری مسٹر بیک مقرر کیے گئے تھے۔ (حالاں کہ بعد میں مسٹر بیک کی جگہ آفتاب احمد خاں صاحب سکریٹری نامزد کیے گئے تھے) اس کمیٹی نے فوراً اپنا کام شروع کر دیا تھا اور محسن الملک کی قیادت میں اس کمیٹی نے جلد ہی ایک لاکھ روپے کا سرمایہ جمع کر کے کالج کے ذمہ واجب ضروری قرضے ادا کر دیے تھے جس کی وجہ سے کالج کو اپنے مختلف نوعیت کے کاموں کو جاری رکھنے میں بڑی راحت ملی تھی۔

مسٹر بیک اور سید محمود:

سید محمود نے اپنے خط مورخہ ۲۲/جولائی ۱۸۹۸ء میں الہ آباد سے مسٹر بیک کو اطلاع دی تھی کہ وہ الہ آباد میں لفٹنٹ گورنر سے بھی ملاقات کریں گے تا کہ مسٹر بیک کو رجسٹرار مقرر کرنے کے سلسلے میں انھیں اپنے موقوف سے مطلع کر سکیں۔ انھوں نے اس خط میں مزید تحریر کیا تھا کہ:

''اگر مختصراً بیان کیا جائے تو آپ کے رجسٹرار مقرر کیے جانے کے سلسلے میں جو تنازعہ شروع ہوگیا ہے وہ دراصل مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کی تقلید پسندی اور سرسید احمد خاں کی آزاد خیالی کے پرانے جھگڑے کو دوبارہ شروع کرنے کی ایک کوشش ہے۔ سمیع اللہ خاں صاحب نے یہ حملہ اس خادم اور آپ کے ساتھ ساتھ میرے والد اور کالج کے ٹرسٹیوں پر بھی کیا ہے۔ جو شور وغل اس وقت مچایا جا رہا ہے وہ بھی پہلے ہی جیسا ہے۔ یہ نام نہاد ''تقلید پسند'' حضرات (جیسا کہ آپ اور میں بخوبی واقف ہیں) میرے والد کے انتقال کا انتظار کر رہے تھے تا کہ وہ دوبارہ تازہ دم ہو کر کالج کے خلاف اپنی مہم اس دروغ گوئی کے حیلے سے شروع کر سکیں کہ میرا آپ کو اپنے اختیارات کے ذریعہ رجسٹرار مقرر کرنا دراصل کالج کو انگلش (یعنی

کرچین) ادارہ بنانے کے مترادف ہے۔ حالاں کہ آپ کا یہ تقرر
صرف ایک سال کے لیے ہی کیا گیا ہے''۔[10]

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسٹر بیک اس تنازعے سے اپنے آپ کو علیحدہ کر کے اس طرح کی ''پوزیشن'' لینا چاہتے تھے گویا وہ سید محمود اور ٹرسٹیوں کے درمیان جاری اس رسہ کشی میں ایک فریق نہ ہو کر ایک ثالث میں (جو بڑی حد تک ان کے ایک شاطر انگریز ہونے کی دلیل تھی) دوسری طرف سید محمود اپنے ہر خط میں اس بات کی وضاحت کرتے رہتے تھے کہ ان کو (یعنی مسٹر بیک کو) رجسٹرار متعین کرنے کے لیے انھوں نے ٹرسٹیوں کی مخالفت تک مول لینے سے گریز نہیں کیا ہے۔ کیوں کہ حقیقت یہی تھی کہ مسٹر بیک رجسٹرار بننے کے لیے خواہش مند ہی نہیں کافی کوشاں بھی تھے اور سید محمود نے انھیں رجسٹرار بنا کر ایک طرح سے ان کی اس خواہش کا احترام کیا تھا۔ دراصل جب سید محمود کالج کے ایڈمنسٹریشن کو چست درست کرنے میں رات دن غلطاں و پیچاں تھے اس وقت محسن الملک نے اپنے تجربہ کی بنا پر نہایت چابک دستی سے سرسید میموریل فنڈ کمیٹی کے ذریعہ روپیہ جمع کر کے نہ صرف کالج کے استحکام کا ایک بڑا مسئلہ حل کر دیا تھا بلکہ کالج سے متعلق لوگوں (یعنی ٹرسٹیوں) کا بڑی حد تک تعاون اور اعتماد بھی حاصل کر لیا تھا۔ اسی کمیٹی کے کاموں کے دوران صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کی مصالحتی کوششوں کے نتیجے میں اب مسٹر بیک نہ صرف محسن الملک کی سکریٹری شپ کی دعوے داری کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھنے لگے تھے بلکہ اس دعوے داری میں کسی حد تک ان کو اپنے مفادات کے تحفظ کے امکانات بھی نظر آنے لگے تھے۔

سمیع اللہ خاں صاحب اور رامپور ڈیپوٹیشن:

سرسید کے انتقال کے بعد سکریٹری شپ کی دعوے داری کے سلسلے میں محسن الملک اور وقار الملک کے علاوہ سمیع اللہ خاں صاحب بھی ایک بار پھر میدان میں آ گئے تھے۔ سکریٹری شپ کی دعوے داری کی فہرست میں بعض ٹرسٹیوں کی لسٹ میں ان کا نام سرِ فہرست تھا۔ ۳۱/ جولائی ۱۸۹۸ء میں جب سرسید میموریل فنڈ کمیٹی کا ایک وفد نواب صاحب (رامپور) کی خدمت میں کالج کے لیے چندہ مانگنے کی غرض سے بھیجا گیا تھا۔ سمیع اللہ خاں صاحب کا نام اس وفد میں بطور خاص شامل کیا گیا تھا۔ نواب صاحب نے سرسید میموریل فنڈ میں پچاس ہزار روپے بطور چندہ دینے کے وعدے کے ساتھ مندرجہ ذیل دو شرائط وفد کے

ممبران کے سامنے رکھی تھیں۔

۱۔ سکریٹری کو مقرر کرنے اور معطل کرنے کے اختیارات نواب صاحب کو دیئے جائیں۔

۲۔ نیز یورپین اسٹاف کو مقرر کرنے اور معطل کرنے کے اختیارات بھی نواب صاحب کے ذمہ کیے جائیں۔[۱۱]

کہا جاتا ہے کہ نواب صاحب نے یہ شرائط سمیع اللہ خاں صاحب کی ایما اور تحریک پر وفد کے سامنے رکھی تھیں۔ اس بات کا اس قدر چرچہ ہوا کہ کالج کے یورپین اسٹاف کے ذریعہ یہ شکایت لفٹننٹ گورنر تک پہنچ گئی۔ لفٹننٹ گورنر کے سکریٹری مسٹر وی۔اے۔اسمتھ کے خط بنام سمیع اللہ خاں مورخہ ۹/اگست ۱۸۹۸ء کے ذریعہ سمیع اللہ خاں صاحب سے اس سلسلے میں وضاحت طلب کی گئی تھی۔ سمیع اللہ خاں صاحب نے اپنے خط مورخہ ۱۴/اگست ۱۸۹۸ء (بنام مسٹر اسمتھ) میں نواب صاحب کے ساتھ وفد کے ممبران کی جو بات چیت ہوئی تھی اس کا مکمل حوالہ دیتے ہوئے اپنے اوپر لگائے گئے اس الزام کو ایک تہمت قرار دیتے ہوئے اس سے قطعی انکار کیا تھا۔[۱۲] سمیع اللہ خاں صاحب کے اس خط کے جواب میں مسٹر اسمتھ کے خط مورخہ ۶/ستمبر ۱۸۹۸ء کے ذریعہ سمیع اللہ خاں صاحب کو مطلع کیا گیا تھا کہ:

"لفٹننٹ گورنر صاحب کو انکوائری کرنے کے بعد یہ یقین ہو گیا ہے کہ آپ ہی کی ایما اور تجویز پر نواب صاحب نے چندہ دینے کے لیے مندرجہ ذیل دو شرائط ڈیپوٹیشن کے سامنے رکھی تھیں۔

۱۔ سکریٹری کو مقرر کرنے اور معطل کرنے کے اختیارات انھیں دیئے جائیں۔

۲۔ نیز یورپین اسٹاف کو مقرر کرنے اور معطل کرنے کے اختیارات بھی ان کے سپرد کیے جائیں۔

اسی وجہ سے لفٹننٹ گورنر آپ کے ذریعہ دی گئی صفائی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں ان کی خواہش ہے کہ آپ یہ باور کرلیں کہ آئندہ آپ اور وہ ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہوں گے"۔[۱۳]

سمیع اللہ خاں صاحب نے اس واقعے کے سلسلے میں اپنے خط مورخہ ۲/ستمبر

۱۸۹۸ء (بنام محسن الملک) کے ذریعہ محسن الملک کو اس بہتان تراشی کے لیے مورد الزام ٹھہرایا تھا۔[۱۴] محسن الملک نے اپنے خط مورخہ ۱۵ر ستمبر کے ذریعہ اس بات کا تو اقرار کیا تھا کہ عام طور پر لوگوں میں یہ بات مشہور تھی لیکن خود کا اس بہتان تراشی میں شریک ہونے سے قطعی انکار کیا تھا۔ بلکہ سمیع اللہ خاں صاحب کے لیے اپنے دل میں موجود عزت واحترام کا تذکرہ کرتے ہوئے انھیں (یعنی سمیع اللہ خاں صاحب کو) کالج کی سکریٹری شپ کا حقیقی وجائز حق دار، مندرجہ ذیل الفاظ میں ٹھہرایا تھا۔

> ''میرے نزدیک آپ سے بہتر اور آپ کے بعد نواب وقار الملک اور حاجی اسماعیل خاں سے بڑھ کر کوئی اس کام کو نہیں چلا سکتا ہے اور اگر بدنصیبی سے کچھ اختلافات باہم آپ کے اور سید صاحب مرحوم اور آنریبل سید محمود اور انگلش اسٹاف کے پیش نہ آجاتے تو بہت شخص آپ ہی کو اس عہدہ کے لیے مستحق سمجھتے اور میں تو صرف آپ کو مستحق سمجھتا''۔[۱۵]

غرض اس واقعہ کے سلسلے میں لفٹنٹ گورنر کے مندرجہ بالا خط کے بعد سمیع اللہ خاں صاحب سکریٹری شپ کی دوڑ سے قطعی طور پر باہر ہو گئے تھے۔ اب اس دوڑ میں محسن الملک سب سے آگے نظر آنے لگے تھے۔ جو ایک طرح سے ان کی فراست پر دلیل قرار دی جا سکتی ہے۔

سید محمود پر مسٹر بیک کا اعتراض:

سید محمود کا کالج کی اصل عمارت میں سکریٹری کے لیے ایک عمدہ آفس قائم کرنے کا خیال ابھی تک پوری طرح شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا تھا۔ انھوں نے سکریٹری کے لیے جو آفس انسٹی ٹیوٹ کی عمارت میں قائم کیا تھا اس سے وہ مطمئن نہیں تھے۔ وہ سکریٹری اور اس کے عملے کے لیے کالج کی اصل عمارت کے اندر ہی ایک باقاعدہ آفس قائم کرنا چاہتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے اپنی پہلی فرصت میں سکریٹری کے لیے ''مہدی منزل'' میں ایک آفس قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ مہدی منزل کالج کے کلاسوں کے کمروں سے ملحق (موجود لٹن لائبریری کے مشرق میں) واقع ہے۔ جب سرسید نے کالج میں ''لا'' کی کلاسیں شروع کرنے اور سید محمود کے ذریعہ تحفتاً دی گئی کتابوں سے ''لا'' کے طلبا کے لیے ایک لائبریری

قائم کرنے کا فیصلہ کیا تھا اس وقت مہدی منزل کو ''لا'' کی لائبریری قائم کرنے کے لیے وقف کر دیا گیا تھا۔ سید محمود نے اسی عمارت میں کچھ ردوبدل کرنے کے بعد اپنا آفس قائم کر لیا تھا۔ غالباً یہ اگست ۱۸۹۸ء کے اواخر کا واقعہ ہے۔ لیکن اب تک حالات کافی بدل چکے تھے یعنی اب مسٹر بیک بھی سید محمود کے کام کرنے کے طور طریقوں پر انگلی اٹھانے لگے تھے۔ اس آفس کے قیام کے سلسلے میں مسٹر بیک نے اپنے خط (بنام سید محمود) مورخہ ۴ر ستمبر ۱۸۹۸ء میں شملہ سے تحریر کیا تھا کہ:

> ''میرا خیال ہے کہ آپ نے اپنے آفس کے کلرکوں کی تعداد میں کچھ اضافہ کیا ہے اور آپ کالج میں کچھ تعمیرات کا کام بھی کروا رہے ہیں میں اس سلسلے میں آپ کا دھیان اس امر کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ آج کل اخراجات کے سلسلے میں ہمیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ آپ کے والد کے انتقال کے وقت کالج پر بے تحاشہ قرضہ تھا اور ضروری اخراجات عام آمدنی سے بہت زیادہ تھے۔ حالاں کہ کافی کوشش کے بعد قرضے کا بڑا حصہ ادا کیا جا چکا ہے۔ لیکن ابھی بھی کالج کے اخراجات اس کی عام آمدنی سے کافی زیادہ ہیں''۔ [۱۶]

اسی کے ساتھ مسٹر بیک نے اپنے اس خط میں ان قوانین کا تفصیلی حوالہ بھی دیا تھا جن کی رو سے کسی خرچ سے پہلے ٹرسٹیوں کی رضامندی حاصل کرنا ضروری ہوتی ہے۔ اس خط سے واضح اشارے ملتے ہیں کہ اب مسٹر بیک (اور ان کے ساتھ کل یورپین اسٹاف) بتدریج سید محمود کے مخالف خیمے کی طرف راغب ہوتے جا رہے تھے۔ اس رغبت میں سمیع اللہ خاں صاحب کے سکریٹری شپ کی دوڑ سے باہر ہو جانے کے امکانات اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کے ذریعہ مسٹر بیک اور محسن الملک کے مابین مصالحتی عمل شروع کروانے کا بڑا ہاتھ تھا۔

سید محمود نے مسٹر بیک کے مندرجہ بالا خط کا تفصیلی جواب ۱۵ر ستمبر ۱۸۹۸ء کو ارسال کیا تھا۔ انھوں نے اپنے اس خط میں کلرکوں کے تقرر اور سکریٹری کا نیا آفس قائم کرنے کے سلسلے میں عمارت میں کی گئی ردوبدل کی تفصیلات فراہم کی تھیں۔ ہم اس طویل خط میں سے عمارت میں کی گئی تعمیری ردوبدل سے متعلق چند اقتباسات قارئین کے سامنے

پیش کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اس سلسلے میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''آپ کے خط میں جہاں تک کالج کے اندر تعمیراتی عمل شروع کرنے کا تذکرہ ہے اس سلسلے میں میرے خیال میں صرف اتنا لکھنا کافی ہوگا کہ منشی ناصر خاں صاحب کی رپورٹ مورخہ ۱۰ر ستمبر ۱۸۹۸ء کے مطابق اس تعمیراتی عمل پر جس کا آپ نے ذکر کیا ہے صرف بارہ روپیہ آٹھ آنے اور نو پائی خرچ کیے گئے ہیں۔ یہ معمولی رقم بھی مہدی منزل کے برآمدے کے ایک کونے میں ایک ''پارٹیشن'' کی دیوار بنوا کر ایک چھوٹا سا غسل خانہ بنوانے کی اجرت وغیرہ کے بطور خرچ کی گئی تھی۔ جس کے سلسلے میں کئی مرتبہ میں نے اپنے والد سے بھی، ان کی زندگی ہی میں اپنی ایما ظاہر کی تھی اور انھوں نے مجھے اس تعمیر کے لیے بہ خوشی اجازت دے دی تھی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ مہدی منزل کے دونوں کمرے ''لا'' کی لائبریری کے لیے وقف کر دیئے گئے تھے۔ اور ان میں ''لا'' کی کتابیں رکھنے کے لیے میرے خرچ پر انتظام کیا گیا تھا۔ ٹرسٹیوں نے میرے ذریعہ تحفتاً دی گئی ان کتابوں کو میری اس شرط کے ساتھ قبول کیا تھا کہ جب کبھی میں کالج کے سلسلے میں مستقلاً علی گڑھ آؤں گا اس وقت یہ دونوں کمرے میرے تصرف میں رہیں گے۔ موجودہ حالت میں، میرے والد کے انتقال کے بعد سے میں ان کی جگہ قانونی طور پر سکریٹری مقرر ہو گیا ہوں۔ اور آپ نے برائے مہربانی جن ذمہ داریوں کو رجسٹرار کا عہدہ قبول کر کے اپنے ذمہ لینا پسند کیا ہے ان کی وجہ سے میرے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ میں کسی ایسے کمرے میں موجود رہوں جہاں خط و کتابت میں وقت برباد کیے بغیر کالج کے مختلف معاملات کے سلسلے میں آپ سے بحیثیت رجسٹرار (اور بطور پرنسپل بھی) با آسانی صلاح مشورہ کر سکوں۔ میں یہ سب آپ کو اس لیے لکھ رہا ہوں کیوں کہ آپ میرے کام کرنے کے طور طریقوں سے بخوبی واقف ہیں۔ کام کرنے کے ان طریقوں کی خصوصیت یہ ہی ہے کہ میں اور آپ

بآسانی بغیر کسی دقت کے (یعنی ایک دوسرے کے گھروں پر حاضری دیئے بغیر) باہم صلاح ومشورہ کرسکیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میری اس بات سے اتفاق کریں گے کہ اس طرح کی غیر رسمی اور دوستانہ مشاورت ہی کی وجہ سے ہم لوگ ہمیشہ باہم اتفاق کے حامل نتائج پر پہنچے ہیں جس کے ہم دونوں ایک طرح سے عادی ہو گئے ہیں۔ اور اسی دوستانہ مشاورت کے ذریعہ ہم دونوں نے اپنا بہت سا وہ قیمتی وقت بچالیا ہے جو باہم خط و کتابت کے ذریعہ کسی نتیجے پر پہنچنے میں ضائع ہونا لازمی تھا۔ میرے خیال میں واپس علی گڑھ آنے کے بعد آپ غسل خانے کے لیے بنائی گئی اس ''پارٹیشن وال'' کو دیکھ کر ضرور مطمئن ہو جائیں گے۔ میں یہ بھی مزید بتلانا چاہوں گا کہ جہاں ایک طرف یہ دیوار اتنی چھوٹی اور سستی ہے کہ تقریباً آدھے گھنٹے کے اندر (اصل عمارت کو کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچائے بغیر) ہٹائی جاسکتی ہے۔ وہیں اگر آپ کے خیال سے ۱۲ روپیہ آٹھ آنے نو پائی کی رقم (جو اس پر خرچ ہوئی ہے) قاعدے کے مطابق جائز قرار نہیں دی جاسکتی ہے۔ تو ایسی حالت میں، میں یہ رقم بہ خوشی اپنی جیب سے ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ کو میرا پچھلا رجسٹرڈ خط موصول ہو گیا ہوگا۔ جس میں رام پور میں پیش آنے والے واقعات سے متعلق چند اہم دستاویزات ملفوف تھیں۔ امید ہے کہ آپ اور مسز بیک دونوں کی صحت کے لیے شملہ کی آب و ہوا راس آرہی ہوگی''۔ [۱۷]

کالج میں ایڈمنسٹریٹو بلاک کی تعمیر:

سید محمود کالج کے ایڈمنسٹریشن کو چست درست کرنے کے کس قدر خواہاں تھے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے ایک مفصل اسکیم تیار کی تھی کہ کالج کی عمارت کے اندر ہی سکریٹری کے آفس اور اس کے ''سکریٹریٹ'' کے لیے ایک ایڈمنسٹریٹو بلاک'' تعمیر کیا جائے۔ اس سلسلے میں ان کی تجویز تھی کہ وکٹوریہ گیٹ (یعنی کالج کے صدر

دروازے) کی لائن میں جس طرح مشرقی کونے پر ''سالار منزل'' یعنی ڈائننگ ہال کی عمارت تعمیر کی گئی ہے اسی کے جواب کے بطور مغربی کونے پر سکریٹری اور اس کے متعلقہ دفاتر کے لیے ایک عمدہ عمارت تعمیر کرنا چاہیے (اس وقت اس جگہ پر مشرقی طرز کے قدمچوں والے بیت الخلا کی عمارت موجود تھی) دفاتر کے لیے تجویز کی گئی اس عمارت کا انھوں نے اپنے ذاتی خرچ سے ایک عمدہ نقشہ بھی بنوالیا تھا جس کا اکثر تذکرہ محسن الملک کے سکریٹری ہو جانے کے بعد سید محمود نے اپنے خطوط میں کیا ہے۔ وہ اس عمارت کی تعمیر کے سلسلے میں ہمیشہ اصرار کرتے رہے تھے۔ آج جو عمارت اس مجوزہ جگہ پر موجود ہے اس کی ہیئت اور ساخت کو دیکھ کر یہی گمان ہوتا ہے کہ غالباً یہ عمارت اسی نقشہ پر تعمیر کی گئی ہے جو سید محمود نے بنوایا تھا (یہ وہ عمارت ہے جس میں ایک عرصہ تک یونیورسٹی کا شعبہ کامرس قائم رہا تھا، نیز دس بارہ برس پہلے اسی عمارت میں شعبہ وائلڈ لائف بھی قائم کیا گیا تھا)

سادات منزل کی تعمیر کا منصوبہ:

مندرجہ بالا عمارت کے علاوہ سید محمود نے کچی بارک کے چوک کے وسط میں ایک بڑی دو منزلہ عمارت موسومہ ''سادات منزل''، تعمیر کرنے کا منصوبہ بھی بنایا تھا۔ سادات منزل تعمیر کرنے کی تجویز سرسید کی زندگی ہی میں منظور کرلی گئی تھی۔ سید افتخار عالم مارہروی کے مطابق سید محمود نے اس عمارت کا ایک عمدہ نقشہ بھی تیار کروالیا تھا۔ (سید افتخار عالم مارہروی کی کتاب ''محمڈن کالج ہسٹری'' میں یہ نقشہ شائع کیا گیا ہے) اس عمارت کا نقشہ گول تھا جس کے اوپر چھت کے بطور ایک بہت بڑا گنبد بنانا تجویز کیا گیا تھا۔ تخمینے کے مطابق اس عمارت کو تعمیر کرنے کے واسطے تقریباً ۱۵۰۰۰ روپے کی لاگت درکار تھی۔ ''سادات منزل'' کی تعمیر کے لیے سرمایہ فراہم کرنے کے واسطے چندہ شروع کر دیا گیا تھا۔ مرزا عابد علی بیگ کی ۱۹۰۱ء میں ترتیب دی گئی ''خلاصہ رپورٹ'' کے مطابق ایک بڑی رقم چندے کی اس مد میں جمع بھی ہوگئی تھی (ہم عربی رقوم سے ناواقفیت کی بنا پر رقم کا اندراج پڑھنے سے قاصر رہے)۔[۱۸] اس عمارت کو تعمیر کرنے کے منصوبے کے در پردہ ہمیں سید محمود کی سید مہدی علی خاں صاحب (محسن الملک) کو سکریٹری شپ کے مقابلے میں زک پہنچانے کی نیت کار فرما نظر آتی ہے جو ایک طرح سے اس قسم کے معاملات میں سید محمود کی سادہ لوحی پر دلیل ہے۔ دراصل مہدی علی خاں صاحب (محسن الملک) کی پیدائش ایک

شیعہ خاندان میں ہوئی تھی بعد میں انھوں نے (تبدیلی اعتقاد کے بعد) سنی مسلک اختیار کرلیا تھا۔ ساتھ ہی سنی مسلک پر ایک تقابلی رسالہ بھی تصنیف کیا تھا۔ انہیں وجوہ سے شیعہ حضرات میں کس حد تک ان کے خلاف ایک طرح کی آزردگی پائی جاتی تھی۔ غالباً انہیں وجوہ کی بنا پر سکریٹری شپ کے تنازعہ میں مہدی علی خاں صاحب (محسن الملک) کے مقابلے میں سید محمود شیعہ حضرات کو اپنا فطری حمایتی تصور کرتے تھے اور ان کی حمایت کو مزید مستحکم کرنے کے خیال سے غالباً اس قسم کے شگوفے چھوڑتے رہتے تھے۔ سید محمود نے (سید مہدی علی خاں صاحب کے سکریٹری منتخب ہو جانے کے بعد) بورڈنگ ہاؤس میں شیعہ طالب علموں کے نماز پڑھنے کے واسطے ایک علیحدہ مسجد تعمیر کیے جانے کے مطالبے کو بھی زور شور سے اٹھایا تھا جس میں نوبت پولیس تھانے تک پہنچ گئی تھی (جس کا تذکرہ ہم آئندہ کریں گے) غرض ''سادات منزل'' کو تعمیر کرنے کے لیے جو جگہ تجویز کی گئی تھی وہ ہمارے خیال سے کسی بھی طرح کی تعمیر کے لیے قطعی موزوں نہیں تھی۔ اگر واقعی اس جگہ کوئی عمارت تعمیر کردی جاتی تو کالج کی دوسری تمام عمارتوں کے نقشوں پر اس کا خاصا منفی تاثر قائم ہوتا کیوں کہ اس عمارت کا مجوزہ نقشہ کسی طور پر کالج کی دوسری عمارتوں کے نقشوں سے (جو تعمیر ہو چکی تھی) ہم آہنگ نہیں تھا۔ بہر حال سید محمود کے سکریٹری شپ سے ہٹائے جانے کے بعد اس عمارت کی تعمیر کا مسئلہ التوا میں پڑ گیا تھا۔

سید محمود کے دور کی تعمیرات:

جہاں تک کالج کی عمارتوں کا تعلق ہے سید محمود کے دورِ سکریٹری شپ میں کوئی نمایاں تعمیری کام انجام نہیں دیا گیا تھا سوائے اس ''پلیا'' کے جو میکڈانلڈ ہوسٹل کے قریب ماریسن روڈ پر واقع ہے۔ غالباً سید محمود کی ایما پر ہی یہ پلیا تعمیر کی گئی تھی۔ جس کی شہادت مسٹر بیریسن کے نام لکھے گئے مندرجہ ذیل خط مورخہ ۱۸۹۸ء کے ابتدائی ڈرافٹ سے فراہم ہوتی ہے جس پر کسی کے دستخط موجود نہیں ہیں۔ اس خط میں تحریر ہے کہ:

> ''کالج کمپاؤنڈ کے شمالی مغربی کونے پر جہاں کالج کا رائیڈنگ کلب واقع تھا وہاں پبلک روڈ کے کنارے موجود کھلے گندے نالے کے اوپر ہم ایک ''پلیا'' بنانے کے خواہش مند ہیں تاکہ گھوڑے اور گاڑیاں بآسانی گندے نالے کو پار کرسکا کریں۔ مجھے امید ہے کہ

آپ برائے مہربانی پلیا تعمیر کرنے کی اجازت عنایت فرمائیں گے''۔ ۱۹

غرض ہم کہہ سکتے ہیں کہ کالج کی عمارتوں میں میکڈانلڈ ہوسٹل کے قریب واقع یہ ''پلیا'' ہی سید محمود کے دورِ سکریٹری شپ میں ہونے والی تعمیرات کی واحد نشانی ہے۔

مولانا شبلی نعمانی کی کالج سے رخصت:

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ سید محمود ذاتی طور پر مولانا شبلی نعمانی سے آزردہ خاطر رہنے لگے تھے۔ اسی وجہ سے سرسید کے انتقال کے فوراً بعد مولانا نے وہ چھوٹا بنگلہ جو سرسید ہاؤس کے احاطہ میں ان کی رہائش کے لیے سرسید نے انھیں دے رکھا تھا فوراً خالی کر دیا تھا۔ اور اسماعیل خاں صاحب کے اصرار پر ان کی کوٹھی (موسومہ حال نشاط کوٹھی) میں منتقل ہو گئے تھے۔ سرسید کے انتقال کے تین دن بعد بورڈ آف مینجمنٹ کا جو اجلاس ۳۱ / مارچ ۱۸۹۸ء کو منعقد ہوا تھا اس میں مولانا نے شرکت کی تھی (مولانا بورڈ آف مینجمنٹ کے رکن تھے) لیکن اس کے کچھ عرصہ بعد ہی مولانا کو مسٹر بیک کا ایک خط موصول ہوا تھا جس میں ان سے استفسار کیا گیا تھا کہ چوں کہ علی گڑھ میں گرمیوں کا موسم ان کو موافق نہیں آتا تھا اسی وجہ سے سرسید نے انھیں یہ رعایت دے رکھی تھی کہ وہ گرمیوں کا موسم اپنے آبائی وطن میں گزارا کریں اور صرف سردیوں کے موسم میں علی گڑھ آکر کالج کے درس اور تدریس کے کاموں میں حصہ لیا کریں۔ اسی حوالے سے مسٹر بیک نے مولانا کو لکھا تھا کہ اسی روایتی ضابطے کی رو سے اب بھی ان کو گرمیوں کے موسم میں علی گڑھ سے باہر رہنے کی آزادی ہے۔ اس خط کے موصول ہونے کے فوراً بعد مولانا اپنے آبائی وطن (اعظم گڑھ) روانہ ہو گئے تھے۔ میر ولایت حسین اس واقعہ کے سلسلے میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''بیک صاحب سید محمود کے طرفدار تھے۔ ان کو یہ معلوم ہوا کہ مولوی شبلی صاحب حاجی اسماعیل خاں صاحب کی کوٹھی میں رہتے ہیں اور وہ حاجی محمد اسماعیل خاں صاحب کو سید محمود کے خلاف آمادہ کرتے ہیں اس لیے بیک صاحب نے مولوی شبلی صاحب سے کہا کہ مولانا آپ نے تو گرمی اور برسات کے موسم میں علی گڑھ سے باہر رہنے کی اجازت حاصل کر لی تھی۔ اب گرمی کا موسم ہے آپ تشریف کیوں

نہیں لے جاتے ہیں چنانچہ مولوی شبلی علی گڑھ سے چلے گئے''۔[۲۰]

موسم گرما کے ختم ہونے کے بعد مولانا شبلی نعمانی نے اپنے وطن سے ہی اپنا استعفیٰ پرنسپل کے نام ارسال کر دیا تھا۔

سید محمود کی ازدواجی زندگی:

ہم یہاں اس بات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ سید محمود کی ازدواجی زندگی میں (جو ان کے سکریٹری شپ سے معذول ہونے کے بعد نہایت تلخ اور ناگوار ہوگئی تھی) اگست ۱۸۹۸ء تک کوئی نمایاں کشیدگی نظر نہیں آتی ہے۔ مورخہ ۱۵؍اگست ۱۸۹۸ء کا مشرف جہاں بیگم صاحبہ کا ایک ضابطہ کا خط بنام سکریٹری (یعنی بنام سید محمود) سرسید اکیڈمی کی آرکا بوز میں موجود ہے جو بہ ظاہر سید محمود کی ایما پر ہی لکھا گیا تھا۔ اس خط میں بیگم صاحبہ نے اپنے نام موجود ۱۵ ڈبینچروں کو (جن کی کل مالیت ساڑھے سات ہزار روپے تھی جو ہمارے اندازے کے مطابق آج کے تقریباً گیارہ لاکھ روپیہ کے مساوی تھے) ذاتی ضرورت کے تحت فروخت کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ ان پندرہ ڈبینچروں میں سے ۱۰ ڈبینچر خود ان کے نام تھے جو انھوں نے سرسید کی زندگی ہی میں خریدے تھے۔ بقایہ پانچ ڈبینچر وہ تھے جو ابتداً سید محمود نے خریدے تھے لیکن بیگم صاحبہ کے بیان کے مطابق بعد میں یہ پانچوں ڈبینچر سید محمود نے بیگم صاحبہ کے ہاتھ ۱۶؍مارچ ۱۸۹۸ء کو فروخت کر دیئے تھے۔ اس خط پر گواہوں کے بطور مندرجہ ذیل دو لوگوں کے دستخط موجود ہیں۔[۲۱]

۱۔ خواجہ احمد اللہ۔ جو مشرف جہاں بیگم صاحبہ کے رشتے کے بھائی تھے اور کالج ہی میں زیر تعلیم تھے۔

۲۔ خواجہ مسلح الدین احمد۔ جو مشرف جہاں بیگم صاحبہ کے حقیقی بھائی تھے۔

ان ناموں سے ہم نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ اس زمانے میں مشرف جہاں بیگم صاحبہ کے ساتھ سرسید ہاؤس میں ان کے کئی قریبی عزیز رہائش پذیر تھے۔ اس ضمن میں یہ تو ہمیں پہلے سے علم ہے کہ بیگم صاحبہ کے ایک دوسرے حقیقی بھائی خواجہ وجیہ الدین احمد پچھلے پندرہ برس سے سید محمود کے پرسنل اسسٹنٹ کے بطور کام کر رہے تھے اور ان کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ سید محمود کے علی گڑھ آنے کے بعد وہ کالج کے غیر تدریسی اسٹاف میں بطور پرسنل سکریٹری (سکریٹری کالج) شامل کر لیے گئے تھے اور سرسید ہاؤس ہی میں مقیم تھے۔ غرض

اس زمانے میں سید محمود کے گھر میں ان کی بیگم صاحبہ کے تین بھائیوں کی موجودگی اس بات پر دلیل ہے کہ سید محمود کے اپنی بیگم سے تعلقات اگر بہت خوشگوار نہ سہی تو ناخوشگوار بھی نہیں تھے۔ ہمارے خیال سے ان کی ازدواجی زندگی کی ناخوشگواری اس وقت سے بتدریج بڑھنا شروع ہوئی تھی جب سکریٹری شپ سے ہٹائے جانے کے ردِ عمل کے بطور سید محمود کی ذہنی کیفیت متاثر ہونا شروع ہوئی تھی جس کے ساتھ ہی ان کی ازدواجی زندگی بھی منتشر ہوتی چلی گئی تھی۔

سکریٹری شپ کی امیدواری اور وقارالملک:

مولوی مشتاق حسین (وقارالملک) بھی کالج کے اس پرآشوب دور میں پوری طرح سرگرم نظر آتے ہیں۔ ان کا نام بھی سکریٹری شپ کے امیدواروں کی فہرست میں شامل تھا۔ حالاں کہ وقارالملک کو خود اس بات کا احساس تھا کہ مہدی علی خاں صاحب (محسن الملک) سکریٹری شپ کے اس مقابلے میں بہت مضبوط دعوے دار ہیں لیکن اس کے باوجود ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولوی مشتاق حسین صاحب (وقارالملک) اس بات کے لیے کوشاں تھے کہ کسی طور سے سکریٹری شپ کے انتخاب کو فی الحال ملتوی کروا کر کچھ مہلت حاصل کر لی جائے۔ نواب محسن الملک اور نواب وقارالملک کے مزاج اور طریقہ کار میں نمایاں فرق موجود تھا۔ دونوں کے مابین حیدرآباد کے زمانہ قیام سے ہی اختلافات موجود تھے۔ اس سلسلے میں محمد اکرام اللہ خاں ''وقار حیات'' میں تحریر کرتے ہیں کہ:

> ''نواب محسن الملک اور نواب وقارالملک کی طبائع، طریق عمل اور پالیسی میں ہمیشہ سے اختلاف تھا۔ چنانچہ حیدرآباد کے زمانہ قیام میں اس اختلاف کی وجہ سے بعض اوقات باہمی بے لطفی تک نوبت پہنچ گئی تھی''۔ [۲۲]

ظاہر ہے کہ جب اس طرح کے اختلافات موجود ہوں تو رقابت اور حسد کے جذبہ کی موجودگی سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ مولوی مشتاق حسین سکریٹری کے عہدے کے لیے منتخب کیے جانے کے متمنی ضرور تھے لیکن بہت زیادہ پُرامید نہیں تھے اسی وجہ سے انھیں کچھ وقت درکار تھا تا کہ حالات کو اپنی موافقت میں ہموار کر سکیں۔ اسی موقف کے تحت انھوں نے ''مجموعہ قواعد و قوانین'' کی ترمیم کا مسئلہ اٹھایا اور اس بات پر زور دیا کہ سکریٹری و

دیگر عہدوں کے انتخابات اس وقت تک کے لیے ملتوی کر دیئے جائیں جب تک کہ مذکورہ قوانین میں ترمیمات کیے جانے کا عمل پورا نہ ہو جائے۔ اس سلسلے میں محمد اکرام اللہ خاں تحریر کرتے ہیں کہ:

''نواب وقار الملک نے جب یہ دیکھا کہ عہدوں کے لیے جو کش مکش جاری ہے وہ ناموزوں حد تک ترقی کر گئی ہے تو انھوں نے یہ چاہا کہ بالفعل عہدیداروں کے انتخاب و تقرر کا معاملہ ملتوی کر دیا جائے تا کہ ٹرسٹیوں کو اطمینان سے ان معاملات پر غور کرنے کا موقع مل سکے''۔[۲۳]

اسی کے ساتھ انھوں نے کالج کی ناقابلِ اطمینان حالت کے پیش نظر ٹرسٹیوں کے نام ایک خط کے ذریعہ کالج کے کاموں کو انجام دینے کے لیے اپنی غیر مشروط خدمات بھی پیش کی تھیں۔ اس خط میں انھوں نے تحریر کیا تھا کہ:

''میں آمادہ ہوں کہ جب تک ہمارا قانون از سرِ نو ایک مکمل صورت اختیار کرے اور کمیٹی کے مجوزہ عہدوں پر تقررات عمل میں آجائیں اپنا قیام علی گڑھ کالج کے پاس ہی اختیار کروں اور آنریبل لائف آنریری سکریٹری صاحب (یعنی سید محمود) کو ان کے کاموں میں مدد دوں۔ میں اپنے لیے کوئی خاص پوزیشن نہیں چاہتا نہ اب اور نہ آئندہ۔ کالج کے ٹرسٹی اور سید محمود صاحب کے قدیمی نیاز مند اور قوم کے ایک ادنی خادم کی حیثیت اس طرح کام کرنے کی غرض سے میرے لیے بالکل کافی ہے''۔[۲۴]

یعنی وقار الملک کی اس وقت یہی حکمتِ عملی نظر آتی ہے کہ انتخابات کو کچھ عرصہ کے لیے ملتوی کروا کر وہ چاہتے تھے کہ سید محمود کے ساتھ وابستہ ہو کر کالج کے کاموں کے سلسلے میں اپنی مستعدی کا مظاہرہ کر کے ٹرسٹیوں اور کالج کے اسٹاف کا اعتماد اور تعاون حاصل کر سکیں۔

سید محمود مخالفین کے نرغے میں:

جب سید محمود کالج کے نظام کو چست درست کرنے میں غلطاں و پیچاں تھے۔ اسی زمانے میں آہستہ آہستہ زمین ان کے پیروں کے نیچے سے کھسکتی جا رہی تھی۔ ان کے تحکمانہ

انداز، ان کی خود پسندی، ان کی خود اعتمادی اور خودنمائی نے انھیں فرصت ہی نہ دی کہ وہ اپنے آس پاس ہونے والے تغیرات کا جائزہ لے سکتے۔ ٹرسٹیوں کی اکثریت تو پہلے ہی سے ان سے خائف اور آزردہ تھی۔ اب ان کے سب سے بھروسے مند حمایتی یعنی مسٹر بیک (اور ان کے ساتھ کل یورپین اسٹاف) نے بھی ان کا ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا تھا۔ مسٹر بیک کے لیے سید محمود کی قانونی لیاقت اور قاعدے قوانین کی پابندی کی تلقین ایک مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ وہ ایسے آدمی کو ترجیح دینے کے لیے تیار تھے جو ان کا افسرِ اعلیٰ ہونے کے باوجود کسی طرح سے ان کو اپنا پابند کرنے کا مجاز نہ ہو سکے۔ یہ صورتِ حال اسی وقت ممکن ہو سکتی تھی جب سکریٹری کے بطور سید محمود کے بجائے کسی نسبتاً روایتی نہج اور مصالحتی خو کے شخص کو سکریٹری کے عہدے کے لیے منتخب کروالیا جائے۔ سمیع اللہ خاں صاحب کی تقلید پسندی اور سید احمد خاں صاحب کی آزاد خیالی کے درمیان جو کشمکش ہمیشہ سے چلی آرہی تھی اس میں مسٹر بیک ذاتی وجوہ کی بنا پر سمیع اللہ خاں صاحب کے ساتھ وقار الملک اور محسن الملک سے بھی عناد اور بغض روا رکھتے تھے۔ لیکن جیسے ہی محسن الملک نے سمیع اللہ خاں صاحب اور وقار الملک سے اپنے آپ کو علیحدہ کرنا شروع کیا تو وہ سید محمود کے مقابلے میں مسٹر بیک کے لیے ایک عمدہ متبادل بن کر سامنے آگئے۔ رامپور کے واقعے کے بعد سمیع اللہ خاں صاحب کی سکریٹری شپ کے لیے امیدواری قطعی کالعدم قرار دی جا چکی تھی اور وقار الملک کو اس عہدے سے دور رکھنے کے لیے محسن الملک کی حکمتِ عملی اور فراست خاصی کارگر ثابت ہوئی تھی اسی وجہ سے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کی کوششوں کے ذریعہ مسٹر بیک کو مہدی علی خاں صاحب اور دوسرے متعلقہ ٹرسٹیوں کی طرف سے تعاون اور ان کے مفادات کے تحفظ کی پوری یقین دہانی کے بعد مسٹر بیک (یعنی یورپین اسٹاف) پوری طرح سے محسن الملک کی سکریٹری شپ کی دعوے داری کے حامی ہو گئے تھے۔ مسٹر بیک ہی کی کوششوں سے اس سلسلے میں لفٹننٹ گورنر کی ایما بھی حاصل کر لی گئی تھی۔ سید محمود ابھی تک مسٹر بیک اور محسن الملک کے مابین اتحاد واشتراک کے بطور طے کی گئی تجاویز سے بڑی حد تک بے خبر تھے۔ مسٹر بیک نے اپنے خط مورخہ ۲۱ر نومبر ۱۸۹۸ء کے ذریعہ سید محمود کو ان تجاویز سے باخبر کروایا تھا جن کی رو سے طے کیا گیا تھا کہ سید محمود ٹرسٹیوں کے لائف پریسیڈنٹ (ان تمام اختیارات کے ساتھ جو وہ اپنے پاس رکھنا پسند کریں) نامزد کیے جائیں تاکہ ان کی جگہ ٹرسٹیان اپنی پسند کے مطابق محسن الملک کو اپنا سکریٹری منتخب کر سکیں۔[۲۵] اس خط کے موصول

ہونے کے بعد سید محمود نے متعدد نہایت طویل خطوط کے ذریعہ مسٹر بیک کو یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ محسن الملک بھی سمیع اللہ خاں صاحب اور وقار الملک جیسے تقلید پسند لوگوں میں سے ایک ہیں جن کے خوف سے مسٹر بیک نے قانونِ ٹرسٹیان کے ذریعہ یہ کوشش کی تھی کہ آئندہ یہ لوگ سکریٹری کے عہدے پر قابض نہ ہوسکیں۔ اسی کے ساتھ سید محمود نے مسٹر بیک اور مسٹر موریسن کو طرح طرح کی رعایتیں دینے کے وعدے بھی کیے تھے۔ سید محمود نے بیچ کا راستہ نکالنے کی غرض سے اس بات پر بھی اپنی رضامندی ظاہر کی تھی کہ اگر سید محمد احمد خاں صاحب کو سکریٹری منتخب کیا جاسکے تو وہ اپنے عہدے سے مستعفی ہونے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن ان کی یہ سب کوششیں بے کار ثابت ہوئیں اور ۳۱ر جنوری ۱۸۹۹ء کے اجلاس ٹرسٹیاں میں اکثریت کی رائے سے (یعنی ۵۰ ووٹوں سے) سید محمود ٹرسٹیوں کے صدر اور سید مہدی علی خاں (محسن الملک) ٹرسٹیوں کے سکریٹری منتخب کیے گئے تھے۔

محسن الملک کا خاکسارانہ رویہ:

جس اجلاسِ ٹرسٹیان میں محسن الملک سکریٹری منتخب ہوئے تھے اس جلسے کا چشم دید حال مختلف لوگوں نے قلم بند کیا ہے۔ یہ ایک بات ان سب تذکروں میں مشترک ہے کہ سکریٹری منتخب ہوجانے کے بعد محسن الملک نے اپنی ٹوپی سید محمود کے قدموں میں یہ کہہ کر رکھ دی تھی کہ اگر وہ انہیں اجازت دیں تب ہی وہ سکریٹری ہونا پسند کریں گے۔ اس سلسلے میں میر ولایت حسین کی آپ بیتی میں تحریر ہے کہ:

> ''منشی نجم الدین صاحب کا جو اس جلسہ میں موجود تھے، بیان ہے کہ اس تجویز کے پاس ہونے پر نواب محسن الملک نے سید محمود کے قدموں پر اپنی ٹوپی ڈال دی اور رو رو کر کہا کہ تو میرا شہزادہ ہے اگر تو مجھ کو سکریٹری کرے تو سکریٹری ہوتا ہوں''۔ [۲۶]

''مشاہدات وتاثرات'' میں شیخ عبداللہ صاحب تحریر کرتے ہیں کہ جب صدرِ جلسہ نے سید محمود کو اپنی بات کہنے کے لیے پانچ منٹ سے زیادہ وقت دینے سے انکار کیا تو سید محمود اپنے کاغذات اٹھا کر ہال سے باہر جانے لگے۔

> ''لیکن ابھی وہ دروازے تک پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ نواب محسن الملک اپنی کرسی سے اٹھے اور اپنی ٹوپی اتار کر سید محمود کے قدموں پر

رکھی اول تو سید محمود بہت چیں بہ جبیں ہوئے لیکن جب محسن الملک زارزار رونے لگے تو جھک کر ان کو اٹھالیا اور گلے سے لگالیا''۔[۲۷]

مولوی محمد امین صاحب ''حیات محسن'' میں تحریر کرتے ہیں کہ سکریٹری منتخب ہو جانے کے بعد محسن الملک نے ہال کے باہر برآمدے میں آکر سید محمود کا ہاتھ پکڑا کہا کہ:

''محمود سن یہ وقت ایسا ہے کہ مجھے اور تجھ کو دونوں کو مر جانا چاہیے۔ میں ٹرسٹیوں کے کہنے کی کچھ پرواہ نہیں کرتا اگر تو مجھے سکریٹری مقرر کرے تو میں سکریٹری مقرر ہوتا ہوں، میری اور تیری ۳۰ برس کی دوستی ہے۔ تو نے اس عرصے میں مجھے بہت تکلیفیں دی ہیں، لیکن اس پر بھی میں تیرے کہنے سے باہر نہیں ہوں۔ تیری جوتیاں اٹھانے کو موجود ہوں۔ یہ کہہ کر نواب محسن الملک زمین پر گر پڑے اور سید محمود کے پیروں پر سر رگڑنے لگے''۔[۲۸]

اس واقعے میں سچائی جو بھی ہو لیکن مہدی علی خاں صاحب (محسن الملک) جیسے بردبار بزرگ کا یہ رویہ ہمیں ان کے شایانِ شان نظر نہیں آیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یا تو عوام میں اپنی مخصوص مخلصانہ وفدویانہ ساکھ بنانے کی غرض سے انھوں نے یہ وتیرہ اختیار کیا تھا۔ یا وہ سید محمود کے آئندہ ہونے والے ردِعمل سے واقعی خائف تھے اور اس طرح انھیں خوش کرنے کی سعی کر رہے تھے۔ یا پھر ان کے ضمیر پر کسی طرح کا بوجھ تھا۔ جس کو وہ اس طرح کچھ ہلکا کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ بہر حال حقیقت جو بھی رہی ہو لیکن ہم تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ سکریٹری منتخب ہو جانے کے بعد سرِ عام ٹرسٹیوں کے اجلاس میں سید مہدی علی خاں صاحب کا یہ طرزِ عمل ان کی شخصیت پر ایک سوالیہ نشان ضرور لگاتا ہے۔

سید محمود کا ردِ عمل:

سکریٹری شپ سے ہٹائے جانے سے سید محمود کی 'انا' پر اس قدر گہری ضرب لگی تھی کہ جس کی وجہ سے ان کی پوری شخصیت ایک طرح سے منتشر ہو کر رہ گئی تھی۔ ان کا ردِ عمل نہایت شدید تھا۔ اب وہ ایک زخمی شیر کی مانند تھے جس کو کسی بھی طرح سے قابو میں رکھنا محال تھا۔ وہ ہر ایک سے انتقام لینے کے متمنی نظر آتے تھے۔ انھیں اپنی ذلت اور رسوائی کا بھی شدت سے احساس تھا۔ جہاں ایک طرف شراب کے نشے میں وہ ان تلخ اور کثیف

احساسات سے فرار حاصل کرتے تھے۔ وہیں دوسری طرف اپنے قلم کی نوک سے لوگوں کو لہولہان کر کے وہ اپنے جذبۂ انتقام کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتے تھے۔ ان کے چچا زاد بھائی سید محمد احمد خاں اور دیرینہ معتقد مرزا عابد علی بیگ ہی ان کے جاں نثاروں کے بطور اب ان کے ساتھ موجود رہ گئے تھے۔ (جو ان کے ہرجا اور بے جا عمل میں ان کے برابر کے شریک ہوتے تھے) سید محمود کے قلم میں اب بھی کافی رعنائی باقی تھی جس کی وجہ سے وہ محسن الملک کے ذریعہ پیش کی گئی ہر تجویز کی مخالفت نہایت موثر انداز سے کرتے تھے۔ اسی لیے محسن الملک کے لیے کسی بھی کام کو کرنے کے لیے ٹرسٹیوں کی منظوری حاصل کرنا محال ہو گیا تھا۔ ٹرسٹیوں کے صدر نامزد ہونے کے ناطے ہر اجلاس کی صدارت سید محمود ہی کیا کرتے تھے اسی لیے یہ طولانی اجلاس، تجویزوں پر باکثرت بحث و مباحثہ کے باوجود، کسی فیصلے پر پہنچے بغیر ہی برخاست ہو جاتے تھے۔ یورپین اسٹاف بھی اب سید محمود کی انتقامی کارروائیوں کے نشانے پر رہتا تھا۔ کالج کے اسٹاف کا ہر وہ شخص جو مسٹر بیک اور مسٹر ماریسن سے کسی طرح کی وفاداری کا مرتکب ہوتا تھا سید محمود کی انتقامی کارروائیوں کا ہدف ضرور بنتا تھا۔

مسٹر بیک سے مخالفت:

جولائی ۱۸۹۹ء میں حالات کافی تشویشناک ہو گئے تھے۔ ہمیں صحیح واقعات کا تو علم نہیں ہے۔ لیکن اس زمانے میں مسٹر بیک کے شملہ سے تحریر کیے گئے چند خطوط سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ غالباً سید محمود کی ایما پر ہوسٹل کے اندر شیعہ بورڈروں کے لیے ایک علیحدہ مسجد تعمیر کیے جانے کا مطالبہ اٹھایا گیا تھا۔ شیعہ بورڈروں نے ہوسٹل کے انچارج اساتذہ یعنی مسٹر نیاز محمد خاں اور مسٹر غلام محی الدین صاحب کے سامنے اپنے مطالبات پیش کیے تھے جس پر غالباً انھوں نے طلبا کو تنبیہ کی تھی جس کے نتیجے میں مذکورہ اساتذہ اور طلبا میں کشیدگی پیدا ہو گئی تھی اور نوبت پولیس میں رپورٹ درج کروانے تک پہنچی تھی۔ ان واقعات کے سلسلے میں مسٹر بیک نے شملہ سے جو تادیبی خطوط مرزا عابد علی بیگ، سید محمد احمد خاں صاحب اور سید محمود کو تحریر کیے تھے ان سے ان واقعات کی اصل نوعیت پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ مسٹر بیک نے اپنے خط مورخہ ۱۵ر جولائی ۱۸۹۹ء بنام مرزا عابد علی بیگ میں تحریر کیا تھا کہ:

> ''میں آپ کے کارناموں کی مکمل تفصیل سن چکا ہوں کہ آپ نے کس طرح ضابطوں کی خلاف ورزی کی ہے۔ انتظامی معاملات میں خلل

ڈالا ہے۔ ایک استاد کے خلاف جھوٹے الزامات عائد کیے ہیں اور کالج کو زک پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ میں اس سے بھی واقف ہوں کہ جب سے آپ ریٹائر ہوئے ہیں یعنی پچھلے دو سال میں کالج کے اندر ہونے والے ہر جھگڑے کے پیچھے آپ کے محرکات شامل رہے ہیں۔ میں آپ کے مقاصد اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ آپ جن کو اپنا مخالف سمجھتے ہیں ان کو بدنام کرنا یا ان کی ساکھ خراب کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ آپ جان بوجھ کر کالج اور مسلمانوں کے مفاد کو زک پہنچاتے ہیں۔ میں آپ کے ان طور طریقوں سے اس وجہ سے بخوبی واقف ہوں کہ خود ان کا شکار ہو چکا ہوں۔ آپ دوستوں میں نفاق ڈلوانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بغض اور کینہ پروری کی باتوں کو مشتہر کرتے ہیں۔ آپ میں خود سامنے آنے کی ہمت نہیں ہوتی ہے اسی وجہ سے آپ ہمیشہ کسی دوسرے کو سامنے کر دیتے ہیں اور خود کو دھوکے اور فریب کے ذریعہ صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ کی یہ خصوصیات اب کالج کے خیر خواہوں پر عیاں ہوگئی ہیں۔ اس لیے میری یہ صلاح ہے کہ بہتر ہوگا کہ آپ علی گڑھ چھوڑ دیں اور ٹرسٹی شپ سے مستعفی ہو جائیں جس کے لیے آپ اپنے آپ کو قطعی نااہل ثابت کر چکے ہیں۔ میں یہاں موجود رہ کر سرسید کی خواہشات کو بدخواہی کی سازشوں کے ذریعہ پامال کرنے کی کسی کو اجازت نہیں دے سکتا ہوں''۔ [۲۹]

اس خط کے ساتھ ہی ۱۶؍جولائی ۱۸۹۹ء کو مسٹر بیک نے شملہ سے سید محمد احمد خاں صاحب کے نام مندرجہ ذیل خط ارسال کیا تھا جس میں تحریر تھا کہ:

''خدا کی کبھی یہ مرضی نہیں رہی ہوگی کہ آپ کسی اسکول یا کالج سے کوئی واسطہ رکھیں۔ آپ کا استادوں کے خلاف فوجداری کا مقدمہ دائر کرنے کا کارنامہ تھیٹر کا ایک مزاحیہ سین تو ہوسکتا ہے لیکن میں کالج کو مسخروں کی آماجگاہ کے بطور رسوا کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا ہوں۔ یہ آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی کہ بے چارے سید محمود

اپنے ہوش میں نہیں ہیں اور ان کی اس طرح کی حرکات انہیں عوام میں اور زیادہ رسوا کر رہی ہیں اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ مرزا عابد علی بیگ ایک گھٹیا قسم کے سازشی انسان ہیں جو ہمیشہ آپس میں جھگڑے کروانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اسی لیے کسی شریف آدمی کے لیے ان سے بے تکلفی یا دوستی کا سلوک روا رکھنا صحیح نہیں ہے لیکن جب آپ اس طرح کے لوگوں کو اپنا قائد تسلیم کر لیتے ہیں تو اس عمل سے آپ اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کی عزت کو رسوا کرتے ہیں۔ میں آپ کی شریفانہ طبیعت سے واقف ہوں لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ اس بات کو بھی ذہن نشین کر لیں کہ جہاں تک کالج جیسے عظیم ادارے کے نظم و نسق میں دخل اندازی کا تعلق ہے۔ جس کے قائم رکھنے کی قانونی ذمہ داری میری ہے اس لیے میں کسی بھی مروت یا خوف کے بغیر اپنی ڈیوٹی بخوبی انجام دینے میں نہ ہچکچاؤں گا۔ آپ کی تمام تر مخالفت اور دروغ گوئی پر مبنی الزامات کے باوجود میرے دل میں آپ کے لیے خیر خواہی کے جذبات موجود ہیں کیوں کہ مجھے اندازہ ہے اور جسے خود آپ نے بھی ٹرسٹیوں کی میٹنگ میں بیان کیا تھا کہ آپ نے جو کچھ کہا ہے یا لکھا ہے وہ اپنے طور پر نہیں لکھا ہے بلکہ مرزا کے کہنے پر یہ سب کیا ہے۔ اسی لیے میں یہ خط لکھ کر آپ کو خبردار کرنا چاہتا ہوں کہ اس طرح کی مزید نادانیاں کر کے اپنے آپ کو اور زیادہ رسوا نہ کریں''۔[۳۰]

مندرجہ بالا خطوط کے ساتھ ہی مسٹر بیک نے ۱۸ر جولائی ۱۸۹۹ء کو سید محمود کو مندرجہ ذیل خط تحریر کیا تھا:

''مجھے معتبر ذرائع سے علی گڑھ سے اطلاع ملی ہے کہ آپ نے مسٹر عابد علی بیگ اور سید محمد احمد صاحب کے ساتھ مل کر ایم اے او کالجیٹ اسکول کے طلبا کو ان کے استادوں کے خلاف شکایتیں کرنے کے لیے اکسایا تھا اور اساتذہ پر طلبا کو غلط سزائیں دینے کا الزام لگوایا تھا۔ آپ اور آپ کے ساتھ مندرجہ بالا دو حضرات پولیس سپرنٹنڈنٹ

کے پاس گئے تھے اور انھیں مجبور کیا تھا کہ وہ آپ کے ساتھ پولیس کے سپاہی بورڈنگ ہاؤس میں بھیجیں تا کہ استادوں کو گرفتار کیا جا سکے۔

۲۔ میں ان واقعات کے سلسلے میں ضابطے کی انکوائری کر رہا ہوں تا کہ اصل حالات معلوم ہو سکیں اور جب انکوائری مکمل ہو جائے گی تو میں آپ کو اس کے ذریعہ سامنے آنے والے حقائق سے آگاہ کروں گا تا کہ آپ اگر مناسب سمجھیں تو اپنی صفائی یا اپنے نقطۂ نظر کو واضح کر سکیں۔

۳۔ حالاں کہ آپ کے رویہ نے اس نظم ونسق کی جڑیں ہلا دی ہیں جس کے بغیر کوئی تعلیمی ادارہ قائم نہیں رہ سکتا ہے اور اسی کے ساتھ آپ نے پرنسپل کی حیثیت سے مجھے ملے اختیارات کو بھی پامال کر دیا ہے۔

۴۔ میں یہاں اس بات کا مزید اضافہ کرنا چاہوں گا کہ آپ نے جان بوجھ کر میرے اختیارات پر اپنے ایک آفیشیل خط میں حملہ کیا ہے جو آپ نے میرے ایک ماتحت کو لکھا ہے جس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے۔

''اس طرح کا رویہ مذہبِ اسلام کے منافی ہے اور اللہ کی زبان میں، جو قادرِ مطلق ہے، جیسا کہ قرآن میں موجود ہے لیکن آپ کا نام نیاز محمد خاں ہونے کے باوجود پرنسپل تھیوڈور بیک سے زیادہ حماقت کا حامل معلوم ہوتا ہے جن کے بل بوتے پر آپ نے یہ شرارتی طریقہ اختیار کیا تھا۔ اس میں آپ کی اسلامی مذہبیات کے تئیں جہالت آشکارا ہے اور ساتھ ہی پرنسپل تھیوڈور بیک کے احکام کی مکمل غلامی کا پرتو نظر آتا ہے''۔

آپ کے خیالی اور مضحکہ خیز الزامات سے درگزر کرتے ہوئے جو آپ نے مجھ پر اور مسٹر نیاز محمد خاں پر ایک مزید مسجد تعمیر کروانے کی آپ کی خواہش کے سلسلے میں عائد کیے ہیں، میں آپ کی توجہ اس

بات کی طرف مبذول کروانا چاہتا ہوں کہ آپ نے میرے ماتحتوں کی سرکاری کاموں کے سلسلے میں فرمانبرداری کو غلامی سے تعبیر کر کے انھیں میرے احکامات نہ ماننے پر اکسانے کی کوشش کی ہے۔

۵۔ میں نے یہ معمولی باتیں آپ کے ذہن کے رویہ کی نشان دہی کرنے کے لیے لکھی ہیں۔ جو مجھے نظر آتی ہیں اور جن کے بارے میں مجھے متعدد لوگوں سے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے اختیار کر رکھی ہیں۔ یعنی آپ نے یہ مصمم ارادہ کر رکھا ہے کہ ہر طرح کے منصبی اختیارات کو درہم برہم کر کے کالج کے انتظامات کو ناممکن بنا دیا جائے۔

۶۔ اگر آپ کے ان الزامات میں ذرا بھی سچائی ہوتی، جو آپ نے کالج کے دو استادوں کے اوپر لگائے ہیں تو آپ قاعدے کے مطابق انھیں، میری رائے جاننے کے لیے، میرے پاس بھیجتے اور شائستگی اور کالج کی عزت کی خاطر ایسے معاملات کا بنٹارا ذاتی طور پر ادارے کے اندرونی نظم ونسق کے قواعد کی مطابقت سے کیا جاتا اور انھیں کورٹ کچہری میں لے جا کر الم نشرح نہ کیا جاتا۔

۷۔ میرے پاس اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے کہ میں سرسید کے قائم کیے ہوئے اس کالج کے نام کو بدنامی اور رسوائی سے بچانے کے لیے حتی الامکان کوشش کروں تا کہ اس طرح کے غیر مہذب واقعات دوبارہ یہاں نہ ہوسکیں۔ یقین کیجیے یہ میرے لیے نہایت تکلیف دہ عمل ہوگا خاص طور پر ہماری دیرینہ دوستی کو دیکھتے ہوئے لیکن میں یہ اقدام اٹھانے کے لیے مجبور ہوگیا ہوں اور آپ کی خدمت میں مودبانہ صلاح پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ خود اپنے ذہنی سکون اور کالج کی عمدہ ساکھ کی خاطر اچھا ہوگا کہ آپ اس کالج سے اپنا آفیشیل تعلق ختم کرلیں تا کہ آئندہ ہمیشہ کے لیے اس غیر شائستہ قضیہ کو ختم کیا جاسکے جس سے اس میں ملوث لوگوں کی بدنامی ہونا لازمی امر ہے''۔[۳۱]

مندرجہ بالا واقعات کے سلسلے میں انکوائری کرنے کی غرض سے مسٹر بیک نے

شملہ سے مورخہ ۱۸؍جولائی ۱۸۹۹ء کو ایک خط میر ولایت حسین صاحب کو بھی تحریر کیا تھا جس کی کاپیاں مندرجہ ذیل لوگوں کو ارسال کی گئی تھیں۔

۱۔میر ولایت حسین ۔۲۔مسٹر ایف جے مون ۔۳۔نیاز محمد خاں صاحب۔ ۴۔غلام محی الدین صاحب ۔۵۔محمد عبداللہ اور ۶ ۔ پروفیسر ضیاء الدین صاحب۔ اس خط میں انھوں نے تحریر کیا تھا کہ:

''میری آپ سے درخواست ہے کہ برائے مہربانی مندرجہ ذیل امور کے سلسلے میں آپ جو کچھ جانتے ہوں اس کے بارے میں مجھے اپنی مکمل رپورٹ کے ذریعہ مطلع کریں۔

(۱) سید محمود کے ذریعہ ہوسٹل میں مسٹر نیاز محمد خاں اور مسٹر غلام محی الدین کو پریشان کرنے یا گرفتار کروانے کے لیے پولیس کے سپاہی کو بلانے کا واقعہ اور دوسرے وہ تمام حالات جو اس سے متعلق ہوں۔

(۲) سید محمود کے ذریعہ کیا گیا کوئی بھی وہ کام جو بورڈنگ ہاؤس یا کالج کے نظم ونسق کو کمزور کرنے یا طلبا کو نافرمانی کرنے پر اکسانے کے لیے کیا گیا ہو۔

(۳) پچھلے دو مہینوں کے اندر سید محمود کے ذریعہ نشہ کی حالت میں بورڈنگ ہاؤس کے اندر کیا گیا کوئی بھی عمل۔

میں آپ سے درخواست کروں گا کہ ان واقعات کے سلسلے میں مندرجہ ذیل امتیازات کو روا رکھیں کہ:

(۱) وہ واقعات جو آپ نے اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں۔

(۲) وہ واقعات جن کے بارے میں آپ نے صرف سنا ہے۔

(۳) یا وہ نتائج جو آپ نے مختلف واقعات کی بنا پر اخذ کیے ہیں۔

اسی کے ساتھ میں یہ بھی چاہوں گا کہ ان واقعات کے سلسلے میں مرزا عابد علی بیگ صاحب اور محمد احمد خاں صاحب کی حرکات وسکنات اور حصہ داری سے بھی آپ لوگ مجھے آگاہ کریں''۔[۳۲]

یہ وہ زمانہ تھا جب مسٹر بیک پوری طرح کالج کے انتظامات پر حاوی ہو گئے تھے۔ کیوں کہ ان کی مدد اور ایما حاصل کرنے کے بعد ہی محسن الملک سید محمود کو سکریٹری شپ

سے معزول کروا کر سکریٹری منتخب ہونے میں کامیاب ہوئے تھے اسی وجہ سے مسٹر بیک کے اتنے احسان مند اور مشکور تھے کہ کسی بھی حالت میں ان پر انگلی نہیں اٹھا سکتے تھے۔ دوسری طرف سید محمود کی انا پر ایسی کاری ضرب لگی تھی کہ وہ اپنی انتقامی کارروائیوں میں صحیح اور غلط کا امتیاز ہی کھو بیٹھے تھے۔ ہر شخص ان سے خائف اور نالاں تھا اور یقین رکھتا تھا کہ صرف یورپین اسٹاف ہی سید محمود پر انکوش لگا سکتا ہے اس لیے ہر مسئلے میں مسٹر بیک کی حمایت کرتے تھے۔ مسٹر بیک ایک مشاق انگریز حکمراں کی طرح ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کے مصداق اپنا دائرہ اختیار بڑھانے میں مصروف تھے۔ مسٹر بیک اپنے خط مورخہ ۲۲/ جولائی ۱۸۹۹ء میں شملہ سے محسن الملک کو تحریر کرتے ہیں کہ:

> ''آپ نے محمود، عابد علی اور محمد احمد کو جو خطوط لکھے ہیں میں ان سے قطعی متفق ہوں میں نے ان (خطوط) کو انگریزی میں اپنے اس نوٹ کے ساتھ کہ محمد احمد نے ٹرسٹی شپ سے اپنا استعفیٰ پیش کر دیا ہے، چھپوا کر رکھ لیا ہے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو ان کو ٹرسٹیوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ برائے مہربانی اس سلسلے میں تار سے مطلع کریں۔ لفٹنٹ گورنر سے آپ کی ملاقات کے بارے میں معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی اور آپ نے جو میمورنڈم انھیں دیا ہے اس کے لیے میری مبارک باد قبول کیجیے۔
>
> میں نے یہ طے کر لیا ہے کہ محمود کے سلسلے میں ٹرسٹیوں کو مجھ میں اور ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ کیوں کہ میری صحت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ میں بیک وقت پرنسپل ہونے کے ساتھ ساتھ پاگل خانے کے جیلر کے فرائض بھی انجام دوں، کیوں کہ یہ دونوں ہی کل وقتی کام ہیں۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے اور غالباً آپ کا بھی۔ ہم لوگ ٹرسٹیوں کی میٹنگ پر امن طریقہ سے نہیں کر سکتے ہیں۔ ہم لارڈ کرزن کو کالج میں مدعو نہیں کر سکتے ہیں۔ حالاں کہ وہ اس سلسلے میں اپنی خواہش کا اظہار کر چکے ہیں۔ ہمارے طلبا روز یہ مکرو منظر دیکھتے ہیں کہ ایک شرابی ان کے درمیان گھوم رہا ہے اور ہر ایک پر چیخ چلا رہا ہے۔ ان کے مذہبی فرائض کی ادائیگی کی بے حرمتی

کرر ہا ہے اوران کے استادوں کو گالیاں دے رہا ہے۔
یہ شخص ہماری قوم کا یکتا اعزاز تصور کیا جاتا تھا۔ ہم لوگ جو واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ کیا تھے اسی وجہ سے ان کے لیے خلوص اور محبت کے جذبات رکھتے ہیں اوران کی بہت سی خطاؤں کو درگزر بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن عوام کا معاملہ مختلف ہے۔ جیسے جیسے ان کے بدقسمت مرض کے ساتھ ان کا ذہنی توازن متزلزل ہوتا جارہا ہے۔ (میں ان کی شراب کی لت کوایک لا علاج مرض تصور کرتا ہوں) ویسے ویسے وہ زیادہ کینہ پرور ہوتے جارہے ہیں۔ اس میں ان کی زندگی بھر کی ٹریننگ ان کی اعانت کرتی ہے۔ وہ ہر شخص کے خلاف قانونی چارہ جوئی کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ وہ کافی عرصہ سے اسی سلسلے میں لوگوں کوڈرادھمکارہے تھے لیکن اب انھوں نے ان دو استادوں کے خلاف مقدمہ دائر کر کے اس کی عملی شروعات کردی ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس عمل کی انتہا کہاں ہوگی۔ جلد ہی آپ پر اور مجھ پر اور دوسرے بہت سے لوگوں پر مقدمے دائر کیے جائیں گے کیوں کہ پاجی خصلت مرزامحمود کے پاگل پن کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی ذاتی عداوتوں کے بدلے چکانے کی کوشش کرے گا۔ میں تو فیصلہ کر چکا ہوں اور آپ سے بھی درخواست ہے کہ ثابت قدم رہیں۔ حالاں کہ یہ آسان کام نہیں ہوگا کیوں کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ علی گڑھ میں رہیں اور محمود اپنے ہوش وحواس میں رہیں اور مرزا انھیں وقتی طور پر تنہا چھوڑ دیں۔ چوں کہ چھٹیوں کے ختم ہونے سے پہلے کوئی کاروائی نہیں کی جاسکتی ہے اس لیے اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو دو مہینے کے لیے علی گڑھ سے الموڑا آ گیا ہوتا۔ یہاں کا موسم نہایت خوبصورت ہورہا ہے۔ ہمارے بچے کی پیدائش پر مبارک باد بھیجنے کا بہت بہت شکریہ قبول کیجیے۔"

نوٹ: یہاں ایک اور بات کہنا چاہتا ہوں ہمیں مشتاق حسین (یعنی وقار الملک) کے محمود اور مرزا سے مل جانے کی خبر سننے کے لیے

تیار رہنا چاہیے۔ لیکن میرے خیال میں یہ لوگ ۱۲ ممبروں سے زیادہ
کی تائید یا حمایت حاصل نہ کرسکیں گے۔ وہ خود چاہے جو کچھ کہیں
مجھے اس سلسلے میں کوئی مغالطہ نہیں ہے''۔[۳۳]

مسٹر بیک کا انتقال:

اس زمانے میں مسٹر بیک کافی علیل تھے۔ وہ شملہ میں صحت کی بحالی اور علاج کے لیے مقیم تھے مسٹر بیک کو اپنے تحریر کردہ انتظامی لائحہ عمل کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اپنی علالت کی وجہ سے زیادہ وقت نہ مل سکا تھا۔ اگست ۱۸۹۹ء میں ان کی طبیعت زیادہ خراب ہونا شروع ہوگئی تھی۔ جگر میں پھوڑا تشخیص کیا گیا تھا۔ جب علاج سے کوئی افاقہ نہ ہوا تو آپریشن کیا جانا تجویز کیا گیا تھا۔ لیکن آپریشن کے باوجود وہ اس بیماری سے جاں بر نہ ہوسکے تھے اور ۲ ستمبر ۱۸۹۹ء کی رات ساڑھے آٹھ بجے ان کا انتقال ہوگیا تھا۔ شملہ ہی میں ان کی تدفین کی گئی تھی۔

مسٹر ماریسن اس زمانے میں چھٹی (فرلو) پر انگلستان گئے ہوئے تھے ان کا ارادہ تھا کہ چھٹی ختم ہونے کے بعد وہ کالج سے مستعفی ہوجائیں گے اور انگلستان ہی سے اپنا استعفیٰ بھیج دیں گے۔ مسٹر بیک کے انتقال کے بعد سکریٹری ٹرسٹیان نے بذریعہ تار انھیں کالج میں پرنسپل کا عہدہ سنبھالنے کی پیش کش کی تھی۔ مسٹر ماریسن نے اس پیش کش کو قبول کرتے ہوئے اپنی مشروط رضامندی سے سکریٹری ٹرسٹیان کو مطلع کیا تھا (مسٹر ماریسن نے یہ شرط رکھی تھی کہ وہ اپنے کام کے سلسلے میں سید محمود سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے) غرض ۲۹ر اکتوبر ۱۸۹۹ء کو مسٹر ماریسن نے انگلستان سے واپس آکر کالج کے پرنسپل کے آفس کا چارج سنبھال لیا تھا۔

سید محمود کی ازدواجی زندگی میں انتشار:

سید محمود کے سکریٹری شپ سے ہٹنے سے پہلے ہی سے ان کے اپنی بیگم صاحبہ سے تعلقات کشیدہ ہونا شروع ہوگئے تھے۔ جہاں تک ہم سمجھ سکے ہیں یہ کشیدگی اور اختلافات خواجہ وجیہ الدین خاں صاحب اور سید راس مسعود کی وجہ سے شروع ہوئے تھے۔ مشرف جہاں بیگم صاحبہ اپنے بھائی اور بیٹے دونوں کو سید محمود کی متلون مزاجانہ ''عتاب وعنایات'' کی کارروائیوں سے محفوظ رکھنا چاہتی تھیں اسی وجہ سے سید محمود کی ناخوشگواری اور عداوت کا شکار

ہوئی تھیں۔ خواجہ وجیہ الدین، سید محمود کے پرسنل اسسٹنٹ کے بطور کالج کے اسٹاف میں متعین تھے۔ جس زمانے میں سید محمود کے بجائے محسن الملک کو سکریٹری منتخب کیے جانے کی تجویز پر عمل جاری تھا اس زمانے میں سید محمود نہایت آشفتہ مزاج ہو گئے تھے۔ ان کے آفس کا اسٹاف جو دن رات ان کی طولانی مراسلت اور مختلف کاغذات کی نقلیں تیار کرنے میں مصروف رہتا تھا اکثر ذرا سی تاخیر یا کوتاہی کے سبب سید محمود کی تادیبی کارروائیوں کا شکار بنتا تھا۔ اسی وجہ سے زیادہ تر اسٹاف کے لوگ چھٹی لے کر گھر بیٹھ گئے تھے جس کی وجہ سے سید محمود اور زیادہ برہم رہنے لگے تھے۔ اسٹاف کی کمی اور سید محمود کی متلون مزاجی کے سبب وہ لوگ بھی جو ان کے ہمدرد اور مخلص تھے ان کے ساتھ کام کرنے سے گھبرانے لگے تھے۔ غالباً اسی وجہ سے خواجہ وجیہ الدین بھی سول سرجن کے سٹرفکیٹ پر رجسٹرار سے تین مہینے کی چھٹی منظور کروا کر چلے گئے تھے۔ (بعد میں انھوں نے غالباً تین مہینے کی چھٹی اور بڑھوالی تھی) جس کی وجہ سے سید محمود ان سے سخت برہم ہو گئے تھے۔ سید محمود نے اس سلسلے میں اپنے خط مورخہ ۲۵/نومبر ۱۸۹۸ء میں مسٹر بیک (یعنی رجسٹرار کالج) کو احتجاجاً تحریر کیا تھا کہ:

> "یہ امر بالکل یقینی ہے کہ خواجہ وجیہ الدین کے زمرے کے عہدے داروں (یعنی سکریٹری کے پرسنل اسسٹنٹ) کی چھٹی منظور کرنے یا چھٹی منسوخ کرنے کا حق سوائے خود سکریٹری کے کالج کے کسی بھی عہدے دار کو نہیں پہنچتا ہے"۔ [۳۴]

جہاں تک ہمیں علم ہے خواجہ وجیہ الدین خاں صاحب جنوری ۱۸۹۹ء تک مستقل چھٹی پر رہے تھے۔ ۳۱/جنوری ۱۸۹۹ء کو محسن الملک کے سکریٹری منتخب ہو جانے کے بعد ہی انھوں نے چھٹی سے واپس آکر سکریٹری کے آفس میں اپنا کام سنبھالا تھا۔ ظاہر ہے اس زمانے میں محسن الملک کے آفس میں ان کے پرسنل اسسٹنٹ کے بطور کام کرنے والا کوئی بھی شخص سید محمود کے لیے کسی بھی طرح سے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا تھا۔ نہ کہ وہ شخص خود ان کی اپنی بیگم صاحبہ کا حقیقی بھائی تھا جو انہی کے مکان میں ان کے ساتھ ہی رہائش پذیر تھا۔ غرض اب وجیہ الدین خاں صاحب کی سرسید ہاؤس میں موجودگی سید محمود کو اپنی بیگم، مشرف جہاں صاحبہ سے متنفر اور برہم کرنے کے لیے کافی تھی۔ اسی کے ساتھ سکریٹری شپ سے معطلی کے بعد سید محمود نے اپنے صاحبزادے سید راس مسعود کو مدرسۃ العلوم میں تعلیم دلوانے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مدرسۃ العلوم کے اساتذہ جاہل ہیں اور معیارِ تعلیم ناقص ہے اس

لیے وہ خود اپنے بیٹے کی عمدہ تعلیم کا انتظام کرنا چاہتے تھے۔ مشرف جہاں بیگم صاحبہ اپنے بیٹے کو سید محمود کی متلون مزاجانہ ''عنایات'' سے محفوظ رکھنے کے لیے چاہتی تھیں کہ کسی طرح سید راس مسعود بورڈنگ ہاؤس میں داخل ہو جائیں تاکہ سید محمود کی مضرات سے محفوظ رہ سکیں۔ سید محمود ان اختلافات کی وجہ سے مشرف جہاں بیگم صاحبہ سے اس قدر متنفر اور برہم ہو گئے تھے کہ گھر کے اندر ایک طرح کا بٹوارہ سا ہو گیا تھا۔ سید محمود کبھی مکان کے اس حصہ میں نہ جاتے تھے جس میں بیگم صاحبہ اپنے صاحبزادے اور تین بھائیوں کے ساتھ رہتی تھیں نہ ادھر سے کوئی شخص مکان کے اس حصہ میں آنے کی ہمت کر سکتا تھا جس میں سید محمود اپنے چچازاد بھائی سید محمد احمد صاحب اور مرزا عابد علی بیگ صاحب کے ساتھ دن رات طویل مراسلے اور لامتناہی روئیدادیں لکھوانے میں مصروف رہتے تھے۔ سید محمود نے بیگم صاحبہ کو گھر کے اخراجات کے واسطے پیسہ دینا بھی بند کر دیا تھا۔ بیگم صاحبہ نے اپنے اور اپنے صاحبزادے کے گزارے کے لیے مختلف لوگوں کے ذریعہ، سید محمود سے مکان میں رہائش کے عوض کرایہ ادا کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ (کیوں کہ یہ مکان ان کے نام تھا) لوگوں کے کہنے پر یہ تصفیہ ہو گیا تھا کہ سید محمود جب تک مکان کے ایک حصہ میں مقیم رہیں گے وہ بیگم صاحبہ کو ڈیڑھ سو روپے ماہوار بطور کرایہ ادا کرتے رہیں گے۔ اس تصفیہ کے باوجود سید محمود شاذ و نادر ہی اس پر عمل کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے بیگم صاحبہ ہمیشہ مالی مشکلات سے دوچار رہتی تھیں۔ وہ اپنے بھائیوں کے ذریعہ اپنی مشکلات و تکالیف کی داستان ضلع کے حکام، خاص طور پر انگریز کلکٹر کے کانوں تک پہنچواتی رہتی تھیں۔ اس سلسلے میں ان کی ایک درخواست مورخہ ۲ر اکتوبر ۱۸۹۹ء، جو ضلع کلکٹر مسٹر آئی اے بلونی کی معرفت لفٹنٹ گورنر کی خدمت میں پیش کروائی گئی تھی۔ یوپی گورنمنٹ کی آرکایوز واقع لکھنؤ میں موجود ہے۔ اس درخواست سے مشرف جہاں بیگم صاحبہ کی ان مشکلات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے جو ان کو اس زمانے میں درپیش تھیں۔ مشرف جہاں بیگم صاحبہ اپنی اس درخواست میں تحریر کرتی ہیں کہ:

''قبل اس کے میں نے بذریعہ اپنے بھائی خواجہ فخر الدین احمد کے، اپنی تکلیف سے آپ کو اطلاع دے دی ہے اور خود بھی زبانی آپ سے کہہ دیا ہے۔ چوں کہ اب تک حالت بدستور ہے اور کئی مہینے سے سید محمود نے کچھ خرچ نہیں دیا ہے اس لیے بامجبوری میں آپ کی خدمت میں یہ عرضی بھیجتی ہوں کہ اسے آپ حضور رئیس جناب لفٹنٹ

گورنر بہادر دام اقبالہ کو بھیجوا دیں اور جو میری حالت ہے اس سے حضور ممدوح کو مطلع کر دیں تاکہ حضور ممدوح اپنی خاص مہربانی اور توجہ سے جو ہمیشہ سے اس خاندان پر وہ کرتے آئے ہیں اس کا انتظام کر دیں اور مجھے پوری امید ہے کہ جناب لفٹنٹ گورنر بہادر میرے خسر مرحوم سرسید کی خاطر اور خیال سے ایسا انتظام فرمادیں گے جس سے میرا بیٹا اور میں ان تکالیفات سے جو قابلِ بیان نہیں ہیں نجات پاؤں۔ جن باتوں پر میں جناب لفٹنٹ گورنر بہادر کی توجہ چاہتی ہوں وہ یہ ہیں:

۱۔ میرے بیٹے راس مسعود کی تعلیم اور تربیت کا انتظام کر دیا جائے اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے کسی یورپین پروفیسر کے سپرد کر دیا جائے اور کسی طرح کا اس کی تعلیم اور تربیت میں سید محمود کو دخل نہ ہو۔

۲۔ منجملہ پنشن سید محمود کے جس قدر نواب صاحب بہادر مناسب سمجھیں میرے خانگی اخراجات کے واسطے علیحدہ کر دیں اور ایسا انتظام ہو جائے کہ خزانے سے تار سے مجھے مل جایا کریں اور چوں کہ سید محمود وعدہ کر چکے ہیں کہ بابت کرایہ کوٹھی کے جو میرے نام ہے اور جس میں وہ رہتے ہیں، مبلغ ڈیڑھ سو روپے ماہوار دیا کریں گے اس لیے ماہ بہ ماہ کرایہ ملنے کا انتظام کر دیا جائے یا ان سے کوٹھی خالی کرادی جائے۔

۳۔ جس قدر قرضہ میری معرفت ذمہ سید محمود (ہے) جس کی تعداد قریب چھ ہزار روپے کے ہوگی اور جس کا ثبوت موجود ہے وہ اگر یک مشت نہ ہو سکے تو باقساط دلوا دیا جائے۔

۴۔ جو پنشن بابت خیر خواہی غدر کے میرے خسر کو ملتی تھی اور اب سید محمود کو ملتی ہے۔ وہ سید صاحب کے پوتے یعنی میرے بیٹے راس مسعود کے نام کر دی جائے۔ اگر چہ یہ پنشن سید محمود کی ہی حیات کے لیے ہے مگر بلحاظ اون ملکی اور قومی خدمات کے جو میرے خسر نے کی ہیں اور بلحاظ اوس توجہ اور مہربانی کے جو ہمیشہ سے سرکار نے مرحوم

سرسید پر کیے ہیں اور بنظر اوس دوستی کے جو نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کو
مرحوم سے تھی اگر خاص طور پر اور خاص رعایت فرما کر جناب لفٹنٹ
گورنر بہادر اس پنشن کو میرے بیٹے کے نام منتقل فرمادیں تو خاص
احسان ہوگا۔ ورنہ میرا اور میرے بیٹے راس مسعود کا گزارا مشکل ہے
اور اخراجات روزمرہ کے میسر آنا بھی دشوار ہے اور سید محمود کی حالت
اب اس درجہ پر پہنچ گئی ہے کہ اون کی طرف سے بلکہ اون کی زندگی
سے بھی مایوسی ہے میں نے ضروری باتیں اس عرضی میں لکھی ہیں اور
تفصیل اوس کی میرے بھائی خواجہ فخر الدین احمد بالمشافع آپ سے
کریں گے۔ اوسے آپ میری ہی زبان سے سمجھو اور جناب نواب
لفٹنٹ گورنر بہادر کو اس سے مطلع کردینا۔

مشرف جہاں محمود بیگم، زوجہ سید محمود، ۲/اکتوبر ۱۸۹۹ء بقلم خود"۔[۳۵]

سید راس مسعود کی تعلیم کا انتظام:

غالباً مندرجہ بالا درخواست ہی کی وجہ سے حکام کی ہدایات کے بموجب سید راس مسعود کو مسٹر ماریسن کی سرپرستی میں بورڈنگ ہاؤس میں داخل کروادیا گیا تھا۔ جس کے لیے مشرف بیگم صاحبہ کی تحریری اجازت بھی حاصل کرلی گئی تھی۔ سید محمود نے راس مسعود کے بورڈنگ ہاؤس میں داخل کیے جانے کے خلاف ناراضگی کا اظہار کیا تھا وہ انہیں واپس لانے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ بقول میر ولایت حسین ایک رات اپنے بیٹے کو تلاش کرنے کے لیے بورڈنگ ہاؤس میں آکر انھوں نے خاصا ہنگامہ بھی کیا تھا۔ جس کی وجہ سی وقتی طور پر سید راس مسعود کی رہائش کا انتظام مسٹر موریسن کے گھر پر ہی کردیا گیا تھا۔

سید محمود کی ماریسن کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی نیت:

غالباً ضلع کے اعلیٰ حکام نے راس مسعود کی والدہ کی ایما اور تحریری اجازت حاصل کرنے کے بعد سید راس مسعود کو مسٹر ماریسن کی سرپرستی میں بورڈنگ ہاؤس میں داخل کروادیا تھا۔ جب سید محمود نے بورڈنگ ہاؤس میں جاکر سید راس مسعود کو وہاں سے واپس گھر لانے کی کوشش کی تھی اس وقت حفظ ماتقدم کے بطور سید راس مسعود کی رہائش کا انتظام پرنسپل مسٹر ماریسن کی قیام گاہ پر ہی کروادیا گیا تھا۔ اس واقعہ کے بعد سید محمود نے مسٹر ماریسن

کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنے کی تیاریاں شروع کردی تھیں۔ اس سلسلے میں سرسید اکیڈمی (علی گڑھ) کی آرکائیوز میں سید محمود کی اپنے چند قانونی مشیروں کے ساتھ ایک مشاورتی میٹنگ کی روائیداد مورخہ ۴رفروری ۱۹۰۰ء موجود ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ اس وقت وہ کافی تندہی کے ساتھ مسٹر ماریسن کے خلاف مقدمہ دائر کرنے کے لیے اپنے خیر خواہوں کے ساتھ صلاح مشورہ کرنے میں مصروف تھے۔ اس روائیداد میں تحریر ہے کہ:

''علی گڑھ مورخہ ۴رفروری ۱۹۰۰ء

موجود اشخاص:

سید محمود اسکوایر، مرزا عابد علی بیگ صاحب، کے جوالا پرشاد، سید محمد احمد، سید محمود کے فرزند سید راس مسعود کس سرپرستی کے سلسلے کی مشاورۃ۔ مندرجہ ذیل متنازعہ مسائل وضع کیے گئے۔

۱۔ اسلامی قانون کے مطابق کیا ایک اجنبی شخص، جو بالغ اور ذی ہوش ہونے کے ساتھ ساتھ دوسری کل قانونی صلاحیتیں رکھتا ہے، بلا لحاظ بیٹے کی والدہ کی خواہشات کے (جو حیات ہیں) یا ایک باپ کے ذریعہ (جو حیات ہے) اپنے ۱۱ برس کی عمر کے بیٹے کا سرپرست کسی قانونی دستاویز کے ذریعہ (یا اس کے بغیر) مقرر کیا جا سکتا ہے۔ اگر ایسا ہوسکتا ہے تو کیا ایک غیر مسلم کو سرپرست کے بطور مقرر کیا جا سکتا ہے؟

۲۔ اگر ایسا ممکن ہو جائے تو کیا ایسے سرپرست کا تقرر (بیٹے کے تئیں) اس کے باپ کے خاندانی بزرگ ہونے کی حیثیت سے کل یا جزوی اختیارات سلب کردے گا۔ یعنی بیٹے کی سرپرستی سے متعلق باپ کی ذمہ داری اس حد تک ختم کردی جائے گی کہ اس کی بات کو مقرر کردہ سرپرست کی ہدایات کے سلسلے میں دخل اندازی کے مترادف سمجھا جائے گا۔

۳۔ اسلامی قانون کے مطابق ایک لڑکے کے لیے بلوغیت کی قانونی عمر کیا تجویز کی گئی ہے؟ اور کس حد تک وہ قانون انڈین بلوغیت ایکٹ (۱۸۷۵ء) سے متاثر ہوتا ہے؟

۴۔ کس حد تک اس طرح کے بچے کے سرپرست کا تنازعہ سول کورٹ میں شکایت دائر کرنے کا موضوع بن سکتا ہے؟ اور سول کورٹ کس طرح ایکٹ (XII۔۱۸۸۶) کی دفعہ ۵۵۳ کے تحت (جو شمالی مغربی صوبے میں رائج ہے) عمل کرے گا۔ دوسرے لفظوں میں کیا ''محمڈن لا'' کا بلوغیت کے سلسلے میں بلوغیت ایکٹ (IX۔۱۸۷۵) کے خلاف اطلاق کیا جا سکتا ہے؟

۵۔ کیا اگر کوئی قانونی دستاویز 'محمڈن لا' کے تحت لکھی جائے تو وہ تحریر سول کورٹ کے سرپرستی کے سلسلے کے ایکٹ (VIII۔۱۸۹۰) کے دخل دینے کے اختیار سے مبرا سمجھی جائے گی؟ یہ ایکٹ خاص طور پر ''سرپرستی'' کو مستحکم کرنے کے لیے پاس کیا گیا تھا جس کی وضاحت اس کی ابتدائی تمہید میں موجود ہے اور جس کی رو سے یہ بغیر کسی امتیاز کے سب پر یکساں طور سے عائد ہوتا ہے۔

۶۔ کیا 'محمڈن لا' کے تحت ایک پدری چچا (یعنی ایک ہی دادا کی اولاد) کو سرپرستی کے سلسلے میں لڑکے کی والدہ یا والدہ کے باپ اور بھائیوں پر فوقیت دی جائے گی یا نہیں؟

دستخط سید محمود۔ دستخط جوالا پرشاد، دستخط محمد احمد''۔[۳۶]

اس روئیداد کی آخری لائنوں میں سید محمود اس بات پر سوال اٹھا رہے ہیں کہ اسلامی قانون کی رو سے سید راس مسعود کی سرپرستی کے سلسلے میں ان کے نانا اور ماموں کے مقابلے میں ان کے (راس مسعود کے) چچا یعنی سید محمد احمد خاں صاحب کو فوقیت دی جائے گی یا نہیں؟ سید محمود کے اس سوال سے ہمارے اس مفروضہ کو تقویت ملتی ہے کہ اس زمانے میں مشرف جہاں بیگم صاحبہ کے والد اور بھائی (دو حقیقی بھائی اور ایک رشتہ کے بھائی) علی گڑھ میں ان کے ساتھ موجود تھے اور وہ بیگم صاحبہ اور ان کے صغیر سنہ صاحبزادے سید راس مسعود کو سید محمود کی جارحانہ کارروائیوں سے محفوظ رکھنے میں ان کی معاونت کر رہے تھے۔

سید محمود کا سیتا پور منتقل ہونا:

ویسے تو سید محمود عموماً لکھنؤ، الہ آباد اور سیتا پور وغیرہ آتے جاتے رہتے تھے اور

اکثر طویل عرصہ کے لیے علی گڑھ سے باہر مقیم رہتے تھے۔ لیکن اب حالات کافی خراب ہوتے جارہے تھے۔ خاص طور پر محسن الملک اور مسٹر ماریسن ان کی علی گڑھ میں موجودگی سے دل برداشتہ رہنے لگے تھے۔ دوسری طرف علی گڑھ میں چھوٹی چھوٹی باتیں سید محمود کو مشتعل کرنے کے لیے کافی ہوتی تھیں۔ خانگی معاملات میں بھی کشیدگی حد سے زیادہ بڑھ چکی تھی سید محمود گھر کے نوکروں تک سے مشکوک ہوگئے تھے اوران کے ہاتھ سے پانی پینے تک کے روادار نہیں تھے۔ (انہیں شک ہوگیا تھا کہ انہیں زہر دیا جاسکتا ہے) غالباً انھیں حالات کی وجہ سید محمود کے بھائی سید محمد احمد خاں نے مناسب سمجھا کہ انہیں اپنے ساتھ رہائش اختیار کرنے کے لیے سیتاپور منتقل ہوجانے کے لیے آمادہ کریں۔ وہ کب مستقل رہائش اختیار کرنے کے لیے علی گڑھ سے سیتاپور منتقل ہوئے تھے اس کے بارے میں ہم کوئی بات وثوق سے نہیں کہہ سکتے ہیں، لیکن خیال اغلب ہے کہ وہ اگست ۱۹۰۰ء تک عارضی طور پر علی گڑھ سے سیتاپور منتقل ہوگئے تھے۔ لیکن مختلف اجلاسوں میں شرکت کرنے اور اپنے مختلف نوعیت کے کاموں کوانجام دینے کے لیے وہ علی گڑھ آکر بھی لمبے عرصہ تک مقیم رہتے تھے۔ لیکن غالباً جون ۱۹۰۱ء کے بعد سے اُن کا علی گڑھ آنا جانا نسبتاً کم ہوگیا تھا۔ کہا جاسکتا ہے کہ اب وہ ایک طرح سے مستقل طور پر سیتاپور میں سکونت پذیر ہوگئے تھے۔

سید محمود کا وزیٹر مقرر کیا جانا:

سید محمود کے لکھنے کے مطابق ۱۴؍اپریل ۱۹۰۰ء کو نواب محسن الملک علی گڑھ میں ان کے پاس ''ڈیمی آفیشل'' ملاقات کے لیے تشریف لائے تھے۔ اوران کو ایک باضابطہ چھٹی جواردو میں لکھی ہوئی تھی مرحمت کی تھی جس سے ان کو بہت تعجب ہوا تھا۔ اس کی عبارت بجنسہٖ حسب ذیل تھی:

> ''مدرسۃ العلوم کے اکثر ٹرسٹیان کی خواہش ہے کہ آپ سے درخواست کی جائے کہ آپ کالج کی وزیٹری کا عہدہ قبول کریں''۔ ۳۷

''سالانہ بجٹ میٹنگ ٹرسٹیان منعقدہ ۲۷؍اکتوبر ۱۹۰۱ء میں تجویز تقرر سید محمود بر عہدہ وزیٹری کالج پاس ہوئی اور نواب فیاض علی خاں صاحب سید محمود کے بجائے دو سال کے لیے پریسیڈنٹ منتخب ہوئے''۔

سید محمود نے اپنے خط مورخہ ۱۶؍نومبر ۱۹۰۰ء بنام سکریٹری لفٹنٹ گورنر صوبہ شمال

مغرب، کے ذریعہ وزیٹری کے عہدے کو قبول کرنے سے معذرت چاہی تھی۔[۳۸] لیکن پھر لفٹنٹ گورنر ہی کی ایما اور درخواست پر وہ یہ عہدہ قبول کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے اور تار برقی مورخہ ۳۰ر دسمبر ۱۹۰۰ء کے ذریعہ سکریٹری ٹرسٹیان کالج کو اپنی رضامندی ارسال کر دی تھی۔[۳۹]

ترمیم قانون کے لیے سلیکٹ کمیٹی کی تشکیل:

ٹرسٹیوں کے اجلاس منعقدہ ۳۰ر جنوری ۱۹۰۰ء میں نواب وقار الملک (مشتاق حسین صاحب) کی ایما پر ایک سلیکٹ کمیٹی مقرر کی گئی تھی۔ جس کو موجودہ قواعد و قوانین ٹرسٹیان پر اول سے آخر تک غور کرنے کے بعد جو امور ترمیم و اصلاح کے قابل ہوں ان کو مع ترمیمات کے پیش کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، مرزا عابد علی بیگ اور محمد موسیٰ خاں صاحب اس کمیٹی کے ممبر نامزد ہوئے تھے۔[۴۰] مشتاق حسین صاحب (نواب وقار الملک) اس کمیٹی کے سکریٹری مقرر کیے گئے تھے۔ سکریٹری کو یہ حق بھی دیا گیا تھا کہ اور جس ٹرسٹی کو مناسب سمجھیں بطور ممبر کمیٹی میں شریک کر سکتے ہیں۔

مشتاق حسین صاحب نے مندرجہ ذیل مزید چار ٹرسٹیوں کو اس کمیٹی میں شریک ہونے کے لیے رضامند کر لیا تھا۔[۴۱] ان کے نام تھے۔ (۱) خان بہادر مولوی ذکاء اللہ صاحب، (۲) حاجی محمد اسماعیل خاں صاحب (رئیس دتاولی) (۳) مولوی محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب (رئیس بھیکم پور) (۴) آنریبل سید محمود صاحب۔

اس کمیٹی کا اول اجلاس سید محمود کی رہائش گاہ (یعنی سر سید ہاؤس) میں سید محمود ہی کی زیر صدارت ۲۶ر اپریل ۱۹۰۱ء کو منعقد ہوا تھا۔ اس جلسے میں باتفاق رائے ممبران کمیٹی نے سید محمود کو اس سلیکٹ کمیٹی کا پریسیڈنٹ مقرر کیا تھا نیز سید محمد احمد خاں کو اسسٹنٹ سکریٹری مقرر کیا گیا تھا۔ ۲۶ر اپریل کے پہلے جلسے کے بعد تواتر سے اس کمیٹی کے ۱۸ اجلاس علی گڑھ ہی میں منعقد ہوئے تھے۔ بعد میں سید محمود کے سیتاپور منتقل ہونے کے بعد ۱۴ر جون ۱۹۰۱ء کو مشتاق حسین صاحب (وقار الملک) امروہہ سے اور مرزا عابد علی بیگ صاحب مرادآباد سے سیتاپور پہنچ گئے تھے۔ مشتاق حسین صاحب تقریباً ایک مہینے سے زیادہ سیتاپور میں (سید محمد احمد خاں صاحب کی کوٹھی میں) رہ کر سلیکٹ کمیٹی کے اجلاسوں میں شرکت کرتے رہے تھے۔ یہ اجلاس روزانہ منعقد ہوتے تھے۔ بعد میں چند خانگی مصروفیات کی بنا

پر مشتاق حسین صاحب کمیٹی کے اجلاسوں کی کارروائی کی ذمہ داری اسسٹنٹ سکریٹری (یعنی سید محمد احمد خاں صاحب) کے سپرد کر کے واپس امروہہ چلے گئے تھے۔ لیکن مرزا عابد علی بیگ صاحب سیتاپور ہی میں موجود رہے تھے اور مشتاق حسین صاحب کے امروہہ چلے جانے کے بعد بھی سلیکٹ کمیٹی کے اجلاسوں کی کارروائی تواتر سے چلتی رہی تھی۔ سید محمود کے تحریر کرنے کے مطابق:

> ''جون ۱۹۰۱ء سے اکتوبر ۱۹۰۱ء تک اس کمیٹی کے ۱۱۹ اجلاس ہو چکے تھے۔ جن میں سے اٹھ اجلاس علی گڑھ میں منعقد ہوئے تھے اور ۱۴ر جون ۱۹۰۱ء کے بعد سے اکتوبر تک ایک سو گیارہ اجلاس بمقام سیتاپور منعقد ہوئے تھے اور تادم تحریر ابھی جاری ہیں۔ ہر اجلاس کی روزانہ روائیدادیں مکمل تحریر کی جاتی ہیں اور رجسٹر پر روزانہ صاف ہوتی ہیں''۔[۴۲]

سید محمود کی مندرجہ بالا اطلاع کے مطابق پچھلے چار مہینوں (یعنی ۱۲۰ دنوں) میں اس کمیٹی کے ایک سو گیارہ اجلاس منعقد ہوئے تھے اس سے قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس زمانے میں سید محمود کس تندہی سے اپنے اس محبوب مشغلہ میں مصروف ہو گئے تھے۔ اس کمیٹی کے قیام کا ایک دوسرا پہلو یہ بھی تصور کیا جا سکتا ہے کہ اس کے توسل سے مشتاق حسین صاحب (وقار الملک) کو سید محمود کے قریب آنے اور ان سے اپنے دیرینہ اختلافات دور کر کے ان کا اعتماد حاصل کرنے کا سنہرا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ نتیجہ کے بطور مہدی علی خاں صاحب (محسن الملک) کے خلاف سیتاپور میں ایک مضبوط محاذ تشکیل پانے لگا تھا۔ جس کی وجہ سے محسن الملک کی مشکلات خاصی بڑھ گئی تھیں۔

محسن الملک کی پریشانیاں:

لفٹنٹ گورنر مسٹر انٹونی میکڈانلڈ نے ۱۸۹۹ء میں اردو ہندی سے متعلق جو ریزرلیوشن صادر کیا تھا اس نے مسلمانوں میں سخت ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ مہدی علی خاں صاحب (محسن الملک) اس ایجی ٹیشن کے روح رواں تھے۔ اس سلسلے کا سب سے ابتدائی جلسہ علی گڑھ میں محسن الملک کی رہائش گاہ ہی پر منعقد ہوا تھا۔ اسی جلسے میں اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا تھا۔ بعد ازاں اسی ایسوسی ایشن کی مرکزی کمیٹی کا ایک بڑا

جلسہ لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا۔ مہدی علی خاں صاحب نے اس میں معرکتہ الآراء تقریر کی تھی۔ وہ اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن کے سکریٹری مقرر ہوئے تھے۔ لفٹننٹ گورنر مسٹر انٹونی میکڈانلڈ اس ایجی ٹیشن کی وجہ سے ان لوگوں سے شاکی ہو گئے تھے جو اس کی سربراہی کر رہے تھے۔ ان میں محسن الملک کا نام سرِ فہرست تھا۔ سید محمود، محسن الملک کی مخالفت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں گنواتے تھے۔ انھوں نے اپنے خط مورخہ ۲۴ر نومبر ۱۹۰۱ء بنام سکریٹری لفٹننٹ گورنر، میں محسن الملک پر الزام عاید کیا تھا کہ انھوں نے کالج کو سیاست کا اکھاڑہ بنا دیا ہے۔ 'حالاں کہ بانی کالج، سر سید احمد خاں صاحب' کالج کو سیاست سے ہمیشہ علیحدہ رکھنے کی پالیسی پر گامزن رہے تھے لیکن مہدی علی خاں صاحب نے بانیِ کالج کی پالیسی کے خلاف عمل کرتے ہوئے کالج کو سیاست کا اکھاڑہ بنا دیا ہے۔[۴۳]

لفٹننٹ گورنر صاحب پہلے سے اردو کی موافقت میں چلائی جانے والی مہم کی وجہ سے مہدی علی خاں صاحب (محسن الملک) سے کافی شاکی تھے۔ اسی وجہ سے انھوں نے سید محمود کے اس خط کو کافی اہم قرار دیتے ہوئے اپنی آرا و مشاہدات کے ساتھ چھپوا کر کالج کے ٹرسٹیوں میں مشتہر کروا دیا تھا۔ جس کی وجہ سے صاحب بہادر کا رخ دیکھتے ہی زیادہ تر ٹرسٹیوں نے اس ایجی ٹیشن کے متعلق محتاط رویہ اختیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ نواب فیاض علی خاں صاحب (نومنتخب صدر ٹرسٹیان) نے اردو ڈیفنس کمیٹی میں اپنی شمولیت کو ایک غلط فہمی پر مبنی قرار دیتے ہوئے اس سے اپنی علیحدگی کا اعلان کر دیا تھا۔ غرض مہدی علی خاں صاحب (محسن الملک) کے لیے اس وقت ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ اس مسئلہ پر گفتگو کرنے کے لیے لفٹننٹ گورنر نے ان سے ملاقات کرنے تک سے انکار کر دیا تھا۔ بلکہ لفٹننٹ گورنر نے اپنی اس ایما سے مہدی علی خاں صاحب کو بالواسطہ باخبر کرا دیا تھا کہ وہ کالج کی سکریٹری شپ اور اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن کی رکنیت میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لیں تو بہتر ہے۔ اس طرح مہدی علی خاں صاحب کے سامنے ایک بڑی مشکل آ کھڑی ہوئی تھی۔ اس امتحان کی گھڑی میں اگر مہدی علی خاں صاحب اردو کی حمایت میں کالج کی سکریٹری شپ سے مستعفی ہو جاتے تو شاید عوام کی نظروں میں ان کی وقعت بہت بڑھ جاتی۔ لیکن ہوا وہی جس نے ایک بار پھر مہدی علی خاں صاحب (محسن الملک) کی شخصیت پر سوالیہ نشان لگا دیا یعنی محسن الملک نے گورنر کے دباؤ میں آ کر کالج کے سکریٹری کے بطور قائم رہنے کے واسطے 'اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن' سے اپنا تعلق منقطع کر لیا تھا۔ اس واقعہ کے بعد سے لوگ مہدی علی خاں

صاحب کی شخصیت کی کمزوریوں پر سنجیدگی سے انگلیاں اٹھانے لگے تھے۔

محسن الملک پرڈپٹی نذیر احمد کے اعتراضات:

ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے مولوی بشیر الدین صاحب کے نام اپنے ایک طویل خط میں محسن الملک پر مندرجہ ذیل کمزوریوں کا الزام عائد کیا تھا۔ان کی رائے تھی کہ:

۱۔محسن الملک نے سرسید کی پالیسی کے خلاف اس زمانے کے علما کو جنھوں نے سالہائے دراز سے مسلمانوں پر اپنا مذہبی اقتدار بٹھا رکھا تھا...... اور مسلمانوں کو بدستور شاہراہِ ترقی سے محروم کر رہے تھے، کالج کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی تھی۔

۲۔قوم کے دلوں میں مذہبی تعصب کا جو ناسور تھا اس کی خبر نہ لی ظاہر کے اندمال والتیام کے پیچھے پڑے رہے۔

۳۔نواب محسن الملک نے بجائے اس کے کہ علی گڑھ کالج کے سکریٹری ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کی تعلیم کی باگ اپنے ہاتھ میں رکھتے انھوں نے وہ باگ گورنمنٹ کے حوالے کردی۔

۴۔اردو کی حمایت میں کھڑے ہوئے اور گورنمنٹ کی بیجا سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

۵۔عربی کے بارے میں بھی ایسی ہی بزدلی ظاہر کی۔

۶۔بمبئی کی کانفرنس میں بدرالدین طیب جی کو کانفرنس کا پریسیڈنٹ بنایا جو ہر بات میں سید احمد خاں کی پالیسی کے خلاف تھے اور ہیں۔ یہی وجہ ہوئی کہ بمبئی میں ناکامی ہوئی۔

۷۔لکھنؤ کی کانفرنس میں تعلقہ دارانِ محمود آباد و جہانگیر آباد کے چندوں کی شکر گزاری میں ایشیائی مبالغہ اور خوشامد سے ناپسندیدہ حد تک کام لیا۔

۸۔حکیم عبدالعزیز اور حکیم عبدالولی کی خاطر سے طب یونانی کی حمایت میں غلط اور سید احمد خاں کی پالیسی کے خلاف رزولیوشن پاس کرالیا۔اور چوں کہ وہ خود یونانی علاج نہیں کرتے ہیں اور نہ کالج

میں یونانی معالج ہے، پس یہ رزولیوشن کانشنس کے خلاف پاس کرایا
گیا۔ اگر ممبروں نے پاس کیا تو نواب محسن الملک کو مخالفت کرنی تھی
مگراس کو چاہیے اخلاقی جرات جو نواب صاحب میں مفقود تھی۔
۹۔ سید جعفر حسین نے ٹیکنیکل ایجوکیشن کے خلاف ریزولیوشن پروپوز
کیا (اگرچہ ان کی بات چلنے نہ پائی) مگر نواب محسن الملک نے سینٹرل
کمیٹی کے سکریٹری ہونے کی حیثیت سے اس کو قبول تو کرلیا تھا اور
مزہ یہ کہ مباحثہ کے وقت رزولیوشن کی تائید تک نہ کی اور یہ صرف سید
جعفر حسین کی خوشامد سے کہ انھوں نے ون روپی فنڈ میں چند ہزار
روپیہ فراہم کیا تھا''۔۴۴

مولوی نذیر احمد صاحب کے علاوہ بھی عام طور پر لوگوں کا خیال تھا کہ محسن الملک موقع پرستی سے کام لیتے ہیں۔ وہ اپنی بات پر ثابت قدمی کے ساتھ قائم رہنے کے بجائے موقع کی نزاکت کے تحت اپنا رویہ تبدیل کرتے رہتے ہیں اور اسے اپنی حکمت عملی قرار دیتے ہیں۔ مولوی محمد امین صاحب نے ''حیات محسن'' میں اسی بات کو اس طرح بیان کیا ہے۔

''قدرت نے اُن کمالات کے ساتھ جو نواب صاحب کی ذات
میں مجتمع کیے تھے۔ یہ تعلق بھی رکھ دیا تھا کہ ان میں جذبات کو مغلوب
کرنے کی پوری طاقت نہ تھی اور ان کے قلب پر موافق اور مخالف
حالات کا بہت جلد اثر پڑ جاتا تھا اور بجائے اس کے کہ وہ جرات سے
کام لے کر اپنا مافی الضمیر صاف طور سے کہہ دیں حکمت عملی اور
پالیسی سے کام لیتے تھے''۔۴۵

محسن الملک کی سکریٹری کے عہدے سے علیحدگی کی پیش کش:

سرکلر بنام ٹرسٹیان مورخہ ۱۰؍اپریل ۱۹۰۱ء میں محسن الملک نے اعلان کردیا تھا کہ ان کے عہدے کی میعاد جنوری ۱۹۰۲ء میں ختم ہو رہی ہے۔ اس کے بعد وہ کسی بھی صورت میں اس ذمہ داری کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوں گے۔ اس سرکلر میں انھوں نے تحریر کیا تھا کہ:

''میرا تقرر عہدہ آنریری سکریٹری ٹرسٹیان مدرسۃ العلوم علی گڑھ پر

۳۱/جنوری ۱۸۹۱ء کو جب کہ سالانہ اجلاس ٹرسٹیان منعقد ہوا تھا عمل میں آیا تھا اور بموجب دفعہ ۴۷ قواعد وقوانین ٹرسٹیان کے ہر ایک سکریٹری اور جوائنٹ سکریٹری اور اسسٹنٹ سکریٹری کا تقرر صرف تین سال کے لیے ہوتا تھا اور اس کے بعد دوبارہ منتخب ہو سکتا تھا۔ چوں کہ جنوری ۳۰/۱۹۰۲ء کو میرے عہدے کی میعادِ سہ سالہ ختم ہوگئی اس لیے میں آپ کو اس بات سے آگاہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں آئندہ اس عہدہ آنریری سکریٹری کے قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوں''۔[۴۶]

محسن الملک اس سے پہلے بھی دو مرتبہ اپنے عہدے سے مستعفی ہونے کی پیش کش کر چکے تھے۔ اور دونوں بار ٹرسٹیوں کے اصرار پر اپنا استعفیٰ واپس لے لیا تھا۔ لیکن اس مرتبہ سید محمود اور وقار الملک وغیرہ اس امر کو یقینی بنانا چاہتے تھے کہ ان کا استعفیٰ منظور کرلیا جائے اور ان کی جگہ کسی دوسرے شخص کو سکریٹری منتخب کرلیا جائے۔ اس سلسلے میں سید محمود نے اپنے خط بنام ڈپٹی نذیر احمد صاحب مورخہ ۳/اکتوبر ۱۹۰۱ء کے ذریعہ ڈپٹی نذیر احمد صاحب کو آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ محسن الملک کے بجائے سکریٹری شپ کے عہدے کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اور ان سے استدعا کی تھی کہ وہ اس تجویز کے سلسلے میں اپنی منظوری ارسال کردیں تا کہ ان کے نام کی باقاعدہ تجویز ٹرسٹیوں کے پاس ارسال کی جا سکے۔[۴۷] لیکن جیسا کہ ان کا مزاج تھا ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے اس عہدے کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کردیا تھا۔

سکریٹری شپ کے لیے وقار الملک کے نام کی تجویز:

ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے عہدہ سکریٹری شپ کی ذمہ داریوں کو قبول کرنے سے معذوری ظاہر کرنے کے بعد سید محمود نے اپنے خط مورخہ ۲۳/نومبر ۱۹۰۱ء کے ذریعہ مشتاق حسین صاحب (وقار الملک) کا نام سکریٹری شپ کے لیے تجویز کیا۔[۴۸] مہدی علی خاں صاحب (محسن الملک) گویا اس نام کی تجویز کے منتظر ہی تھے۔ انھوں نے نہ صرف اس تجویز کی حمایت کی بلکہ خود خط لکھ کر مشتاق حسین صاحب کو اس عہدہ کو قبول کرنے کے لیے آمادہ کیا۔ مہدی علی خاں صاحب نے تجویز کیا تھا کہ '' کاموں کو اب تقسیم کرنا چاہیے کہ آنریری

سکریٹری ٹرسٹیان کے عہدہ کا کام جس سے کالج کا اندرونی کام مراد ہے تم مجھ سے بہتر کر سکتے ہو عہدہ آنریری سکریٹری کا تم لو اور کانفرنس اور سرسید میموریل فنڈ کا کام جس میں باہر جانا، اور جلسے کرنا اور چندہ وصول کرنا ہے یہ کام میں تم سے بہتر کروں گا یہ دونوں کام میرے پاس رہیں''۹۴ے مشتاق حسین صاحب نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ دوسرے لوگوں نے بھی اس تجویز کو پسند کیا۔ یہاں تک کہ یہ تجویز مہدی علی خاں صاحب کے استعفیٰ کے ساتھ سالانہ اجلاس کے ایجنڈے میں داخل ہوئی اور ٹرسٹیوں کے سامنے پیش ہونا قرار پائی۔ اتنا سب ہو جانے کے بعد مہدی علی خاں صاحب نے مشتاق حسین صاحب سے اصرار کیا کہ اب علی گڑھ میں رہائش اختیار کرنے کی غرض سے جلد ان کو علی گڑھ منتقل ہو جانا چاہیے۔ مہدی علی خاں صاحب نے اپنے مکان کے قریب ہی ایک دوسرا مکان مشتاق حسین صاحب کی رہائش کے لیے طے کروا دیا تھا۔ اب یہ امر اس قدر یقینی ہو گیا تھا کہ مارچ ۱۹۰۲ء میں جب مشتاق حسین صاحب اپنے وطن امروہہ سے سالانہ جلسے میں شرکت کی غرض سے روانہ ہوئے تو ریلوے اسٹیشن پر مال گاڑی کے ڈبہ کا انتظام بھی کرتے گئے تا کہ اپنا ضروری اسباب ایک ساتھ علی گڑھ منتقل کروا سکیں۔ علی گڑھ پہنچنے کے بعد جلسے میں شرکت کرنے کے لیے جاتے ہوئے مہدی علی خاں صاحب نے مشتاق صاحب کو وہ مکان دکھلانا چاہا جو انھوں نے مشتاق صاحب کی رہائش کے لیے پسند کیا تھا۔ مشتاق حسین صاحب نے ازراہِ تکلف کہا کہ ''ایسی جلدی کیا ہے۔ جلسہ ہو جانے دیجیے اس کے بعد دیکھ لیں گے''۔ جلسے میں ٹرسٹیوں کے ووٹوں کو جب شمار کیا گیا تو دو ووٹوں کے علاوہ سب ووٹ اس تجویز کے حق میں تھے کہ مہدی علی خاں صاحب کا استعفیٰ منظور کرنے کے بعد مشتاق حسین صاحب کو سکریٹری منتخب کیا جاوے۔ لیکن اس سب کے باوجود اس جلسے کا اختتام اس تجویز پر ہوا کہ مہدی علی خاں صاحب کا استعفیٰ واپس کروایا جائے۔ اور فی الحال وہ ہی عہدہ سکریٹری پر قائم رہیں۔ یہ فیصلہ کیوں کر ہوا اس کے لیے ہم صرف یہ ہی کہہ سکتے ہیں کہ ایک بار پھر مہدی علی خاں صاحب اپنی حکمت عملی اور فراست میں کامیاب ہوئے تھے۔ اس سلسلے میں مشتاق حسین صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''مگر جلسے کا اختتام اس پر ہوا کہ نواب محسن الملک بہادر نے اپنا استعفیٰ عہدہ آنریری سکریٹری سے واپس لیا اور مجھے کوئی ضرورت نہ ان کے مجوزہ مکان کو دیکھنے کی باقی رہی نہ ریلوے مال گاڑی کے انتظام کی۔

''مردان موقوف و مقبرہ مسمار'' اور میں نے کبھی اس کے بعد جناب ممدوح سے اس کی شکایت نہ کی کہ اگر یہ ہی منظور تھا تو اس تماشہ کی ضرورت ہی کیا تھی''۔ ۵۰؎

غرض اس طرح ایک بار پھر مہدی علی خاں صاحب سکریٹری کے عہدے پر قائم رہنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

سرسید کے مزار کی تعمیر:

جہاں تک سرسید کے مزار کا تعلق ہے ہماری اطلاع کے مطابق اس کا نقشہ سید محمود نے ہی بنوایا تھا اور انھیں کی کوششوں سے ۱۹۰۲ء میں اس مزار کی تعمیر مولوی زین العابدین صاحب کی زیر نگرانی شروع ہوئی تھی اور احتمال یہ ہی ہے کہ سید محمود کی حیات ہی میں مکمل ہو گئی تھی۔ اس سلسلے میں سید محمود کا خط بنام محسن الملک بطور شہادت پیش کیا جا سکتا ہے جو مورخہ ۳۰؍جولائی ۱۹۰۲ء کو سیتاپور سے تحریر کیا گیا تھا۔ اس خط میں سید محمود نے تحریر کیا تھا کہ:

''پس ایسی صورت میں آپ پر روشن ہوگا کہ سرسید احمد مرحوم کے ناواجبی انکسار اور تنفر خود نمائی کی وجہ سے ان کی یادگار کی کوئی عمارت بالضرور تعمیر نہیں ہوئی ہے۔ ان کی وفات ۲۷؍مارچ ۱۸۹۸ء کو ہوئی اور ان کو ایک گوشہ مسجد مدرسۃ العلوم میں مدفون کیا گیا اور ان کی قبر ان کی وصیت کے موافق کچی رہے گی۔ لیکن گرد اس کے اس غرض سے کہ توہین ان کی تربت کی نہ ہو ایک محجر بنوانے کی تجویز کی گئی اور اس کے مصارف تعمیر اس روپیہ سے جو میری زوجہ محمود بیگم نے میری اجازت سے اس غرض کے لیے دیئے تھے اور اس روپیہ سے جو میری یادگار میں میرے عنایت فرما احباب نے بتعداد مبلغ دو ہزار کے دیئے (جو حسب رپورٹ عابد علی بیگ کے ثابت ہے) اس روپیہ میں میرے مجوزہ نقشہ کے مطابق جو ٹرسٹیان کالج نے ازراہ عنایت منظور فرمایا ہے تعمیر ہو رہی ہے اور ان کے محب صادق و قدیم خان بہادر مولوی زین العابدین صاحب ٹرسٹی و سکریٹری بلڈنگ فنڈ کمیٹی کے اہتمام سے تعمیر ہو رہی ہے''۔ ۵۱؎

نہ صرف سرسید کے مزار کا نقشہ سید محمود نے بنوایا تھا بلکہ کالج کے سکریٹری کے آفس کے بطور ایک سکریٹریٹ قائم کرنے کے لیے انھوں نے اپنے خرچ سے ایک عمارت کا نقشہ بنوایا تھا جس کو ہم کالج کا ایڈمنسٹریٹیو بلاک کہہ سکتے ہیں۔

کالج میں ایڈمنسٹریٹیو بلاک کی تعمیر:

سیتاپور سے تحریر کیے گئے سید محمود کے خط بنام نواب مزمل اللہ خاں صاحب جوائنٹ سکریٹری مدرسۃ العلوم (دراصل اس زمانے میں مہدی علی خاں صاحب بمبئی گئے ہوئے تھے ان کی غیر موجودگی میں مزمل اللہ خاں صاحب قائم مقام سکریٹری کے فرائض انجام دے رہے تھے) مورخہ ۲۴/اگست ۱۹۰۲ء سے واضح اطلاع ملتی ہے کہ سید محمود اس وقت تک کالج میں سکریٹری کے دفتر کے لیے ایک علیحدہ عمارت (ان کے مجوزہ نقشے کے مطابق) تعمیر کیے جانے کے لیے مسلسل اصرار کر رہے تھے۔ اس خط میں سید محمود نے مندرجہ ذیل تین تحریکات پیش کی تھیں۔

> ''اول آنریری سکریٹری سے درخواست کی جائے کہ جملہ کاغذات ودستاویزات، چٹھیاں متعلقہ دفتر سکریٹری ٹرسٹیان جواب بہ حالتِ بے ترتیبی کے ہیں ان کو مرتب کرا کر ایسے رجسٹروں کو مجلد تیار کرادیں کہ جس طرح پر دفتر سرکاری سکریٹریٹ میں رجسٹر و کاغذات مرتب رہتے ہیں کہ اس میں سے ہر کاغذ اور چٹھیات کا بوقت ضرورت میں ملاحظہ کرنا محض آسان ہوتا ہے اور اس غرض سے ایک رقم صایب صرف کرنے کی اجازت سکریٹری ٹرسٹیان کو عطا کی جاوے''۔[۵۲]

اس تحریک کے سلسلے کے رزولیشن کے آخیر میں درج تھا کہ مجلد رجسٹر ہائے دفتر سکریٹریٹ کے نقشے کس نہج پر مرتب کیے جانا چاہیں اور اس سلسلے میں سکریٹری کو ہدایت کرنے کی درخواست تھی کہ اس بارے میں سید محمود ٹرسٹی، وزیٹر کالج کی رائے مشورہ اور مدد طلب فرمادیں۔ مندرجہ بالا تحریک اور رزولیشن سے جہاں ایک طرف سید محمود کی محسن الملک کے لیے مشکلات پیدا کرنے کی نیت نظر آتی ہے (کیوں کہ ان کو یقین تھا کہ انگریزی سے کم واقفیت کی بنا پر سکریٹری کے آفس کے جملہ دستاویزات کو سرکاری دفتروں کی مانند مرتب کروانے میں سکریٹری کے دفتر کا عملہ آسانی سے کامیاب نہ ہو سکے گا) وہیں دوسری

طرف یہ بات بھی وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ سید محمود شروع ہی سے کالج کے تنظیمی نظام کو چست درست کرنے کے لیے سکریٹری کے واسطے ایک باقاعدہ سکریٹریٹ کی ضرورت پر زور دیتے رہے تھے اور اس وقت بھی صدق دل سے اس کے لیے کوشاں تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اس کام کو انجام دنے کے لیے ان سے زیادہ بہتر کوئی دوسرا شخص نہیں ہوسکتا ہے۔ اسی وجہ سے انھوں نے اپنے اس ریزولیوشن میں خصوصی طور پر درج کر دیا تھا کہ:

''اس بارے میں سید محمود ٹرسٹی و وزیٹر کالج کی رائے اور مشورہ اور مدد طلب کی جائے''۔۵۳؎

اس خط میں موجود دوسری دو تحریکات میں بھی سکریٹری کے 'سکریٹریٹ' کے لیے عمدہ عمارت تعمیر کیے جانے کے متعلق تجاویز پیش کی گئی تھیں جن کی رو سے تجویز کیا گیا تھا کہ جو روپے وقتاً فوقتاً سر سید احمد میموریل فنڈ میں سر سید کی کوئی یادگار قائم کرنے کے سلسلے میں جمع ہوتا رہا ہے اس کو مکان دفتر سکریٹری ٹرسٹیان کے تعمیر کرنے میں صرف کیا جائے کیوں کہ آخری عمر میں سر سید کی یہ خواہش تھی کہ دفتر سکریٹری ٹرسٹیان کے ترتیب دینے کے لیے ایک علیحدہ عمدہ عمارت کالج میں تعمیر کروائی جائے اس لیے اس طرح کی عمارت ان کی عمدہ یادگار کے بطور تعمیر کی جاسکتی ہے۔ اس طرح ایک بار پھر انھوں نے اس بات کی پُر زور وکالت کی تھی کہ یہ قرار پا جاوے کہ:

''گوشہ جنوبی مغربی عمارت کالج بطرف چپ (یعنی بائیں) صدر دروازہ کالج (یعنی وکٹوریہ گیٹ) اس خالی آراضی گوشہ بالمقابل سالار منزل کے بطور ''تعمیر سوال جواب کے'' دفتر سکریٹریٹ کے لیے تجویز کر دیا جائے''۔۵۴؎

تقریباً تین سال پہلے سید محمود نے اپنے خرچ سے اس عمارت کے لیے ایک باقاعدہ نقشہ بھی بنوالیا تھا۔ سید محمود آخیر وقت تک کوشش کرتے رہے تھے کہ کسی طرح سکریٹری کے دفتر کے بطور 'سکریٹریٹ' کی یہ عمارت تیار ہو جائے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ سید محمود اپنی ان کوششوں میں کس حد تک کامیاب ہوئے تھے۔ لیکن آج اس مجوزہ آراضی پر جو عمارت موجود ہے اس کی ہیئت اور ساخت کو دیکھ کر یہی قیاس ہوتا ہے کہ شاید یہ عمارت سید محمود کے تجویز کردہ نقشہ کے مطابق سکریٹری کے دفاتر کے استعمال کے لیے ہی تعمیر کروائی گئی ہوگی۔ یہ وہ عمارت ہے جس میں ایک عرصہ تک کامرس ڈپارٹمنٹ قائم رہا

تھا۔ آج کل غالباً اس عمارت کے کمرے طلبا کی رہائش کے لیے استعمال کیے جا رہے ہیں۔

سید محمود کا انتقال:

۱۹۰۲ء کے اواخیر اور ۱۹۰۳ء کے اوائل میں سید محمود کی بتدریج خراب ہوتی ہوئی صحت کی وجہ سے ان کا سیتاپور سے علی گڑھ آنا جانا یکسر ختم ہو گیا تھا۔ لکھنے پڑھنے میں بھی کمی آ گئی تھی اسی وجہ سے ۱۹۰۳ء میں لکھی گئی سید محمود کی تحریریں کمیاب ہیں۔ جہاں تک ان کی صحت کی روز افزوں خرابی کا تعلق ہے اس میں ان کی شراب نوشی اور باکثرت سگریٹ پینے کی عادت ہی کو مخصوص وجوہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان عادات کی وجہ سے جو بھی مضر اثرات کسی شخص کی صحت پر مرتب ہو سکتے ہیں وہ سب سید محمود کی صحت پر مرتب ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ہمیں یہ شک تو کافی عرصے پہلے ہوا تھا کہ غالباً وہ ذیابیطس (شکر) کی بیماری میں مبتلا ہو گئے تھے (حالاں کہ اس سلسلے میں ہمیں کوئی یقینی حوالہ دستیاب نہ ہو سکا) اس کے علاوہ ہمارے خیال میں انھیں ہائی بلیڈ پریشر کی شکایت رہنے لگی تھی (جس کا اظہار اکثر ان کے رویہ سے ہوتا رہتا تھا) وہ جگر اور گردوں کے فعل کی خرابی میں بھی مبتلا ہو گئے تھے۔ جسم میں خون کی کمی اور کسی حد تک دل کی شریانو میں چکنائی کا جماؤ بھی ضرور ہوا ہوگا۔ سانس کی تکلیف بھی رہنے لگی تھی۔ غرض ان کے جسم کے کل عضوِ حیات بتدریج متاثر ہو رہے تھے جس کی وجہ سے ان کی توانائی آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی۔ مئی ۱۹۰۳ء تک ان کی زندگی کی امید تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ۸ر مئی ۱۹۰۳ء کو سیتاپور ہی میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ جنازہ بذریعہ ریل سیتاپور سے علی گڑھ لایا گیا تھا۔ اور اسٹیشن سے 'سرسید ہاؤس' لے جایا گیا۔ (کیوں کہ ابھی تک پیلی کوٹھی یعنی محمود منزل تعمیر نہیں ہوئی تھی اور مشرف جہاں بیگم صاحبہ معہ اپنے برادران کے 'سرسید ہاؤس' ہی میں سکونت پذیر تھیں) تدفین یونیورسٹی کی مسجد میں (شمالی اراضی کے پلاٹ میں) سرسید کے قرب ہی میں ادا کی گئی تھی۔ اس طرح سرسید کے خوابوں کے محل کا مرکزی اور سب سے توانا ستون بتدریج کمزور ہو کر منہدم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ تھیوڈور بیک پیپرز، مرتبہ: خلیق احمد نظامی، سرسید اکیڈمی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (1991) ص: ۱۱۶

۲۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ص: ۱۰۹

۳۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ص: ۱۱۰

۴۔ پوسٹ ماسٹر، علی گڑھ کا خط مورخہ ۲۹ مارچ ۱۸۹۸ء آرکایوز، سرسید اکیڈمی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۵۔ تھیوڈور بیک پیپرز، مرتبہ: خلیق احمد نظامی، سرسید اکیڈمی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (1991) ص: ۱۱۳

۶۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ص: ۱۲۰

۷۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ص: ۲۴۔۱۲۳

۸۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ص: ۴۶۔۱۴۵

۹۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ص ۱۵۷

۱۰۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ص: ۱۶۱

۱۱۔ مسٹر وی اے اسمتھ کا خط بنام سمیع اللہ خاں مورخہ ۹ اگست ۱۹۸۹ء، آرکایوز، سرسید اکیڈمی، علی گڑھ

۱۲۔ سمیع اللہ خاں کا خط بنام مسٹر وی اے اسمتھ مورخہ ۱۴ اگست ۱۸۹۸ء، آرکایوز، سرسید اکیڈمی، علی گڑھ

۱۳۔ تھیوڈور بیک پیپرز، مرتبہ: خلیق احمد نظامی، سرسید اکیڈمی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (1991) ص: ۳۳۰

۱۴۔ سمیع اللہ خاں کا خط بنام محسن الملک مورخہ ۲ ستمبر ۱۸۹۸ء، آرکایوز، سرسید اکیڈمی، علی گڑھ

۱۵۔ تھیوڈور بیک پیپرز، مرتبہ: خلیق احمد نظامی، سرسید اکیڈمی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (1991) ص: ۳۲۱

۱۶۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ: ۱۶۷

۱۷۔ تھیوڈور بیک پیپرز، مرتبہ: خلیق احمد نظامی، سرسید اکیڈمی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (1991) ص ۱۸۱۔۱۷۹

۱۸۔ خلاصہ رپورٹ مرزا عابد علی بیگ صاحب در مطبع ریاض ہند، علی گڑھ سے طبع شدہ (مارچ ۱۸۹۸ء)

۱۹۔ خط بنام مسٹر پیرسن مورخہ ۱۸۹۸ء، (ابتدائی ڈرافٹ غیر دستخط شدہ)، آرکایوز، سرسید اکیڈمی، علی گڑھ

۲۰۔ آپ بیتی۔ میر ولایت حسین، مرتب: سید محمد ٹونکی پبلشر سید ہادی حسن زیدی حبیب اللہ منزل ڈگ روڈ، علی گڑھ (۱۹۷۰ء) ص: ۱۲۶

۲۱۔ مشرف جہاں بیگم کا خط بنام سکریٹری ٹرسٹیان، مورخہ ۱۰ اگست ۱۸۹۸ء بحوالہ سید محمود پیپرز، مرتبہ: اقبال حسین، سرسید اکیڈمی، علی گڑھ (۲۰۰۵ء)

۲۲۔ وقار حیات، مرتبہ: محمد اکرام اللہ خاں ندوی، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، سلطان جہاں منزل، علی گڑھ (۱۳۴۴ھ) ص: ۴۳۶

۲۳۔ وقار حیات، مرتبہ: محمد اکرام اللہ خاں ندوی، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، سلطان جہاں منزل، علی گڑھ (۱۳۴۴ھ) ص: ۴۲۳

۲۴۔ وقار حیات، مرتبہ: محمد اکرام اللہ خاں ندوی، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، سلطان جہاں منزل، علی گڑھ (۱۳۴۴ھ) ص: ۴۲۶

۲۵۔ مسٹر بیک کا خط بنام سید محمود، مورخہ ۲۱ نومبر ۱۸۹۸ء آرکایوز، سرسید اکیڈمی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

۲۶۔ آپ بیتی۔ میر ولایت حسین، مرتب: سید محمد ٹونکی پبلشر سید ہادی حسن زیدی حبیب اللہ منزل ڈگ روڈ، علی گڑھ (۱۹۷۰ء) ص: ۱۲۶

۲۷۔ مشاہدات وتاثرات مصنفہ ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ فیملی ایجوکیشن ایسوسی ایشن علی گڑھ (۱۹۶۹ء) ص:۵۹
۲۸۔ حیات محسن مرتبہ مولوی محمد امین زبیری مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں طبع ہوئی (۱۹۳۴ء) ص:۷۹۔۷۸
۲۹۔ تھیوڈور بیک پیپرز، مرتبہ خلیق احمد نظامی، سرسید اکیڈمی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (۱۹۹۱) ص:۵۔۳۷
۳۰۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ص:۲۔۳۷
۳۱۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ص:۳۸۰۔۳۷۸
۳۲۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ص:۳۷۸۔۳۷۷
۳۳۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ص:۳۸۲۔۳۸۱
۳۴۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ص:۱۹۷
۳۵۔ مشرف جہاں بیگم کی مسٹر آئی اے بلوی (کلکٹر علی گڑھ) کی معرفت لفٹنٹ گورنر کو دی گئی درخواست مورخہ ۱۲ اکتوبر ۱۸۹۹ء، یوپی آرکایوز لکھنؤ۔ فائل نمبر ۱۴۸۶ اے، (۱۸۹۹) سرسید احمد خاں کی پولیٹکل پینشن (مسٹر ڈیوڈ لیلیو یلڈ کے توسل سے حاصل ہوئی)
۳۶۔ رویداد قانونی مشاورت برائے سرپرستی سید راس مسعود مورخہ ۴ر فروری ۱۹۰۰ء آرکایوز سرسید اکیڈمی، علی گڑھ
۳۷۔ التماس از طرف سید محمود و کاغذات متعلقہ (مجلد) مخطوطات سیکشن مولانا آزاد لائبریری اے ایم یو، علیگڑھ
۳۸۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً
۳۹۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً
۴۰۔ وقار حیات، مرتبہ: محمد اکرام اللہ خاں ندوی، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، سلطان جہاں منزل، علی گڑھ (۱۳۴۴ھ) ص:۴۳۳۔۴۳۲
۴۱۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ص:۴۳۳
۴۲۔ التماس از طرف سید محمود و کاغذات متعلقہ (مجلد) مخطوطات سیکشن مولانا آزاد لائبریری اے ایم یو، علیگڑھ
۴۳۔ سید محمود کا خط بنام سکریٹری لفٹنٹ گورنر مورخہ ۲۴ر نومبر ۱۹۰۱ء، آرکایوز، سرسید اکیڈمی، علی گڑھ
۴۴۔ حیات محسن مرتبہ مولوی محمد امین زبیری مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ میں طبع ہوئی (۱۹۳۴ء) ص:۲۲۹۔۲۲۸
۴۵۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ص:۲۳۲
۴۶۔ التماس از طرف سید محمود و کاغذات متعلقہ (مجلد) مخطوطات سیکشن مولانا آزاد لائبریری اے ایم یو، علیگڑھ
۴۷۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً
۴۸۔ سید محمود کا خط بنام مشتاق حسین صاحب مورخہ ۲۳ر نومبر ۱۹۰۱ء، از سیتاپور، آرکایوز، سرسید اکیڈمی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ،
۴۹۔ وقار حیات، مرتبہ: محمد اکرام اللہ خاں ندوی، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، علی گڑھ (۱۳۴۴ھ) ص:۴۴۸
۵۰۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص:۴۵۰۔۴۴۹
۵۱۔ التماس از طرف سید محمود و کاغذات متعلقہ (مجلد) مخطوطات سیکشن مولانا آزاد لائبریری اے ایم یو، علیگڑھ
۵۲۔ جسٹس سید محمود پیپرز، مرتبہ: اقبال حسین، سرسید اکیڈمی مسلم یونیورسٹی علیگڑھ، (۲۰۰۵ء) ص:۵۶۷۔۵۶۶
۵۳۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص:۵۶۷
۵۴۔ ایضا ایضاً ایضاً ص:۵۶۹

☆☆☆

شجرۂ نسب، سرسید احمد خاں

Map of cantonment area (1872) in which old parade ground and three Collin's bungalows can be seen

PLAN OF THE HOUSE OF
SIR SYED AHMAD KHAN
Sir Syed's additions in the building
are shown with thick black lines

نقشہ نمبر۔۲

مطبوعات ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ علی گڑھ

اقبالیات

کتاب	مصنف	قیمت
کلیات اقبال	صدی ایڈیشن	۸۵/۰۰
دانشور اقبال	آل احمد سرور	۱۵۰/۰۰
فکر اقبال	خلیفہ عبدالحکیم	۲۰۰/۰۰
اقبال بحیثیت شاعر	رفیع الدین ہاشمی	۷۵/۰۰
اقبال شاعر و مفکر	نورالحسن نقوی	۸۰/۰۰
اقبال فن اور فن اور فلسفہ	نورالحسن نقوی	۳۰/۰۰
بانگ درا (عکسی)	علامہ اقبال	۳۵/۰۰
بال جبریل (عکسی)	علامہ اقبال	۳۰/۰۰
ضرب کلیم (عکسی)	علامہ اقبال	۳۰/۰۰
ارمغان حجاز اردو (عکسی)	علامہ اقبال	۱۰/۰۰

غالبیات

کتاب	مصنف	قیمت
دیوان غالب	مقدمہ نورالحسن نقوی	۵۰/۰۰
غالب شخص اور شاعر	مجنوں گورکھپوری	۴۰/۰۰
غالب شاعر اور مکتوب نگار	نورالحسن نقوی	۵۰/۰۰

[illegible]

کتاب	مصنف	قیمت
محمڈن کالج سے مسلم یونیورسٹی تک	نورالحسن نقوی	۳۰۰/۰۰
سرسید احمد خاں اور ان کا عہد	ثریا حسین	۲۰۰/۰۰
مسلم یونیورسٹی کی کہانی عمارتوں کی زبانی	افتخار عالم	۲۰۰/۰۰
سرسید: درون خانہ	افتخار عالم	۳۰۰/۰۰
مطالعہ سرسید احمد خاں	عبدالحق	۶۰/۰۰
سرسید اور ان کے نامور رفقاء	سید عبداللہ	۶۰/۰۰
انتخاب مضامین سرسید	آل احمد سرور	۲۰/۰۰
سرسید اور ان کے کارنامے	نورالحسن نقوی	۱۵/۰۰

لسانیات

کتاب	مصنف	قیمت
مقدمہ تاریخ زبان اردو	ڈاکٹر مسعود حسین خاں	۶۰/۰۰
اردو زبان کی تاریخ	ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ	۱۰۰/۰۰
اردو کی لسانی تشکیل	ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ	۷۵/۰۰
اردو کی لسانیات	شوکت سبزواری	۵۰/۰۰
ہندوستانی لسانیات	محی الدین زور	۵۰/۰۰

ادب و تنقید

کتاب	مصنف	قیمت
نظریاتی تنقید: مسائل و مباحث	ابوالکلام قاسمی	۲۰۰/۰۰
شاعری کی تنقید	ابوالکلام قاسمی	۱۵۰/۰۰
تصویریں اجالوں کی (خاکے)	نورالحسن نقوی	۱۲۰/۰۰
نذیر احمد کے ناول	ڈاکٹر اشفاق محمد خاں	۸۰/۰۰
اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمن اعظمی	۱۰۰/۰۰
خواب باقی ہیں (خودنوشت)	آل احمد سرور	۲۰۰/۰۰
کچھ خطبے کچھ مقالے	آل احمد سرور	۱۵۰/۰۰
رشید احمد صدیقی کے خطوط	آل احمد سرور	۱۸۰/۰۰
ساحر لدھیانوی حیات اور کارنامے	انور ظہیر انصاری	۲۰۰/۰۰

کتاب	مصنف	قیمت
فکر روشن	آل احمد سرور	۱۵۰/۰۰
اردو تحریک	آل احمد سرور	۲۰۰/۰۰
افکار کے دیے	آل احمد سرور	۲۰۰/۰۰
جرنیلی سڑک	رضا علی عابدی	۱۵۰/۰۰
شیر دریا	رضا علی عابدی	۱۵۰/۰۰
فن ترجمہ اور روایت	ڈاکٹر قمر رئیس	۲۰۰/۰۰
فن تنقید اور تنقید نگاری	نورالحسن نقوی	۳۵/۰۰
اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ	سنبل نگار	۸۰/۰۰
اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ	سنبل نگار	۶۵/۰۰
داستان ناول اور افسانہ	دردانہ قاسمی	۴۰/۰۰
اردو میں مختصر افسانہ نگاری کی تنقید	پروین اظہر	۱۰۰/۰۰
اردو ادب کی تاریخ	عظیم الحق جنیدی	۳۵/۰۰
تاریخ ادب اردو	نورالحسن نقوی	۶۰/۰۰
اردو ناول کی تاریخ و تنقید	علی عباس حسینی	۷۵/۰۰
اردو ڈراما کا ارتقاء	عشرت رحمانی	۱۵۰/۰۰
اردو ڈراما کی تاریخ و تنقید	عشرت رحمانی	۶۰/۰۰
دکنی ادب کی تاریخ	محی الدین قادری زور	۲۰/۰۰
اردو قصیدہ نگاری	مرتبہ ام ہانی اشرف	۴۵/۰۰
اردو مرثیہ نگاری	مرتبہ ام ہانی اشرف	۳۵/۰۰
ناول کا فن	مترجم ابوالکلام قاسمی	۳۰/۰۰
ناول کیا ہے؟	محمد احسن فاروقی	۵۰/۰۰
اردو مثنوی کا ارتقاء	عبدالقادر سروری	۳۰/۰۰
اردو تنقید کا ارتقاء	عبادت بریلوی	۷۵/۰۰
جدید شاعری	عبادت بریلوی	۱۵۰/۰۰
غزل اور مطالعہ غزل	عبادت بریلوی	۱۵۰/۰۰
داستان سے افسانے تک	وقار عظیم	۶۰/۰۰
نظم جدید کی کروٹیں	وزیر آغا	۴۰/۰۰
غزل کی سرگذشت	اختر انصاری	۲۰/۰۰
غزل اور درس غزل	اختر انصاری	۳۰/۰۰
انشائیہ اور انشائیے	محمد حسنین	۵۰/۰۰
ابوالکلام آزاد کا اسلوب نگارش	عبدالمغنی	۵۰/۰۰
اردو قصائد کا سماجیاتی مطالعہ	ڈاکٹر ام ہانی اشرف	۱۵۰/۰۰
آل احمد سرور شخصیت اور فن	امتیاز احمد	۱۵۰/۰۰
آج کا اردو ادب	ابواللیث صدیقی	۴۰/۰۰

سیاسیات

کتاب	مصنف	قیمت
دنیا کی حکومتیں (ورلڈ کانسٹی ٹیوشن)	محمد ہاشم قدوائی	۹۰/۰۰
اصول سیاسیات (پرنسپل آف پولیٹکل سائنس)	محمد ہاشم قدوائی	۸۰/۰۰
جمہوریہ ہند (کانسٹی ٹیوشن آف انڈیا)	محمد ہاشم قدوائی	۶۰/۰۰
مبادی سیاسیات (ایلیمنٹس آف پولیٹکس)	محمد ہاشم قدوائی	۶۰/۰۰

[illegible]

کتاب	مصنف	قیمت
اصول تعلیم	ڈاکٹر ضیاء الدین علوی	۵۰/۰۰
جدید تعلیمی مسائل	ڈاکٹر ضیاء الدین علوی	۵۰/۰۰
تعلیم اور اس کے اصول	محمد شریف خاں	۲۵/۰۰
جدید تعلیمی نفسیات	محمد شریف خاں	۵۰/۰۰
عربی کیسے پڑھائیں	محمد شریف خاں	۲۵/۰۰
تنظیم مدارس کے بنیادی اصول	محمد شریف خاں، اشتیاق احمد ظلی	۳۰/۰۰
تعلیمی نفسیات کے نئے زاویے	مسرت زمانی	۵۰/۰۰
ثانوی تعلیم اور اس کے مسائل	محمد قاسم صدیقی	۴۰/۰۰
اصول تدریس	محمد قاسم صدیقی	۵۰/۰۰
اردو کیسے پڑھائیں	سلیم عبداللہ	۳۰/۰۰
آیئے اردو سیکھیں	مرزا خلیل بیگ	۱۵/۰۰
سائنس کی تدریس	وزارت حسین	۵۰/۰۰

[illegible]

کتاب	مصنف	قیمت
جدید علم سائنس	وزارت حسین	۴۰/۰۰
رہبر صحت	مسرت زمانی	۲۵/۰۰
رہبر تندرستی	مسرت زمانی	۳۵/۰۰
علم خانہ داری	مسرت زمانی	۴۰/۰۰
بچوں کی تربیت	مسرت زمانی	۳۵/۰۰
گلدستہ مضامین و انشاء پردازی	ڈاکٹر محمد عارف خاں	۳۰/۰۰
تفہیم البلاغت	وہاب اشرفی	۴۰/۰۰
اردو صرف	ڈاکٹر انصار اللہ	۱۸/۰۰
اردو نحو	ڈاکٹر انصار اللہ	۱۲/۰۰
اردو ٹھکشک	ہندی کے ذریعہ اردو سیکھیے	۱۲/۰۰
انگلش ٹرانسلیشن کمپوزیشن اینڈ گرامر	ایم۔ اے۔ شہید	۳۰/۰۰

ناول اور افسانے

کتاب	مصنف	قیمت
آخر شب کے ہمسفر (ناول)	قرۃ العین حیدر	۱۰۰/۰۰
چار ناولٹ (ناولٹ)	قرۃ العین حیدر	۷۵/۰۰
روشنی کی رفتار (افسانے)	قرۃ العین حیدر	۷۵/۰۰
ضدی (ناولٹ)	عصمت چغتائی	۳۰/۰۰
راجندر سنگھ بیدی اور ان کے افسانے	ڈاکٹر اطہر پرویز	۷۵/۰۰
کرشن چندر اور ان کے افسانے	ڈاکٹر اطہر پرویز	۶۰/۰۰
ہمارے پسندیدہ افسانے	ڈاکٹر اطہر پرویز	۶۰/۰۰
اردو کے تیرہ افسانے	ڈاکٹر اطہر پرویز	۷۵/۰۰
منٹو کے نمائندہ افسانے	ڈاکٹر اطہر پرویز	۵۰/۰۰
پریم چند کے نمائندہ افسانے	ڈاکٹر قمر رئیس	۶۰/۰۰
نمائندہ مختصر افسانے	محمد طاہر فاروقی	۲۵/۰۰
باغ کا دروازہ	طارق چھتاری	۱۵۰/۰۰

ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ مسلم یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

افتخار عالم خاں کی سر سید پر دیگر تصانیف
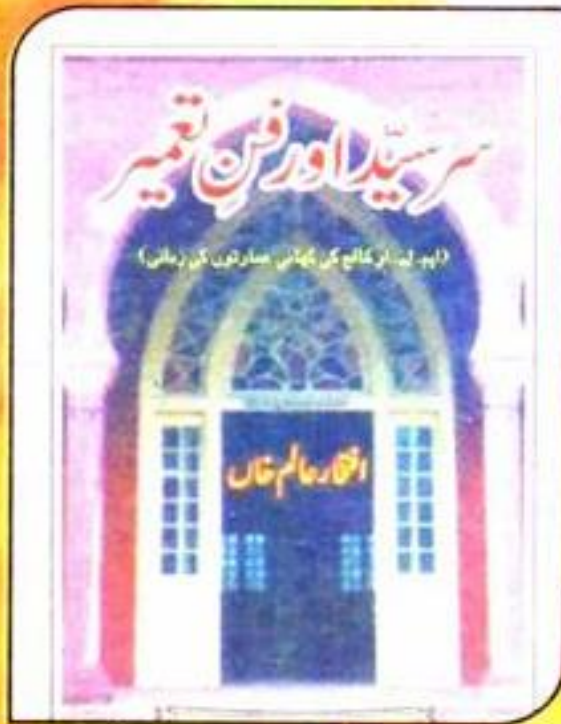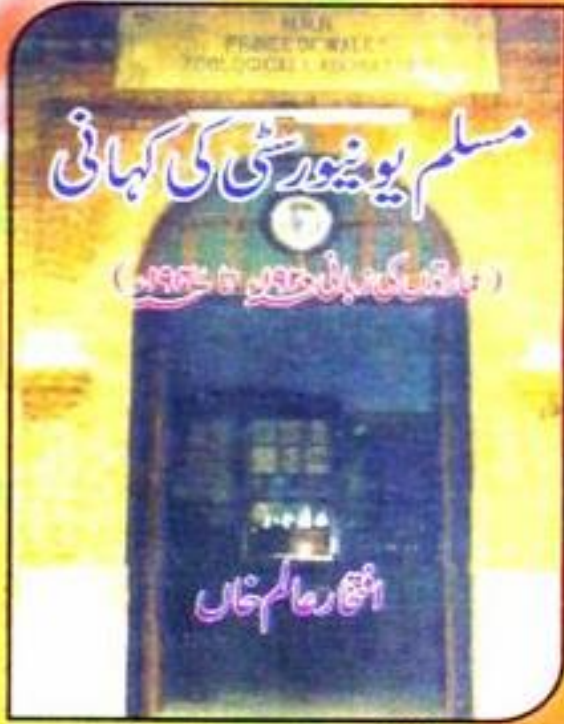
متفرق مصنفین کی سر سید پر تصانیف

ایجوکیشنل بک ہاؤس، مُسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲